ہومیو ڈاکٹر محمد ہاشم مرزا



ڈاکٹر صاحب مرحوم 50 سال سے زائد عرصہ طب کے شعبے سے وابستہ رہے اور 20 سال سے زائد عرصہ ''ماہنامہ آنچل'' کے معروف سلسلے ''آپ کی صحت'' کے ذریعے قارئین کو ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کے مطابق طبی مشورے فراہم کرتے رہے۔ مندرجہ ذیل دوائیں ڈاکٹر صاحب کے 50 سالہ طبی تجربے کا نچوڑ ہیں۔

قدرتی بال، سر کی رونق بحال



ایک بوتل بذریعہ منی آرڈر

قیمت =/700 روپے

براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت =/500 روپے

چہرے و دیگر غیر ضروری بالوں کا مستقل خاتمہ



ایک بوتل بذریعہ منی آرڈر

قیمت =/900 روپے

براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت =/800 روپے

ایفروڈائٹ بریسٹ بیوٹی



ایک بوتل بذریعہ منی آرڈر

قیمت =/600 روپے

براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت =/500 روپے

ایفروڈائٹ پین کلر



ایک بوتل بذریعہ منی آرڈر

قیمت =/700 روپے

براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت =/500 روپے

منی آرڈر بذریعہ
پاکستان پوسٹ بھیجنے کا پتا:
منی آرڈر کرنے کے بعد فارم نمبر، نام، ایڈریس، مطلوبہ دوا، بھیجی گئی رقم، 0320-1299119 پر SMS کردیں

ہومیو ڈاکٹر محمد ہاشم مرزا کلینک

ایڈریس: دوکان نمبر C-5، کے ڈی فلینس فیز 4،
شادمان ٹاؤن نمبر 2، سیکٹر B-14، نارتھ کراچی 75850
فون نمبر: 021-36997059، صبح 10 تا رات 9 بجے
منی آرڈر کی سہولت میسر نہ ہونے کی صورت میں فون پر رابطہ کریں

زیر نگرانی:
محمد عاصم مرزا
محمد آصف مرزا
محمد عامر مرزا

ماہنامہ

حجاب کراچی

جنوری 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک

میرے خواب زندہ ہیں — نادیہ فاطمہ رضوی کا سلسلے وار ناول
دل کے دریچے — صدف آصف کا سلسلے وار ناول
شب آرزو تیری چاہ میں — نائلہ طارق کا منفرد سلسلے وا ناول

اس کے علاوہ

یمنیٰ اختر، کرن نعمان، شبانہ شوکت، نگہت غفار
آسیہ مظہر چوہدری ودیگر بہنوں کی خوب صورت تحریریں

قارئین کے ذوق کے عین مطابق مستقل سلسلوں میں پڑھیے

طب نبویؐ، بزم سخن، کچن کارنر، آرائش حسن، عالم میں انتخاب
شوخیٔ تحریر، حسن خیال، ہومیو کارنر، شوبز کی دنیا، ٹوٹکے

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں/ (021-35620771/2)

ماہنامہ

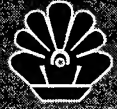
نئے اُفق

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس









مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
گروپ ایڈیٹر
طاہر احمد قریشی
تزئین
نورالدین



جلد	42
شمارہ	01
فروری	2018

پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........600 روپے



اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242



aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk



پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی





















خط وکتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے جب افغانستان میں پاکستان کی شیر دل افواج نے روس جیسی سپر پاور کو شکست سے دوچار کیا۔ وہ پاک افواج ہی تھی امریکن نہیں امریکن تو آج تک طالبان کو جو خود ان کی ہی پیداوار ہیں قابو نہیں کر سکے پاک افواج دنیا کی بہترین افواج میں شمار ہوتی ہے تب میں اب میں یہ فرق ہے کہ آج پاک افواج ہر قسم کے جوہری اسلحہ سے لیس ہے امریکا جو سات سمندر پار ہے جبکہ روس کی تو سرحد سے سرحد ملی ہوئی تھی امریکا نے اگر میلی آنکھ سے دیکھا تو اسے بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ یہود ونصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے تقریباً گیارہ بارہ مقامات پر قرآن میں مختلف انداز میں یہی بات دہرائی گئی ہے اس کا مشاہدہ تمام عالم انسانیت اور خصوصاً تمام ہی اسلامی ممالک یہود وہنود کے مظالم وشقاوت کا شکار ہیں امریکا جو یہود وہنود کی دوغلی نسل سے تعلق رکھتا ہے امریکی حکمرانوں کی بڑی تعداد کا تعلق یہودی النسل افراد سے ہے وہاں کی تجارت وثقافت پر یہودیوں کی بڑی مضبوط گرفت ہے یہ دونوں اقوام ایک دوسرے کی دوست صرف مسلمانوں کو مٹانے انہیں نیست ونابود کرنے کے لیے تو ہیں لیکن باہم یہ بھی ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے لیکن جب معاملہ مسلمانوں کا ہو تو یہ ایک مضبوط چٹان کی مانند ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں آج اگر ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ سکیں تو ہمیں نظر آ جائے گا کہ کون سا اسلامی ملک ایسا ہے جہاں یہود وہنود نے اپنے پنجے نہ گاڑھ رکھے ہوں اپنے ظلم وستم کا شکار نہ بنا رکھا ہو افغانستان ہو عراق ہو یمن ہو شام ہو ایران ہو یا افریقی ریاستیں یہاں تک کہ مسلم دنیا کے سب سے اہم اور مقدس ملک سعودی عرب بھی ان کے چنگل سے آزاد نہیں ہے معاشی طور پر اقتصادی طور پر سیاسی طور پر اور عسکری طور پر اپنا فرمانبردار اطاعت گزار بنا رکھا ہے جس نے بھی ذرا سر اٹھانے کی کوشش کی اس کا سر کچلنے کے لیے فوری عملدرآمد شروع ہو جاتا ہے عراق کی کیا دشمنی تھی امریکا سے جو اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی کرنل معمر قذافی نے کیا کیا تھا جو اسے قتل کر کے وہاں اپنے پسندیدہ افراد کو متعین کر دیا شام نے یمن نے افغانستان نے کونسی امریکی گدھی چرائی تھی جو اسے تہس نہس کر کے رکھ دیا اب پاکستان کو نشانے پر رکھنے کی تیاری کر لی گئی ہے حالانکہ پاکستان نے اپنے قیام سے لے کر آج تک تقریباً ستر برس امریکی اطاعت میں ہی گزاری ہے اب جبکہ پاکستان نے اپنے ہمسائے ممالک چین اور روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو امریکی حکمرانوں کو کیوں مرچیں لگ رہی ہیں صرف اس لیے کہ خطے کا ایک اہم ملک جو مسلمان بھی ہے جوہری توانائی کا حامل بھی وہ ان کے ہاتھوں سے پھسلے جا رہا ہے اس کی وجہ وہ خود بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں افغانستان جو ایک خالص مسلم مملکت کے طور پر خود امریکی سرپرستی اور تعاون سے بنا تھا اسے صرف اس لیے بارود کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا خاک وخون میں نہلا دیا گیا کہ کلیسا کو یہ قطعی پسند نہیں تھا کہ زمین پر ان کے علاوہ بھی کوئی مذہب کے نام پر سربلند کرے اب جبکہ امریکا اور اس کے اتحادی فرعونوں نے افغان مسلمانوں کا خود ان کی اپنی سرزمین پر رہنا مشکل کر دیا ہے خاک وخون میں نہلا دیا ہے اور یہ سب انہوں نے پاکستان کو آگے لگا کر کیا یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی جوتی مسلمانوں کا سر اس کے باوجود امریکا بہادر پاکستان سے مطمئن نہیں وہ چاہتا ہے کہ پاکستان کا بھی وہی حشر نشر ہو جو اس نے افغانستان عراق وشام کا کر دیا ہے وہاں اپنی مرضی کے سیکولر حکمران بٹھا کر بھی اسے چین نہیں ہے افغانستان جس کی طویل سرحد پاکستان سے ملحق ہے جس نے امریکی منشا ومرضی کے مطابق افغان مجاہدین طالبان اور دیگر مسلمان قوتوں کو بغاوت، دہشت گردی کے نام پر کچلا اور امریکی پالیسیوں کے برخلاف خود اپنے وطن عزیز میں دہشت گردوں کی سرکوبی کی جس سے وطن عزیز میں انتقامی دہشت گردی نے جنم لیا اور خودکش دہشت گردی بھی افغانستان کے حوالے سے امریکی تحفہ ہے، پاکستان میں منشیات اسلحہ اور

دہشت گردی صرف اور صرف افغانستان میں امریکی مداخلت اور اس مداخلت میں پاکستان کی شرکت نے پاکستان کو دہشت گردی سے آشنا کیا اس امریکی ردعمل کے طور پر اب تک تقریباً ستر ہزار جانوں کا نقصان پاکستان اٹھا چکا ہے صرف اور صرف امریکی خوشنودی کی خاطر آج وہی امریکا پاکستان کو آنکھیں دکھا رہا ہے دھمکی دے رہا ہے اگر اس نے کوئی خطیر رقم پاکستان کو ادا بھی کی ہے تو کون سا احسان کیا ہے اس ملنے والی رقم سے کئی گنا زیادہ کا پاکستان نے نقصان برداشت کیا ہے اس کے جواب میں آج امریکا پاکستان کی امداد روکنے یا بند کرنے کی دھمکی دے رہا ہے جبکہ ملنے والی تمام رقم نہ تو قرض تھیں نہ امداد بلکہ وہ تمام رقوم خدمات کا معاوضہ ہے جو بھی پوری طرح ادا بھی نہیں ہوا یہ تو وہی مثل ہوگی چور مچائے شور۔

تمام غیر مسلم قوتیں ہمیشہ سے مسلمانوں سے خوفزدہ رہتی ہیں یہی وجہ ان کے اتحاد کی بھی ہے اس لیے ہی وہ تمام اقوام مسلمانوں کے خلاف انہیں مٹانے اور ختم کرنے کے لیے ایک آواز بن جاتے ہیں افغانستان کو زیر کرنے اور امریکی قبضہ مضبوط کرانے میں پاکستان نے سردھڑ کی بازی لگائی تھی اس لیے بھی اس کا حق بنتا ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی سرحد افغانستان سے ملتی ہے اسے افغانستان میں وہ اختیارات ملنے چاہیے تھے جو امریکا نے پاکستان کے دشمن ناپسندیدہ پڑوسی بھارت کو عطا کیے ہیں جبکہ نہ اس کی سرحد ملتی ہے نہ معاشرت نہ مذہب نہ زبان کسی قسم کی کوئی مطابقت نہیں بنتی لیکن صرف اسلام دشمنی میں بھارت کی ہندو قوم کو افغانستان میں کھیل کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا ہے کیونکہ بھارتی ہندو بھی مسلمانوں کے اتنے ہی دشمن ہیں جتنے یہود و ہنود پاکستان میں ہونے والی تمام تر دہشت گردی کے پس پشت بھارتی ہاتھ ہمیشہ رہا ہے اب جبکہ ایک اہم اور بڑا جاسوسی نیٹ ورک پکڑ لیا گیا کلبھوشن یادو گرفتار ہو چکا ہے اس نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے اور سارا کچا چٹھا بیان کر دیا ہے اس کے باوجود بھارت اور اس کا نیا باس و سرپرست امریکا مسلسل آنکھوں میں دھول جھونکنے میں مصروف ہے امریکی شہ پر بھارت بلوچستان کو ایک الگ ریاست بنوانے کے محاذ میں گو کہ ناکام ہو چکا ہے لیکن اس کی مذموم کارروائیاں بھی ختم نہیں ہوئیں اب بھی افغانستان جہاں بھارت کو ہر طرح کی کھلی آزادی حاصل ہے وہاں سے وہ پاکستان کے خلاف سازش کر رہا ہے اس میں اس کی مدد امریکا و اسرائیل کر رہے ہیں اور اب امریکا نے براہ راست پاکستان کے خلاف اپنے قلبی بغض کا اظہار کر دیا ہے امریکی صدر جو خود بھی یہودی نژاد ہے نے کھل کر اسرائیل کی حمایت کرتے ہوئے پہلے بیت المقدس کو اسرائیلی دارالحکومت بنانے کا حکم جاری کیا جس نے عالم اسلام میں ایک کرب و بے چینی ایک ہلچل نے جنم لیا اب مسلمانوں کے خلاف دوسرا بڑا اقدم پاکستان کو اپنے نشانہ پر رکھ کر کیا ہے لیکن پاکستان کا معاملہ اور اس کا محل وقوع اور حدود اربعہ خطے کے اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے اس کی سرحدیں جہاں ایران افغانستان سے ملتی ہیں وہیں چین جیسے دوست اور دوستی کے خواہش مند روس سے بھی ملتی ہیں اگر امریکی عسکری قوتوں کو یہ گمان ہے کہ پاکستان کے ایک طرف ان کا حمایت یافتہ بھارت ہے تو دوسری طرف خود امریکی افواج کے زیر تسلط افغانستان ہے لیکن ان نا سمجھوں کو یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ چین جس کے مفادات اب پاکستان سے وابستہ ہو چکے ہیں وہ کبھی بھی پاکستان کو اکیلا نہیں چھوڑے گا اور روس بھی کسی نہ کسی حد تک پاکستان کے ساتھ ضرور کھڑا ہوگا چاہے وہ بغض معاویہ میں ہی کیوں نہ ہو امریکا سے وہ اپنا انتقام لینے اور اسے خاک چٹانے کے لیے جیسا کہ امریکا روس کے ساتھ افغانستان کے معاملے میں کر چکا ہے جس کے نتیجے میں روس منتشر ہوا اس کا انتقام لینے کے لیے وہ پاکستان کے ساتھ کھڑا ہو سکتا ہے پاکستان اب کسی بھی طرح تنہا نہیں اگر امریکا نے کسی بھی طرح عسکری برتری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو منہ کی کھائے گا ان شاء اللہ۔ پاکستانی حکمرانوں کو حوصلے اور ہمت سے کام لینا ہوگا کسی طرح کے خوف یا دہشت گردی سے ڈر کر سر جھکانے کی ضرورت نہیں بلکہ سینہ تان کر کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ پاکستان کا قیام اللہ کی مشیت اور کرم و فضل کا نتیجہ ہے اس کی حفاظت ان شاء اللہ تعالیٰ، اللہ فرما رہا ہے اور ہمیشہ فرماتا رہے گا ہمیں ایک آواز ایک قوت اور ایک قوم بن کر سینہ سپر ہونا ہوگا دشمن چاہے کوئی بھی ہو اللہ کی قوت سے بڑا نہیں ہو سکتا پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے۔ آمین



گفتگو

اقبال بھٹی

''حضرت محمود بن لبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''شرک اصغر'' کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ''ریا'' (یعنی دکھاوے کے لیے کوئی کام کرنا۔'' (احمد)

عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

سال نو کا دوسرا یعنی فروری کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔

وقت اتنی تیزی سے گزرتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے کہ ہم جنوری کے شمارے سے فارغ ہوئے اور اب فروری کا اداریہ تحریر کر رہے ہیں۔ بہت سے لکھنے والوں کو شکایت ہے کہ ان کی کہانیاں نہیں لگ رہیں' شاید ہم انہیں جان بوجھ کر دبا رہے ہیں تو ایسا نہیں ہے جب سے ہم نے نئے لکھنے والوں کو موقع دینا شروع کیا ہے کہانیوں کا ڈھیر جمع ہو گیا ہے جسے پڑھنے کے لیے بھی وقت درکار ہوتا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ کچھ کہانیاں ڈھیر میں دب کر تاخیر کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لکھنے والے اپنی تحریر بھیجنے سے پہلے اس کی فوٹو اسٹیٹ ضرور کروالیا کریں اور ہمیں اوریجنل صفحات بھیجا کریں' دوسرے کہانی لکھنے کا ایک طریقہ اپنائیں' ہمیشہ صفحہ کے ایک طرف ایک لائن چھوڑ کر لکھیں' صفحات کے دونوں طرف لکھی ہوئی کوئی کہانی قبول نہیں کی جائے گی۔

اس ماہ سچی کہانیوں کے مدیر بھائی ناصر رضا نئے افق ملتان کے ایجنٹ شیخ عمر دین دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنائے۔ ہمارے محترم لکھاری شہباز اکبر الفت کی والدہ ماجدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ماں کی جدائی ایک بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے' اللہ رب العزت شہباز اکبر الفت کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کی والدہ کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔

اس ماہ عشنا کوثر سردار کی ایک سو سولہ چاند کی راتیں اختتام پذیر ہو رہی ہے' انہوں نے بڑے خوب صورت انداز میں اسے لکھا اور اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کیا اب آئندہ ماہ سے معروف لکھاری عمارہ خان کی پراسرار سلسلے وار کہانی ''وہ تیس دن'' شائع کی جا رہی ہے۔ عمارہ خان لکھنے والوں میں ایک بڑا نام ہے' وہ تیس دن ایک آسیب زدہ مکان کی کہانی ہے جہاں ہر ماہ گھر کے ایک مکین کی موت واقع ہو جاتی ہے' کیوں یہ آپ کو کہانی پڑھ کر معلوم ہوگا۔

اب آیئے اپنے خطوط کی طرف۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم ومکرم جناب اقبال بھٹی صاحب سلام

شوق امید واثق ہے کہ آپ اور آپ کے رفقا کار بالکل خیریت سے ہوں گے نئے سال کا پہلا شمارہ میرے سامنے ہے اس بار ٹائٹل بناتے ہوئے مصور نے کمال کر دیا ایک ماہ جبین نے خوب صورت پالتو کتوں کو ساتھ لیا ہوا ہے اس لوکیشن نے ٹائٹل کی خوب صورتی میں بہت اضافہ کیا ہے انتباہ پڑھ کر احساس ہوا کہ اس وطن عزیز میں ناہنجاروں کا ایک ٹولہ موجود ہے جس میں اخلاقیات نام کی کوئی چیز سرے سے ہے ہی نہیں چوری تو چوری ہے خواہ وہ کسی معمولی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی مگر کسی شاعر نے ان ہی اخلاق باختہ لوگوں کے لیے لکھا تھا۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی، دستک میں مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے پاکستان کے واحد مخلص دوست چین کے بارے میں بہت سی چیزیں بتائیں چین اور پاکستان بے لوث دوستی کے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں رب کریم پاک چین دوستی کو نظر بد سے بچائے اور اسے قائم و دائم رکھے آمین، گفتگو سے پہلے آپ نے حدیث پاک لکھ کر ہم پر بہت احسان کیا ہے خاص کر نوجوان نسل کے لیے یہ ایک بہت بڑا سبق ہے محترمہ عشنا کوثر سردار کو اچانک دو صدمات سے دوچار ہونا پڑا اللہ تعالیٰ انہیں دونوں صدمات برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے، آمین۔ کرسی صدارت پر براجمان ایم حسن نظامی کا خط بڑا دلکش ہے اللہ تعالیٰ ان کی ساری نیک تمناؤں کو پورا فرمائے، آمین۔ حسن بھائی تبصرہ پسند فرمانے کا بے حد شکریہ، محمد رفاقت کا خط بھی لاجواب ہے رفاقت بھائی غریب غربا کو صاحب نصاب نہ ہونے کی وجہ سے زکواۃ نہیں دیتے مگر زکوۃ جو لوگ بھی دیتے ہیں اس کا بے جا استعمال ہو رہا ہے جو اللہ کی نظر میں بہت ناپسندیدہ ہے اللہ تعالیٰ ہمیں یہ روش بدل کر زکوٰۃ مستحقین پر خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین، آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا اس کے لیے شکر گزار ہوں رفاقت پیارے خط اور تبصرہ پسند فرمانے پر شکریہ قبول فرمایئے پرنس افضل شاہین صاحب نے اپنے خط میں نئے عیسوی سال کی مبارک دی ہے خیر مبارک ویسے ہم مسلمانوں کا تو ہجری سال ہے جو یکم محرم سے شروع ہوتا ہے مگر کیا کریں پوری دنیا کا نظام عیسوی سال کے ساتھ چل رہا ہے آپ نے اپنا خط ایک خوب صورت شعر اور لاجواب قطعہ سے کیا ہے جو قابل ستائش ہے کرسی صدارت پر بیٹھنے اور چٹھی کو پسند فرمانے پر بے حد ممنون ہوں، محترم جناب عبدالجبار رومی انصاری نے بھی اپنے خط کا آغاز ایک قطعہ سے کیا ہے بڑی اچھی روایت ہے جسے جاری رہنا چاہیے انہوں نے اپنے خط میں آقائے نامدار ﷺ کا ذکر بڑے پیارے انداز میں کیا ہے، عبدالجبار صاحب خط کی پسندیدگی کا شکریہ، پیارے بھائی ریاض بٹ کا خط ان کی کہانی اصل مجرم کی طرح خوب صورت ہے بھیا آپ نے مجھے اپنے حسین دل میں بٹھا رکھا ہے یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے آپ کو میرا ہر خط پسند آتا ہے یہ میرے لیے قابل فخر بات ہے اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی صحت مند زندگی عطا فرمائے، آمین۔ گفتگو کے آخر میں محترم جناب جاوید احمد کا طویل بامعنی خط ہے صدیقی بھائی آپ کو میرا تبصرہ جاندار لگا یہ میری خوش قسمتی ہے اللہ آپ کو خوش رکھے آمین، اس بار جناب عمر ارشد صاحب کی محفل میں کمی بہت محسوس ہوئی خداوند کریم انہیں صحت مند رکھے، آمین۔ اقرا میں اسم حق تعالیٰ ''الباری'' کی جس طرح تشریح ہوئی وہ قابل تعریف ہے اللہ تعالیٰ جناب طاہر قریشی کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے آمین، باقی ہر انتخاب اور ہر تحریر میں جریدہ نے اپنا معیار برقرار رکھا ہے، رب کریم اسے ترقی کی

راہوں پر اسی طرح گامزن رکھے، آمین۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم، سورج آسمان پر چھائی دھند کو چیرتے ہوئے کچھ مکمل تھکا ہارا سا دھیرے دھیرے مغرب کی جانب عازم سفر تھا جب نئے افق کا دیدار ہوا ایک تو یہ سرد موسم ہمیشہ سے میرے اعصاب کشیدہ کر دیتا ہے نامعلوم سی بے چینی چھا جاتی ہے، ذرا سی آہٹ پر دل دھڑک دھڑک جاتا ہے اس پر مصداق یہ نئے افق کا ٹائٹل، ہائے رے ظالم جس نے بھی بنایا کمال بنایا برف کے نرم و نازک سفید گالوں کو مات دیتی دوشیزہ اور دائیں بائیں حسن کے دو محافظ رب جانتا ہے دل پر کیا کیا بیت رہی ہے بہرحال ٹائٹل کو چھوڑتے ہوئے اندر کی طرف بڑھتے ہیں جہاں حیرت کے کئی جہاں منتظر ہیں یقیناً اس شمارے کی خاص بات محترم قریشی صاحب کا کالم ہے چلتے ہو تو چین کو چلیے یہ تحریر ابن صفی کے حوالے سے ہمارے لیے یادگار بن گئی قریشی صاحب نے جس اسلوب سے مسٹر سنگی کے ساتھ ملاقات کا احوال بیان کیا اور اس کے ساتھ ابن صفی صاحب کے یادگار کردار سنگ ہی کی یاد دلائی اس نے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی بھر دی قریشی صاحب کا بہت شکریہ کہ انہوں نے اپنے ساتھ ہمیں بھی چین کی سیر کروائی، گفتگو میں اس دفعہ کافی ساتھی غائب ہیں چلیں جو تشریف لائے ہیں ان کی بات کرتے ہیں ریاض بٹ صاحب لگتا ہے آپ نے میری بات دل پر لے لی ہے کم از کم آپ کے شعر سے تو مجھے ایسا ہی لگا اگر میری کوئی گزشتہ بات سخت تھی تو دلی معذرت اللہ آپ کو خوش رکھے، ریاض قمر بھائی آپ نے بڑی مختصر حاضری دی ہے اللہ آپ کے تمام معاملات درست فرمائے ایم حسن نظامی صاحب کرسی صدارت کی بہت مبارکباد، عبدالجبار رومی صاحب مجھے یاد رکھنے کا شکریہ، آپ کا تبصرہ عمدہ رہا پیارے بزنس مین بھائی جاوید احمد صدیقی کافی عرصے بعد تشریف لائے ہیں جی آیا نوں، آپ کے خیالات جان کر اچھا لگا آپ نے کافی تفصیل سے تبصرہ فرمایا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، اب کہانیوں کی طرف بڑھتے ہیں ابتدائی صفحات پر امجد جاوید صاحب موجود ہیں کہانی نے دل خوش کر دیا، میں سمجھتا ہوں یہ مکمل طور پر ایک معاشرتی کہانی تھی فارحہ جیسے کردار ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں البتہ جیسا انجام ہوا اس کی مجھے توقع نہیں تھی ویلڈن جناب کورٹ رپورٹر خلیل جبار بھی ہمیشہ کی طرح اچھی کہانی لے کر آئے محبت کے نام پر کیا کچھ ہو رہا ہے یہ سبھی جانتے ہیں زرین قمر ماشاء اللہ دو کہانیاں لے کر حاضر ہوئیں۔ ابھی زیر مطالعہ ہیں اللہ انہیں مزید ہمت سے نوازے نئے افق میں ایک خوشگوار احساس عمارہ خان کا نام دیکھ کر ہوا یقیناً عمارہ ایک اچھی رائٹر ہیں اور مسلسل محنت سے اپنا مقام بنا رہی ہیں، ان کی تحریر کردہ کہانی بدلہ روایتی خوفناک کہانیوں سے ہٹ کر تھی، کیونکہ اکثر خوفناک اور پر اسرار کہانیوں کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا، ہر صفحہ پر ایک چڑیل اور دو چار خونخوار بھوت برآمد ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس عمارہ خان نے باقاعدہ ایک تھیم، پلاٹ اور مرکزی خیال کے تحت کہانی ترتیب دی، مگر مجھے اختتام پر کچھ تشنگی کا احساس ہوا لیکن کہانی کی پر اسراریت نے اس احساس کو زائل کر دیا اب کچھ بات کرتے ہیں سلسلے وار ناولز کی جناب فارس مغل کا ناول ہمجان اختتام کو پہنچا ان سے جو توقعات تھیں وہ اس پر بخوبی پورا اترے ہیں امید ہے کہ جلد نئے شاہکار کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ ایک سو سولہ چاند کی راتیں

دل کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کرتا چلا جا رہا ہے اس دفعہ صفحات کچھ کم تھے، عشنا کوثر کے کزن اور خالہ کی وفات کا جان کر دکھ ہوا، اللہ مرحومین کے درجات بلند فرمائے، آخری صفحات پر ناول مرشد تو اب سرپٹ دوڑنے لگا ہے، مرشد صاحب اس قسط میں پورے ایکشن میں دکھائی دیے نئے ہنگامے، نئے معرکے یہ قسط خوب رہی، ساحر صاحب بہت عمدہ لکھ رہے ہیں، مجموعی طور پر سال کا پہلا شمارہ بہترین رہا تمام منتظمین کو مبارکباد، والسلام۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم نئے سال 2018ء کا پہلا شمارہ 22 دسمبر کو ملا اس بار سرورق بہت منفرد اور خوب صورت ہے بنانے والے کو بے اختیار داد دینے کو جی چاہا سب سے پہلے دستک پڑھی محترم مشتاق احمد قریشی صاحب اس بار چین کی سیر کرا رہے تھے اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے کہ پاک چین دوستی دیوار چین سے بھی مضبوط ہے میرے لیے سب سے خوش آئند بات یہ ہے کہ محترم استاد ابن صفی مرحوم کے زندہ جاوید کردار سنگ کی یاد تازہ ہوگئی یہ ایک لازوال کردار ہے اور ان کے ناول نیلی لکیر، خونی بگولے، جونک کی واپسی، زرد فتنہ اور بہت سے یادگار ناول یاد آ گئے خیر یہ قصہ پھر کبھی سہی کیونکہ اس پر گھنٹوں لکھا جا سکتا ہے گفتگو میں پہنچے تو قابل احترام اقبال بھٹی صاحب بڑی اچھی لکھاری عشنا کوثر کی خالہ اور ان کے کزن کی فوتگی کی خبر دے رہے تھے ہم سب قاری اور لکھاری اور تمام نئے افق کی ٹیم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں، خدا مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ گفتگو میں پہلا خط ہے جناب ایم حسن نظامی صاحب کا آپ کی حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ آپ کا خط محفل کی جان ہے محمد رفاقت صاحب اس بار آپ کا خط ذرا طویل اور مدلل ہے بہت اچھے لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے میرا تبصرہ اور کہانی بازگشت کو اتنی پذیرائی دینے کا شکریہ ریاض حسین قمر بھائی آپ کا خط بھی قابل تعریف ہے اور آپ کے خیالات بہت ارفع و اعلیٰ ہیں آپ کی حوصلہ افزائی سے میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے خدا ہماری بیٹی کے نصیب اچھے کرے کیونکہ آپ کی بیٹی بھی ہماری بیٹیوں کی طرح ہے پرنس افضل شاہین شعر پسند آیا آپ ذرا جلدی خط ارسال کر دیا کریں آپ نے جن سلسلوں کو شروع کرنے کے لیے کہا ہے میرا ووٹ بھی اس کے حق میں ہے عبدالجبار رومی آپ کا خط بھی ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور پراثر الفاظ کا مرقع ہے آپ نے میری کہانی پر تبصرہ نہیں کیا اس بار جاوید احمد صدیقی صاحب بھی تشریف لائے ہیں اور کیا خوب آئے ہیں بڑا جاندار اور بھرپور تبصرہ ہے آپ بہت لمبی ڈبکی لگا جاتے ہیں اور ہماری نظریں آپ کا خط محفل میں ڈھونڈتی رہ جاتی ہیں اتنا طویل انتظار نہ کرایا کریں کہ آنکھیں پتھرا جائیں آپ کی حوصلہ افزائی میرے لیے ہیرے جواہرات سے بھی قیمتی ہے اس بار کی تفتیشی کہانی پڑھ کر رائے ضرور دیجیے گا خطوط کی محفل تو تمام ہوئی اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف امجد جاوید بہت بڑے لکھاری ہیں ان کی اس بار کی کہانی ''سایہ دیوار'' آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے پڑھی میری بار بار کی کہی ہوئی بات انہوں نے اپنی کہانی میں بالکل سچ ثابت کر دکھائی کہ اچھے لوگ ہر دور میں موجود رہے ہیں ارباز اور ماورا ایسے ہی کردار ہیں جیتے جاگتے، رانا زاہد حسین صاحب آپ کی تحریر اندر باہر کے کیا کہنے بڑی پرمزاح اور بوجھل

لمحوں کے لیے اکسیر تحریر ہے برجستہ جملوں اور حوالوں نے کہانی کو بہت جاندار بنادیا آپ کی ایسی ہی تحریروں کا انتظار رہے گا ویل ڈن برزخ بھی ایک اچھی کہانی ہے مہتاب خان بھی نئے افق میں جانا پہچانا نام ہے ان کی تحریر لغزش ایک نشتر کی طرح کی تحریر ہے جب آگ اور پانی اکٹھے ہوتے ہیں تو ایسی ہی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں اور ایک لمحے کی لغزش جب اچانک انسان کے سامنے آتی ہے تو انسان کانپ اٹھتا ہے صفیہ ساری بات سمجھ گئی تھی یہ کہانی حقیقت کے قریب لگی فارس مغل کی ہیجان کا آخری حصہ بھی تعریف کے قابل ہے، مصنف کی گرفت کہانی پر آخر تک رہی جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں اب کچھ بات ہوجائے باقی سلسلوں کی ذوق آگہی میں شہروز خان، محمد فرقان رومان، عبدالجبار رومی اور پرنس افضل شاہین کے انتخابات بیسٹ ہیں باقی بھی اچھے ہیں خوش بوئے سخن میں سارا کلام اپنی مثال آپ ہے کسی ایک کی زیادہ تعریف کرنا زیادتی ہوگی، سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔اب اجازت ان شاء اللہ اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔

بشیر احمد بھٹی...... بھاولپور۔ جناب محترم مشتاق احمد قریشی صاحب جناب عمران احمد صاحب آداب السلام علیکم، بعد سلام کے گزارش ہے کہ گفتگو میں چند مشوروں کے ساتھ حاضر خدمت ہوں، پہلا مشورہ عرصہ تک جناب ابن صفی مرحوم صاحب کے ناول ماہنامہ نیا رخ اور نئے افق میں پڑھتے رہے ہیں اب بے شک ان کو نئے افق میں شائع نہ کریں قارئین کے لیے نئے افق میں طویل اور مختصر کہانیاں شائع ہورہی ہیں آپ سے گزارش ہے کہ جس طرح کرن ڈائجسٹ کے ساتھ ہر ماہ ایک کتابچہ پکوان، بیوٹی کلینک وغیرہ جیسا شائع ہوتا ہے اسی طرح محترم ابن صفی کا پہلا ناول کتابچے کی صورت میں شائع کرکے نئے افق کے قارئین کو گفٹ کریں ٹائٹل پر لکھا ہوا ہو کہ اس ماہ کے نئے افق کے ساتھ ابن صفی کا ناول لینا نہ بھولیں، اسی طرح ہر ماہ نئے افق ڈائجسٹ کے ہمراہ ایک ناول کتابچے کی صورت میں قارئین خوشی خوشی حاصل کریں گے نئے افق کی قیمت بے شک ساٹھ 60 روپے کردیں، دوسرا مشورہ آپ لکھتے ہیں کہ قارئین اپنی تحریریں جلد ارسال کیا کریں لیکن مقررہ تاریخ نہیں بتاتے یہ تحریر کریں کہ قارئین کی تحریریں فلاں تاریخ تک پہنچ جانی چاہیے بے شک تحریروں کے لیے کوپن بھی شائع کردیا کریں اس طرح ہر تحریر بھیجنے کو ڈائجسٹ خریدنا پڑتا ہے جس سے سرکولیشن میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے بغیر کوپن کے ہزاروں لوگ بغیر ڈائجسٹ خریدے اپنی تحریریں شائع کرا کے انعام کے حق دار مفت میں بن جاتے ہیں کوپن سے اصل قارئین جو ہر ماہ باقاعدگی سے ڈائجسٹ خریدتے ہیں اور وہ جو مفت بر ہیں ان کا پتا چل جاتا ہے بغیر کوپن کے تو مدیران اندھیرے میں رہتے ہیں کہ کون مفت خورہ ہے اور کون خریدار ہے چوتھا مشورہ شمارہ فروری 2016ء میں آپ نے لکھا ہے کہ کئی لکھاری اپنی کہانیاں کئی ڈائجسٹوں کو بھیج دیتے ہیں یعنی ایک کہانی چار یا پانچ ڈائجسٹوں کو بھیج کر شائع کرلیتے ہیں ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے ہاں البتہ آپ یہ تحریر شائع کریں کہ جو لکھاری اپنی کوئی سی بہترین کہانی کسی ڈائجسٹ میں شائع کراچکے ہیں اور قند مکرر کے ساتھ دوبارہ شائع کرانا چاہتے ہیں تو تقریباً پانچ سال بعد حوالہ دے کر کہانی بھیجیں کہانی سدابہار ہوئی تو ہم شائع کریں گے ورنہ ضائع کردیں گے جنہوں نے حوالہ نہ دیا اور

کہانی دوبارہ شائع کرادی تو ہم اسے بلیک لسٹ کردیں گے۔
☆محترم بشیر بھٹی صاحب تجاویز دینے کا شکریہ ان شاء اللہ ہم آپ کی تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ سلام عرض امید ہے آپ اور سبھی احباب نئے افق بخیریت ہوں گے، نئے سال کا پہلا پرچہ ذرا تاخیر سے جلوہ گر ہوا مگر نامور لکھاریوں کی تحریروں اور آپ کی بیکراں محنت نے سبھی گلے شکوے دور کردیے دستک میں جناب مشتاق احمد نے خوب صورت انداز میں چین کی سیر کرائی اور یوں لگا جیسے ہم سنکیانگ میں پھر رہے ہیں۔ گفتگو میں سبھی احباب اپنے خوب صورت اور پر معنی تجزیے لیے حاضر پائے آپ نے میرے خط کو اولیت کی سند سے نوازا اور سبھی ساتھیوں نے میری نگارشات کو پسند فرمایا جس کے لیے بے حد شکریہ، محمد رفاقت، ریاض حسین قمر، پرنس بھائی، عبدالجبار رومی، ریاض بٹ اور جاوید احمد صدیقی، سبھی احباب کے خطوط اور گفتگو معیاری اور پر معنی پائی، طاہر قریشی صاحب ہمیشہ کی طرح اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ''الباری'' پر خوب صورت انداز سے طبع آزمائی فرمارہے تھے آخر میں انہوں نے اس کے فضائل پر بھی روشنی ڈالی جو لائق تحسین پائے۔ سایہ دیوار پرچے کی پہلی تحریر انسان کی مجبوریوں اور آزمائش پر مبنی پائی امجد جاوید کا خوب صورت اور رواں انداز بے حد پسند آیا فارحہ اور جمال احمد کے ملاپ پر خوشی ہوئی۔ زرین قمر صاحب کی دونوں تحریریں ہی معیاری اور منفرد پائیں خلیل جبار، پراسرار اور ماورائی تحریر لائے نیم والے بزرگ کی کوششیں اور محنتیں رنگ لائیں اور شاہ رخ کی خلاصی ہوئی جس سے وہ اپنوں میں سرخرو ہوا، بدلہ عمارہ خان نے اپنے خوب صورت لفظوں کا جادو جگا کر حیران کردیا حسن کے کردار پر حیرت ہوئی۔ سید محمود حسن بھی اپنی قابلیت کا لوہا منواتے نظر نواز ہوئے انہوں نے پراسرار آوازوں کی کھوج عمدہ انداز سے کی۔ عشنا کوثر سردار کی خالہ اور کزن کی افسوسناک خبر پر دل خون کے آنسو رویا خداوند کریم مرحومین کو اپنی جوار رحمت میں خاص جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔ رانا زاہد حسین بھی لکھاریوں کی صف میں بہت بڑا نام رکھتے ہیں میں نے ان کی پیشتر تحریریں پڑھی ہیں، وہ کرداروں میں ڈوب کر جذبات و احساسات لکھنے کے ماہر ہیں، فارس مغل کے ہمجان کا آخری حصہ بے حد پسند آیا اور آخر میں جذباتی انداز تحریر سے آنکھوں کے گوشے نم ہوگئے۔ ریاض بٹ صاحب موجودہ صورت حال میں چاقو مار لوگوں کا پرچار کرکے نظر نواز ہوئے بلا شبہ ایسے لوگ ہمارے معاشرہ کے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں اس دھرتی پر جینے کا کوئی حق ہرگز نہیں عمدہ سوچ پرویلکم جی اس کے علاوہ ذوق آگہی میں منفرد اور خوب صورت تجزیے، شاعری میں بے مثال ردیف قافیے اور کترنیں، لطائف اور انمول باتیں بے حد سراہنے کے قابل پائیں، مرشد صاحب ساحر جمیل سید خوب صورت سیڑھی کی ساتویں نشست پر جلوہ گر پائے گئے آٹھویں کڑی میں وہ کیا گل کھلاتے ہیں اور حجاب کو بازیاب کیسے کراتے ہیں۔ بہرحال 2018ء کا پہلا اور افتتاحی پرچہ بے حد اچھا لگا جس کے لیے ادارہ مبارکباد کا مستحق ٹھہرا۔ لو جی خوش رہیے اور خوشیاں بانٹیے اگلے ماہ تک خدا حافظ۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم جناب اقبال بھٹی صاحب اور تمام ادارے کے افراد کو میرا اسلام قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور نئے افق کے ادارے کے تمام لوگوں کو صحت و تندرستی دے آمین۔ اس دفعہ رسالہ بہت دیر سے ملا جلدی میں خط لکھ رہا ہوں شاید وقت پر نہ پہنچ سکے پھر بھی اپنے دوستوں سے دور نہیں رہ سکتا، جس کی وجہ سے خط لکھ ہی دیا رسالہ بڑی آب و تاب کے ساتھ آیا جس نے دل کو خوش کر دیا، نئے افق کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے اور جب یہ رسالہ آتا ہے تو دل کرتا ہے کہ ایک ہی رات میں ایسے پڑھ لیا جائے، میری طرح اور پڑھنے والے بھی اس کو باریک بینی سے پڑھتے ہیں جس کا اندازہ قارئین اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ان کے تبصرے جاندار اور حقیقت کے قریب ہوتے ہیں سب سے پہلے ان ہی خطوط کی طرف آتے ہیں، جس سے رسالے کے معیار کا پتا چلتا ہے جس میں ایم حسن نظامی صاحب، ریاض حسین قمر صاحب، پرنس افضل شاہین صاحب، عبدالجبار رومی انصاری صاحب، جاوید احمد صدیقی صاحب نے بہت ہی اچھے انداز میں خط لکھے اور اپنی رائے کا اظہار کیا، جاوید احمد صدیقی صاحب آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ان ہی کیمروں کی وجہ سے تو اجوبی بی پکڑی گئی تھیں، کہانی پسند کرنے کا شکریہ، سب لوگوں کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے خط کو اور کہانی کو پسند کیا آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو جناب اس دفعہ بھی سب ہی کہانیاں اچھی ہیں، جن میں برزخ، لغزش چھوٹی کہانی تھی مگر اثر انگیز تھی چندر گانٹھ، زرین قمر کی اس دفعہ دونوں کہانیوں نے اچھا تاثر دیا سایہ دیوار، سچی محبت، بدلہ، زیگی، اندر باہر، ہیجان بھی پڑھنے کے لائق تھیں، مرشد پڑھی بہت ہی اچھی جا رہی ہے ہیجان کا آخری حصہ خوب رہا، ذوق آگہی میں بھی بہت کچھ پڑھنے کو ملا جس سے میرے علم میں اضافہ ہوا میری طرف سے سب لکھنے والوں کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو اور سب لوگ دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں آپ کا مخلص، اب اجازت۔

پرنس افضل شاہین...... بھاولنگر۔ اس بار سال نومبر میں ایک حسینہ اپنے دو شکاری کتوں کے ساتھ نمودار ہوئی ہمیں ایسے لگا جیسے وہ کتوں کو کہہ رہی ہو۔

وہ میرا ہو جو نگاہوں میں حیا رکھتا ہو
ہر قدم ساتھ چلے عزم وفا رکھتا ہو
ناز اس کے نہ اٹھاؤں تو شکایت نہ کرے
وہ میرے درد کو سہنے کی ادا رکھتا ہو

آگے بڑھے تو دستک میں انکل مشتاق صاحب عوامی جمہوریہ چین کے بارے میں بتا رہے تھے ہم انہیں ان کے کامیاب دورے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں جی ہم بھی بچپن سے ہی یہ سنتے آئے تھے کہ حدیث میں ہے کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے جو کہ بعد میں غلط ثابت ہوئی چین ہمارا قابل بھروسہ دوست ملک ہے ابن صفی صاحب کے کردار کے بارے میں آپ نے خوب لکھا ہم بھی چائنہ ریڈیو انٹرنیشنل سنتے ہیں اور ہر بدھ یا دوسرے بدھ میری آواز میں چین کے بارے میں رپورٹ نشر ہوتی ہے جو کہ آپ لوگ بھی ایف ایم 98 دوستی چینل یا پھر چائنہ ریڈیو انٹرنیشنل کی

اردو سروس سے بروز بدھ رات ساڑھے سات تا پونے آٹھ اور پھر ساڑھے آٹھ تا پونے نو بجے نشر مکرر کے طور پر سن سکتے ہیں۔ آگے بڑھ کر ہم اپنے پسند کے سلسلے گفتگو میں پہنچے تو آپ عشنا کوثر سردار کی خالہ پھر ان کے جواں سال کزن اللہ کو پیارے ہو گئے ہم بھی ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر دے، آمین۔ کرسی صدارت پر محترم حسن نظامی براجمان تھے مبارکباد' جناب محمد رفاقت صاحب رسالے کا معیار برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ ریاض حسین قمر صاحب اللہ تعالیٰ آپ کی بیٹی کے نصیب اچھے کرے' آمین۔ جاوید احمد صدیقی اور ریاض بٹ کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ عبدالجبار رومی انصاری صاحب آپ کا قطعہ ہی شاندار ہوتا ہے میری تحریر پسند فرمانے کا بہت شکریہ۔ طاہر قریشی بھائی نے اقرأ میں اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام ''الباری'' پر خوب صورت تحریر پیش کی' بہت ہی اچھا لگا۔ ذوق آگہی میں شہروز خان، ایس حبیب خان، محمد فرقان، عبدالرحمان، خوشبوئے سخن میں فرخ حجاز، عمر فاروق ارشد، پروفیسر علی خاکی، عامر خان چاند چھائے رہے۔ زریں قمر کی چندر گانٹھ واقعی پراسرار اور خوب صورت کہانی تھی' اتنی پیاری کہانی تحریر کرنے پر ہم زریں قمر کو مبارک باد پیش کرتے ہیں' امید ہے آئندہ بھی وہ ہمارے لیے ایسی ہی کہانیاں لکھتی رہیں گی۔ دعا ہے نئے افق ترقی کرتا رہے آمین۔



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔

☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔

☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔

☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3' تاریخ تک مل جانے چاہیے۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر میں فون کرنے سے گریز کریں

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

المصور

(صورت گری کرنے والا)

مصور: اسم فاعل واحد مذکر تصویر مصدر، صورت بنانے والا، پیدا کرنے والا، اپنی مخلوقات کے نقش ونگار اور اعضاء تشکیل دینے والا ''المصور'' وہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے جس نے تمام کائنات اور اس میں موجود ہر قسم کی مخلوقات کی تصویر بنائی اور انہیں ایک خاص ترتیب دی۔ یعنی مصورِ الٰہی وہ ہستی ہے جو ہر ہر چیز کو الگ الگ اور خاص صورت اور شناخت عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کی مخلوقات بے حد وحساب ہیں اپنی ان لاتعداد تخلیقات میں اُس نے جو اختلافِ صورت وشناخت رکھا ہے باوجود اس عظیم کثرت کے ان میں شناخت کی تمیز بھی رکھی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مہتم بالشان خالق اور قادرِ مطلق مصور ہے اس عظیم اور لازوال مصور کا کمال ہے کہ کروڑوں مختلف مخلوقات کو نہ صرف جداگانہ صورت وشناخت بخشی بلکہ انہیں مختلف جنس ونوع بھی بخشی اور ان سب کا مختلف نظام افزائش بھی اس مصور عالی نے بنایا۔ اگر انسان کچھ نہ دیکھے صرف اپنی نوعِ انسانی کو ہی دیکھ اور سمجھ لے کہ اربوں انسان اس دنیا میں موجود ہیں جن کی نہ صرف صورتیں، شکلیں مختلف ہیں بلکہ عادات وخصائل بھی مختلف ہیں۔ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف بھی ہوتا ہے اور اپنی صورت میں کامل بھی ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسا مصور ایسا ہے جو اپنی تمام تصویروں کو زندگی کے خوبصورت رنگوں سے سجا کر ان کو جان دار بنا کر انہیں زندگی بخش دیتا ہے۔ اس کی ہر تصویر چلتا، پھرتا، بولتا ہوا ایک شاہکار ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ایسا عظیم مصور ہے جو اپنی مشیت ومرضی سے جس طرح چاہتا ہے صورت سازی فرماتا ہے۔

ترجمہ:۔ وہ ماں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جس طرح کی چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں وہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔ (آل عمران۔٦)

آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت مصوری کا ذکر آیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ہستی ایسی ہے جو رحمِ مادر میں ہی انسان کو اُس کی شکل وصورت عطا کردیتا ہے۔ جس طرح اس کی مشیت ومنصوبہ بندی ہوتی ہے، وہ بناتا ہے، جب کسی نئے انسان یا کسی بھی مخلوق کو خلق یعنی پیدا کرنا چاہتا ہے تو پہلے اُس کے اسباب پیدا فرماتا ہے اور اُس کی شکل وصورت جو نہایت متناسب خصوصیات کی حامل ہوتی ہے عطا کردیتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور اس تصویر سازی میں شریک نہیں ہوتا یہ کام صرف وہ اپنے ارادے اور مشیت سے جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ اس تصویر سازی کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ وہ ایسا حاکم ودانا اور عظیم مصور ہے کہ اس کے اس تمام تخلیقی عمل میں نہ کبھی کوئی رکاوٹ آتی ہے اور نہ ہی آسکتی ہے۔ وہ یہ تمام کام اکیلا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی بڑی قدرت والی، بڑی قوت وقبضے والی، حکمت والی برحق ہے، وہی اکیلی ہستی تمام تر عبادات اور دعاء مانگنے اور انہیں پورا کرنے کی مستحق ہے۔

ترجمہ:۔ اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم ہی نے تمہاری صورت بنائی۔ (الاعراف۔١١)

لفظ خلق کبھی تو قرآنِ حکیم میں صرف وجود میں لانے کے لئے آتا ہے، اسی طرح صورت یعنی تصویر کا مفہوم بھی کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو شکل وصورت اور خصائص دینا۔ اس اعتبار سے خلق اور تصویر کی تخلیق کے دو مرحلے نہیں ہوتے بلکہ کسی

تخلیق میں بیک کئی راحل وقت ہوتے ہیں۔ تصویر کا یہ مطلب ہے کہ انسان کو صرف وجود ہی نہیں بخشا گیا بلکہ ایک ترقی یافتہ تصویر اور صاحب خصائص وکمالات وجود بھی دیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں تخلیقِ آدم کے بارے میں جتنی بھی آیات آئی ہیں وہ اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کے انسانی خواص اور فرائض منصبی دے دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی ایسے عظیم مصور کی ہے جو نہ صرف تصویر نک سک سے درست بناتا ہے بلکہ اسے زندگی بھی دیتا ہے اور اس کے زندگی گزارنے کا نقشہ بھی وہی مصور بناتا ہے۔

ترجمہ:۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا' اور تمہاری صورتیں بنائیں اور بہت اچھی بنائیں۔ (المومن۔ ۶۴)

اس آیتِ کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ مصوری کا ذکر ہوا ہے لیکن اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا ہے کہ میں نے ہی تمہارے ٹھہرنے کے لئے یہ زمین کا فرش بنایا اور آسمان کی چھت تمہارے سروں پر تانی ہے۔ یعنی زمین وآسمان کی بے شمار نعمتوں اور سہولتوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ زمین پر انسان کو قرار حاصل ہے اور انسان کا یہ قیام اور تمام سہولتیں اس کائنات کے نقشے کے اندر باقاعدہ حساب کتاب سے رکھی گئی ہیں۔ اس کی تعمیر میں زمین وآسمان کی تخلیق کے ساتھ ہی انسان کی پیاری صورتیں اور اس کی پرورش کے لئے رزق کے خزانے بھی رکھ دیئے گئے ہیں۔ اللہ اپنی اس صفت کے ذریعے انسانوں کو آگاہ فرمارہا ہے کہ میں نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تمہارے لئے نہ صرف یہ کائنات اور اس کا نظام پیدا کیا ہے بلکہ تمہیں خوبصورت شکل دے کر پیدا کیا ہے۔ اس لئے تم پر لازم ہے کہ تم ایک اکیلے اللہ جس کی بے پناہ قدرت اور صفات ہیں کی عبادت کرو۔

ترجمہ:۔ اُسی نے آسمانوں اور زمین کو عدل وحکمت سے پیدا کیا' اُسی نے تمہاری صورتیں بنائیں اور بہت اچھی بنائیں اور اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ (التغابن۔ ۳)

آیتِ کریمہ سے ایک مومن کو یہ شعور ملتا ہے کہ اس ساری عظیم تر کائنات کی تخلیق اور تدبیر یں حق یعنی پوری درست منصوبہ بندی ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کوئی عارضی یا غیر ضروری چیز نہیں ہے۔ اس کائنات کی تشکیل حق پر ہے جو ہستی یہ اعلان کررہی ہے وہ کوئی معمولی ہستی نہیں وہ خود اس ساری کائنات کی پیدا کرنے والی ہستی۔ یہ اُسے ہی معلوم ہے کہ اُس نے یہ سارا نظامِ عالم کن بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کائنات بنائی اور پیدا کی اسی طرح انسان کو پیدا کیا۔ اگر انسان خود اپنی ساخت اور اپنے خدوخال اور نقشے پر غور کرلے اور یہ سمجھ لے کہ انسانی جسم کا نظام کیسے قائم ہے اور کیسے کام کررہا ہے تو اسے ادراک ہوجائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ہے ''اور اس نے تمہاری صورت بنائی اور عمدہ بنائی'' اللہ جلِ شانہٗ اپنے بندوں کو یہ شعور عطا فرمارہا ہے کہ اللہ کے نزدیک تم کتنے محترم اور مکرم ہو کہ اللہ نے تمہیں اپنی تمام مخلوقات میں بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ نہ صرف تمہاری پیدائشی تصویر بہت حسین وجمیل ہے بلکہ تمہاری اخلاقی تصویر اور تمہاری شعوری تصویر بھی بہت اچھی اور حسین ترین ہے۔ انسان اگر فکر کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کی جسمانی ساخت تمام زندہ جسمانی ساختوں سے زیادہ مکمل ہے اور روحانی وشعوری قابلیتوں کے لحاظ سے بھی ہر طرح مکمل ہے۔ ایک ایسا نقشہ ہے جس میں کمال اور جمال دونوں ہی پائے جاتے ہیں اور عدل وحکمت یہی ہے کہ وہ محسن کو اس کے احسان کی اور بدکار کو اس کی بدی کی پوری جزا دے۔ اللہ اپنے عدل کا مکمل اہتمام روزِ حشر قیامت والے دن فرمائے گا۔

فضائل:۔ اگر ''یا مصور'' کا ورد ہر روز بعد نماز کیا جائے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ حسن وخوبی سے نوازتا ہے اس کے فکر وادراک میں حسن وخیر پیدا کردیتا ہے۔ اگر کوئی عورت اس اسم مبارک کا ورد معمول بنالے تو اللہ اس کے حسن وجمال میں اضافہ فرماتا ہے اور اسے برقرار رکھتا ہے۔ جو کوئی شخص نماز مغرب کے بعد اکیس (۲۱) مرتبہ اس اسم مبارک کا ورد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ایمان کو مضبوط وپختہ فرمائے گا ان شاء اللہ۔



گمشدہ

زرین قمر

Little Girl Lost ایک ناقابل تسخیر کھلاڑی کی کہانی جسے Alexandria Clarke نے لکھا ہے اور زرین قمر نے ترجمہ و تلخیص کر کے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

یہ ایک ایسی بہادر کھلاڑی کی داستان ہے جسے فٹ بال کے فائنل میچ میں شرکت کرنے سے روکنے کے لیے اس کی فیملی کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور پھر اس کی بہن کو بھی جو اس کی جگہ لے چکی ہوئی ہے اغوا کر لیا جاتا ہے لیکن وہ بہادر حسینہ ہمت نہیں ہارتی اور مجرم تک پہنچ کر اسے کیفر کردار تک پہنچاتی ہے قارئین کے لیے خاص تحفہ۔





ماہ مئی کا اختتام تھا اور بیلے ڈیم ہائی اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح بربجیت کو بھی ان چھٹیوں کا انتظار تھا اسکول کا آخری ورکنگ ڈے تھا اور اسکول کے مرکزی ہال میں اسٹوڈنٹس کا مجمع تھا' سب ہی چھٹیوں کی پلاننگ میں مصروف تھے شدید گرمی کے باوجود اے سی کی ٹھنڈک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بربجیت نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنا اسکول بیگ کاندھے پر ڈالا اور ہال کے گیٹ کی طرف بڑھی۔

''ہائے بی بربجیت' تمہارا دھیان کہاں ہے؟'' اسے پشت کی جانب سے آواز آئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا سامنے اس کی کلاس فیلو آٹوم پارکر کھڑی تھی۔

''میں تمہیں آوازیں دے رہی ہوں اور تم سن ہی نہیں رہی ہو؟'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''میرا دھیان کہیں اور تھا۔'' بربجیت نے اپنے کاندھوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دیتے ہوئے کہا اور اسی وقت اس کا دوسرا کلاس فیلو ایمیٹ وہاں آ گیا اور آتے ہی آٹوم کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

''یہاں بوائز کا آنا منع ہے۔'' بربجیت نے منہ بنا کر کہا اس کی نظریں ایمیٹ کی بلو کلر کی فٹ بال ٹیم کی شرٹ پر تھیں جو پسینے سے تر تھی۔

''میرا خیال ہے تم نے اپنی ہوم ورک ڈائری پر ٹیچر کے دستخط کروا لیے ہیں؟'' ایمیٹ نے پوچھا۔

''ہاں...... اب میں جانے ہی والی تھی۔'' بربجیت نے کہا۔

''تم نے یہ دیکھی؟'' ایمیٹ نے اپنی فائل سے ایک فوٹو نکال کر اس کی طرف بڑھایا جس میں وہ اپنی اسکول کی فٹ بال ٹیم کے ساتھ موجود تھا اس میں بربجیت اور آٹوم بھی تھیں وہ بھی اس ٹیم میں شامل تھیں۔

''یہ ایک یادگار تصویر ہے۔'' آٹوم نے کہا۔

''یہ تصویر میری طرف سے تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔'' ایمیٹ نے تصویر بربجیت کو دیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔''

''کیا تم ہمیں سالگرہ میں انوائٹ نہیں کرو گی؟'' ایمیٹ نے پوچھا۔

''تم نے مجھے بھی نہیں بلایا؟'' آٹوم نے شکوہ کیا۔

''ویسے پارٹی کا کیا وقت مقرر کیا ہے؟'' ایمیٹ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا اس سال کوئی پارٹی نہیں ہو رہی ہے۔'' بربجیت نے آٹوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ تمہاری سولہویں سالگرہ ہے تمہیں پارٹی تو دینا چاہیے اور شاید تمہارے والدین تمہیں اس بار تحفے میں اچھی سی کار لے کر دیں؟'' ایمیٹ نے کہا۔

''تم میرے والدین سے ملے ہو؟ دراصل ہم ایک نئی کار لینے یا پارٹی دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔'' بربجیت نے کہا۔

''تو پھر میں تمہیں پارٹی دوں گا...... آج رات...... بتاؤ میں کس وقت تمہیں لینے آؤں؟'' ایمیٹ نے پوچھا۔

''وہ فارغ نہیں ہے...... ہمارے کچھ پلان ہیں۔'' آٹوم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں مجھے پتہ ہے' بیسٹ گرل کے بیسٹ فرینڈ اس کی پارٹی میں ہوں گے۔'' ایمیٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بھلا ہم غریبوں کو کون پوچھتا ہے؟''

''چلو اب دیر ہو رہی ہے۔'' آٹوم نے کہا اور بربجیت کے ساتھ آگے بڑھی۔

''تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ ایمیٹ کے ساتھ ایسا روکھا برتاؤ مت کیا کرو وہ تمہارے بچپن کا ساتھی ہے تم دونوں کے والدین ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور تم دونوں ایک دوسرے کے لیے مستقبل میں بہترین ساتھی ثابت ہو سکتے ہو۔'' آٹوم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس کا یوں بے تکلف ہونا پسند نہیں ہے۔'' بربجیت نے کہا۔ ''اور تمہاری تو عادت ہے مجھے نصیحت کرنے کی۔''

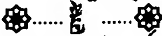
''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کیا واقعی تم آج کوئی پارٹی نہیں کر رہی ہو؟ تمہارے والدین نے بھی کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں' وہ مجھے اسکول سے لینے آئیں گے اور ہم لوگ آج رات کا کھانا جلدی کھا لیں گے لیکن پارٹی تو کوئی نہیں ہے۔'' بربجیت نے کہا۔

''ٹھیک ہے دراصل تم اپنی فیملی سے بہت پیار کرتی ہو اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو سب سے ناراض ہو جاتی۔'' آٹوم نے کہا اور اس سے رخصت ہوگئی اسکول کے گیٹ کے باہر اس کے والدین اپنی کار میں اس کے منتظر تھے وہ کار کا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی جہاں اس کی چھوٹی بہن ہولی بھی موجود تھی وہ صرف سات سال کی تھی۔

''آپ نے ہولی کا تو نیا ڈریس بنا دیا ہے؟'' بربجیت نے کار میں بیٹھتے ہوئے اپنی والدہ سے شکوہ کیا جو اگلی سیٹ

پر اس کے والد کے ساتھ بیٹھی تھی اس کی نظریں ہولی کے گلابی کپڑوں پر تھیں جن میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔
''ہیپی برتھ ڈے بی۔'' ہولی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تھینک یو ڈیئر......'' بر بجیت نے اس کے گال پر پیار کرلیا۔
''ہاں تو میری سالگرہ کے لیے آپ لوگوں نے کون سے پروگرام بنائے ہیں؟'' بر بجیت نے والدہ سے پوچھا۔
''ہم نے یہ معاملہ ہولی پر چھوڑ دیا ہے۔'' اس کے والد نے کار کے اگلے شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''گویا آج ہولی کی پسند کا کھانا کھائیں گے؟'' بر بجیت نے پوچھا۔
''ہاں......اس میں کیا حرج ہے؟''
''تم کتنے سال کی ہوگئی ہو؟'' ہولی نے پیار سے پوچھا۔
''سولہ سال کی۔' بر بجیت نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
''تو تم مجھ سے صرف نو سال بڑی ہو؟'' ہولی نے اپنی انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا اور اسی وقت بر بجیت کی والدہ کے فون کی بیل بجی اور انہوں نے موبائل کان سے لگایا۔
''ہیلو اینسی، تم کیسی ہو؟'' اس کی والدہ نے کہا اور پھر لڑکیوں کی طرف مڑیں۔
''تمہاری آنٹی تمہارا پوچھ رہی ہیں۔''
'ہم ٹھیک ہیں آنٹی۔' ہولی اور بر بجیت نے ایک آواز ہو کر کہا۔''آنٹی اینسی یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟'' بر بجیت نے بآواز بلند پوچھا۔
''دی باؤسی ہاؤس۔'' آنٹی کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور بر بجیت سیٹ پر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی والدہ ہلکی آواز میں بات کر رہی تھیں لیکن ایک دو جملے اڑتے اڑتے اس کے کان تک بھی آگئے۔
''اچھا میں منٹ ہیں......سب لوگ آرہے ہیں نا؟ اور کیک؟ اس کا کیا ہوا؟'' بات کر کے اس کی والدہ نے فون رکھ دیا۔
''تو میری سرپرائز پارٹی کا کیک کس مزے کا ہوگا؟'' بر بجیت نے پوچھا۔
''کون سا کیک؟'' اس کے والد نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔
''اوہ پلیز بتائیں نا؟ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کیک خریدوں، میں پارٹی بھی نہیں کر سکتی۔''
''ہم تو ڈیکوریشن کی بات کر رہے تھے۔'' اس کی والدہ نے کہا۔
''کیا پارٹی میں میرے سارے دوست آرہے ہیں؟'' بر بجیت نے پوچھا۔''کیا ایمیٹ بھی آرہا ہے؟''
''ہاں، وہ اور اس کی فٹ بال ٹیم بہت مدد کر رہی ہے ہر کام میں۔'' اس کے ڈیڈی نے کہا۔
''اوہ...... اس نے تو آج مجھے خوب بے وقوف بنایا......وہ تو انجان بن رہا تھا......'' بر بجیت نے کہا۔
''میرا اندازہ ہے کہ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔'' اس کے ڈیڈی نے کہا اور سامنے سڑک پر آنے والے موڑ سے کار دائیں جانب موڑی۔
''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔'' بر بجیت نے کہا۔
''تم واقعی میری پیاری بیٹی ہو۔'' اس کے والد نے پیچھے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔
''ڈیڈی آگے دیکھیں۔'' بر بجیت زور سے چیخی ان کے سامنے اچانک ایک تیز رفتار چھوٹا ٹرک آگیا تھا۔ سب چیزیں جیسے بہت سست رفتار میں حرکت کرنے لگی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے سیکڑوں گھنٹے اس ایک لمحے میں سما گئے ہوں جیسے وقت ختم ہوگیا ہو۔ اسے اپنے والدین کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں کار سڑک پر لڑھک رہی تھی اس کی سیٹ بیلٹ اس کے گلے میں پھنسی ہوئی تھی بر بجیت نے اپنی بائیں جانب دیکھا ہولی ٹھیک تھی لیکن خوفزدہ تھی۔ بر بجیت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے سہارا دیا اور پھر سب کچھ اس کی نظروں سے غائب ہوگیا۔



بر بجیت شمالی تھائی لینڈ کے جس علاقے میں سفر کر رہی تھی وہ نہایت گھنے جنگل پر مشتمل تھا اس کے ہاتھوں کی گرفت بائیک کے ہینڈل پر مضبوط تھی اور اس کی موٹر بائیک کے ٹائروں کے نیچے لمبی گھاس اور کیچڑ جیسی زمین موجود تھی جس کی وجہ سے خاصی پھسلن موجود تھی لیکن وہ اس سے بے پروا نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اس کے چند ساتھی بھی اس کے ساتھ اس علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ بر بجیت کے ساتھ بائیک پر اس کی دوست ایلس بھی بیٹھی تھی اس نے مضبوطی سے اسے پکڑا ہوا تھا پھر بر بجیت نے بائیک اوپر اٹھاتے ایک بڑی جست لگائی اور بائیک کئی فٹ اونچی جھاڑیاں پھلانگتی ہوئی ایک کھلے حصے میں آگئی بائیک کی رفتار کم ہوتے ہی ایلس نے بر بجیت کی کمر چھوڑ دی تھی اور بائیک سے اتر گئی تھی۔
''ارے کیا ہوا ایلس؟ تم ٹھیک تو ہو؟'' بر بجیت نے

ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اوہ...... میری توبہ...... اب میں کبھی تمہارے ساتھ بائیک پر سفر نہیں کروں گی۔'' ایلس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑے ہوئے کہا۔ ''تم تو دیوانوں کی طرح بائیک چلاتی ہو۔''

''میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتایا تھا۔'' برجیت نے اپنا ہیلمٹ کا اسٹیپ کھولتے ہوئے کہا اور اسی وقت دو اور بائیک رائیڈر اسی کے انداز میں جھاڑیوں پر سے چھلانگ لگاتے ہوئے میدان میں نمودار ہوئے یہ زیک اور ایکسور تھے جو اس کے بہترین دوست تھے اس وقت بے پروائی سے سیٹیاں بجا رہے تھے۔

''کمال کردیا برجیت' میں نے اپنی زندگی میں کسی لڑکی کو ایسی بہادری سے بائیک چلاتے نہیں دیکھا۔'' زیک نے اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے کہا۔

''میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں ہمیں کوئی حادثہ ہی پیش نہ آجائے۔'' ایلس نے کہا۔

''حادثے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میں بہترین بائیک رائیڈر ہوں۔'' برجیت نے فخر سے سر بلند کرتے ہوئے کہا اور پھر زیک کی طرف مڑ کر اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔

''لاؤ میرا انعام......''

''تمہارا انعام ایکسور کے پاس ہے۔'' زیک نے جواب دیا۔

برجیت دو ہفتے پہلے ہی اکیلی چیانگ مائی آئی تھی اس کے ساتھ نہ کوئی دوست تھا اور نہ ہی اس کا وہاں آنے کا کوئی مقصد تھا بس وہ تو وہاں کسی اچھے سے ہوٹل میں کمرہ بک کروا کر نئی دنیاؤں اور نئے لوگوں میں کھو جانا چاہتی تھی۔ زیک اور ایلس کا تعلق کیلیفورنیا سے تھا جبکہ ایکسور اسپین کے کسی علاقے سے وہاں آیا تھا۔ برجیت ان سب کے ساتھ خوش تھی لیکن ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔

''برجیت ڈبولیس' آج کے مقابلے کی تم چیمپئن ہو اور بہترین بائیک رائیڈر ہو۔'' ایکسور نے کہا۔

''ناقابل تسخیر۔'' ایلس نے بھی رائے دی۔

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔'' ایکسور نے ایلس کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''برجیت تم تو ایک دیوی ہو' خوبصورت دیوی جو ہمارے دلوں پر راج کرتی ہے تم جیت گئی ہو اور تمہیں انعام کے طور پر یہ خوش قسمتی کا ہاتھی دیا جاتا ہے جو لکڑی سے بنا ہوا ہے اور ہم نے ایک مارکیٹ سے نہایت سستا خریدا ہے۔'' ایکسور مکمل مذاق کے موڈ میں تھا۔ برجیت نے اس کے ہاتھ سے وہ زنجیر لے لی جس میں ہاتھی پڑا تھا اور اسے اپنے سر سے اونچا اٹھا کر دوستوں کو دکھانے لگی۔

''دیکھو دوستو...... میں تم سب کی بہادری کی داد دیتی ہوں لیکن آخر میں تو کسی ایک کو ہی فتح ملنا تھی۔'' اس نے کہا۔

''مبارک ہو فاتح جہاں۔'' ایلس نے طنز کیا اور سب ہنس پڑے۔

''چلو اب اونچائی سے چھلانگ لگانے کا مقابلہ کرتے ہیں جس مقصد سے ہم یہاں آئے ہیں۔'' برجیت نے کہا اور وہ لوگ ایک ہموار راستے کی طرف بڑھ گئے جہاں ان سے پہلے آنے والے سیاح موجود تھے جو اونچائی سے چھلانگ لگانے کا منظر دیکھنے اور اس میں حصہ لینے آئے تھے ان کی سربراہ ایک خاتون بھی تھی جس کا تعلق مقامی ہوٹل سے تھا اور وہ وہاں نگران کی خدمات انجام دے رہی تھی۔

پہاڑی کا وہ مقام خاصی بلندی پر واقع تھا اور اس مقام سے نیچے پانی میں چھلانگ لگانا تھا جس کے آس پاس آبشاریں بھی موجود تھیں برجیت کو ہمیشہ سے ایسے خطرناک کام کرنے کا شوق تھا اور وہ اسی شوق کی تسکین کے لیے یہاں آئی تھی اسے بے چینی سے اس لمحے کا انتظار تھا جب اس کی پانی میں چھلانگ لگانے کی باری آنا تھی جبکہ ایلس کے ہاتھ خوف سے کانپ رہے تھے۔

''کیا واقعی تم اس جگہ سے چھلانگ لگاؤ گی؟'' ایلس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں' کیوں نہیں؟'' برجیت نے کہا وہ زمین پر بیٹھ کر اپنے جوتوں کے تسمے کھول رہی تھی پھر اس نے جوتے اتار کر ایک طرف پھینک دیئے تھے۔

''ہم اپنا سامان لینے یہاں پھر بائیک پر آجائیں گے۔'' اس نے پیچھے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے پوچھا اور اونچائی سے نیچے چھلانگ لگادی سب حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

کئی گھنٹوں کے بعد وہ لوگ واپس ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ ان کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے وہ تیز تیز آوازوں میں باتیں کرتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں داخل ہوئے۔

''برجیت' تم نے تو آج کمال ہی کردیا...... اتنی اونچائی سے چھلانگ لگانے پر میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں...... تمہارے چہرے پر کوئی خوف نہیں تھا۔'' نگراں خاتون نے کہا جو ان کے ساتھ ہی واپس آئی تھی۔

''ہاں' اس کے پاس خوش قسمتی کا سمبل وہ ہاتھی بھی تو

موجود تھا۔" ایلس نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اور تم نے بھی تو چھلانگ لگانے میں حصہ لیا میں تمہاری بہادری پر تمہیں فائیو گولڈ اسٹارز دیتی ہوں۔" برجیت نے جواب دیا وہ سب استقبالیہ کے قریب پہنچ گئے تھے ایکسور نے آگے بڑھ کر استقبالیہ کلرک ڈاؤ سے کسی آنے والے پیغام کے بارے میں پوچھا۔
"نہیں تمہارے لیے تو نہیں لیکن اس کے لیے پیغام ہے۔" ڈاؤ نے برجیت کی طرف اشارہ کیا اور سب مڑ کر برجیت کی طرف دیکھنے لگے۔
"میرے لیے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ نہیں ہوسکتا۔" ایلس نے کہا۔
"برجیت کے لیے بھی کوئی پیغام نہیں آیا۔"
"لیکن یہ برجیت ڈوبیز کے لیے ہے۔" ڈاؤ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ایک چٹ دیکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ چٹ برجیت کی طرف بڑھادی اس نے تیزی سے وہ چٹ پکڑی لیکن اس پر کسی پیغام کے بجائے امریکا کا ایک فون نمبر لکھا تھا۔
"ٹھیک ہے لیکن یہ نمبر کس نے دیا؟" برجیت نے حیرت سے پوچھا۔
"اس نے اپنا نام آٹوم بتایا تھا۔" ڈاؤ نے کہا۔
"آٹوم......؟ اوہ اچھا...... اچھا اس نے کیا کہا تھا؟" برجیت نے پوچھا۔
"میں اس کی بات سمجھ نہیں سکی میری انگریزی بہت اچھی نہیں ہے۔" ڈاؤ نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔
"حیرت ہے برجیت ہم تو سمجھتے تھے کہ صرف ہم ہی تمہیں جانتے ہیں لیکن اب پتہ چلا کہ باہر کی دنیا میں بھی تمہارا کوئی جاننے والا موجود ہے پچھلے دو ہفتے میں تمہیں آنے والا یہ پہلا پیغام ہے۔" زیک نے اس کے ہاتھ میں پکڑی چٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیا میں تمہارا فون استعمال کرسکتی ہوں؟" برجیت نے زیک سے کہا کیونکہ اس کے پاس اپنا فون نہیں تھا۔
"ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔" زیک نے اپنا فون اسے دیتے ہوئے کہا۔
"شکریہ۔" برجیت نے فون اس کے ہاتھ سے لے لیا جو ایک زپ والے کور میں بند تھا ایسا زیک نے حفاظت کے خیال سے کیا تھا کہ کسی بے احتیاطی سے وہ خراب نہ ہوجائے۔ برجیت فون لے کر اپنے ساتھیوں سے کچھ فاصلے پر چلی گئی تھی لیکن سب اسی کی طرف تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ برجیت نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا اس وقت تھائی لینڈ میں شام کے سات بجے تھے اور تھائی لینڈ میں وقت نارتھ کیلیفورنیا کے مقابلے میں گیارہ گھنٹے پیچھے تھا جس کا مطلب تھا کہ وہاں اس وقت صبح کے پانچ بج رہے ہوں گے جو نمبر اسے دیا گیا تھا وہ بیلے ڈیم کا نمبر تھا جو اس کا آبائی شہر تھا لیکن وہ جھجک رہی تھی کہ اتنی صبح کسی کو فون کرے یا نہ کرے اس نے آخر کار نمبر ملایا کئی بیلوں کے بعد دوسری طرف سے کسی نے فون ریسیو کیا۔
"ہیلو......" ایک بہت ہلکی آواز سنائی دی جو نیند میں ڈوبی ہوئی تھی وہ کسی مرد کی آواز تھی۔
"کیا میں آٹوم سے بات کرسکتی ہوں؟"
"کون......؟ تم کون ہو؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
"میں برجیت ڈوبیز بات کررہی ہوں۔"
"اوہ...... اچھا...... رکو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔
"آٹوم...... اٹھو...... تمہارا فون ہے۔ تمہاری دوست ہولی کی بہن بات کرنا چاہتی ہے۔" اس شخص نے کہا تو برجیت کو احساس ہوا کہ اس نے کافی عرصہ سے ہولی سے بات نہیں کی وہ اپنی معروفیات میں مگن تھی۔
"بی؟" دوسری طرف سے اسے آٹوم کی جانی پہچانی آواز سنائی دی اور برجیت کا دل زور سے دھڑکا اسے برسوں سے کسی نے اتنی چاہت واپنائیت سے نہیں پکارا تھا۔
"ہائے...... آٹوم......"
"اوہ...... خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔" دوسری طرف سے آٹوم کی جوشیلی آواز سنائی دی۔
"ہاں...... میں ٹھیک ہوں...... بتاؤ کیا بات ہے؟" برجیت نے پوچھا لیکن دوسری طرف خاموشی رہی برجیت کا دل انجانے خوف سے دھڑکا اور وہ سوچنے لگی کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہوگی تب ہی آٹوم نے اس کے لیے پیغام چھوڑا ہوگا۔
"بی میری بات غور سے سنو۔"
"بتاؤ...... کیا بات ہے؟" برجیت نے بے چینی سے پوچھا۔
"تمہاری بہن ہولی......"
"کیا ہوا لی کو؟ آٹوم پوری بات بتاؤ...... اسے کیا ہوا؟"
"وہ غائب ہے۔" آٹوم نے جھجکتے ہوئے بتایا اور برجیت کو یوں لگا جیسے تھائی لینڈ کے گرم موسم میں بھی اس کا خون اس کی رگوں میں منجمد ہوگیا ہو۔
"کیا؟"
"میرا مطلب ہے کہ وہ کہیں چلی گئی ہے اور تمہارے والدین......"
"میرے والدین......؟ وہ بل اور ایملی میرے

والدین نہیں ہیں۔" بربجیٹ نے آٹوم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ انہوں نے پولیس کی ایک رپورٹ مکمل کروادی ہے۔"
"کب؟"
"دو دن پہلے۔"
"دو دن پہلے ؟" بربجیٹ نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کہا اس کی نظریں ایکسور پر تھیں جو اس کی کال ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور فکرمندی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟" بربجیٹ نے ناراضگی سے کہا۔
"تمہیں پتہ ہے بی کہ تمہیں ڈھونڈنا میرے لیے کتنا مشکل تھا میں تھائی لینڈ کے کئی ہوسٹلوں اور ہوٹلوں میں فون کرتی رہی پھر تم تک پہنچنے میں مجھے ایک پوسٹ کارڈ سے مدد ملی جو تم نے کچھ دن پہلے ہولی کو بھیجا تھا۔"
"اچھا دیکھو میں لمبی بات نہیں کرسکتی یہ میرا فون نہیں ہے اور یہ کال مہنگی ہوسکتی ہے مجھے مختصراً بتاؤ کیا بات ہے؟ ہولی کہاں چلی گئی ہے؟"
"یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔" آٹوم نے کہا۔ "پولیس کو بھی کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے یوں لگتا ہے کہ وہ اچانک غائب ہوگئی ہے...... بی...... میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آتا۔"
"یہ بہت برا ہوا ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔" بربجیٹ نے اداسی سے کہا۔
"اب تم کیا کروگی ؟" آٹوم نے فکرمندی سے پوچھا اور بربجیٹ کی نظریں آسمان پر ڈوبتے سورج پر جم گئیں جس کی ہلکی سنہری شعاعوں نے آسمان پر موجود بادلوں کو سرخ کردیا تھا اور ایک ہوائی جہاز دور اڑتا ہوا اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔
"میں واپس آرہی ہوں۔" بربجیٹ نے جواب دیا اور فون بند کردیا۔

❀......☆......❀

چیانگ مائی سے نارتھ کیلیفورنیا بیلے ڈیم کی فلائٹ پورے ایک دن کی تھی اور اس ہوائی سفر کا ایک ایک منٹ گزارنا بربجیٹ کے لیے مشکل ہو رہا تھا یہ سب اس کی توقعات کے خلاف تھا درحقیقت تو گھر سے فرار وہ ہوئی تھی اپنی پریشانیوں سے وہ بھاگی تھی جبکہ ہولی اس سے بہت مختلف تھی وہ اپنے حالات میں خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔
بربجیٹ اپنی اکانومی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا جھکی اور اس نے سیٹ کے نیچے رکھا ہوا اپنا سفری بیگ آہستہ سے باہر کھینچا وہ اپنے برابر والی سیٹ پر بیٹھی خاتون کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی جو سو رہی تھی اس کے بیگ میں اس کے کچھ کپڑے ہائیکنگ کے جوتے اور کچھ ذاتی سامان تھا اس سامان کے بھی نیچے رکھی نوٹ بک اس نے ڈھونڈھ کر نکالی یہ واحد چیز تھی جو وہ ہمیشہ سنبھال کر رکھتی تھی لیکن اس میں بھی اس کے سفر کی پوری تفصیلات موجود نہیں تھیں بلکہ اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں معلومات زیادہ تھیں ہولی کے بارے میں جو اس کی چھیتی بہن تھی جو اس سے بہت پیار کرتی تھی اسے پرواہ نہیں تھی کہ بربجیٹ کہاں ہے کس براعظم میں ہے کس ملک میں ہے وہ اسے ہر حال میں خط لکھتی تھی تصویریں بھیجتی تھی اور ان سب کو بربجیٹ اس نوٹ بک میں رکھتی تھی یہی ہولی کی موجودگی کا اس کے پاس کل ریکارڈ تھا۔
اگر اس کا تعلیمی دور ایسے ختم ہوتا جیسے کہ اس نے پلان کیا تھا تو اس کی زندگی بھی ہولی کی زندگی سے مختلف نہ ہوتی وہ سترہ سال کی تھی اور بیلے ڈیم ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھی بہترین ایتھلیٹ تھی اسمارٹ' لمبی اور خوبصورت تھی اس کی پراعتماد اور دل کو لبھانے والی شخصیت ہر تصویر میں نمایاں تھی اس کے بال لمبے اور پرکشش تھے اس نے ثابت کردیا تھا کہ لڑکیاں خوبصورت اور نازک مزاج ہونے کے باوجود بھی اسپورٹس میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں' ہولی اسکول کی کئی اسپورٹس ٹیموں میں کھیلتی تھی اس کا شمار بہترین کھلاڑیوں میں ہوتا تھا اس نے کئی ریکارڈ نئے بنائے تھے اور کالج کے لڑکے اس کے گرد چکر کاٹتے تھے اور اس کی ایک نظر کے خواہشمند تھے۔
بربجیٹ نے اپنی نوٹ بک میں رکھی ہولی کی سب سے پسندیدہ تصویر نکالی اس میں وہ اپنی فٹ بال ٹیم کی دوسری ساتھیوں کے ساتھ موجود تھی جو پچھلے سال ہونے والے چیمپئن شپ کے مقابلوں میں لی گئی تھی اس کی یہ بہترین تصویر تھی۔
"اوہ...... کیا یہ تمہاری رشتہ دار ہے اس کی شکل بالکل تم سے ملتی ہے۔" بربجیٹ کے قریب بیٹھی خاتون نے اس سے پوچھا جو اب جاگ گئی تھی۔
"ہم بہنیں ہیں۔" بربجیٹ نے جواب دیا۔
"مجھے جہاز میں سفر کرنا بالکل پسند نہیں ہے۔" اس خاتون نے کہا۔ "لیکن تمہیں پسند ہے؟"
"نہیں......" بربجیٹ نے کہا اور جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی نیچے بادلوں نے آسمان کو چھپایا ہوا تھا۔ بربجیٹ نے نوٹ بک سے گر جانے والے ہولی کے خطوط اپنی گود میں سے اٹھائے اور سب چیزیں واپس نوٹ بک

میں رکھ دیں اور اسے واپس بیگ میں رکھ دیا۔

نارتھ کیلیفورنیا ایئرپورٹ پر آٹوم اسے لینے آئی تھی۔ بربجیٹ پہلی نظر میں اسے پہچان نہیں سکی تھی وہ سفید کلر کی اسپورٹس کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی اس نے بلو کلر کا ہائی نیک پہنا ہوا تھا بال ماڈرن انداز میں کٹے تھے اور آنکھوں پر گلابی فریم کا چشمہ لگا تھا۔

"تم تو خانہ بدوش لگ رہی ہو۔" آٹوم نے بربجیٹ کو دیکھتے ہی کہا۔

"ایسا نہیں ہے میں بہت جلدی میں روانہ ہوئی چنانچہ خود پر زیادہ توجہ نہیں دی۔" بربجیٹ نے اپنے بکھرے بال انگلیوں سے درست کرتے ہوئے کہا اور کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اپنا سفری بیگ پچھلی سیٹ پر رکھ کر خود آٹوم کے برابر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔

"اچھا اب بتاؤ میری بہن ہولی کے بارے میں تمہیں کیا پتہ ہے میں سب جاننا چاہتی ہوں۔" بربجیٹ نے کہا اور آٹوم اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"بی! مجھے لگتا ہے کہ تمہیں ہولی کی اتنی پروا نہیں جتنی تم ظاہر کر رہی ہو۔"

"کیوں؟ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ دو سال پہلے جب ہولی کی کلائی فریکچر ہوئی تھی تب تو تم نے اس کی خیریت تک نہیں پوچھی تھی۔"

"اور کچھ؟" بربجیٹ نے اداسی سے پوچھا۔

"اور جب اسے فوڈ پوائزننگ ہوئی تھی اور وہ اسپتال میں داخل تھی تب بھی تم نے اس کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔"

"ایسا نہیں ہے آٹوم...... میں نے اس کے بارے میں پتہ کیا تھا اور جب مجھے اس کی خیریت کی اطلاع ملی تھی تو میں مطمئن ہوگئی تھی لیکن اب معاملہ مختلف ہے تم نے مجھے بتایا ہے کہ وہ لاپتہ ہے اور میں فوراً واپس آگئی ہوں مجھے بتاؤ کہ تم اس کے بارے میں اور کیا جانتی ہو؟"

"وہ جمعرات کی سہ پہر میرے بوتیک میں آئی تھی تب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا اور دوسرے دن مجھے ملرز کا فون آیا تھا کہ وہ گھر نہیں پہنچی وہ پچھلی رات سے لاپتہ تھی۔"

"میں سمجھتی تھی کہ بل اور ایملی اس کی اچھی دیکھ بھال کریں گے۔" بربجیٹ نے افسوس سے کہا۔

"دیکھو میں جانتی ہوں کہ تمہارے والدین سے تمہارے تعلقات اچھے نہیں تھے لیکن وہ ہولی سے محبت کرتے ہیں اور اس حادثے سے بہت دکھی ہیں۔"

"ایک تو یہ سمجھ لو کہ وہ میرے سگے ماں باپ نہیں ہیں اور دوسری بات یہ کہ اگر انہیں ہولی کی اتنی پروا ہوتی تو کیا انہیں اس کی غیر موجودگی کا احساس پوری رات گزرنے کے بعد ہوتا؟"

"میرا مشورہ تو یہ ہے بی کہ تم ان لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنا۔" آٹوم نے کہا اور کار ایک موڑ سے مڑی بربجیٹ کی نظریں سڑک کے کنارے لگے سائن بورڈ پر پڑیں جہاں سفید رنگ کے بڑے بڑے الفاظ میں لکھا تھا۔ 'بیلی ڈیم' پنڈر تمیل'

"تمہارا غم کم نہیں ہوا؟" آٹوم نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"اچھا میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی حادثہ پیش آئے' اپنی سیٹ بیلٹس باندھ لو۔" آٹوم نے کہا بربجیٹ نے اس کی تائید میں بیلٹس باندھ لیں اور آٹوم نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

"اس سے فرق نہیں پڑتا کہ تم نے سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی ہے یا نہیں جب میرے والدین کو حادثہ پیش آیا تو انہوں نے بھی بیلٹس باندھی ہوئی تھیں لیکن وہ نہیں بچ سکے۔" بربجیٹ نے دکھ سے کہا۔

"جو مقدر میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔" آٹوم نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ ہولی کے معاملے میں پولیس کیا کہتی ہے؟"

"وہ کچھ نہیں کر سکتے انہیں کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے انہوں نے ایک رپورٹ مکمل کر لی ہے جس میں اس کی شناخت اور ذاتی معلومات درج کی گئی ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں' ہولی تقریباً اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی چنانچہ کسی حد تک خود مختار تصور کی جا رہی ہے وہ اپنی مرضی سے بھی کہیں جا سکتی تھی۔"

"کیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ بغیر اطلاع کے غائب ہے؟" بربجیٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"انہوں نے اپنے طور پر تحقیقات کر لی ہیں' مسنگ پرسن سینٹر کو بھی معلومات دے دی گئی ہیں بل اور ایملی بھی اس کے لیے پریشان ہیں لیکن اب تک کچھ نہیں ہوا ہے پولیس کا خیال ہے کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر زخمی ہوگئی ہے یا مر گئی ہے لیکن اب تک کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔"

"وہ زخمی ہوگئی ہے یا مر گئی ہے۔" بربجیٹ نے سرگوشی میں کہا وہ سوچ رہی تھی کہ ایسی نوجوان لڑکیاں جو کھو جاتی ہیں اور جنہیں زخمی یا مردہ سمجھ کر ان کی کیس فائلیں بند کر دی جاتی ہیں ان کی خبروں سے اخبار و رسائل بھرے ہوتے ہیں لیکن ان کی دستیابی کے لیے کچھ خاص کام نہیں ہوتا کیونکہ ان کے لاپتہ ہونے کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور ان

میں سے بہت کم اپنے گھروں کو زندہ پہنچتی ہیں اس نے آنکھیں بند کرلیں اب اس کا دھیان صرف گاڑی کے انجن کی آواز اور روڈ پر رگڑتے ٹائروں کی دھمک پر تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو اس نے آٹوم کی طرف غور سے دیکھا اور ایک نمایاں تبدیلی نوٹ کر کے حیران رہ گئی آٹوم پہلے سے زیادہ موٹی لگ رہی تھی۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں...... میں امید سے ہوں۔'' آٹوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کب......؟ کس سے؟ میرا مطلب ہے تمہاری شادی کب ہوئی؟ کس سے ہوئی؟''

''تم اسے نہیں جانتیں' جس نے تم سے فون پر بات کی تھی وہی میرا شوہر ہے اس کا نام کرسٹن ہے وہ مجھے بہت چاہتا ہے' ہماری شادی کو تین سال ہو گئے ہیں۔''

''لیکن ہیری جب تم سے بات ہوئی تھی تو تم کسی جیکسن کو چاہتی تھیں؟'' بریجیٹ نے کہا۔

''ہاں لیکن اس بات کو پانچ سال گزر گئے اس نے مجھ سے بے وفائی کی اور پھر مجھے کرسٹن مل گیا وہ بہت اچھا ہے۔'' آٹوم نے وضاحت کی اور بریجیٹ نے اثبات میں سر ہلایا وہ سوچ رہی تھی کہ وہ بھی تو یکسانیت سے گھبرا کر گھر سے چل دی اور پھر اس نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا اس نے اتنی زندگی اپنے گھر سے دور گزاری تھی اور اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ غیر ممالک میں ایک اجنبی کی طرح زندگی گزارنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا بیلی ڈیم میں اپنے جاننے والوں کے درمیان ان کے سوالوں کا مقابلہ کرنا۔ زندگی اس وقت آسان ہوتی ہے جب کوئی تمہارے بارے میں نہیں جانتا لیکن جیسے جیسے وہ تمہارے بارے میں جانتے جاتے ہیں ان کے سوالات اور تم سے ان کی امیدیں بڑھتی جاتی ہیں بریجیٹ جانتی تھی کہ اس کی واپسی پر اس کے جاننے والوں کو اس سے بڑی امیدیں ہوں گی۔

بریجیٹ نے ہاتھ بڑھا کر کار میں لگے ٹیپ کا والیوم بڑھا دیا تھا اب دونوں خاموش تھیں اور کار تیز رفتاری سے بیلی ڈیم کی طرف بڑھ رہی تھی پھر جب ان کی کار بیلی ڈیم کے علاقے میں داخل ہوئی تو ماحول ہی بدل گیا دور دور تک مکئی کے کھیت لگے تھے' سڑک کے کنارے گاؤں کے ریوڑ جارہے تھے کھیتوں کے کنارے مرغیاں چگ رہی تھیں درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے بریجیٹ کھڑکی سے قریب ہو کر بیٹھ گئی دور دور فارم ہاؤسز نظر آرہے تھے اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی ہوئی تھی یہاں کی فضا میں سکون تھا جس کا احساس بریجیٹ کو اب ہو رہا تھا۔ آٹوم نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے وہ اداس تھی اسے اپنے بال سنوارنے کا بھی ہوش نہیں تھا آٹوم نے اپنی کلائی میں پہنا ہوا ہیئر بینڈ اتار کر اس کی طرف بڑھا دیا اور اس نے خاموشی سے وہ بینڈ لے کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔

''تمہیں پتہ ہے یہ بینڈ لگانے کے بعد تم اپنی عمر سے پندرہ سال چھوٹی لگ رہی ہو اور مجھے اسکول کا وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب ہم ہر فکر سے آزاد تھے مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم دونوں اسی زمانے میں ہوں اور کسی اسپورٹس میں شرکت کرنے جارہے ہوں۔'' آٹوم بول رہی تھی اور بریجیٹ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اگر یہی بات ہے تو ہماری کہانی ادھوری رہ جائے گی اگر ہم اپنے دوست ہیری سے نہ ملے۔'' بریجیٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے ہیری نے ایک فوڈ ٹرک پر رقم لگائی ہے اور اب مختلف علاقوں میں باربی کیو کے ذریعے کما رہا ہے زبردست کاروبار کر رہا ہے۔'' آٹوم نے بتایا۔

''اچھا' واقعی؟'' بریجیٹ نے حیرت سے کہا وہ جانتی تھی کہ آٹوم دوستوں کی دوست ہے' وہ اگر چاہتی تو آج اسے لینے نہ آتی اور بریجیٹ مقامی بس کے ذریعے بیلی ڈیم جاتی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا وہ دوستی کا ناتا نبھانے خود چلی آئی تھی اور اسے اپنی کار میں بیلی ڈیم لے جارہی تھی اور اب ہیری سے ملوانے پر بھی رضامند ہو گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ہیری کے فوڈ ٹرک کے سامنے موجود تھیں اور ہیری بریجیٹ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''اوہ تم نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''یہ ہولی کی تلاش میں آئی ہے؟'' آٹوم نے جواب دیا۔

''ہولی اس کی چھوٹی بہن؟ کیوں اسے کیا ہوا؟'' ہیری نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔

''تمہیں نہیں معلوم......؟ تم بہت بے خبر ہو سارے بیلی ڈیم کو پتہ ہے کہ وہ اچانک غائب ہو گئی ہے۔'' آٹوم نے بتایا۔

''اوہ...... افسوس کی خبر ہے۔'' ہیری نے کہا پھر اس نے کافی اور بسکٹ سے ان کی تواضع کی تھی اور جب آٹوم نے قیمت ادا کرنا چاہی تھی تو اس نے منع کر دیا تھا۔

''اسکول کے پرانے ساتھیوں کو میری طرف سے یہ چھوٹا سا نذرانہ ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور آٹوم

بربجیٹ کے ساتھ واپس کار میں آ بیٹھی۔
''تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟'' آٹوم نے اس سے پوچھا۔
''بل اور ایملی کی رہائش پر ڈراپ کردو۔'' بربجیٹ نے کہا۔
''تم واقعی وہاں جانا چاہتی ہو یا وہاں جانے سے پہلے کچھ آرام کرنا چاہتی ہو...... تم آخری بار کتنی دیر پہلے سوئی تھیں؟''
''میں جہاز میں کچھ دیر کے لیے سوئی تھی۔''
''میرے پوچھنے کا مطلب ہے کہ آرام سے بستر پر لیٹ کر کب سوئی تھیں؟''
''آٹوم! میری پرواہمت کرو بس مجھے بل اور ایملی کے گھر پر ڈراپ کردو۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔'' آٹوم نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔
جلد ہی وہ جس علاقے میں سفر کررہی تھیں وہ بربجیٹ کی بچپن کی یادوں سے بھرا ہوا تھا یہ وہی مکانات اور گلیاں تھیں جہاں اس نے کھیلتے کودتے اپنا لڑکپن بتایا تھا۔ کچھ گھروں میں لوگوں نے مرغیاں اور بکریاں پالی ہوئی تھیں یہی دیہاتی زندگی کا حسن تھا گھروں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ تھا جس سڑک پر وہ سفر کررہی تھیں وہ سیدھی بل اور ایملی کے گھر تک جاتی تھی لیکن آٹوم نے وہاں تک پہنچنے کے لیے لمبا راستہ چنا تھا کیونکہ درمیان میں بربجیٹ کا گھر بھی پڑتا تھا اور آٹوم نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے ویران حالت میں دیکھ کر دکھی ہوجائے۔
کار سے اترتے ہوئے بربجیٹ نے پچھلی سیٹ سے اپنا بیگ اٹھایا اور آٹوم کو الوداع کہتی ہوئی کار سے اتر گئی۔
''بی! ٹھہرو تم چاہو تو میرے ساتھ بھی رک سکتی ہو اس طرح تم کافی پریشانی سے بچ جاؤ گی۔''
''شکریہ، لیکن میں ٹھیک ہوں...... میں تمہیں بعد میں کال کروں گی۔'' بربجیٹ نے مسکراتے ہوئے کہا اور کار کا دروازہ بند کردیا اور الوداعی ہاتھ ہلاتی وہاں سے چل دی آٹوم نے بھی کار آگے بڑھادی تھی۔
بل اور ایملی کا گھر بھی دوسرے گھروں کی طرح بربجیٹ کے لیے جانا پہچانا تھا بس اس پر نیا کلر کیا گیا تھا اور باہر کے احاطے کے کچھ تختے نئے لگائے گئے تھے لان میں کچھ سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ بربجیٹ لان سے گزرتی بیرونی دروازے تک آئی تھی اور دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ لاک تھا اس نے اندازہ لگایا کہ کوئی گھر پر موجود نہیں ہے اس نے ساری رات آٹوم کے ساتھ اس کی کار میں سفر کیا تھا اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے اور بل اور ایملی اپنی اپنی ملازمت پر جاچکے تھے اور ان کے بچے اسکول' بربجیٹ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ علاقے میں ادھر ادھر ماری ماری پھرے اس نے ایک کھڑکی کی جھری سے اندر جھانکا اسے گھر کا کچھ اندرونی حصہ نظر آیا سامنے کچن تھا جہاں سنک میں کچھ برتن پڑے تھے ایک بلی کمرے میں گھوم رہی تھی اور دائیں ہاتھ سے ایک زینہ اوپر جارہا تھا جہاں کسی کمرے میں اس کی بہن ہولی کی یادیں بکھری پڑی تھیں اور اس کی منتظر تھیں لیکن وہ اندر نہیں جاسکتی تھی وہ مجبور تھی اس نے ایک گہری سانس لی اور گھر کے باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اس نے اپنا بیگ بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں سے اسے دو راستے نظر آرہے تھے ایک راستہ وہ تھا جس پر سے وہ آٹوم کے ساتھ یہاں آئی تھی اور دوسرا راستہ وہ تھا جو شہر کی سمت جاتا تھا' اور اس راستے کو نظر انداز کرتے ہوئے آٹوم اسے یہاں لائی تھی اسی راستے پر نظریں جما کر بربجیٹ وہاں بیٹھ گئی تھی اور اس کے بچپن کی یادوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا علاقے کے گھر اپنی پچھلی حالت میں تھے ان میں بہت کم تبدیلیاں آئی تھیں یہ وہ گلیاں تھیں جہاں وہ ہولی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی اور اسی راستے پر آگے جاکر اس کا پرانا گھر تھا جہاں وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑنے تک رہی تھی اس کے والدین کی وفات کے بعد وہ اور ہولی تنہا رہ گئی تھیں اور مقامی قانون کے مطابق ہولی چھوٹی ہونے کی وجہ سے کسی ذمہ دار فیملی کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی ہولی کا سارا سامان صرف دو بوکس میں آ گیا تھا ایک میں اس کی ضرورت کی چیزیں تھیں اور دوسرے میں اس کی یادگار چیزیں تھیں جو بہت زیادہ تھیں اور ان کی جگہ اس کے نئے والدین کے گھر میں نہیں تھی وہ باکس بربجیٹ نے اسی گھر میں اپنے کمرے میں چھپادیا تھا تاکہ وہ خیراتی ادارے کو جانے سے بچ جائے اور کبھی اس کی بہن کے کام آسکے۔
اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر آنٹی اینی کا گھر تھا جہاں اکثر صبح کو وہ چلی جاتی تھی اور ان کے ساتھ ناشتہ کرتی تھی اپنے خیالوں میں بہتی وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ اس گھر کی چل دی جہاں اس کی بہت سی یادیں تھیں اس کی دستک پر ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا تھا۔
''میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟'' بوڑھی عورت نے پوچھا۔
''مم...... میرا یہاں گھر ہے...... میں یہاں رہتی تھی۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور واپس مڑ گئی بوڑھی عورت نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی اور دروازہ بند کرلیا تھا۔
بربجیٹ اپنے بیگ کو کاندھے پر لٹکائے آہستہ آہستہ

قدم اٹھاتی ایک ہوٹل کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی جہاں کچن میں کام کرنے والی ملازمہ کی ضرورت کا اشتہار لگا تھا وہ اندر داخل ہوئی کاؤنٹر پر ایک نوجوان موجود تھا جس کے بیج پر اس کا نام گرانٹ لکھا تھا۔

''تم کون ہو؟'' گرانٹ نے پوچھ۔

''ایک مہمان۔'' بربجیٹ نے کہا۔ ''کیا تم اپنے تمام کسٹمرز سے ایسے ہی بات کرتے ہو؟''

''ہاں...... لیکن تم مجھے جانی پہچانی لگتی ہو۔''

''میں ہولی ڈیرس کی بہن ہوں۔'' اس نے کہا تو گرانٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ میری بہن ہے...... مجھے ایک کمرا کرائے پر چاہیے کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟''

''ضرور' میرے پاس ایک کمرہ ہے۔'' اس نے کہا اور ضروری فارم بھرنے کے بعد بربجیٹ کو کمرے کی چابی پکڑا دی رقم ادا کرنے کے لیے بربجیٹ نے اسے اپنا کریڈٹ کارڈ دے دیا تھا۔

''تم ہولی کو جانتے ہو؟'' بربجیٹ نے پوچھا وہ اس کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

''ہاں' ہم ساتھ ہی اسکول جاتے تھے میں نے پچھلے سال گریجویٹ کیا ہے ہولی کو ہر کوئی جانتا ہے وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔'' گرانٹ نے کہا۔

''اوہ...... یہ بات ہے۔''

''ہاں وہ سافٹ بال کیپٹن' اسٹوڈینٹس کونسل کی صدر اور بہترین کھلاڑی تھی وہ سب سے بہت اچھی طرح پیش آتی تھی اور بہت ٹھنڈے ذہن کی مالک تھی۔''

''واقعی؟''

''وہ بہت ہی اچھی تھی...... وہ اچانک غائب ہوگئی ہے۔'' گرانٹ نے کہا اور ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔

''نمبر 113' یہ تمہارا کمرہ ہے۔'' اس نے دروازے کے لاک میں چابی گھماتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا پھر اس نے کمرے کی لائٹ آن کر دی تھی' کمرہ خاصا کشادہ اور ہوادار تھا ایک کھڑکی ہوٹل کے عقب میں کھیتوں کی جانب کھلتی تھی بیڈ خاصا بڑا تھا بربجیٹ بیڈ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی گرانٹ دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

''کیا تم نے کبھی اس علاقے سے کہیں اور جانے کے بارے میں سوچا؟'' بربجیٹ نے پوچھا۔

''کہاں؟ ہوٹل سے باہر؟'' گرانٹ نے پوچھا۔

''نہیں...... بیلی ڈیم سے باہر' تم نے اسکول مکمل کر لیا' آگے تعلیم کے بارے میں کہیں سوچا؟''

''نہیں...... میرے لیے اتنا کافی ہے۔''

''اچھا' تو پھر بس یونہی...... گھوم پھر کر دنیا دیکھنے کا خیال تمہیں نہیں آیا؟ تم یہاں بور نہیں ہوتے؟''

''نہیں' اگر ہم لوگ بور ہوتے ہیں تو کوئی محفل جما لیتے ہیں' اچھا اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔'' اس نے کہا تو بربجیٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے امید ہے تمہاری بہن ہولی جلد واپس آ جائے گی۔'' گرانٹ نے جاتے جاتے کہا۔

''مجھے بھی یہی امید ہے۔'' بربجیٹ نے جواب دیا۔

گرانٹ کے جانے کے بعد وہ لیٹ کر سو گئی جب اس کی آنکھ کھلی تو سہ پہر ہو چکی تھی اس نے شاور لیا لباس تبدیل کیا اور اپنے کمرے کی چابی کارڈ اور چند ڈالرز جیب میں رکھ کر باہر آ گئی۔ اس نے راستے میں ایک کیفے سے سینڈوچ اور کافی لی تھی اور بل اور ایملی کے گھر کی طرف بڑھ گئی تھی گھر کے احاطے میں ایک کتے نے اس کا استقبال کیا تھا ڈرائیو وے میں بل کا ٹرک اور ایملی کی کار کھڑی تھی اور گھر کی دیوار سے لگی تین بائیسکلز بھی کھڑی تھیں گھر کے اندر سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جن میں وہ ایملی کی آواز بہ خوبی پہچان گئی تھی اس نے دروازے پر دستک دی دروازہ ایملی نے ہی کھولا تھا وہ کافی عمر رسیدہ ہوگئی تھی اس کے ہلکے براؤن بال اب سفید ہوگئے تھے اس نے نیلے اور سفید چیک کی شرٹ کے ساتھ بلو کلر کی جینز پہنی ہوئی تھی۔

''بربجیٹ۔'' ایملی نے حیرت سے کہا۔

''ہائے۔'' بربجیٹ نے کہا۔

کمرے میں تین بچے ایک کاؤچ پر اچھل رہے تھے اور شور مچا رہے تھے جن میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔

''چپ ہو جاؤ۔'' ایملی نے مڑ کر انہیں ڈانٹا اور وہ تینوں چپ ہو گئے۔

''کون ہے؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''تم لوگ اوپر جاؤ۔'' ایملی نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ڈنر کی تیاری کرو صرف پندرہ منٹ باقی ہیں اور ریان کو نیچے بھیجنا اس سے کہو کہ ٹیبل ٹھیک کرے آج کھانا سرو کرنے کی اس کی باری ہے۔''

''تم یہاں کیا کر رہی ہو بربجیٹ۔'' بچوں کے جانے کے بعد ایملی نے پوچھا۔

''مجھ سے یہ مت کہنا کہ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو...... کیا مجھے اندر آنے کا نہیں کہو گی؟'' بربجیٹ نے حیرت سے کہا اسے ایملی کے رویے پر حیرت تھی ایملی برا سا منہ بنا کر پیچھے ہٹ گئی اور اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا گھر ہمیشہ کی طرح کھلونوں اور چیزوں سے بھرا پڑا تھا

کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی کچن میں بھی سامان بکھرا ہوا تھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا......؟ تم تو یونان...... یا پتہ نہیں کس علاقے میں تھیں؟" ایملی نے پوچھا۔

"تھائی لینڈ...... مجھے آٹوم نے بتایا ہے۔" بربجیت نے جواب دیا۔

"ہاں وہی یہ کام کر سکتی تھی۔" ایملی نے ناگواری سے کہا۔

"کسی نہ کسی کو تو اتنا با اخلاق ہونا تھا کہ وہ مجھے میری بہن کی گمشدگی کے بارے میں بتائے۔" بربجیت نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اور کچن میں ایک اسٹول پر جگہ بنا کر بیٹھ گئی۔

"معاملات کنٹرول میں ہیں بربجیت۔" ایملی نے کچن میں آ کر اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔

"اوہ...... تو کیا ہولی گھر واپس آ گئی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر معاملات کنٹرول میں تو نہیں ہیں۔"

"تم کیا چاہتی ہو بربجیت۔" ایملی نے ساس بناتے ہوئے پوچھا۔

"تم یہاں کس پلان کے تحت آئی ہو، کیا تم سمجھتی ہو کہ تم پولیس سے بہتر کام کر سکتی ہو؟"

"ایسا نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا صرف تمہاری یہاں موجودگی ہی اسے جادوئی طور پر حاضر کر دے گی؟"

"شاید۔" بربجیت نے ایملی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہولی تمہاری طرح نہیں ہے...... وہ بھاگ کر نہیں گئی...... ہم اس کے لیے پریشان ہیں اور اگر تمہارے اندر ذرا سی بھی شرافت ہوتی تو تم یہاں نہ آتیں۔"

"میری بہن لاپتہ ہوئی ہے...... میں یہاں تمہیں تنگ کرنے نہیں آئی ہوں ایملی...... میں اس لیے آئی ہوں کہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"گویا تم صرف اپنے ذہن کو تسکین دینے کے لیے یہاں آئی ہو؟"

"میں ہولی کے لیے آئی ہوں، آٹوم نے بتایا کہ وہ اسکول سے گھر واپس نہیں آئی تھی اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، کیا تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

"وہ بہت اچھی تھی ہر چیز میں نمایاں، تعلیم میں بہترین، وہ بہت اچھی جا رہی تھی۔" ایملی نے کھانا بناتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اس کے ساتھ کیا ہوا؟"

"پولیس کا خیال ہے کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔" ایملی نے منہ بنا کر کہا۔

"میں نے پولیس کا خیال نہیں پوچھا۔"

"میں نہیں جانتی بربجیت...... میں تنگ آ گئی ہوں...... تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ شہر میں ایک بڑا فٹ بال کا مقابلہ ہونے والا ہے اور وہ اس کی بہت شوقین ہے وہ ضرور یہ میچ دیکھنے آئے گی۔"

"کیا تم نے یہ بات پولیس کو بتائی؟"

"ہاں بتائی ہے لیکن میرا خیال ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" ایملی نے ایک گلاس میں اورنج جوس نکال کر بربجیت کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو۔"

"شکریہ۔" بربجیت نے کہا اور جوس کا گلاس تھام لیا۔

"پولیس کو ہولی کے کمرے، اس کی کار یا شہر میں کہیں اور ایسا کوئی سراغ نہیں ملا جس سے یہ اندازہ ہو کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔" ایملی نے کہا۔

"آٹوم نے بتایا ایسا لگتا ہے کہ وہ غائب ہو گئی ہے؟" بربجیت نے کہا اور اسی وقت ایک نوعمر لڑکا سیڑھیاں اترتا نیچے کمرے میں آ گیا۔

"اوہ...... شٹ...... تم ہولی کی بہن ہو نا؟" اس نے پوچھا۔

"ریان، دھیان سے بات کرو۔" ایملی نے اسے تنبیہہ کی۔ "چلو تم ٹیبل لگاؤ۔"

"اچھا اچھا مجھے پتا ہے ورنہ بل ناراض ہوگا۔" ریان نے کہا۔ "کل تم دونوں اسی بارے میں بات کر رہے تھے نا؟" ریان نے ایملی سے کہا۔

"شٹ اپ۔" ایملی نے اسے چپ رہنے کو کہا۔

"اوکے۔" [illegible] کہا اور بربجیت کی طرف [illegible] جھکا۔

"بل بھی [illegible]" [illegible] اس نے کہا۔

"ریان!" ایملی نے پھر اسے ڈانٹا۔

"میں ٹیبل سیٹ کر رہا ہوں۔" اس نے بربجیت کی طرف بامعنی نگاہوں سے دیکھا۔ "میں تو بس ٹیبل ہی سیٹ کر رہا ہوں۔" اس نے دہرایا اور بربجیت ایملی کی طرف مڑی۔

"کیا یہ درست کہہ رہا ہے کہ تم اور بل میرے بارے میں لڑ رہے تھے؟"

"ہم کسی بات پر متفق نہیں تھے۔"

"تمہاری لڑائی ہوئی؟ کس بات پر؟"

"ہم یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ ہمیں ہولی کے بارے میں تمہیں بتانا چاہیے یا نہیں؟" ایملی نے کہا۔

"اور میرا خیال ہے کہ بل ایسا نہیں چاہتا ہوگا؟" بربجیت نے پوچھا۔

''تم نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے بربجیٹ...... تم کیا چاہتی ہو؟'' ایملی نے پوچھا۔

''میں......'' بربجیٹ نے کچھ کہنا چاہا اسی وقت زینے پر پھر کسی کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور سیڑھیوں سے بل نیچے اترا' وہ تقریباً چھ فٹ سے زیادہ لمبا تھا اس کے شانے چوڑے اور جسم توانا تھا' چہرے پر داڑھی تھی' چہرے سے خاصا سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر بربجیٹ پر پڑی۔

''اوہ...... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے اجنبیت سے پوچھا۔

''بل۔'' ایملی نے کچھ کہنا چاہا لیکن بل نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔

''میرے گھر سے نکل جاؤ'' اس نے بربجیٹ کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''بل...... ہم صرف کچھ باتیں کر رہے تھے...... تمہیں غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایملی نے اسے سمجھانا چاہا۔

''ایملی' میں اسے یہاں دیکھنا نہیں چاہتا۔'' بل نے غصے سے کہا۔

''میں تمہاری مدد سے اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتی ہوں۔'' بربجیٹ نے وضاحت کی۔

''تم بالکل بھی نہیں بدلی ہو...... تم بہت تیز اور چالاک ہو۔'' بل اس کی طرف جھپٹا لیکن وہ اچھل کر دوسری طرف جا کھڑی ہوئی۔

''وہ سب دس سال پہلے کی بات ہے جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔'' بربجیٹ نے کہا۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟'' بل ایملی کی طرف مڑا۔ ''میں نے کہا تھا کہ یہ ہوگا...... کیا تم نے اسے کال کی ہے؟'' بل نے ایملی سے پوچھا۔

''نہیں...... میں......'' ایملی بولتے بولتے رک گئی۔

''ایملی کو الزام مت دو...... اس نے کچھ نہیں کیا ہے...... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ایملی غائب ہوگئی ہے۔ اور تمہیں اس کی پروا نہیں جبکہ وہ تمہاری نگہداشت میں دی گئی تھی۔''

''اور میرا خیال ہے کہ اسے تم نے غائب کیا ہے۔'' بل نے اس پر الزام لگایا۔

''کیا بکواس ہے بھلا میں اپنی بہن کو کیوں اغوا کروں گی؟''

''یہ کام تم ہی کر سکتی ہو تم اسے بے حد چاہتی تھیں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں لیکن یہاں کے قانون سے مجبور تھیں اب جب وہ اٹھارہ سال کی ہونے والی ہے تو تم نے اسے اغوا کر لیا تاکہ اٹھارہ کی ہونے کے بعد وہ آزادی سے تمہارے ساتھ گھوم پھر سکے اور اغوا ہونے کا ڈھونگ رچایا۔'' بل نے کہا وہ بہت غصے میں تھا۔

''یہ غلط ہے......''

''ارے کوئی مجھے بتائے گا کہ میں ٹیبل کتنی دیر تک سیٹ کرتا رہوں مجھے کتنے لوگوں کے لیے ٹیبل سیٹ کرنا ہے؟ کیا ہولی کی روح بھی یہاں موجود ہے اور کیا اس کی بہن ڈنر پر ہمارے ساتھ ہوگی؟'' ریان نے چیخ کر پوچھا۔

''ہم چھ لوگ ہیں ریان۔'' ایملی نے کہا۔

''میری بات سنو بل...... میں تمہارے گھر کی اوپری منزل میں ہولی کے کمرے کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔'' بربجیٹ نے ریان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''ہرگز بھی نہیں۔'' بل نے سختی سے جواب دیا۔ 'میں تمہیں اس کی چیزوں میں گھسنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''میں ہولی کو تم سے بہتر جانتی ہوں...... ہوسکتا ہے وہ کوئی نشان چھوڑ گئی ہو جس سے پتہ چل سکے کہ وہ کہاں ہے؟ میں تم دونوں سے جلدی ایسی نشانی ڈھونڈ لوں گی۔''

''پولیس پہلے ہی اس کے کمرے کو چھان چکی ہے...... انہیں کچھ نہیں ملا۔''

''میں پولیس آفیسر نہیں ہوں...... اس کی بہن ہوں۔'' بربجیٹ نے سمجھایا۔

''بس نام کی بہن ہو......'' بل نے غصے سے کہا۔

''میری بات سنو بل۔'' ایملی نے بل کو مخاطب کیا۔ ''بربجیٹ ہولی کی بہن ہے اب بحث ختم کرو' یہ بھی ہولی کے لیے پریشان ہے یقیناً وہ کچھ عرصہ شہر میں رہے گی اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لو......'' پھر ایملی بربجیٹ کی طرف مڑی۔

''اور بربجیٹ تم...... تمہیں ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا...... وعدہ کرو تم کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرو گی۔''

'میں وعدہ کرتی ہوں۔'' بربجیٹ نے جلدی سے کہا وہ بھی یہ لاحاصل بحث ختم کرنا چاہتی تھی۔

''نہیں۔'' بل نے مخالفت کی۔

''میں کچھ نہیں سنوں گی ہم سمجھدار ہیں بچے نہیں' ہمیں سمجھدار لوگوں ہی کی طرح عمل کرنا چاہیے۔'' ایملی نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں اب ہولی کا کمرہ دیکھ سکتی ہوں؟'' بربجیٹ نے پوچھا اور ایملی نے بل کی طرف دیکھا جس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بربجیٹ! میں چاہتی ہوں ابھی تم معاملے کو کچھ ٹھنڈا ہونے دو دراصل پچھلے کئی دن سے ہم بہت پریشانیوں سے گزر رہے ہیں۔'' ایملی نے کہا۔

''اچھا تو کیا میں کل آ جاؤں؟'' بریجیٹ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں سوچ کر بتاؤں گی کیا تمہارا کوئی نمبر ہے جس پر تم سے رابطہ کیا جا سکے؟'' ایملی نے کہا اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

''میرے پاس کوئی فون نہیں ہے۔'' بریجیٹ نے جواب دیا۔ ''لیکن میں یہاں کے واحد ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں تم مجھ سے وہاں مل سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے میں تم سے رابطے میں رہوں گی۔'' ایملی نے کہا اور اسے دراوزے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا' بریجیٹ خاموشی سے گھر سے نکل گئی تھی پھر وہ زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ اسے اپنے پیچھے سڑک پر بائیک کے ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے ریان؟'' بریجیٹ نے کہا اسے اپنے پیچھے ریان کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

''تمہیں میرا نام یاد ہے؟'' ریان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام اتنا مشکل بھی نہیں کہ اسے یاد نہ رکھا جا سکے' مجھے یقین ہے تم میرے پیچھے بے مقصد نہیں آئے ہو؟''

''ہاں۔'' ریان نے جواب دیا لیکن وہ سر گھما کر ایملی کے گھر کی طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا شاید اسے ڈر تھا کہ اس کے گھر سے باہر جانے کا علم ایملی اور بل کو نہ ہو جائے۔

''دیکھو بعض اوقات ہولی میرے ساتھ اچھا رویہ نہیں رکھتی تھی لیکن وہ بذات خود اچھی تھی اور مجھے پسند بھی تھی اور میں نہیں چاہتا کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہو اور میرا خیال ہے کہ تم اس کی بہن ہونے کے ناتے زیادہ بہتر جانتی ہو گی کہ اسے کیسے ڈھونڈا جا سکتا ہے اس لیے......''

''ارے...... رکو' رکو ذرا سانس لے لو...... آرام سے بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' بریجیٹ نے کہا۔

''میں تمہیں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں منگل کو ساڑھے تین بجے تک گھر آ جاتا ہوں اور بل اور ایملی شام چھ بجے تک آتے ہیں تو اگر تم واقعی ہولی کا کمرہ دیکھنا چاہتی ہو...... کیونکہ تم جانتی ہو بل تو تمہیں اوپر اس کے کمرے میں جانے نہیں دے گا...... تو تم کل تین بجے تک آ جانا میں تمہیں اس کا کمرہ دکھا دوں گا۔''

''تم مجھے کمرہ دکھا دو گے؟'' بریجیٹ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تم مجھے جانتے تک نہیں...... ممکن ہے میں کوئی دھوکے باز ہوں؟ کوئی غلط لڑکی ہوں؟''

''نہیں میرا خیال ہے تم اتنی بری نہیں ہو اور پھر میں تمہیں تمہاری بہن کا کمرہ ہی دکھاؤں گا تمہیں بل اور ایملی کی قیمتی چیزوں کا ٹھکانہ نہیں بتاؤں گا۔'' ریان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ریان...... میں کل آ جاؤں گی۔''

''گڈ......'' ریان نے کہا اور واپس مڑ گیا۔

دوسرے روز بریجیٹ کی ملاقات ہوٹل کے لاؤنج میں ایمیٹ سے ہوئی وہ لنچ کر رہی تھی تب ہی ایمیٹ اس کے قریب آ کھڑا ہوا وہ پہلے سے زیادہ توانا نظر آ رہا تھا۔

''ارے بھئی یہ پرانی کالج گرل یہاں کیا کر رہی ہے؟ تم کیسے واپس بیلی ڈیم آ گئی ہو؟'' اس نے بریجیٹ کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں نہیں معلوم؟ بیلی ڈیم میں سب کو پتہ ہے میری بہن ہولی اچانک غائب ہوئی ہے۔''

''کیا؟ ہولی غائب ہے؟'' ایمیٹ نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

''تمہیں تو جم جانے اور ایکسر سائز کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی ہو گی۔'' بریجیٹ نے اس کے توانا جسم کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''وہ پچھلے ہفتے سے لاپتہ ہے۔''

''اوہ مجھے یہ جان کر افسوس ہوا۔'' ایمیٹ کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''میں اس کے لیے ہی واپس آئی ہوں لیکن میں فیصلہ نہیں کر سکی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے' میں نے اسے کافی عرصے سے نہیں دیکھا۔''

''پریشان مت ہو بی' میرا خیال ہے پولیس اسے ڈھونڈ نکالے گی۔''

''بل اور ایملی مجھے اس کا کمرہ دکھانے کے لیے بھی تیار نہیں۔'' بریجیٹ نے کہا۔

''تم اکیلے ان سے ملنے چلی گئیں؟'' ایمیٹ نے کہا۔

''ہاں' بل تو مجھے مارنے کے لیے لپکا تھا لیکن ایملی درمیان میں آ گئی۔''

''لیکن پہلے تو وہ ایسا غصے والا نہیں تھا؟'' ایمیٹ نے حیرت سے کہا۔

''مگر اب وہ ایسا ہی ہو گیا ہے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے پر سکون ہو کر بات نہیں کی۔''

''بہت افسوس کی بات ہے۔''

''ایمیٹ میں ہولی کے بغیر نہیں رہ سکتی پتہ نہیں میری بہن کس حال میں ہو گی میں ہر قیمت پر اسے ڈھونڈنا چاہتی ہوں مجھے ایملی کے گھر دوبارہ جانا ہے وہاں ریان میری مدد

Medora
Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے



خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس

MEDORA OF LONDON

کرے گا اور مجھے ہولی کا کمرہ دکھائے گا شاید وہاں سے کوئی سراغ مل سکے۔"

"اگر تم کہو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" ایمیٹ نے پیش کش کی۔

"نہیں میں اکیلے ہی جاؤں گی لیکن اگر بعد میں تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

ایمیٹ سے ملنے کے بعد بربجیٹ اپنے کمرے میں گئی وہاں اس نے لباس تبدیل کیا اس کے سفری بیگ میں دو تین سوٹ ہی تھے اس نے ایک جینز تبدیل کی اور اس کے ساتھ بلو کلر کی ٹی شرٹ پہن لی پھر اس نے اپنے پرس کا جائزہ لیا جس میں کرنسی بھری تھی لیکن وہ تھائی نوٹ تھے۔ جو یہاں اس کے استعمال کے نہیں تھے اس کے علاوہ کچھ رقم اس کے کریڈٹ کارڈ میں بھی باقی تھی جسے وہ خرچ کرسکتی تھی لیکن اگر اسے بیلی ڈیم میں کچھ عرصہ رہنا پڑا تو اسے مزید کپڑوں کی ضرورت ہوگی اس نے فیصلہ کیا کہ ایملی کے گھر جاتے ہوئے وہ آٹوم کے بوتیک جائے گی اور اپنے لیے چند اچھے لباس خریدے گی لیکن جب وہ راستے میں تھی تو اس کی نظر علاقے کے چھوٹے پولیس اسٹیشن پر پڑی اور وہ ایک ارادے کے ساتھ اس میں داخل ہوگئی۔

اسٹیشن میں ایک ڈیسک پر ایک پولیس آفیسر بیٹھا کسی فائل کا جائزہ لے رہا تھا۔ بربجیٹ اسے پہچان گئی وہ اپنے والدین کی وفات کے بعد کئی بار یہاں آچکی تھی۔ اس وقت اس پولیس آفیسر کے سر کے بال گھنے اور سیاہ تھے لیکن اب اس نے اپنا گنجا سر چھپانے کے لیے وگ لگائی ہوئی تھی۔ جیسے ہی بربجیٹ کمرے میں داخل ہوئی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"اوہ......تم؟......پہلی بار جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تمہارے چہرے پر جلنے کے نشان تھے اور بال کٹے ہوئے تھے۔" پولیس آفیسر نے کہا۔

"ہاں یہ بہت سال پہلے کی بات ہے۔"

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" آفیسر نے کہا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں' تم ابھی ریٹائرڈ نہیں ہوئے ہو؟" بربجیٹ نے پوچھا۔

"میں تم سے یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ تم کیوں آئی ہو میرا خیال ہے مجھے کسی حد تک اندازہ تو ہے۔"

"ہولی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا بربجیٹ کہ میں تم سے کیا کہوں؟"

"مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟ یوں لگتا ہے جیسے کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں نہ آٹوم کو نہ بل اور ایملی کو اور میں اس بات پر یقین نہیں کرسکتی کہ وہ بھاگ گئی ہے وہ ایسی نہیں تھی اسکاٹ۔" بربجیٹ نے پولیس آفیسر کا نام لیا۔

"نہیں' میرا یہ مطلب نہیں کہ میں کچھ نہیں جانتا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں سب کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں نہیں بتا سکتے؟"

"کیونکہ تم ہولی کی قانونی سرپرست نہیں ہو۔"

"مذاق مت کرو اسکاٹ۔"

"میں مجبور ہوں۔"

"میں اس کی بہن ہوں' اس سے میرا خون کا رشتہ ہے اور مجھے یہ معلوم کرنے کی اجازت نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کتنی غلط بات ہے؟" بربجیٹ نے برہمی سے کہا۔

"مجھے اندازہ ہے......اور میری یہ خواہش ہے کہ میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں لیکن موجودہ صورت حال میں میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

"تمہارے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔" بربجیٹ نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو اس نے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ "تمہارے ہاتھ تمہارے کمپیوٹر کے قریب ہیں اور جہاں تک میرا اندازہ ہے تمہارے اس کمپیوٹر میں کہیں ہولی کے بارے میں بھی معلومات محفوظ ہوں گی۔"

"میرا مقصد ہے کہ میں قانون کی پاسداری کرنے پر مجبور ہوں۔"

"نہیں تم مجبور نہیں ہو' میرا خیال ہے تم خود مجھے بتانا نہیں چاہتے۔" بربجیٹ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں چلتا کہ کچھ دن پہلے تک خبروں میں چل رہا تھا......سنو میں واقعی تمہاری مدد کرتا اگر میرے لیے ممکن ہوتا تم مجھے جانتی ہو میں نے ہمیشہ تمہاری مدد کی۔ میرا خیال ہے تمہیں اس سلسلے میں بل اور ایملی سے بات کرنا چاہیے۔" اسکاٹ نے اسے مشورہ دیا۔ "ویسے اس سلسلے میں انسپکٹر بریٹ شاید تمہاری مدد کرسکے وہ اس کیس کی تحقیقات کررہی تھی۔"

"میں بل اور ایملی سے مل چکی ہوں......وہ مجھے یہاں دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔"

"اس کے لیے میں کچھ نہیں کرسکتا...... تمہیں یاد ہے نا کہ تم نے ایک بار ان کے کھیت میں آگ لگادی تھی۔"

"یہ بہت پرانی بات ہے۔"

"اگر تم ان پر زور دو تو شاید تمہیں کچھ معلومات مل

جائیں۔"
"میں اپنی سی کوشش کررہی ہوں اگر کچھ پتہ چلا تو تمہیں بھی بتاؤں گی۔" برجیت نے قدرے پرسکون لہجے میں کہا۔"ویسے تم نے اب تک اس کے لیے جو بھی کچھ کیا اس کے لیے تمہاری شکر گزار ہوں۔" اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا' اسکاٹ اسے رخصت کرنے دروازے تک آیا تھا۔
"برجیت رکو...... مجھے تم سے معافی مانگنا ہے۔" اسکاٹ نے کہا۔
"کس بات کی معافی؟"
"تم نے جانے سے پہلے مجھ سے کہا تھا کہ میں ہولی کا خیال رکھوں اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کا خیال رکھوں گا لیکن ...... میں ناکام رہا۔" اسکاٹ نے افسردہ لہجے میں کہا۔
"میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھتی اسکاٹ دراصل یہ بات تمہاری پہنچ سے باہر تھی۔"
"میں صرف تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میرے بس میں جتنا تھا میں نے کیا لیکن میں اسے ڈھونڈ نہیں سکا۔"
"میں اب بھی تم سے کہوں گی کہ اگر اسے ڈھونڈنے میں میری مدد کرسکتے ہو تو کرو۔" برجیت نے کہا۔اور اسٹیشن سے باہر نکل گئی۔
پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے بعد وہ آٹوم کے بوتیک پر پہنچی اور آٹوم سے اپنے لیے نئے کپڑوں کی خریداری کی خواہش کا اظہار کیا جس پر آٹوم نے اسے کئی نئے ڈیزائن کے ملبوسات دکھائے وہ آپس میں ہولی کے بارے میں بھی باتیں کرتی جارہی تھیں آٹوم کو ہولی کے یوں پراسرار طور پر غائب ہوجانے کا افسوس تھا۔
"تم نے بھی تو یہاں سے جاتے وقت بل اور ایملی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا برجیت۔" آٹوم نے شکایتی لہجے میں کہا۔"اور اب تم ایک اور غلطی کررہی ہو کہ تم ایمیٹ سے مل رہی ہو وہ اتنا اچھا شخص نہیں ہے۔"
"لیکن وہ اسکول کے زمانے سے مجھے پسند کرتا ہے۔" برجیت نے کہا۔
"کچھ بھی سہی اس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں اس کے مقابلے میں اپنی آنٹی سے ملنا چاہیے۔"
"آنٹی سے؟ وہ بھی شاید ہولی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہوں گی بھلا وہ کیا میری مدد کریں گی؟"
"دیکھو بی' تمہارے والدین کا انتقال ہوچکا ہے ہولی کھوگئی ہے اب تمہارے خاندان میں صرف تم اور تمہاری اپنی آنٹی ہی باقی بچے ہیں وہ بھی اپنی بہن کی موت سے دلبرداشتہ ہیں تمہیں ان سے ضرور ملنا چاہیے۔" آٹوم نے اسے سمجھایا۔
"ٹھیک ہے مل لوں گی۔"
"تو پھر یہ تین سوٹ میری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہیں۔" آٹوم نے اس کے سوٹ پیک کرتے ہوئے کہا پھر اس نے اپنے بوتیک کے پارلر میں برجیت کو کچھ وقت دیا تھا اور اس کے بال نئے انداز سے تراش کر اسے ایک نیا روپ دے دیا تھا ہلکا سا میک اپ کرنے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ پہچانی نہیں جارہی تھی۔



ریان سے اس کی ملاقات ایملی کے گھر کے باہر ہی ہوگئی تھی وہ اپنی بائیک کی صفائی کررہا تھا اور برجیت کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔
"اوہ......تم تو پہچانی نہیں جارہی ہو......کیا بات ہے؟" ریان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"یہ میری دوست آٹوم کا کمال ہے۔" برجیت نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"گھر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے باہر ہی اتار دینا میں نہیں چاہتا کہ ان کے نشان گھر میں بنیں او ر ایملی مجھ پر کوئی شک کرے۔" ریان نے اسے سمجھایا تو برجیت نے اپنے جوتے باہر ہی اتار دیئے اور پھر گھر میں داخل ہوگئی۔ سیڑھیوں سے اوپر ہولی کا کمرہ موجود تھا جہاں وہ بھی کچھ عرصے رہی تھی۔ یہ گھر کا سب سے چھوٹا بیڈروم تھا جب وہ وہاں رہتی تھی تو ہولی کے ساتھ ایک ہی بیڈ پر سوتی تھی اور ایک ہی الماری تھی جس میں وہ دونوں اپنی چیزیں رکھتی تھیں ان دونوں کے ایملی کے گھر آجانے سے گھر میں چھ بچے ہوگئے تھے ہولی کے کمرے میں اس کے اسکول کی کتابیں اور پسندیدہ ناولز کمرے میں بکھرے پڑے تھے کمرے میں ایک سلیپ پر اس کے انعامات سرٹیفکیٹس اور ٹرافیاں سجی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہولی کی تصویریں بھی رکھی تھیں جن میں وہ مختلف دوستوں اور اپنی کھیل کی ٹیم کے ساتھ کھڑی مسکرارہی تھی اسے ہر کوئی پسند کرتا تھا' برجیت تصویریں دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ نہ جانے ایملی نے پولیس کو حوالے کے طور پر اس کی کونسی تصویر دی ہوگی چلتے چلتے اس کی نظر ایک تصویر پر جم گئی...... وہ تصویر تھی جو اس کی سولہویں سالگرہ کے موقع پر کھینچی گئی تھی اور یہ آخری تصویر تھی جس کے بعد اس کا بچپن اس سے بچھڑ گیا تھا اور اس پر بڑوں والی ذمہ داریاں آپڑی تھیں اس کے والدین فوت ہوگئے تھے اس تصویر میں اس کی پوری فیملی موجود تھی اس کے والدین وہ اور ہولی جو اس کے پیروں پر بیٹھی ہوئی تھی برجیت نے وہ تصویر نکال کر

اپنی جیب میں رکھ لی۔ یہ ایک یادگار تصویر تھی اور وہ اسے ایملی کے گھر میں یوں غیر محفوظ نہیں چھوڑ سکتی تھی اس کے بعد اس نے اچھی طرح کمرے کی تلاشی لی تھی ریان نے اسے بالکل نہیں روکا تھا اس نے الماری کی درازیں اور مختلف بوکسوں میں رکھی ہوئی چیزیں باری باری نکال کر دیکھی تھیں ہولی کی ہر چیز نہایت ہی قرینے سے رکھی ہوئی تھی ان چیزوں میں وہ پوسٹ کارڈز بھی موجود تھے جو بریجیٹ اسے بھیجتی رہی تھی اور وہ تصویریں بھی جو مختلف ممالک سے بریجیٹ اسے بھیجتی رہی تھی اس کے والدین کی جمع پونجی بڑی اولاد ہونے کے ناتے بریجیٹ کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کر دی گئی تھی جس سے وہ اپنے اخراجات پورے کرتی تھی اور ہولی کے لیے بھی خرچ بھیجتی تھی۔

اسی تلاش کے دوران بریجیٹ کے ہاتھ ہولی کا پسندیدہ ناول لگا جس کے آخری صفحے پر ایک لڑکی کی تصویر بنی تھی اور لڑکی کے ہاتھ پر ڈریگن کا ٹیٹو بنا تھا یہ ہاتھ سے بنایا گیا تھا' بریجیٹ کو یہ عجیب سا لگا اور وہ کتاب کا بغور جائزہ لینے لگی اور اسی وقت اسے چھوٹے ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی۔

''اوہ میرے خدا...... اب میری خیر نہیں۔'' ریان جلدی سے بولا۔''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ بل ٹھیک چھ بجے آجاتا ہے۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا اور بریجیٹ نے جلدی سے وہ ناول اپنی شرٹ کا گلا کھول کر اندر ڈال لی۔

''کیا کر رہی ہو وہ آ گیا ہے۔'' ریان نے اسے تنبیہ کی اور اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا' بل اپنے ٹرک سے اتر رہا تھا۔

''تم میرے کمرے میں چھپ جاؤ وہاں بل کو کوئی شبہ نہیں ہوگا۔'' ریان نے کہا۔''تم میرے بیڈ کے نیچے لیٹ جانا۔''

''نہیں......'' بریجیٹ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

''اوہ......تم کیا کر رہی ہو؟ وہ تمہیں دیکھ لے گا؟''

ریان خوفزدہ تھا لیکن بریجیٹ اس کا جواب دیئے بغیر اوپر ہی کمروں کے بعد بنے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی اور اس نے ریان کو بھی اندر کھینچ کر باتھ روم کا دروازہ لاک کر لیا تھا۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' ریان نے حیرت سے پوچھا۔

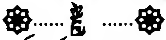
''میں یہاں سے باہر نکلنا چاہتی ہوں۔'' بریجیٹ نے کہا اور باتھ روم کے اوپر بنے روشندان کا شیشہ اوپر ہٹا کر اس جگہ سے آدھی باہر لٹک گئی پھر اس نے ایک ٹانگ باہر نکالی تھی اور قریب لگے ہوئے ہمسائے کے کیسے درخت کی شاخ پکڑ کر اس پر جھول کر روشندان سے نکل گئی تھی پھر اس نے اپنی دونوں ٹانگیں تنے میں پھنسائی تھیں اور نیچے اترنے لگی تھی۔

''اوہ...... یہ ٹرک مجھے بھی سکھانا۔'' ریان نے تعریفی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ خطرناک ہے اگر کبھی تم نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں مار ڈالوں گی۔'' بریجیٹ نے جواب دیا۔ اور اسی وقت گھر کے اندر سے بل کی آواز آئی۔

''ریان کیا تم گھر میں ہو؟''

''جاؤ......وہ تمہیں آواز دے رہا ہے۔'' بریجیٹ نے ریان سے کہا اور وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا پھر اس نے اسے بند کر دیا تھا۔



بلی ڈیم کے واحد بوڑھوں کے مرکز میں علاقے کی مناسبت سے ہر ممکن سہولت دینے کی کوشش کی گئی تھی' آٹوم ہی نے بریجیٹ کو اولڈ ایج ہاؤس کا پتہ دیا تھا جہاں اس کی اپنی آنٹی نفسیاتی شعبے میں زیر علاج تھی وہاں استقبالیہ پر اس کی ملاقات جینٹ سے ہوئی جو ہولی کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔'' کاؤنٹر پر موجود جینٹ نے بریجیٹ سے پوچھا۔

''میں اپنی آنٹی سے ملنا چاہتی ہوں میرا نام بریجیٹ ڈوبس ہے۔'' اس نے کہا۔

''اوہ تم ہولی کی بہن ہو؟'' جینٹ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' بریجیٹ نے کہا تو جینٹ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے بریجیٹ کو گلے لگا لیا۔''مجھے تم سے مل کر بہت اچھا لگا ہولی اکثر تمہارا ذکر کرتی تھی۔''

''اچھا' وہ یہاں کتنا آتی تھی؟''

''وہ ہفتے میں ایک دو بار آجاتی تھی اور اگر اس کے پاس وقت ہوتا تھا تو زیادہ بھی آجاتی تھی وہ اپنی آنٹی سے بہت محبت کرتی تھی......اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم دنیا کی سیاحت پر نکلی ہوئی ہو؟''

''ہاں' کسی حد تک تم یہ کہہ سکتی ہو۔'' بریجیٹ نے جواب دیا۔

''اوہ......سیاحت بڑے مزے کی چیز ہے۔'' جینٹ نے کہا وہ اسے ساتھ لے کر آنٹی کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

''تمہارے پاس تو سیاحت کے حوالے سے بڑی دلچسپ کہانیاں ہوں گی؟ تم اپنے گھر کتنی بار آتی ہیں؟''

''میں یہاں سے جانے کے بعد پہلی بار آئی ہوں...... تم ہولی کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''وہی جو خبروں میں چل رہا ہے مجھے امید ہے کہ وہ

جلد واپس آ جائے گی۔'' جینٹ نے کہا۔
''شکریہ۔''
''مجھے امید ہے اپنی آنٹی تمہیں دیکھ کر خوش ہوں گی۔''
''وہ کیسی ہیں؟ میں نے برسوں سے انہیں نہیں دیکھا لیکن جو کچھ سنا ہے اس کے مطابق وہ تنہائی کی زندگی گزار رہی ہیں۔''
''میرا خیال تھا کہ تمہیں اپنی آنٹی کے بارے میں معلوم ہوگا کہ تمہاری والدہ کی موت کے ساتھ ان کے ساتھ کیا حالات رہے؟'' جینٹ نے آنٹی کے کمرے کے باہر رکتے ہوئے کہا۔
''مجھے یہ تو پتہ تھا کہ میری والدہ کی موت کے بعد وہ صدمے میں چلی گئی تھیں لیکن اس کے بعد کی تفصیلات مجھے معلوم نہیں ہیں۔''
''ہم انہیں ہر ممکن طریقے سے پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے آرام کا خیال رکھتے ہیں' تمہاری فیملی کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اس نے انہیں بہت متاثر کیا ہے' میں تمہیں صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ جب تم ان سے ملو گی تو انہیں پہلے سے بہت مختلف پاؤ گی لیکن بہرحال وہ تمہاری آنٹی ہیں اور تمہارے لیے قابل احترام ہیں۔''
''میں جانتی ہوں۔'' بربجیٹ نے کہا اور جینٹ نے دروازے کا لاک کھول کر اندر جھانکا پھر وہ اندر گئی تھی اور بربجیٹ بھی اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئی تھی کمرہ کشادہ تھا کمرے میں دو بیڈ لگے ہوئے تھے کمرے کی کھڑکی سے لان کا سرسبز منظر نظر آرہا تھا اور اپنی آنٹی وہیل چیئر پر بیٹھی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ دروازے کی طرف ان کی پشت تھی قریب ہی میز پر گلابی رنگ کے پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔
''اینی! دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے؟'' جینٹ نے کہا۔ ''تمہاری بھانجی بربجیٹ آئی ہے۔'' لیکن آنٹی اس کی آواز پر مڑی نہیں تھی جینٹ نے آگے بڑھ کر ان کی وہیل چیئر گھمائی لیکن آنٹی بربجیٹ کی طرف دیکھنے کے بجائے خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔
''بربجیٹ' یہاں بیٹھ جاؤ۔'' جینٹ نے ایک کرسی قریب کرتے ہوئے کہا۔
''ان سے بات کرو' کچھ بھی بات کرو' یہ تمہیں سن سکتی ہیں۔'' جینٹ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔
''یہ اچھی جگہ ہے..... میں دوربین لانا بھول گئی یاد ہے ہم اس سے پڑوس کے گھروں میں جھانکتے تھے۔'' بربجیٹ نے کہا لیکن آنٹی نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''آنٹی مجھے بہت پہلے آپ سے ملنے آنا چاہیے تھا لیکن میں آپ سے ناراض تھی' آپ نے ہمیں غیر لوگوں کے حوالے کر دیا جبکہ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ ہمیں اپنے ساتھ رکھتیں۔'' بربجیٹ نے کہا لیکن آنٹی اسی طرح خالی خالی نظروں سے خلا میں دیکھ رہی تھیں' بربجیٹ کو لگا جیسے وہ کسی بے جان شے سے بات کر رہی ہے۔
''ہولی چلی گئی ہے' کیا تمہیں پتہ ہے؟ مجھے یقین ہے تم بھی اس کی کمی محسوس کرتی ہوگی میں بھی اسے یاد کرتی ہوں۔'' بربجیٹ نے کہا اور ہاتھ میں پکڑی کتاب ٹیبل پر رکھ دی جو اس کے اور آنٹی کے درمیان رکھی تھی۔
''اگر ہم اسے نہیں ڈھونڈ سکے تو کیا ہوگا.....؟ اگر وہ گھر واپس نہیں آئی تو.....؟'' بربجیٹ مسلسل بول رہی تھی لیکن آنٹی خاموش تھیں۔
''کیا تمہیں وہ یاد آتی ہے؟'' اس نے پھر آنٹی سے پوچھا۔ ''مجھے ممی اور ڈیڈی بہت یاد آتے ہیں میں ان کے بغیر اداس ہوں...... کیا تم بھی اداس ہو؟'' اس نے پھر کہا اور اچانک ہی آنٹی نے میز پر رکھی ہوئی ہولی کی کتاب کی طرف دیکھا۔
''یہ ہولی کی ہے۔'' بربجیٹ نے کتاب آنٹی کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے پہچانتی ہو؟'' اس نے پوچھا اور اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکا ایک بوڑھی عورت کو وہیل چیئر پر لیے کمرے میں داخل ہوا۔
''یہ لوسی' یہ تمہارا نیا کمرہ ہے یہاں سے تمہیں گارڈن کا خوبصورت منظر بھی نظر آئے گا۔'' لڑکے نے کہا اور اچانک اس کی نظر بربجیٹ پر پڑی۔
''مداخلت کی معافی چاہتا ہوں' مجھے پتہ نہیں تھا کہ کوئی ان سے ملنے آیا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔
''کوئی بات نہیں میں جا ہی رہی تھی۔'' بربجیٹ نے آنٹی کی گود سے کتاب اٹھاتے ہوئے کہا اور کھڑی ہوگئی اسی وقت اندر آنے والی عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''بربجیٹ؟'' عورت نے اس کا نام لے کر پکارا۔
''جی؟''
''اوہ یہ تم ہو' شاید میں تمہیں یاد نہیں لیکن میں میسی پارک ہوں بہت عرصہ ہوا تم میرے پوتے کی اچھی دوست تھیں وہ تمہیں چاہتا بھی تھا۔''
''ایمیٹ کی دادی؟'' بربجیٹ نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں' تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔''
''آپ مجھے یاد ہیں' آپ بہت مزے کی براؤنیز بناتی تھیں۔''
''شکریہ بیٹی' تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''
''اپنی آنٹی سے ملنے آئی ہوں۔'' بربجیٹ نے کہا اور میسی نے اینی کی طرف دیکھا۔

''اوہ...... اچھا ڈیئر تم پریشان مت ہونا میں ان کا خیال رکھوں گی۔'' میسی نے اپنائیت سے کہا۔
''بہت شکریہ' میں جا رہی ہوں لیکن میں جلد آؤں گی۔''
''ٹھیک ہے...... اگر تمہیں لیمیٹ ملے تو اس سے کہنا مجھے ملنے آئے وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔'' میسی نے کہا۔
''ہاں...... میں ضرور کہوں گی۔'' برجیٹ نے جواب دیا اور کمرے سے نکل گئی۔
اس کا ابھی ہوٹل جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ کمرے کی تنہائی میں شام گزارنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اس نے شہر کے اکلوتے اسٹیڈیم جانے کا فیصلہ کیا جہاں اس کا پسندیدہ کھیل 'فٹ بال میچ' ہو رہا تھا اسے امید تھی کہ شاید وہاں اسے اپنے بچھڑے ہوئے کچھ ساتھی مل سکیں چنانچہ وہ میچ دیکھنے چلی گئی میچ دیکھتے ہوئے اسے کچھ جانے پہچانے چہرے بھی نظر آئے میچ کے اختتام پر جب وہ اسٹیڈیم سے نکل رہی تھی تو کسی نے اسے آواز دی۔
''ارے ٹھہرو...... سنو۔'' فٹ بال کی ایک کھلاڑی اس کی طرف بڑھی اس کے کاندھے پر اس کا بیگ لٹک رہا تھا اور سفید ٹراؤزر پر مٹی کے دھبے لگے ہوئے تھے۔
''تم برجیٹ ہونا؟ ہولی کی بہن اور فٹ بال کی کھلاڑی؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں' تم کون ہو؟''
''میں انسپکٹر ہرٹ ہوں آج ہماری ٹیم کا بیلی ڈیم کی فٹ بال ٹیم سے مقابلہ تھا' کیا تم اب بھی کھیلتی ہو؟''
''نہیں اب میری بہن میری جگہ لے چکی ہے وہ بہت اچھی کھلاڑی ہے' تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟''
''تم میں اور اس میں غضب کی مشابہت ہے۔''
''تم بیلی ڈیم میں نئی ہو؟''
''ہاں...... میں ایک سال سے یہاں ہوں۔'' انسپکٹر ہرٹ نے کہا۔
''تم میری بہن کے بارے میں تو جانتی ہو گی؟''
''ہاں' ہولی اچھی لڑکی ہے تم اس کے لیے ہی یہاں آئی ہو؟ اسے ڈھونڈنے؟ ہے نا؟''
''ہاں' ایسا ہی ہے' کیا تم اس کی گمشدگی کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟'' برجیٹ نے پوچھا۔
''اس کا کیس مجھے نہیں دیا گیا تھا بلکہ کافی لوگ اس پر کام کر رہے تھے اور کیونکہ بل طرہمارے چیف کا بہت اچھا دوست تھا اس لیے ہم ساری معلومات اسے ہی دے دیتے تھے یوں سمجھ لو روزانہ کی معلومات اس کے پاس جمع ہوتی تھیں۔'' ہرٹ نے کہا
''روزانہ کی بنیاد پر تو پھر کافی معلومات جمع ہوئی ہوں گی؟''
''کیا مطلب؟ کیا بل اور ایمی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟''
''نہیں' ایک لفظ بھی نہیں۔''
''اوہ بہت افسوس ہوا' میرا خیال ہے معاملہ مشکل ہو گیا ہے۔''
''اتنا مشکل بھی نہیں' یہ بتاؤ ایسا کوئی طریقہ ہے کہ میں ہولی کے کیس کی معلومات تک رسائی حاصل کر سکوں' میں جانتی ہوں کہ میں اس کی قانونی سرپرست نہیں ہوں لیکن میں اس کی بہن ہوں۔''
''میں دیکھوں گی کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔''
''میرا خیال تھا کہ شاید تم سے مجھے کچھ مدد مل جائے گی؟'' برجیٹ نے مایوسی سے کہا۔
''سارا شہر تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہا ہے' برجیٹ' میں نہیں جانتی کہ کس پر یقین کروں' میں صرف یہ جانتی ہوں کہ اگر میری چھوٹی بہن کھو جاتی تو میں اس کے لیے کتنی دکھی ہوتی میں تمہارے جذبات سمجھتی ہوں۔''
''شکریہ۔''
''میں اب چلتی ہوں...... تمہارا کوئی نمبر؟''
''میرے پاس فون نہیں ہے۔''
''تو پھر ایک خرید لو...... یہ بہت ضروری ہے۔'' ہرٹ نے کہا اور واپس مڑ گئی۔
''یس سر آفیسر ہرٹ۔'' برجیٹ نے با آواز بلند کہا۔
''تم مجھے میگ کہہ سکتی ہو اگر ہم دوست ہیں۔'' ہرٹ نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا اور آگے بڑھ گئی۔
اس رات سوتے سوتے اچانک برجیٹ کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے گھڑی دیکھی صبح کے تین بجے تھے اس کی ٹی شرٹ پسینے کی وجہ سے اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی اس کا کمبل پھسل کر بیڈ سے نیچے گر گیا تھا وہ اپنے پاؤں سکیڑے دائیں کروٹ سے بیڈ پر پڑی تھی اور ہوٹل کا یہ کمرہ جیسے اسے کھانے کو آ رہا تھا چند منٹ کے بعد وہ اٹھی اس نے آٹوم سے لیے ہوئے کپڑوں میں سے ایک نئی جینز اور ٹی شرٹ نکال کر پہنی نئے جوتے پہنے اور ہوٹل سے نکل گئی۔
شہر میں خاموشی تھی بس فٹ پاتھ پر پڑتے ہوئے اس کے جوتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اس کے قریب سے گزرتی ہوئی ایک دو کاریں فضا میں چند لمحوں کے لیے ذرا سا شور کرتی گزر گئیں وہ چلتی ہوئی بیلی ڈیم کے آخری حصے تک چلی گئی جہاں قبرستان میں بنی قبروں کے کتبے وقفے وقفے سے گزرنے والی کاروں کی روشنی سے چمک اٹھتے تھے اچانک اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اس نے اپنی

شرٹ کی آستین نیچے کرلیں ہر طرف سرد موسم کی وجہ سے دھند چھائی ہوئی تھی اور بربجیت کو لگ رہا تھا جیسے قبروں سے روحیں نکل آئی ہوں اور ادھر ادھر گھومتی پھر رہی ہوں وہ دھند میں سے گزرتی ہوئی اپنے والدین کی قبروں کے پاس جا کر رک گئی تھی دونوں کی قبروں پر ایک ہی کتبہ لگا تھا جس پر لکھے الفاظ چاند کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

''اور جب تم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاؤ تو تمہیں چڑھائی کا آغاز کردینا چاہیے۔'' اس نے قبروں پر لکھے کتبے کو با آواز بلند پڑھا۔

''اور جب تمہارے قدم زمین سے لگیں تو تمہیں ڈانس کرنا چاہیے۔'' باقی آدھا کتبہ کسی اور نے اپنی بھاری اور گھمبیر آواز میں پڑھا' بربجیت چونک کر تیزی سے مڑی اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ایمیٹ کھڑا تھا جس نے سرمئی کلر کا جوگر سوٹ پہنا ہوا تھا۔

''کیسا اتفاق ہے ہم دونوں کی ملاقات یہاں ہوگئی۔'' ایمیٹ نے کہا۔

''صبح کے تین بجے ہیں تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' بربجیت نے حیرت سے کہا۔

''مجھے نیند نہیں آرہی تھی چنانچہ میں صبح کی چہل قدمی کے لیے کچھ جلدی ہی نکل آیا۔''

''قبرستان میں چہل قدمی؟''

''وہ قریب ہی میرے دادا کی قبر ہے میں ان سے ملنے آگیا۔'' اس نے ایک سمت اشارہ کیا۔

''اوہ......''

''کیا میں تمہارے والدین کی قبر پر بھی دعا پڑھ سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں......ضرور۔'' بربجیت نے کہا تو وہ اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔

''ان کی موت کے بعد شاید تم پہلی بار یہاں آئی ہو؟''

''ہاں۔'' بربجیت نے کہا اسے وہ دن یاد آگیا جب اپنی آنٹی کے ساتھ یہاں اپنے والدین کی آخری رسومات ادا کرنے یہاں آئی تھی تب بھی ایمیٹ اس کے ساتھ اسی طرح کھڑا ہوا تھا' پھر اس کے والدین کو قبر میں اتارنے کے بعد کہا گیا تھا کہ وہاں موجود لوگ قبر میں تھوڑی تھوڑی مٹی ڈالیں لیکن بربجیت ایسا نہیں کرسکی تھی اس کی آنٹی اپنی نے اسے کہا بھی تھا کہ وہ بھی مٹی ڈالے لیکن وہ بھاگتی ہوئی وہاں سے دور چلی گئی تھی ہر کوئی اسے بلا رہا تھا لیکن وہ واپس نہیں گئی تھی۔

''ہاں' میں پہلی بار آئی ہوں۔'' بربجیت نے خیالات سے چونکتے ہوئے جواب دیا۔

''میں بھی ہولی سے یہاں ملتا تھا۔''

''میں قبرستان میں ہولی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی ایمیٹ' خاص طور سے اس وقت۔''

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' ایمیٹ نے اداسی سے کہا اور بربجیت نے اپنا سر اس کے کاندھے پر رکھ دیا' ایمیٹ اپنے ہاتھ اپنی پشت پر باندھے کھڑا رہا تھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ تم میرا دفاع کرو۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے میں اپنی وجہ سے تمہیں کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی مجھے نہیں معلوم کہ ہولی کے سلسلے میں معلومات کرتے اور اسے ڈھونڈتے ہوئے میں کن خطروں اور مشکلات سے گزروں گی میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تمہیں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔''

''ان باتوں کو چھوڑو تمہیں پتہ ہے خاص دن آرہا ہے۔'' ایمیٹ نے موضوع بدلا۔

''خاص دن؟ کیا مطلب؟''

''تمہاری سالگرہ کا دن...... جمعہ کو تمہاری سالگرہ ہے نا؟''

''اوہ......ہاں شاید۔''

''کیا تم سالگرہ مناؤ گی؟'' ایمیٹ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' بربجیت نے اداسی سے کہا اور اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے سے اس کے بالوں کی کچھ لٹیں اس کے چہرے پر آگئی تھیں جنہیں ایمیٹ نے بڑے پیار سے سنوار دیا۔

''میں جانتا ہوں یہ تمہارے لیے کتنا مشکل ہے' تمہاری سالگرہ اور تمہارے والدین کی برسی کا دن ایک ہی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارے والدین ایسا نہیں چاہتے ہوں گے کہ تم اپنی سالگرہ نہ مناؤ۔''

''کیا تم گیم میں جارہی ہو؟'' کچھ دیر بعد ایمیٹ نے اس سے پوچھا۔

''کیسا گیم؟''

''بیلی ڈیم بہ مقابلہ الیٹ ہائی' اس میں ہولی کی ٹیم کھیل رہی ہے۔'' ایمیٹ نے بتایا۔

''میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس میں ہولی نہیں کھیل رہی ہے۔''

''میں اس کے بارے میں نہیں جانتا...... یہ بڑا میچ ہے سارا شہر جارہا ہے وہاں تم ہولی کے دوستوں سے مل سکوگی اور اس کے کوچز سے بھی' کیا خبر ان کے پاس کوئی انفارمیشن ہو جو ہولی کو ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کرسکے۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے۔'' بربجیت نے کہا۔

''میرا خیال ہے بل اور ایملی بھی جائیں گے' تمہیں

بھی جانا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے میرے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"تو پھر تم جاؤ گی؟"

"ہاں...... یقیناً...... میں جاؤں گی۔"

"گڈ، تمہیں یقیناً مایوسی نہیں ہوگی...... کیا میں تمہیں واپس ہوٹل تک چھوڑ دوں؟"

"ٹھیک ہے۔" بربجیٹ نے کہا اور ایمیٹ اسے راستہ دکھانے کے لیے اس سے آگے چلنے لگا اچانک بربجیٹ کی نظر اپنے والدین کی قبروں کے پاس پڑے ہرے کاغذ پر پڑی اور اس نے جھک کر وہ اٹھا لیا اور بے مقصد اس کی تہیں کھولتی بند کرتی رہی تھی اسے ہولی یاد آ رہی تھی جو اکثر اوریگامی کے ذریعے چیزیں بناتی تھی اور اسے بھی بنانا سکھائی تھی اسے پورا یقین تھا کہ وہ سارس ہولی ہی کا تھا اور وہ اسے اپنے والدین کی قبروں کے پاس چھوڑ گئی تھی ممکن ہے ایسا اس نے غائب ہونے سے کچھ دن پہلے ہی کیا ہو کیونکہ سارس دیکھنے میں پرانا نہیں لگ رہا تھا پھر اچانک فون کی گھنٹی بجی تھی اور اس نے ہوٹل کا لینڈ لائن نمبر والا فون اٹھایا تھا۔

"ہیلو!"

"اوہ شکر ہے تم اٹھ گئی ہو میں صبح سے کئی بار فون کر چکی ہوں۔" دوسری طرف سے آٹوم بول رہی تھی۔ "آج دوپہر کا کھانا میرے اور کرسٹن کے ساتھ کھانا۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن میں کچھ لیٹ ہو جاؤں گی پہلے میں سیل فون خریدوں گی پھر آؤں گی۔" بربجیٹ نے کہا۔

"اوکے میں تمہارا انتظار کروں گی۔ ویسے آج فٹ بال میچ ہے وہاں بھی چلیں گے۔"

"دیکھوں گی اگر موڈ ہوا تو۔"

"ارے وہ ہولی کی ٹیم کا میچ ہے تم دیکھنا نہیں چاہو گی؟"

"ٹھیک ہے...... میں آ کر بات کرتی ہوں۔" بربجیٹ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد تیار ہو کر وہ ہوٹل سے نکل گئی تھی راستے سے اس نے ایک شاپ سے موبائل خریدا اور آٹوم سے ملنے اس کے بوتیک پہنچ گئی جہاں آٹوم نے اسے اپنے شوہر کرسٹن سے ملوایا وہ کافی دیر بربجیٹ سے باتیں کرتے رہے پھر لنچ سے فارغ ہو کر بربجیٹ اسٹیڈیم کی طرف روانہ ہوگئی جہاں وہ ہولی کی کوچ سے ملی اور اس کی ٹیم سے بھی باتیں کیں، کوچ نے اسے بتایا کہ پچھلی جمعرات کو ہولی پریکٹس کے لیے آئی تھی اور آخری بار اس نے ہولی کو پریکٹس کے میدان میں دیکھا تھا جو اسکول کے ساتھ واقع ہے پھر ہولی اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئی تھی اسٹیڈیم میں اس کی ملاقات بل اور ایملی سے بھی ہوئی تھی جنہوں نے اس سے ہاں بھی کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا۔

اسکول کے پلے گراؤنڈ میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا شام آہستہ آہستہ اپنے پر پھیلا رہی تھی گراؤنڈ کے احاطے میں لگے بڑے بڑے درختوں کے پتے تیز ہواؤں سے عجیب سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے جو بڑی پراسرار لگ رہی تھی بربجیٹ ایک ایک چپہ کا جائزہ لیتی آگے بڑھ رہی تھی جب وہ ریلنگ کے قریب پہنچی تو اس نے لوہے کی گرل کو پکڑ لیا اسے بہت زور سے چکر آیا تھا وہ لڑکھڑا کر رہ گئی تھی پھر اچانک اسے سرگوشی سنائی دی جسے وہ سمجھ نہ سکی اس نے سوچا کہ یہ تیز ہوا کے شور میں پتوں کی سرسراہٹ کی آواز ہوگی لیکن چند لمحے بعد ہی اسے پھر وہی آواز سنائی دی۔

"بب...... بی......" بربجیٹ نے چاروں طرف غور سے دیکھا، آس پاس کوئی نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ ہولی کی سرگوشی کی آواز تھی۔

"بی...... بی......" اسے پھر آواز سنائی دی۔

"ہولی...... تم کہاں ہو؟" اس نے باآواز بلند کہا۔

"بی...... میری مدد کرو......" اسے پورا جملہ سنائی دیا۔

"ہولی...... تم کہاں ہو؟" وہ تیزی سے مڑی لیکن دور دور کوئی نہیں تھا۔

"پلیز...... مدد...... مدد......" آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی چلی گئی۔

کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد وہ واپسی کے لیے مڑی تو اس کی نظر اس ریلنگ پر پڑی جسے اس نے سہارا لینے کے لیے پکڑا ہوا تھا وہاں تازہ خون لگا تھا بربجیٹ نے اپنا ہاتھ چیک کیا خون اس کی ہتھیلی سے نکل رہا تھا شاید گرل کا سہارا لیتے ہوئے گرل کی نوک اس کی ہتھیلی میں چبھ گئی تھی اسی وقت اس کی نظریں نیچے زمین پر پڑیں جہاں اس کی ہتھیلی سے نکلنے والے خون کے تازہ قطروں کے ساتھ ساتھ چند سوکھے اور سیاہی مائل خون کے قطرے بھی پڑے تھے اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں وہ ہولی کے تو نہیں تھے وہیں اس کو ہولی کی مدد کے لیے پکار بھی سنائی دی تھی لیکن یہ محض اس کا خیال تھا اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا وہ واپس پھر اسٹیڈیم گئی تھی جہاں اسے انسپکٹر ہرٹ ملی تھی اور اس نے ہرٹ سے اس بات کا ذکر کیا تھا۔

"تم یقیناً کہو گی کہ یہ میرا شک ہے......" بربجیٹ نے مایوسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں' ہم شک پر ہی کام کرتے ہیں اور ثبوت ڈھونڈتے ہیں میں کوشش کروں گی اگر تحقیقات ایک بار رک گئی ہیں تو دوبارہ بھی شروع ہوسکتی ہیں۔'' ہرٹ نے کہا اور اس کی بات پر بربجیٹ کے دل میں امید کی کرن چمکی۔

''میک' تم میرا ساتھ کیوں دے رہی ہو؟ بھلا تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''میں صرف یہ جانتی ہوں کہ کچھ عرصہ پہلے ایسا ہی ایک کیس میرے زیر تفتیش تھا۔''

''ہاں اور اس کا انجام اچھا نہیں ہوا ہوگا۔'' بربجیٹ نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

''کیا تم سننا نہیں چاہو گی کہ کیا ہوا تھا؟'' ہرٹ نے کہا۔

''نہیں...... میں واپس جانا چاہتی ہوں۔'' بربجیٹ نے کہا۔

''چلو میں تمہیں تمہارے ہوٹل چھوڑ دوں۔'' ہرٹ نے پیش کش کی۔

''نہیں' میں ہوٹل نہیں' ایمی کے گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''لیکن کیوں؟''

''مجھے ان سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''اس وقت؟ رات کافی ہو گئی ہے شاید انہیں اعتراض ہو۔'' ہرٹ نے کہا۔

''ہم بھی اچھے دوست رہے ہیں میرا خیال ہے وہ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔'' بربجیٹ نے کہا اور ہرٹ اسے ایملی کے گھر لے جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

ایملی کے گھر پہنچ کر انہیں پھر ناگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا بل اس وقت بربجیٹ کو وہاں ایک پولیس آفیسر کے ساتھ دیکھ کر بہت برہم ہوا تھا۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟ اب یہاں کیوں آئی ہو اور اسے اپنے ساتھ کیوں لائی ہو؟'' بل نے ہرٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میری دوست ہے۔''

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' ایملی نے پوچھا۔

''بتاؤ میری بہن کہاں ہے......؟ اس کی نگہداشت تمہاری قانونی ذمہ داری ہے وہ کہاں غائب ہوگئی یا تم نے اسے غائب کروادیا...... اس کا جواب تمہیں دینا ہوگا۔'' بربجیٹ نے غصے سے کہا۔

''میں کسی کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں تم یہاں سے جاسکتی ہو۔'' بل نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''بل تم ایسا نہیں کرسکتے...... اگر یہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے تو آرام سے اس کے سوالوں کے جواب دے دو یوں دھکے تو مت دو۔'' میک نے کہا۔

''تم بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی ہو...... میں تمہاری شکایت تمہارے چیف سے کروں گا۔'' بل نے اسے دھمکی دی۔

''بل تمہارا اور میرا مسئلہ ایک ہی ہے تم ہولی کے نگران تھے وہ تمہارے گھر سے غائب ہوئی ہے چنانچہ تمہیں اس کو ڈھونڈنے کی فکر ہونا چاہیے' اسی طرح جس طرح وہ میری بہن تھی اور میں اسے ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔ پھر تم مجھ سے تعاون کیوں نہیں کررہے ہو؟'' بربجیٹ نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ سمجھ لو کہ وہ میرے گھر سے غائب نہیں ہوئی ہے بلکہ اسکول کے کھیل کے گراؤنڈ سے غائب ہوئی ہے جب وہ غائب ہوئی تو وہ گھر پر نہیں تھی......'' بل نے کہا اور بربجیٹ اسے حیرت سے دیکھنے لگی کیونکہ یہ بات تو صرف بربجیٹ کو پتا تھی اور یہ کچھ ہی دیر پہلے ہولی کی فٹ بال ٹیم کی کوچ نے اسے بتائی تھی پھر بل کو کیسے پتا تھی بربجیٹ نے اس کے جواب میں بل سے کچھ نہیں کہا اور میک کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر اس نے میک کو واپس چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

''ٹھیک ہے بل یہ بات تم مجھے پہلے ہی بتادیتے تو میں تمہیں تنگ نہ کرتی۔'' بربجیٹ نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئی' انسپکٹر ہرٹ بھی اس کے ساتھ باہر آگئی تھی۔

''تم نے دیکھا...... مجھے پہلے ہی شک تھا اس میں ضرور بل کا ہاتھ ہے کسی کو یہ بات نہیں پتہ کہ ہولی آخری بار کہاں دیکھی گئی لیکن یہ جانتا ہے۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تفتیش کے دوران ہم لوگ بل کو ہی تمام معلومات دیا کرتے تھے ہوسکتا ہے کسی نے اسے بتایا ہو۔'' انسپکٹر ہرٹ نے کہا۔

''لیکن میک' ہولی کو ڈھونڈنے کے بارے میں اس کا رویہ دوستانہ نہیں یہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ میری بہن فٹ بال کی بہترین کھلاڑی تھی آج اس کی ٹیم کا سیمی فائنل ہوا ہے' چند روز میں فائنل میچ ہونے والا ہے اس کی ٹیم کی ہار جیت کا انحصار اس پر ہی تھا مجھے تو اس کی گمشدگی میں کسی سازش کی بو آرہی ہے۔'' بربجیٹ نے کہا۔

''تم فکر نہ کرو...... میں تفتیش دوبارہ شروع کروں گی اگر مجھے کوئی سراغ ملا تو اس دائرے کو بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔'' ہرٹ نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

بربجیٹ کو ہوٹل چھوڑنے کے بعد ہرٹ چلی گئی تھی اور بربجیٹ کافی دیر تک لیٹی ہولی کے بارے میں سوچتی رہی تھی پھر اچانک اسے اس کتاب کا خیال آیا تھا جو ہولی کی تھی اور اسے بل کے گھر سے ملی تھی جس پر کئی جگہ ہولی نے پین

سے نشان لگائے ہوئے تھے جن کا مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس نے کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی کتاب کے ٹائٹل ہی میں تین لفظوں کو سرخ پین سے ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔

The cirt with the Dragon Tattoo برہجیت نے اپنا پین اور ڈائری اٹھالی اور کتاب میں جن لفظوں پر نشان تھے انہیں اپنی ڈائری میں لکھنا شروع کر دیا جب وہ تمام لفظ لکھ چکی تو اس نے انہیں پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تو اس نے کتاب فرش پر پھینک دی وہ کتاب اس کے سامنے الٹی گری تھی اور ٹائٹل کے نشان زدہ الفاظ صاف نظر آ رہے تھے اب وہ انہیں الٹا پڑھ رہی تھی۔ ''Ani''

''اوہ آنٹی انی؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اس نے بے ساختہ کتاب کو دوبارہ اٹھالیا اور اسے پیچھے سے نشان زدہ الفاظ ملا کر پڑھنا شروع کیا اب بات کچھ بن رہی تھی لیکن ساری کتاب پڑھنے کے بعد بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی لیکن ان الفاظ میں جو پیغام بھی دینے کی کوشش کی گئی تھی وہ ادھورا تھا' اسی وقت اس کے ذہن میں خیال آیا' کہ اس کی آنٹی انی اس بارے میں ضرور کچھ جانتی ہوں گی چنانچہ اس نے ان سے ملنے کا ارادہ کیا اور کپڑے تبدیل کرکے ہولی کی بک اور اپنی نوٹ بک لے کر کمرے سے نکل گئی۔

اسپتال میں استقبالیہ پر اسے جینٹ نہیں ملی تھی اور وہ خود ہی آنٹی انی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں میسی بھی موجود تھی۔

''تم میرے پوتے سے ملیں؟ تم نے اسے میرا پیغام دیا؟'' میسی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''نہیں' اتفاق سے میں وہ پیغام نہیں دے سکی جب اس سے ملوں گی تو پیغام دے دوں گی میں انی آنٹی سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں کیا آپ کچھ دیر کے لیے لان میں چلی جائیں گی؟'' برہجیت نے پوچھا تو میسی خوش ہوگئی۔

''ہاں' ہاں کیوں نہیں میں خود بھی ذرا کھلی ہوا میں جانا چاہتی ہوں۔'' میسی نے جواب دیا اور برہجیت نے اس کی وہیل چیئر کمرے سے باہر نکال کر کاریڈور میں کھڑی نرس کو تھمادی۔

''کیا تم ذرا انہیں لان تک لے جاؤ گی؟'' اس نے نرس سے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' نرس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور میسی کی وہیل چیئر لے کر لان کی طرف چلی گئی۔ برہجیت نے کمرے میں واپس آ کر دروازہ بند کرلیا تھا اور انی کے سامنے آ بیٹھی تھی اور ہولی کی کتاب ان کے سامنے رکھ دی۔

''انی آنٹی! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا' اس کی آنٹی خالی خالی نظروں سے لان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''پلیز...... یہ آپ کی ہے' ہے نا؟'' اس نے آنٹی کا ہاتھ اس کتاب پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں میرے اور آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے کیا' آپ مجھے اس کتاب کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں؟'' برہجیت نے کہا اور انی آنٹی نے کمرے میں رکھی میز کی دراز کی طرف اشارہ کیا اس نے اٹھ کر دراز کھولی تو وہاں بھی اس کتاب کی ایک کاپی اور دو لال پین موجود تھے اس نے وہ چیزیں وہاں سے نکال لیں اور پھر آنٹی کے سامنے آ بیٹھی پھر اس نے دونوں کتابوں کے ایک جیسے صفحے کھولے تھے۔ آنٹی کی کتاب میں بھی الفاظ کو نشان زدہ کیا گیا تھا لیکن ان کے الفاظ مختلف تھے آنٹی انی نے اپنی انگلی سے اپنی کتاب کی طرف اشارہ کیا پھر ہولی کی کتاب کی طرف اور پھر اپنی کتاب کی طرف......

''آپ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح بات کرتی تھیں؟'' برہجیت نے پوچھا تو آنٹی نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی...... میں وعدہ کرتی ہوں...... میں بس ہولی کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔''

برہجیت کی اس بات پر آنٹی نے ایک لال پین خود اٹھالیا اور ایک اس کی طرف بڑھا دیا پھر انہوں نے دونوں کتابیں اپنے قریب کرلیں اور باری باری دونوں کتابوں کے الفاظ کے گرد دائرے بنانے لگیں جب وہ اس سے فارغ ہوگئیں تو کتابیں اس کی طرف کھسکا دیں اور برہجیت ان نشانوں کا جائزہ لینے لگی۔

''اچھا اسی لیے ہولی کی کتاب کے الفاظ مجھے سمجھ نہیں آ رہے تھے کیونکہ اس کا آدھا پیغام تو آپ کے پاس محفوظ تھا۔'' برہجیت نے کہا اور انی آنٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن اس رازداری کی کیا ضرورت تھی آپ ہولی سے با آواز بلند بات نہیں کر سکتی تھیں؟'' اس نے پوچھا تو آنٹی نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا ٹھیک ہے میں سمجھ گئی لیکن میں انہیں بغور پڑھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا اور آنٹی نے پھر اثبات میں سر ہلایا' اس کے بعد اس نے اپنی جیب سے وہ کاغذ کا سارس نکالا اور اسے کھول کر دونوں کتابوں کے درمیان رکھا اس کاغذ پر کچھ صفحات کے نمبر لکھے ہوئے تھے اور جس ترتیب سے لکھے تھے اسی ترتیب سے پیغام پڑھنا تھا وہ

بڑھتی گئی اس کے کان دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے کہ آنے والوں کی آہٹ سن کر ہوشیار ہو جائے پھر اس نے ایک کاغذ پر لکھا۔
"میرا خیال ہے میں آوازیں سنتی ہوں' کیا تم بھی میرے والدین کی موت کے بعد ایسی آوازیں سنتی تھیں؟"
اس نے کاغذ ایبی کی طرف بڑھایا اور اس نے جواب میں لکھا۔
"کیسی آوازیں؟"
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے بیان کروں؟ ایسا لگتا ہے کہ میرے اور ہولی کے درمیان کوئی رابطہ ہوتا ہے وہ جو کچھ کرتی ہے بولتی ہے وہ میں جان سکتی ہوں وہ جو محسوس کر سکتی ہے مجھے بھی محسوس ہوتا ہے۔"
"تمہیں کیسے پتہ کہ یہ سب سچ ہے'؟" ایبی نے لکھ کر پوچھا۔
"میں نہیں جانتی......ایسا خود بخود ہوتا ہے۔"
"یہ کب سے شروع ہوا؟"
"کچھ عرصہ پہلے ہی۔"
"ہولی کے نشان زدہ الفاظ پڑھو۔" ایبی نے ہولی کی کتاب کا ایک صفحہ کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔
"مجھے لگتا ہے کچھ برا ہونے والا ہے کچھ لوگ میرے تعاقب میں ہیں وہ شاید مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔"
بربجیٹ نے حیرت سے ایبی کی طرف دیکھا پھر ایبی کی بک دیکھی۔
"وہ کون ہیں؟"
"ان میں سے ایک بل ہے۔" ہولی کی بک میں پیغام تھا۔
"اور دوسرا؟"
"اس کا نام فوکس ہے' وہ خراب آدمی ہے۔" بربجیٹ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اسی وقت دروازے کے باہر آہٹ سنائی دی اور بربجیٹ نے جلدی سے دونوں لال پین واپس دراز میں رکھ دیئے اور کتابیں اپنے بیگ میں چھپالیں۔
"میں پھر آؤں گی...... فی الحال کتابوں کی مجھے ضرورت ہے میں اچھی طرح انہیں دیکھوں گی اور میرا وعدہ ہے کہ میں ہولی کو ڈھونڈ نکالوں گی۔" اس نے کہا اور کمرے سے نکل گئی واپسی پر وہ لفٹ میں تھی کہ اس کے سیل فون کی بیل بجی دوسری طرف سے آٹوم بول رہی تھی۔
"تم کہاں ہو؟"
"میں ایبی آنٹی سے ملنے آئی تھی واپسی جا رہی ہوں۔" بربجیٹ نے کہا۔
"فوراً میرے پاس آجاؤ۔"
"خیریت؟"
"ہاں خیریت ہی ہے...... میرے پاس ایک فون آیا تھا جو تمہیں بتانا ضروری ہے وہ تمہارے متعلق ہی تھا۔" آٹوم نے کہا۔
"کیسا فون......؟ کیا بات ہے؟"
"تم آجاؤ تو تفصیل سے بتاؤں گی۔" آٹوم نے کہا۔
"اچھا میں ابھی آ رہی ہوں۔"
بربجیٹ جب آٹوم کے پاس پہنچی تو وہ اس کی ہی منتظر تھی۔
"کیسا فون آیا تھا؟ کون تھا؟ مجھے بتاؤ۔" بربجیٹ نے بے چینی سے پوچھا۔
"وہ کوئی لڑکی تھی اور اس کی آواز مشکل سے سمجھ آ رہی تھی میرا خیال ہے اس نے اپنا نام "نومی" بتایا تھا۔"
"نومی......نومی نورمنٹ؟" بربجیٹ نے پوچھا۔
"شاید۔"
"اوہ آٹوم یہ بہت ضروری ہے مجھے یاد کر کے بتاؤ اس نے کیا کہا تھا۔"
"میں نے بتایا نا اس کے الفاظ ٹھیک سمجھ نہیں آ رہے تھے اس نے کہا تھا کہ اس کے پاس تمہارے لیے کوئی پیغام ہے اس نے بس اپنا نام بتایا تھا اور ایک بچوں کی نظم پڑھی تھی۔"
"کون سی نظم......؟" بربجیٹ نے پوچھا اسے اپنے اندر خوف کی لہر محسوس ہوئی تھی۔
"مجھے یاد نہیں ہے۔"
"آٹوم!" اس نے تنبیہی انداز میں کہا۔
"میں نے اسے Save کر لیا ہے تم خود پڑھ لو۔"
آٹوم نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور بربجیٹ نے موبائل لے کر اس میں پیغام کھولا جو آڈیو میں تھا۔
"بربجیٹ' میں نومی ہوں......نومی نورمنٹ میرے پاس تمہارے لیے ایک پیغام ہے یہ سنو۔" اور پھر اس نے نظم پڑھنا شروع کر دی تھی۔

"I am abum ble bee
I like to dance and fly .
but if I were to sting someone'
Iwould not be alive

پیغام ختم ہوتے ہی بربجیٹ کرسی کا سہارا لیتی ہوئی بیٹھ گئی اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے اور رنگ سفید پڑ گیا تھا۔
"خدایا......کیا بات ہے' تمہیں کیا ہو رہا ہے؟" آٹوم

نے گھبرا کر پوچھا۔
"کچھ نہیں۔"
"اب مجھے بھی فکر ہو رہی ہے بی...... بتاؤ وہ کس لڑکی کی آواز ہے اور اس نظم کا کیا مطلب ہے؟" آٹوم نے کہا اور فرج سے پانی نکال کر برجیت کو پلایا۔
"میں نومی کو جانتی ہوں...... کئی سال پہلے اس کے ساتھ سفر کر چکی ہوں تب میں فرانس میں تھی۔" برجیت نے بتایا۔
"بی کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ۔"
"کچھ نہیں......"
"میں تمہاری دوست ہوں بی...... اور ہولی کے سلسلے میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"
"یہ جو نظم ہے یہ میں نے ہی بنائی تھی ہولی شہد کی مکھیوں سے ڈرتی تھی جب وہ چھوٹی تھی تو اسے ڈر سے آزاد کرنے کے لیے میں یہ سنایا کرتی تھی اور ہولی نے میرا نام Bumble bee رکھ دیا تھا اور وہ جب بھی خوفزدہ ہوتی تھی تو یہ نظم پڑھتی تھی۔" برجیت نے کہا اور آٹوم نے تسلی دینے والے انداز میں اس کے کاندھے تھپتھپائے۔
"ممی ڈیڈی کے انتقال کے بعد وہ اکثر یہ نظم گنگناتی تھی میں بیماری ساری رات اس کی آواز سنتی رہتی تھی میں سو نہیں سکتی تھی میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔"
"اچھا تو...... نومی نے اس لیے یہ نظم دہرائی ہے۔" آٹوم نے کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"
"مجھے یہی تو حیرت ہے نومی کبھی بھی ہولی سے نہیں ملی ہے اور یہ نظم صرف میرے اور ہولی کے درمیان جانی پہچانی ہے کسی نے اسے نہیں سنا۔"
"تم سمجھتی ہو کہ نومی کو پتہ ہے کہ ہولی کہاں ہے؟" آٹوم نے پوچھا۔
"میں کچھ نہیں کہہ سکتی...... تم اپنا فون مجھے دو میں نمبر ٹریس کروں گی جس سے کال آئی تھی۔"
"نہیں جب تک مجھے تم یہ نہیں بتاؤ گی کہ معاملہ کیا ہے؟"
"آٹوم یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔"
"بی...... تم سمجھتی ہو کہ مجھے معاملے کی سنجیدگی کا احساس نہیں ہے؟ میں سنجیدہ ہوں مجھے بتاؤ معاملہ کیا ہے؟" آٹوم نے کہا اور فون اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔
"میری بات سنو میں ابھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی یوں سمجھ لو کہ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے...... وہ لوگ......" برجیت کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
"کون...... کون لوگ......؟ کیا تم انہیں جانتی ہو؟" آٹوم نے پوچھا۔
"ابھی مجھے یقین نہیں ہے پلیز تم اس معاملے سے الگ رہو۔" برجیت نے کہا اور اس کی شاپ سے نکل گئی وہاں سے وہ سیدھی پولیس اسٹیشن گئی تھی اسکاٹ آفس میں موجود نہیں تھا اور میک اپنی میز پر موجود تھی برجیت ایک کرسی لے کر اس کے پاس بیٹھ گئی میک نے اپنا کمپیوٹر بند کر دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔
"میں چاہتی ہوں کہ تم میرے لیے ایک نمبر ٹریس کرو پلیز۔" برجیت نے کہا۔
"کیا اس کا تعلق ہولی سے ہے؟" میک نے پوچھا۔
"ہاں۔"
"کیا میں یہ بات آفیسر اسکاٹ کو بتاؤں؟"
"نہیں ابھی نہیں ابھی تم اپنے تک ہی رکھو میں جو سمجھ رہی ہوں اگر بات وہی ہے تو میں پولیس کو شامل نہیں کرنا چاہتی اس سے معاملات خراب ہو سکتے ہیں مناسب وقت آنے پر ہم انہیں بتا دیں گے۔"
"تو کیا تم کچھ جانتی ہو؟" میک نے پوچھا۔
"ہاں لیکن ابھی صرف شک ہے۔"
"لیکن شک اہم بھی ہو سکتا ہے۔"
"پلیز تم یہ نمبر ٹریس کرو۔" برجیت نے اسے آٹوم کا سیل فون دیتے ہوئے کہا اور اس نے پاس ورڈ میک کو دے دیا جو آٹوم نے اسے بتایا تھا۔
"یہ کام کتنی دیر میں ہو جائے گا؟"
"تقریباً دو گھنٹے میں تم ہوٹل جاؤ میں وہیں تم سے رابطہ کروں گی۔" میک نے کہا اور برجیت اس کا شکریہ ادا کر کے پولیس اسٹیشن سے نکل گئی۔
ٹھیک دو گھنٹے بعد انسپکٹر ہرٹ برجیت سے ملنے اس کے ہوٹل پہنچ گئی تھی جہاں برجیت نے اسے ہولی کے سلسلے میں ملنے والی تمام معلومات سے آگاہ کیا تھا اور انسپکٹر ہرٹ نے اس بتایا تھا کہ جو فون نمبر اس نے دیا تھا وہ نمبر کافی عرصے سے بند ہے۔"
"کیا نمبر بند ہے؟ لیکن مجھے تو کال اسی نمبر سے آئی تھی۔" برجیت نے کہا۔ "ویسے یہ کس شہر کا نمبر ہے؟"
"یہ نمبر بیلی ڈیم ہی کا ہے یہ ایک موبائل سیل نمبر ہے لیکن کافی عرصے سے استعمال نہیں ہو رہا تھا۔" ہرٹ نے کہا اور برجیت کو لگا جیسے اس کی رگوں میں خون جم گیا ہو۔
"میک......"
"ہاں......"
"مجھے لگتا ہے جس کسی نے بھی ہولی کو اغوا کیا ہے وہ بیلی ڈیم ہی میں ہے۔" برجیت نے کہا۔
"ممکن ہے میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں جو

تحقیق کے دوران میرے علم میں آئی تھی اسے سن کر تمہیں حیرت ہوگی۔" میک نے کہا۔

"ایسی کون سی بات ہے؟"

"جب ہم اس کیس کی تحقیقات کررہے تھے تو میرے علم میں تفتیش کے دوران یہ آیا کہ ہولی کی کار کے ٹائروں کے نشان ہمیں اس عقبی جنگل میں ملے جو ہولی کے اسکول اسٹیڈیم اور بل کے گھر کے درمیان واقع ہے' جنگل کے بیچ میں وہ نشانات غائب ہوگئے تھے اور وہاں سے کافی فاصلے پر ہمیں ہولی کی کار بھی ملی تھی' جس کے دروازے لاک تھے اس کار کے قریب سے انسانی قدموں کے نشانات مغرب کی جانب چلے گئے تھے یعنی بل کے گھر سے مخالف سمت لیکن کچھ دور جا کر وہ بھی غائب ہوگئے تھے۔ میں اپنے جاسوس کتے کے ساتھ اس علاقے میں تفتیش کررہی تھی اور وہ ہولی کے کپڑوں کی بوسونگھ کر ہماری رہنمائی کررہا تھا میں نے اپنی رپورٹ میں یہ بات لکھی تھی اور رپورٹ بل کو دے دی تھی کیونکہ ہمیں یہی ہدایت تھی۔"

"مجھے بھی بل پر شک ہے لیکن میرے پاس کوئی ثبوت نہیں وہی ہولی کے مجرموں کی نشاندہی کے لیے کی جانے والی تحقیقات میں تعاون نہیں کررہا ہے۔" برجیٹ نے کہا۔

"اب ایک بات اور میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔" برجیٹ نے میک سے کہا اور پھر وہ ہولی اور آئی کی کتابیں اٹھالائی اور ان میں نشان زدہ گفتگو اسے دکھائی جو ائی اور ہولی کے درمیان ہوئی تھی اس چیز نے میک کو بہت حیران کیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے ہولی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے پہلے سے اس خطرے کا اندازہ تھا اور وہ اپنی آنٹی سے اس پر بات بھی کرتی تھی۔" میک نے کہا۔

"ہاں...... میک میں چاہتی ہوں' یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان رہے کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دونوں جنگل کے اس حصے میں ایک بار پھر جائیں اور وہاں کا اچھی طرح جائزہ لیں ممکن ہے کوئی خاص نشانی ہمارے ہاتھ لگ جائے اور ہم ہولی تک پہنچ سکیں؟" برجیٹ نے کہا۔

"ٹھیک ہے' آج رات تم تیار رہنا میں بارہ بجے کے بعد آؤں گی مجھے اس جگہ کا علم ہے جہاں ہمیں ہولی کی کار ملی تھی جسے بعد میں پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہارا انتظار کروں گی۔" برجیٹ نے کہا۔

پھر رات ساڑھے گیارہ بجے برجیٹ تیار ہوکر میک کا انتظار کرنے لگی وہ بہت بے چین تھی جو لمحہ گزر رہا تھا اس کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا اچانک اس کے سیل فون کی بیل بجی اس نے فون نکال کر نمبر چیک کیا' یہ کوئی نیا نمبر تھا۔

"ہیلو......" اسے نومی کی آواز سنائی دی۔

"ہاں......نومی بولو......تم کہاں سے بول رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے پاس وقت کم ہے...... میں زیادہ بات نہیں کرسکتی اگر انہیں علم ہوگیا تو وہ مجھے ماردیں گے......"

"تم بولو......جلدی کیا بات ہے؟"

"شاید وہ تم سے کوئی رابطہ کریں......وہ تم سے سودے بازی کرنا چاہتے ہیں...... اگر تم چاہتی ہو کہ ہولی تمہیں زندہ مل جائے تو ان کی بات مان لینا۔"

"نومی تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟" برجیٹ نے پوچھا لیکن کال کٹ گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میک آگئی تھی اور برجیٹ نے اسے آنے والی کال کے بارے میں بتایا تھا۔

"برجیٹ......کوئی ہے جسے ہماری پل پل کی خبر ہے اور وہ یہ معلومات ہولی کے اغوا کرنے والوں کو بتارہا ہے۔ تم نے اپنا نمبر کس کس کو دیا ہے یہ تو نیا نمبر ہے ابھی زیادہ لوگوں کو نہیں دیا ہوگا؟"

"میں نے اپنا نمبر تمہیں' آٹوم کو' لیمیٹ' اور بل کو دیا ہے۔" برجیٹ نے کہا اور بل کے نام پر میک نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"چلو جلدی چلو...... ویسے میں اپنی ایمرجنسی ٹیم کو تیار رہنے کی ہدایات دے کر آئی ہوں میں انہیں کسی وقت بھی کال کرسکتی ہوں ایسی صورت میں وہ موقع پر پہنچ جائیں گے دعا کرو ہمیں ہمارے مقصد میں کامیابی ملے' اگر ہم کامیاب ہوگئے تو شاید کسی بڑی مصیبت سے بچ جائیں اور اگر کامیاب نہیں ہوئے تو ہم ایسی دلدل میں پھنس جائیں گے کہ اس سے نکلنا شاید ہمارے بس میں نہ ہو کیونکہ میں جس خطرے کی بوسونگھ رہی ہوں اس میں بڑے بڑے نام آئیں گے اور ہماری ناکامی کی صورت میں میری ملازمت کے جانے کے ساتھ ساتھ شاید زندگی بھر کا پچھتاوا ملے۔" میک نے کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا...... مجھے امید ہے چلو جلدی چلو۔" برجیٹ نے کہا اور دونوں بڑی عجلت میں ہوٹل سے نکل گئیں۔

جنگل میں پہنچ کر میک نے کار جس جگہ کھڑی کی تھی وہ جگہ چاروں اطراف سے گھنے درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی کار کا انجن بند کرکے میک نیچے اتر گئی برجیٹ نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

"میں اندازے سے اس سمت بڑھوں گی جس سمت

قدموں کے نشان ہمیں لے گئے تھے تم میرے پیچھے آؤ۔'' میک نے سرگوشی میں بریجیٹ سے کہا اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ تقریباً آدھا میل تک آگے بڑھتی رہی تھیں آس پاس کوئی آواز نہیں تھی سوائے مینڈکوں اور جھینگروں کی آوازوں کے یا پھر ان کے قدموں کے نیچے کچلے جانے والے خشک پتوں کے چرمرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''یہاں آ کر وہ قدموں کے نشان غائب ہوگئے تھے۔'' میک نے ایک جگہ رک کر کہا وہ ایک بڑا سا درخت تھا جس کے نیچے کچھ بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے۔

''یہ میں نے تحقیق کے دوران کچھ دیر سستانے کے بہانے یہاں رکھے تھے تاکہ اگر پھر مجھے یہاں آنا پڑے تو میں اس مقام کو پہچان جاؤں۔'' میک نے سرگوشی کی۔

''لیکن اب ہم کدھر جائیں؟'' بریجیٹ نے پوچھا۔

''یہ راستہ میرا جانا پہچانا ہے میں جب بھی رات کو دیر سے آتی تھی تو اسی راستے پر چل کر اپنے گھر جاتی تھی تاکہ پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو جاؤں اور کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں کب آئی ہوں شاید ہولی بھی ایسا کرتی ہو اور ایسا کرتے ہوئے ہی اسے کسی نے اغوا کرلیا ہو؟'' بریجیٹ نے کہا اسی وقت انہیں کچھ فاصلے سے ایک مردانہ آواز سنائی دی یوں لگا جیسے کوئی کسی کو ہدایات دے رہا ہو۔ میک نے بریجیٹ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں احتیاط سے آواز والی سمت میں بڑھنے لگیں چند قدم آگے جانے کے بعد ان کے سامنے گھنی جھاڑیاں آ گئیں جن کے پیچھے کچھ فاصلے پر انہیں سلگتی ہوئی سگریٹ کا ننھا سا شعلہ نظر آیا اور میک نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بریجیٹ کو آگے بڑھنے سے روک دیا وہ دونوں خاموشی سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگیں۔

''وہ دو ہیں......'' میک نے سرگوشی کی۔

''ہاں' مجھے ان کے سائے نظر آ رہے ہیں وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھے ہیں۔'' بریجیٹ نے کہا۔

''باس نے منع کیا تھا کہ یہاں پہرے کے دوران محتاط رہنا اور سگریٹ مت جلانا۔'' ایک نے دوسرے سے کہا۔

''ارے یار' کچھ نہیں ہوتا...... بھلا اس جنگل میں کون آئے گا۔'' سگریٹ پینے والے نے کش لگاتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم جانو...... میں ذرا اس بل کی خبر لے کر آتا ہوں وہ لڑکی کو بہت تنگ کر رہا ہے۔'' پہلے والے نے کہا اور اٹھ کر چند قدم آگے جا کر جھاڑیوں میں غائب ہوگیا میک نے بریجیٹ کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا

تھا اور دبے قدموں سے ذرا سا راستہ بدل کر اس شخص کے پیچھے بڑھی تھی جو جھاڑیوں میں غائب ہوا تھا کچھ قدم آگے جانے کے بعد وہ بھی جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہوئی تھی بریجیٹ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی وہ تیزی سے پیچھے مڑی اور کسی نے اس کے منہ پر رومال رکھ دیا اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی کیونکہ کسی نے اسے جکڑ لیا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکی اور اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔

اس کی آنکھ ایک چھوٹے سے تہہ خانے میں کھلی تھی جس کی چھت تختوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور مٹی اور پتھروں کی ناہموار دیواریں تھیں جن میں جگہ جگہ سوراخ بھی بنے ہوئے تھے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تو اس کی نظر سامنے زنجیروں سے بندھی ہولی پر پڑی جو ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

''ہولی...... میری بہن...... تم...... تم یہاں؟'' بریجیٹ نے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟ ہم کہاں ہیں؟'' بریجیٹ نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم...... وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لائے تھے۔'' ہولی نے جواب دیا۔

''تم کب سے یہاں قید ہو؟''

''پچھلی جمعرات سے...... وہ کہتے ہیں مجھے اپنے اسکول کا فٹ بال میچ نہیں کھیلنے دیں گے کیونکہ وہ چاہتے ہیں یہ مقابلہ کوئی اور جیتے۔'' ہولی نے کہا۔

''اوہ...... مجھے یہی شک تھا...... وہ میرے ساتھ بھی یہی کرنا چاہتے تھے...... میں بھی اپنی ٹیم کی بہترین کھلاڑی تھی اور میری ٹیم کو ہرانے کے لیے مجھے مارنے کی کوشش کی گئی جس میں میں بچ گئی اور میرے والدین اس سازش کا شکار ہوگئے تم بھی زخمی ہوئی تھیں تمہیں یاد ہے نا ہولی؟ تم بہت چھوٹی تھیں' اس دن میری سالگرہ تھی ہم چرچ پر جا رہے تھے۔'' بریجیٹ نے کہا۔

''ہاں...... مجھے یاد ہے بھلا میں کیسے بھول سکتی ہوں اس حادثے میں ہمارے والدین فوت ہوئے' پھر ہماری آنٹی نفسیاتی مریض بن گئیں' ہمارا گھر ویران ہوگیا میں غیروں کی نگہداشت میں چلی گئی اور تم حالات سے تنگ آ کر ہمیں چھوڑ گئیں۔'' ہولی نے روتے ہوئے کہا۔

''اچھا' یہ بتاؤ...... یہ کون لوگ ہیں؟'' بریجیٹ نے پوچھا۔

''یہ جو بھی ہیں یہ تمہیں جانتے ہیں اکثر تمہارا نام لیتے ہیں۔''

''ان میں کوئی خاص شخص جسے تم جانتی ہو؟''

"بل...... میرا سرپرست جس کی ذمہ داری میں مجھے دیا گیا تھا وہ ان کے ساتھ شریک ہے۔" ہولی نے کہا۔
"میرے اغوا میں بھی اسی کا ہاتھ ہے اس نے ان لوگوں کا ساتھ دیا اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کیں۔"
"اوہ مجھے شک تھا...... وہ میرے ساتھ بالکل تعاون نہیں کر رہا تھا......" بریجیٹ نے کہا اور اسی وقت تہہ خانہ کا دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے جن میں سے ایک بل تھا۔
"اچھا تو تمہیں ہوش آ گیا؟" اس نے حقارت سے بریجیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اب سمجھ آیا کہ تم میرے ساتھ تعاون کیوں نہیں کر رہے تھے......" بریجیٹ نے غصے سے کہا۔ "تم نے جو بھی کیا ہے تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا بل...... تم اسکول کے زمانے میں مجھ سے بھی حسد کرتے تھے۔"
"میں پسند نہیں کرتا کہ کوئی مجھ پر سبقت لے جائے۔"
"ہونہہ...... اور اس کے لیے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہو؟"
"کیا حرج ہے؟ اگر اچھی رقم مل رہی ہو تو کون چھوڑتا ہے؟" بل نے ڈھٹائی سے کہا اور بریجیٹ تیزی سے اس پر جھپٹی لیکن بل کے ساتھ اندر آنے والے نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔
"چھوڑو...... میری بہن کو چھوڑو......" ہولی زور زور سے چیخنے لگی تبھی باہر سے بہت سے قدموں کی آواز آنے لگی بل اچانک چونکا تھا اور اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے باہر جاتا میک اپنے پولیس کے ساتھیوں کے ساتھ تہہ خانے میں داخل ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس نے بل کو نشانہ بنایا ہوا تھا۔
"اسے چھوڑ دو......" ایک پولیس آفیسر نے بل کے ساتھی سے دھمکی آمیز لہجے میں کہا جس نے بریجیٹ کو جکڑا ہوا تھا' آزاد ہوتے ہی بریجیٹ ہولی کے قریب جا کھڑی ہوئی تھی۔
"میک اس سے پوچھو اس نے میری ہولی کو کیوں اغوا کیا تھا۔" اس نے انسپکٹر ہرٹ سے کہا۔
"تم فکر مت کرو بی...... اب ہم انہیں دیکھ لیں گے ان سب کی زبانیں بولیں گی اور یہ ہر راز اگلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔" میک نے جواب دیا اور اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔
"تم ان دونوں کو گاڑی میں بٹھاؤ۔" اس نے ہولی اور بریجیٹ کی طرف اشارہ کیا اور بل کی طرف مڑی۔
"ہولی کی زنجیروں کی چابی دو۔" اس نے غصے سے کہا اور بل نے اپنی جیب سے چابی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی جو اس نے بریجیٹ کو پکڑا دی تھی۔
"تم دونوں کو گاڑی جہاں کہو گی چھوڑ دے گی' ایملی کے گھر مت جانا وہاں اب کوئی نہیں ہے۔" میک نے بریجیٹ سے کہا اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
دوسرے دن شام کے وقت ہوٹل میں پارٹی کا سماں تھا' آج سب مل کر بریجیٹ کی سالگرہ منا رہے تھے اس موقع پر اس کے تمام دوست اور ایبی آنٹی بھی موجود تھیں جنہیں بریجیٹ اسپتال سے لے آئی تھی۔
"بی' اور ہولی تمہیں مبارک ہو کہ آج بریجیٹ کی سالگرہ کے موقع پر تم ایک دوسرے سے مل گئی ہو۔" آٹوم نے کہا جو اپنے شوہر کرسٹن کے ساتھ وہاں موجود تھی۔
"میں تمہاری بھی مشکور ہوں آٹوم کہ تم نے میرا ساتھ دیا اور مجھے حوصلہ دیا۔" بریجیٹ نے جواب دیا۔
"بل' ایمی اور ان کے ساتھی پولیس کی تحویل میں ہیں بی...... اور بل نے قبول کر لیا ہے کہ اس نے کھیلوں کی دنیا کے مشہور گیمبلر فوکس کے کہنے پر ہولی کو اغوا کیا تھا اس کا مقصد ہولی کی رہائی کے بدلے بھاری رقم وصول کرنا اور اسے فٹ بال کے فائنل میچ میں شرکت سے روکنا تھا تاکہ اپنی پسندیدہ ٹیم کے جیتنے کے لیے راستہ ہموار کر سکیں۔" میک نے کہا۔
"میں جانتی تھی میک کہ ہولی کو کیوں اغوا کیا گیا ہوگا یہ بات میں اسی دن جان گئی تھی جب مجھے پتہ چلا کہ اسے اسکول کے پلے گراؤنڈ سے اغوا کیا گیا ہے لیکن اب مجھے امید ہے کہ ہولی فائنل میں حصہ لے گی اور اسے کوئی روک نہیں سکے گا' میں نے ایک اچھی کھلاڑی ہونے کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے' اپنی فیملی کو کھو دیا' تنہا ایک طویل عرصے ملکوں ملکوں کی خاک چھانتی رہی کہ میری بہن محفوظ رہے لیکن پھر اسے بھی نہیں بخشا گیا۔" بریجیٹ دکھی لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بی...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" لیمیٹ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا جو قریب ہی کھڑا تھا۔
"اب آنٹی ایبی ہمارے ساتھ رہیں گی۔" ہولی نے ایبی کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا اور ایبی مسکرانے لگی' بریجیٹ نے بڑھ کر سالگرہ کا کیک کاٹا تھا اور ہوٹل کا ہال "ہیپی برتھ ڈے" کی آوازوں اور تالیوں سے گونجنے لگا تھا۔



دھن کی پکی

خلیل جبار

دنیا کی کوئی عدالت اسے سزا نہیں دے سکتی تھی لیکن وہ جانتا تھا
کہ وہ مجرم ہے وہ بھی ایک معصوم لڑکی کا۔
کورٹ رپورٹر کی ڈائری کا ایک ورق۔

ہمارے معاشرے میں جنم لینے والی ایک کہانی

نائلہ نے خودکشی کرلی تھی۔ اخبارات نے اس کی خودکشی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ میری نظر میں نائلہ نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے اس کا قاتل کوئی اور نہیں میں ہوں۔ میں اس کی زندگی میں نہیں آتا تو وہ کبھی بھی خودکشی جیسے جرم کا ارتکاب نہیں کرتی۔ نائلہ کے لواحقین مجھے اس کا قاتل قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں مگر دنیا کی کوئی عدالت مجھے نائلہ کا قاتل قرار نہیں دے سکتی...... نائلہ کے خودکشی کرنے کے اقدام سے میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں۔ میں خود کو لعنت وملامت کر رہا ہوں مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا' گزرا وقت پھر لوٹ کر نہیں آتا' خود کو لعنت ملامت کرنے سے نائلہ پھر سے زندہ نہیں ہوسکتی' یہ تلخ حقیقت ہے کہ نائلہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

میری نائلہ سے فیس بک پر دوستی ہوئی تھی۔ اس سے دوستی سے قبل بھی میری مختلف لڑکیوں سے دوستی رہی تھی۔ وہ اس قدر جذباتی لڑکیاں نہیں تھیں جتنا نائلہ تھی وہ مجھے اپنا سب کچھ سمجھنے لگی تھی' اور مجھ سے شادی کی خواہشمند تھی۔ میری طبیعت ایک بھنورے کی سی ہے۔ ہر کلی کا رس چوسنا ......میری جب نائلہ سے دوستی ہوئی مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میری ہی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ جب مجھے علم ہوا کہ وہ میری ہی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہتی ہے' میں خوش ہوگیا کہ اس سے ملاقات آسانی سے ہوجائے گی' جب میں نے اس مقصد کے لیے موبائل پر پہلی بار کال کی وہ ذرا گھبرائی۔

''میں کیسے آپ سے ملاقات کروں گی' میرے ساتھ ہر وقت ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیاں رہتی ہیں۔''

''کیا ہر وقت رہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں سمجھی نہیں......'' وہ بولی۔

''میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تم پڑھنے جاتی ہوگی اس وقت وہی لڑکی تمہارے ساتھ رہتی ہوگی جو تمہارے ساتھ کلاس میں پڑھتی ہے۔''

''جی......جی ہاں۔''

''کبھی طبیعت خراب ہونے پر تم ان سے پہلے بھی ہاسٹل آجاتی ہوگی۔''

''ہاں مگر طبیعت خراب ہونے پر ایسا کرتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''نائلہ میری خاطر کبھی اپنی طبیعت کو خراب کرلو۔'' میں نے کہا۔

''طبیعت خراب کرلوں؟''

''ہاں طبیعت کا بہانہ کرکے کلاس سے باہر آجاؤ' ہم تھوڑی دیر کو کہیں بیٹھ کر باتیں کرلیں گے اور تمہاری سہیلیوں سے پہلے میں تمہیں ہاسٹل چھوڑ دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''تم مجھے دیکھنا چاہ رہے ہو۔'' نائلہ بولی۔

''میں نے تمہیں فیس بک پر دیکھا ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ تمہیں روبرو دیکھوں۔''

''میری تصویریں دیکھ کر جی نہیں بھرا۔'' نائلہ نے ہنستے



ہوئے کہا۔

”اخبارات میں بے شمار تصاویر آتی ہیں لیکن جن کی تصاویر آتی ہیں وہ ان کی جوانی کی تصاویر ہوتی ہیں' حقیقت میں وہ ایسے نہیں ہوتے۔“

”آپ کن لوگوں کی باتیں کر رہے ہیں؟“

”میں شاعر ادیبوں کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ایسا شاعرہ اور ادیبہ بھی کرتی ہیں۔“ اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہاں میں نے ایک جنرل بات کی ہے ایسا اکثر ہوتا ہے۔“

”لیکن میں نے ایسا نہیں کیا میں جیسی ہوں میری ایسی ہی تصاویر فیس بک پر ہیں۔“

”اسی لیے میں اس حسن کے شاہکار کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیا میری بات پر تمہیں یقین نہیں ہے۔“

”یقین ہے جبھی تم سے دوستی چل رہی ہے ورنہ کبھی کی ختم ہو جاتی۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ اس لیے نائلہ کہ مجھے جھوٹے لوگ پسند نہیں ہیں۔ میں سچ کو پسند کرتا ہوں اور ان لوگوں کو دوست بنانا پسند کرتا ہوں۔“

”ہاں انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جھوٹ آخر جھوٹ ہوتا ہے۔“

”پھر کب بیمار بن رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے ابھی کیا کہا کہ تمہیں جھوٹ پسند نہیں ہے پھر میں کیسے جھوٹ موٹ بیمار بن سکتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی' بات اس نے واقعی

درست اور موقع محل سے کر کے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔
''اس طرح پھر کبھی ہماری ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ملاقات کرنے کو جھوٹ موٹ کا بیمار ہونا ضروری ہے۔''
''مجھے جھوٹ بولنے میں کوئی قباحت نہیں بس میں اس بات سے ڈر رہی ہوں کہ تمہیں جھوٹے لوگ پسند نہیں ہیں۔'' نائلہ نے کہا۔
''ٹھیک ہے میں اپنی بات میں تھوڑی ترمیم کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''وہ کیا؟'' وہ چونکی۔
''جن کے ملنے سے خوشی حاصل ہو ان کے جھوٹ بولنے پر مجھے خوشی ہوتی ہے۔''
''دیکھ لیں انسانوں کو اپنے اصول بہت عزیز ہوتے ہیں اور تم میری خاطر اپنے اصول توڑ رہے ہو۔''
''کچھ لوگ انسان کو اتنے عزیز ہوتے ہیں کہ ان کی خاطر اصول توڑنے پڑ جاتے ہیں۔''
''اس کا مطلب ہے میرے علاوہ بھی اور ایسے لوگ ہیں جن کی خاطر تم اصول توڑ لیتے ہو۔''
''میں نے یہ کب کہا ہے؟''
''ابھی ابھی تم نے کہا ہے کہ کچھ لوگ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے علاوہ بھی......''
''ارے بھئی تم غلط سمجھے' ورنہ میں تمہاری بات سن کر گھبرا گئی تھی۔'' وہ بولی۔
''گھبراؤ نہیں اور ملاقات کے لیے آؤ۔'' میں نے کہا۔
''ٹھیک ہے تمہارے اصرار پر میں ضرور ملاقات کے لیے آؤں گی۔'' وہ بولی۔
''لیکن کب؟'' میں بے تابی سے بولا۔
''اگلا ہفتہ ٹھیک رہے گا۔''
''ایک ہفتہ کیسے گزرے گا میں چاہ رہا ہوں کہ ابھی آ جاؤ۔''
''ابھی میں کیسے آ سکتی ہوں' میں ہاسٹل میں ہوں۔'' وہ بولی۔
''کل ملاقات کر لو۔'' میں نے کہا۔
''کل......'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔
''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں وعدہ نہیں کرتی میں کوشش ضرور کروں گی کہ ہماری ملاقات کل ہو جائے۔''
''میں تمہیں کال کر لوں گا۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔
دوسرے دن میں یونیورسٹی کے گیٹ کے پاس گاڑی میں اس کا انتظار کرنے لگا' میں نے صبح ہونے پر سب سے پہلے بتا دیا تھا کہ میں اس کا کہاں انتظار کروں گا۔ وہ بیماری کا بہانہ بنا کر میرے پاس آ گئی۔ میں اسے کار میں بٹھا کر شہر کے ایک مشہور ہوٹل میں لے گیا۔ میرا طریقہ واردات یہی تھا کہ میں پہلی ملاقات میں کسی قسم کی کنجوسی نہیں کرتا تھا' بلکہ اپنی شاندار گاڑی اور اچھے ہوٹل میں لے جا کر لڑکی کی خوب خاطر مدارت کرتا تھا جس سے لڑکی مرعوب ہو جاتی تھی' نائلہ بھی پہلی ملاقات میں میری خاطر مدارت پر خاصی مرعوب ہو گئی تھی۔
''تم نے بہت تکلف کر ڈالا۔'' وہ بولی۔
''کیسا تکلف دوستی میں سب چلتا ہے۔ دوستوں کا بھی کچھ حق ہوتا ہے کہ ان پر تھوڑا بہت خرچ کیا جائے۔'' میں نے کہا۔
''تھوڑا بہت سمجھ میں آتا ہے لیکن اتنا ڈھیر سارا سامان منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب بچ جائے گا۔''
'جتنا کھا سکتی ہو کھا لو' جو بچ جائے گا وہ کچرے میں چلا جائے گا۔''
''آئندہ ایسا نہیں کرنا۔''
''کیا نہیں کرنا؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔
''اتنا کھانا ہی منگوانا جتنا ہم کھا سکیں۔''
''ٹھیک ہے میں آئندہ اتنا ہی کھانا منگواؤں گا جتنا کھا سکیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ہماری پہلی ملاقات بہت اچھی رہی۔ میری زندگی میں آنے والی حسین لڑکیوں کی طرح وہ بھی حسن میں کسی سے کم نہ تھی۔ میں اس کے حسن سے بہت متاثر ہوا تھا' میں نے وقت سے پہلے اسے یونیورسٹی کے گیٹ پر اتار دیا تھا اور وہ وہاں سے ہاسٹل پہنچ گئی تھی۔
میں نے فیس بک پر اسے جیسا دیکھا تھا' وہ اس سے بھی بڑھ کر حسین نکلی تھی' میں اسے دیکھ کر بے چین

ہوگیا تھا۔ میں جلد بازی کا مظاہرہ کرکے اسے ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا' جلد بازی میں شکار ہاتھ سے نکل جاتا ہے' صبر' برداشت سے شکار جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گرتا ہے' نائلہ پہلی ملاقات میں مجھ سے اور میری باتوں سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ دوسری ملاقات ہونے پر میں نے نائلہ کو متاثر کرنے کو کھانے پینے کا زیادہ سامان منگوالیا۔ اس نے مجھے کئی بار روکا بھی مگر میں نے اس کی سنی ان سنی کردی۔ کھانے پینے کا سامان زیادہ آیا تھا اس لیے بچ گیا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ زیادہ منگوا رہے ہو' دیکھ لو کتنا بچ گیا۔'' اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

''ایسا کرتے ہیں جو بچ گیا ہے تمہاری سہیلیوں کے لیے پیک کرالیتے ہیں۔'' میں نے پیشکش کی۔

''اچھا نہیں لگے گا۔'' وہ بولی۔

''ہم کہہ دیں گے کتے بلیوں کے لیے پیک کرا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہرگز نہ کہنا۔'' وہ گھبراتے ہوئے بولی۔

''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے وہ لطیفہ نہیں سنا کہ ایک صاحب کو ہڈیاں چوسنے کا بہت شوق تھا' اس نے ہوٹل میں کھانا منگوایا' کھانے میں ہڈیاں بھی اچھی تھیں انہیں دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ ہڈیاں بھی چوس لے مگر ہوٹل میں سب لوگوں کے سامنے مذاق بننے کا خیال آ گیا' اس لیے اس شخص نے گھر جا کر ہڈیاں چوسنے کا پروگرام بنالیا اور بیرے کو اپنے کتے کے نام سے ہڈیاں پیک کرنے کا آرڈر دے دیا۔ بیرے نے ہوشیاری دکھائی اور اس نے دوسرے لوگوں کی بچی ہوئی ہڈیاں بھی ان ہڈیوں میں پیک کرکے یہ بات ان صاحب کو بتا بھی دی۔''

''تمہارا لطیفہ اچھا ہے مگر ضروری نہیں کہ حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہو' یہ بیرے بہت سمجھدار ہوتے ہیں' ٹپ کے چکر میں سارے کام ٹھیک کرتے ہیں۔'' میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ میرے قہقہہ لگانے پر وہ بھی مسکرا کر رہ گئی۔

میری دو دعوتوں نے ہی اس پر اچھا رنگ جمع دیا تھا۔ اب میں جب بھی اسے کال کرتا وہ فوراً کال کو اوکے کر دیتی

تھی۔اس کے بعد بھی ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں میں نے ایسی کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی جس سے میرے بارے میں اس کے ذہن میں غلط تاثر پیدا ہو وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگی تھی۔ وہ بہت جذباتی لڑکی تھی وہ مجھ سے جلد سے جلد شادی کرنے کی خواہش مند تھی۔ میں ابھی شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا' انسان کو زندگی ایک بار ملتی ہے اس لیے اسے زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرکے گزارنی چاہیے۔ میرا زندگی کے بارے میں یہی نظریہ تھا۔ شادی کرکے انسان ایک بیوی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔شادی کرکے انسان اپنے آپ کو خود مختلف ذمے داریاں نبھانے کے لیے پابند کرلیتا ہے۔ نائلہ سے چند ملاقاتوں میں میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ خیالوں میں گم رہنے والی لڑکی تھی۔ بہت جلد دوسروں پر اعتبار کرلیتی تھی۔ اس کی سادگی کا میں نے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نے شہر میں ایک فلیٹ اس مقصد کے لیے کرائے پر لیا ہوا تھا' میں اسے پڑھائی کے اوقات میں ہی اس فلیٹ پر لے جاسکتا تھا جب پہلی بار میں اسے فلیٹ پر لے گیا' میرا خیال تھا کہ وہ ڈرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

''کیا ہم شادی کے بعد اس فلیٹ میں رہیں گے۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''ظاہر ہے کہ میرے پاس جو فلیٹ ہے وہاں ہی تمہیں رہنا پڑے گا۔ اب جیسا بھی یہ فلیٹ ہے تمہیں منظور ہوگا۔''

''یہ فلیٹ میری توقع سے بڑھ کر اچھا ہے۔''

''تمہیں پسند آگیا یہ میری خوش نصیبی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں اب اسے کیسے بتاتا کہ یہ فلیٹ میں نے خوبصورت اس لیے بنایا ہوا ہے کہ جس لڑکی کو بھی وہاں لاؤں وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے' اور یہی میرا مقصد تھا جو لڑکی مجھ سے متاثر ہوتی تھی وہ میری بانہوں میں آسانی سے آجاتی تھی۔ میرے فلیٹ سے امیری جھلکتی تھی اور کون لڑکی ایسی ہوگی جو ایسے امیر سے شادی نہ کرنا چاہتی ہو' ہر لڑکی کا خواب یہی ہوتا ہے' خوبصورت شکل وصورت کے ساتھ اس کو گھر بھی اچھا ملے۔

میری لچھے دار باتوں میں آکر نائلہ میری جھولی میں اس طرح آگری جیسے پکا ہوا پھل آکر گرتا ہے۔ میں اس موقع کو خالی نہیں دینا چاہتا تھا' میں نے اس کا بھرپور فائدہ لے لیا تھا۔ ہر لڑکی وقتی طور پر مزاحمت کرتی ہے لیکن پھر وہ اس کام کی عادی ہوجاتی ہے' نائلہ بھی میرا شکار بن گئی تھی اور کیسے نہ بنتی میں شکار کرکر کے شکار کرنے کا ماہر ہوگیا تھا۔ نائلہ دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں مختلف ثابت ہوئی تھی۔ وہ زبردست طریقے سے میری محبت میں مبتلا ہوچکی تھی اور وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی جب اس کا شادی کا مطالبہ شدت اختیار کرنے لگا میں نے اسے سمجھایا۔

''نائلہ شادی ایک نہ ایک دن سب کو ہی کرنا ہوتی ہے میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ شادی کرلوں۔''

''ایسی کیا مجبوری ہے تمہارے ساتھ جو تم شادی نہیں کرسکتے۔''

''نائلہ تم جو یہ چمک دمک دیکھ رہی ہو یہ سب بینک سے لون لے کر حاصل کیا ہے اور ان کی قسطیں ماہانہ بینک سے کٹوتی ہوتی ہے۔ یونیورسٹی سے جو تنخواہ ملتی ہے اس میں بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ گھر پر بھی پیسے بھیجنا پڑتے ہیں۔'' میں نے اسے لمبی کہانی سنائی۔

''میں نے سنا ہے یونیورسٹی کے پروفیسرز صاحبان کی بڑی بھاری تنخواہ ہوتی ہے۔''

''نائلہ میں ابھی لیکچرار ہوں پروفیسر بننے میں ابھی وقت لگے گا۔''

''کمال ہے تم نے مجھے اپنے گھر والوں کے بارے میں بتایا ہی نہیں میں سمجھتی رہی ہوں کہ تم اکیلے ہو۔''

''ہماری ملاقاتوں میں کبھی گھر والوں کے بارے میں بات نہیں ہوئی اس لیے ذکر نہیں آیا۔ میری دو بڑی بہنیں ہیں ان کی بھی شادی کرنی ہے۔''

''تم مجھے اپنے گھر والوں سے ملواؤنا' میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''وہ کیوں؟'' میں چونکا۔

''جس گھر کی مجھے بہو بن کر جانا ہے ان سے شادی

سے پہلے ملاقات ہونی چاہیے۔ تاکہ ذہنی ہم آہنگی ہوجائے۔''

''اچھا یہ بات ہے واقعی اب تم کو گھر والوں سے ملانا ہی پڑے گا۔'' میں نے اسے ٹالنے کو کہا۔

''کب کراؤ گے۔''

''پہلے مجھے تمہارے بارے میں انہیں بتانا پڑے گا' پھر ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار کرنا ہوگا کہ میں نائلہ کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں' تم میری اس سے شادی کرادو ورنہ......''

''ورنہ کیا...... کیا وہ ہماری شادی سے انکار بھی کرسکتے ہیں۔ حالانکہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں' لہٰذا انہیں اس رشتے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اپنے والدین کو یہ بات بتا بھی دی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس رشتے پر کوئی انکار نہیں ہے۔''

''نائلہ ہمارے یہاں برادری سسٹم ہے ہم برادری سے باہر شادی نہیں کرتے اس لیے پہلے مجھے اس رشتے کے لیے ان کا ذہن بنانا پڑے گا' پھر میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔''

''تم زیادہ دیر مت کردینا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری شادی کہیں اور نہ کردیں۔'' نائلہ نے کہا۔

''زندگی مجھے گزارنی ہے ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ میری مرضی کے خلاف کہیں اور شادی کردیں۔ اگر انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو میں اس رشتے سے انکار کردوں گا۔'' میں نے کہا۔

''تم پر بینک کا زیادہ لون ہے تو پھر سوچ سمجھ کر خرچہ کیا کرو' آخر کو ہمیں شادی بھی کرنی ہے۔'' نائلہ نے کہا۔

''میں سوچ سمجھ کر خرچ کرتا ہوں اس لیے اتنا کچھ کرلیا ہے کہ شادی کے بعد پریشانی نہ ہو' میں تنخواہ پر گزارہ نہیں کرتا' میں بورڈ اور یونیورسٹی کے مختلف کام' کاپی چیک کرنا' امتحانات میں ڈیوٹی لگوانا' جیسے کام کرتا ہوں' اس لیے بہت کم عرصے میں اتنا کچھ کرلیا ہے۔''

''یہ تمہاری محنت ہی ہے کہ جو اتنا کچھ کرلیا ہے۔'' نائلہ نے کہا۔

''ہاں اس لیے کہتے ہیں محنت میں عظمت ہے۔''
''تم نے شادی کے لیے ذہن بنایا ہوگا کہ کتنے سال میں شادی کرنی ہے۔''
''نائلہ میں نے پیسے کے لیے اپنا ذہن ایسا الجھایا ہوا ہے کہ شادی کی طرف ذہن جاتا ہی نہیں ہے۔''
''پھر مجھ سے دل کیوں لگایا۔''
''تم مجھے پسند آ گئی ہو اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''
''اسی لیے شادی پر زور دے رہی ہوں کہ شادی کے لیے ذہن بنالو تاکہ میں گھر والوں کو بتادوں کہیں ایسا نہ ہو کہ گھر والوں کو کوئی رشتہ پسند آ جائے اور وہ میری بات کہیں اور پکی کردیں۔''
''والدین کبھی اپنے بچوں کا برا نہیں چاہتے اور اگر تمہارا رشتہ کہیں اور کردیں تو تم انکار مت کرنا ورنہ انہیں تکلیف ہوگی۔''
''کمال ہے ایک طرف تم مجھ سے محبت کے دعوے کررہے ہو اور دوسری طرف والدین کی پسند پر شادی کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔'' نائلہ کو غصہ آ گیا۔
''تمہارے والدین کا تم پر حق زیادہ ہے اس لیے میں نے یہ بات کی ہے۔'' میں نے کہا۔
''یہ کیوں نہیں کہہ رہے ہو کہ مجھ سے دل بھر گیا ہے۔ مجھے کھلونا سمجھ کر کھیلا اور کھلونے سے دل بہل جانے پر پھینک دینا چاہتے ہو اس طرح تم اپنی شادی کے لیے بھی کہہ سکتے ہو کہ میں والدین کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے یہ شادی کرلی۔''
''تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''
''مجھے کچھ نہیں سننا مجھے بتاؤ کہ شادی کروگے یا نہیں' اور کروگے تو کب کروگے۔'' نائلہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔
ایسا لگ رہا تھا کہ آج وہ یہ سوچ کر آئی ہے کہ آج شادی کا دن طے کرکے ہی جائے گی۔ اسے غصے میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اب چالاکی سے کام لینا پڑے گا ورنہ معاملہ گڑبڑ ہوسکتا ہے' ایسی لڑکیوں کو مجھے اچھی طرح سے سبق سکھانا آتا تھا' اس لیے میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔
''ارے بھئی میں مذاق کررہا تھا' تم بہت سنجیدہ ہوگئی ہو۔''
''تم مذاق کررہے ہو اور میرا خون کھول اٹھا ہے۔''
''مذاق کرنے پر تمہارا خون کھول اٹھا۔''
''مجھے کیا پتا تھا کہ تم مذاق کررہے ہو اگر مذاق کررہے تھے تو کم ازکم تمہیں بتانا چاہیے تھا۔''
''میں اگر مذاق کے بارے میں بتادیتا تو تم سمجھ جاتی اور اتنا غصہ نہ ہوتی۔ دیکھو غصے سے تمہارا چہرہ کتنا سرخ ہوگیا ہے' جیسے چہرہ نہیں ٹماٹر ہو۔'' میں نے اسے ہنسانے کو کہا۔
''اچھا باتیں ہوتی رہیں گی تم میرے سوال کے بارے میں بتاؤ کہ......''
''ہم کیا کلاس روم میں بیٹھے ہوئے ہیں جو سوال وجواب کی باتیں ہورہی ہیں۔''
''مذاق نہ کرو سنجیدگی سے میری باتوں کا جواب دو۔''
''اچھا بھئی تم کہتی ہو تو سنجیدہ ہوجاتا ہوں اور تمہارے سوالات کے جوابات دیتا ہوں۔''
''ہاں تو میں......''
''میں چند روز بعد گاؤں جارہا ہوں اور میں گاؤں جاتے ہی امی ابو سے شادی کی بات کرلوں گا' اور یہ بھی پوچھ لوں گا وہ کب تک ہماری شادی کریں گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
شادی کی بات پر وہ شرما گئی۔
''لو بھئی ہم شادی کی بات نہیں کریں گے۔''
''کیوں؟'' وہ گھبرا گئی۔
''میرے شادی کی بات کرنے پر تم شرمارہی ہو اور شادی ہوجانے پر تمہارا کیا حال ہوگا۔''
''اچھا بابا میں نہیں شرماؤں گی تم شادی کی بات ضرور کرلینا۔'' نائلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
آج کی ملاقات نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ میرے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ نائلہ کی زبان بند کردوں اور ایسی لڑکیوں کے منہ بند کرنا مجھے آتا تھا۔ میں نے کمرے میں خفیہ کیمرہ لگایا ہوا تھا' جو لڑکیاں مجھے تنگ کرنے لگتی ہیں ان کی موویٰ بنالیتا ہوں' نیٹ پر فلم چھوڑنے

کی دھمکی پر ایسی لڑکیوں کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔ مجھے نائلہ نے ایسا کرنے پر مجبور کردیا تھا مجھے اس سے بڑی ہمدردی تھی' خاص کر اس کے چہرے پر جو بھولا پن تھا وہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ مجھے جس سے شادی کرنی تھی وہ نائلہ ہرگز نہیں تھی' نائلہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور میں کسی امیر گھرانے میں شادی کا خواہش مند تھا۔

نائلہ کا شادی کے لیے دن بدن اصرار بڑھتا جارہا تھا' دراصل اس کے والدین میری عدم دلچسپی سے اندازہ لگا چکے تھے کہ میں نائلہ سے شادی نہیں کروں گا۔ نائلہ کے لیے ایک اچھا رشتہ آیا تھا اور وہ چاہ رہے تھے کہ جیسے ہی وہ امتحانات دے کر تعلیم سے فارغ ہو اس کی شادی کردی جائے۔

نائلہ ایک ضدی لڑکی تھی وہ میرے علاوہ کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی' اس لیے وہ بضد تھی کہ میں اپنے والدین سے اس رشتے کی بات کروں' نائلہ کے آئے دن شادی کرنے کے مطالبے سے پریشان ہوکر میں نے اس سے جان چھڑانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے اس کی تیار کردہ مووی میموری کارڈ میں ڈال کر اس کے حوالے کردی' اس نے جب وہ فلم دیکھی اس کے حواس اڑ گئے۔

''انیس تم نے یہ کیا حرکت کی ہے' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنا بھی گر سکتے ہو۔'' وہ غصے سے موبائل فون پر چیخی۔

''یہ ٹریلر ہے اگر مجھے مزید پریشان کیا تو یہ فلم نیٹ پر چھوڑ دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''میں نے تمہیں اپنا دیوتا جانا تھا مگر تم نے جو حرکت کی ہے وہ......'' یہ کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''میں تمہارے ساتھ کچھ دن اچھے گزارنا چاہتا تھا اور بس......''

''انیس میں تمہاری ہوں اور تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی۔ اگر مجھے کسی اور کا بنانے کی کوشش کی گئی تو میں موت کو گلے لگالوں گی۔ مگر تمہارے سوا کسی اور کی نہ ہوں گی۔''

''یہ سب جذباتی باتیں ہیں یہ وقت بتادے گا' شادی کے بعد تم میرے بجائے اپنے شوہر کی بانہوں میں ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''انیس کان کھول کر سن لو میرے شوہر بنوگے تو تم بنوگے' ورنہ کوئی دوسرا میرا شوہر نہ بن سکے گا۔'' یہ کہتے ہوئے نائلہ نے کال کاٹ دی۔

اس دن کے بعد نائلہ نے پھر مجھ سے رابطہ نہیں کیا' میں بھی اس کو بھول گیا تھا۔ نائلہ کے امتحان کا رزلٹ آچکا تھا' رزلٹ آنے پر نائلہ نے آخری بار مجھ سے رابطہ کیا' میرے انکار پر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اور اس نے دھمکی دی تھی کہ ایک ہفتے کے اندر میں نے شادی کے لیے ہاں نہ کی اور اپنے گھر والوں کو میرے گھر پر نہ لائے تو میں خودکشی کرلوں گی' میں نے اسے ایک دھمکی جان کر اہمیت نہ دی' ایک ہفتہ گزر جانے پر اخبار میں نائلہ کی خودکشی کی خبر چھپی ہوئی تھی' اس کے لواحقین سارا الزام مجھ پر رکھ رہے تھے' دو ماہ تک اخبارات میں یہ سلسلہ چلا اور پھر ختم ہوگیا۔

نائلہ نے میری خاطر جان دے دی تھی' لہٰذا میرا بھی فرض بنتا تھا کہ خود کو سزا دوں' میری خودغرضی کے سبب ایک جان دنیا سے چلی گئی تھی' میں نے اسے اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھادیا تھا۔ وہ مجھے اپنا دیوتا سمجھ رہی تھی' اور میں کس قدر گھٹیا اور خودغرض انسان ثابت ہوا تھا۔

دنیا کی کوئی عدالت مجھے سزا نہیں دے سکتی لیکن میں خود کو ضرور سزا دے سکتا ہوں اور میں خود کو سزا دے کر رہوں گا۔ میں نے اب فیصلہ کرلیا ہے کہ زندگی بھر شادی نہیں کروں گا اب بقیہ میری زندگی نائلہ کے ساتھ بیتے دنوں کی یاد میں گزار دوں گا' شاید میرے اس اقدام سے نائلہ کی بے قرار روح کو کسی قدر اطمینان وسکون حاصل ہوجائے کہ میں اگر اس کا نہ ہوسکا تو پھر کسی اور کا بھی نہ بن سکا۔



خدا دور نہیں

مہتاب خان

وہ ایک بے بس انسان تھا مگر خدا کا گھر بچانے کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر آ گئی تھی اور پھر خدا نے اس سے کیسے کام لیا اس کا اندازہ آپ کو یہ ناولٹ پڑھ کر ہوگا۔

دلوں کو چھو لینے والی ایک تحریر، جسے آپ مدتوں یاد رکھیں گے

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے اور اسی لحاظ سے یہاں کے ساحل بھی بڑے ہیں۔ کچی بستیاں ہزاروں کی تعداد میں آباد ہیں۔ یہ بستیاں روز بروز بڑھتی اور پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ پھیلاؤ دیکھتے ہوئے ڈر ہے کہ کہیں یہ سب سے زیادہ کچی بستیوں والا شہر نہ بن جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ کچی بستیاں شہر کی انتظامیہ کے لیے ایک بوجھ اور دردِ سر ہی ہوتی ہیں۔ بہر حال وہ بھی ایک ایسی ہی کچی بستی تھی جس میں کثیر تعداد عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں یعنی مسیحی افراد کی تھی۔ بستی کے افراد نے یہاں اپنی عبادت گاہ یعنی ایک چرچ بھی بنایا ہوا تھا' جہاں وہ بڑی باقاعدگی سے عبادت کے لیے جایا کرتے تھے۔

اس بستی میں چالیس پینتالیس سالہ سانولی رنگت اور تنومند جسم کا مالک بشیر مسیح بھی رہتا تھا۔ وہ ایک نہایت ایماندار' محنتی سیدھا سادا اور سچا مسیحی تھا۔

بشیر شہر کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں بطور میل نرس خدمات انجام دیا کرتا تھا جہاں اس کے اوقات کار شام چھ بجے سے رات ایک بجے تک ہوتے تھے۔ جبکہ صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو ڈھائی بجے تک وہ حاجی عبدالقدوس کے پاس ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔

حاجی عبدالقدوس اس شہر کے ایک متمول اور نامور صنعت کار تھے جو آج کل ریٹائرڈ اور صاحب فراش زندگی گزار رہے تھے۔ کچھ عرصے پہلے برین ہیمرج کے نتیجے میں ان کے آدھے جسم پر فالج ہو گیا تھا اور وہ ویل چیئر تک محدود ہو گئے تھے' ان کے تین بیٹے تھے۔ تینوں شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے لیکن تینوں بیرون ملک مقیم تھے۔ ان کی بیوی ایک سال پہلے انہیں داغ مفارقت دے چکی تھیں یوں حاجی عبدالقدوس ڈیفنس میں واقع اپنے وسیع و عریض بنگلے میں ملازموں کے سہارے تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ بیٹے بضد تھے کہ حاجی صاحب ان کے پاس امریکا چلے آئیں مگر ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنی سرزمین پر ہی مرنا پسند کریں گے' آخر بیٹوں نے ان کی اس ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

وہ تینوں اپنی اپنی زندگیوں میں بہت مصروف تھے اور اپنے والد کے پاس جن کو اس وقت ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی آنے سے قاصر تھے لیکن وہ ہر وقت فون' اسکائپ وغیرہ کے ذریعے رابطے میں رہتے تھے۔ بہویں اور پوتے پوتیاں بھی اکثر ان سے بات کرتے تھے مگر مشین بھی کبھی انسانی محبتوں اور پیار بھرے لمس کا نعم البدل ہوتی ہیں۔



اس محلے میں زیادہ تر مکان بشیر کی اپنے برادری والوں کے تھے۔ گلی کے نکڑ پر سب سے پہلے مکان میں اس کی سگی بھتیجی اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ رہتی تھی جبکہ بشیر کے گھر کے سامنے والے مکان میں اس کی چاچی رہتی تھیں' گلی میں ایک دو گھر اور اس کے رشتے داروں کے تھے۔ بشیر کے والدین فوت ہو چکے تھے اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مصروف رہتا تھا کہ اسے کبھی شادی کا خیال نہیں آیا تھا' اس کے



رشتے دار اور خاص طور پر اس کی چاچی اس کی طرف سے بڑی فکر مند رہتی تھیں اور اسے شادی کے لیے اکساتی رہتی تھیں۔

آخر کار چاچی نے ہی اس کے لیے اپنے رشتے داروں میں پروین کو پسند کیا تھا' پروین کھلتی ہوئی رنگت والی بہت خوبصورت اور کم عمر لڑکی تھی۔ وہ جب سے بشیر کی زندگی میں آئی تھی اس کی روکھی پھیکی زندگی رنگین ہوگئی تھی۔ محلہ بھر میں بشیر کی خوبصورت بیوی کا چرچا تھا ہر ایک اسے رشک سے دیکھتا تھا۔

پٹیر کے گھر اس سے بالکل الٹ معاملہ تھا' پٹیر خود پڑھا لکھا اسمارٹ نوجوان تھا جبکہ اس کی بیوی یعنی بشیر کی بھتیجی گہری سانولی رنگت والی موٹی بھدی اور تیز مزاج عورت تھی۔ پٹیر اسمارٹ اور تعلیم یافتہ تو تھا مگر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ وہ سارا سارا دن گھر پر پڑا رہتا یا جوئے کے اڈے پر پایا جاتا تھا۔ اسے جوا کھیلنے کی بری لت پڑ گئی تھی جبکہ اس کی بیوی نسرین میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھی۔ بشیر پٹیر کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا اور کئی مرتبہ اس نے اپنے جاننے والوں سے کہہ سن کر اس کے لیے ملازمت کا بھی بندوبست کیا تھا مگر وہ ٹک کر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

ایسی کچی بستیوں میں عموماً جوئے اور منشیات کے اڈے کھلے عام قائم ہوتے ہیں وہ بھی جوئے کا ایک ایسا ہی اڈا تھا جو اس علاقے کا بدنام زمانہ شخص گوگی چیمپئن کا تھا بلکہ یہاں قائم منشیات اور جوئے کے تمام اڈے اسی کی ملکیت تھے' بستی کی زیادہ تر زمین اس نے خریدی ہوئی تھی' چیمپئن ان دنوں جیل میں تھا' سال چھ مہینے کے لیے اس کا جیل میں آنا جانا لگا رہتا تھا اس کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھی اس کے ان غیر قانونی کاروبار کو سنبھالتے تھے۔

پٹیر اس دن جوئے کے ایک اڈے پر بیٹھا جوا کھیل رہا تھا جب خوفناک مونچھوں اور بھاری جثہ والا رشید گولی اندر داخل ہوا تھا۔ اسے اچانک دیکھ کر پٹیر گھبرا گیا' وہ وہاں سے کھسکنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ رشید نے اسے بھاگتا دیکھ کر دبوچ لیا۔

''بھاگتا کہاں ہے نکال میرے پیسے جو تو نے قرض لیے تھے۔''

''وہ تو میں جوئے میں ہار گیا۔''

''تو میں کیا کروں' مجھے میرا پیسہ واپس چاہیے ورنہ......'' رشید دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''دے دوں گا' پہلی تاریخ کو خود آ کر دوں گا۔'' پٹیر گھگھیاتا ہوا بولا۔

''دیکھ پہلی کا مطلب پہلی ہونی چاہیے اگر پیسے نہیں آئے تو پھر......!'' اس نے پٹیر کو جھٹکے سے دھکیلتے ہوئے کہا۔

پٹیر نے وہاں سے نکل جانا غنیمت جانا تھا وہ تیزی سے باہر نکلا اس کا رخ چاچا بشیر کے گھر کی جانب تھا۔

جتنی پروین خوبصورت تھی اتنی ہی سگھڑ بھی تھی۔ اسے خود بھی اپنی خوبصورتی کا احساس تھا۔ اچھا لباس اور میک اپ اس کی کمزوری تھی...... وہ ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی اور گھر بھی بڑا صاف ستھرا رکھتی تھی۔ اس وقت بھی وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اور سالن پکا کر بیٹھی تھی اس نے سوچا تھا کہ بشیر کے آنے کے بعد گرما گرم روٹیاں بنا لے گی اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اس نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے پٹیر کھڑا تھا۔

''آؤ پٹیر آج کیسے ادھر آ نکلے۔''

وہ اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے بولی۔

''تمہارے ہاتھ کی چائے پینے کو دل چاہ رہا تھا' اسی لیے آ گیا۔''

''اچھا تم بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' پروین نے برآمدے میں پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چاچا بشیر نہیں آئے ابھی تک؟'' پٹیر نے کہا۔

''نہیں ...... آنے والے ہوں گے۔'' کہتی ہوئی وہ برآمدے کے ایک کونے میں بنے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ چائے اسے تھما کر قریب ہی رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں پروین مجھے چاچا کی قسمت پر رشک آتا ہے۔'' وہ پروین کو بغور دیکھتا ہوا بولا تھا۔

''تو میرا نام کیوں لیتا ہے پٹیر مجھے چاچی کیوں نہیں

کہتا۔'' پروین نے اعتراض کیا۔
''اس لیے کہ تم میری ہم عمر ہو...... تمہیں چاچی کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''تم بہت خوبصورت ہوٹی وی اور فلموں میں ایکٹنگ کرو تو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑادو گی' بنی بنائی ماڈل ہو۔''
''مجھے کون چانس دے گا ایکٹنگ کا؟''
اس نے ادھر ادھر دیکھ کر راز داری سے کہا۔ ''تم اگر تھوڑی سی ہمت کرو تو میرے ایک دو جاننے والے ہیں' بس تھوڑا سا خرچا کرنا ہوگا تمہاری تصویریں وغیرہ بنوانے کے لیے۔''
''خرچا؟'' وہ اچنبھے سے بولی۔
''ہاں فی الحال تو تین چار ہزار سے کام چل جائے گا' میں تمہارے لیے جدید فیشن کے کپڑے لے آؤں گا پھر......''
''چار ہزار۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''بشیر سے پوچھ لوں پھر کچھ سوچیں گے۔''
''ارے یہ غضب نہ کرنا بشیر چاچا کو تو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنا چاہیے۔''
''خبردار میں ویسی نہیں جیسی تو مجھے سمجھ بیٹھا ہے۔ چل ہٹ بڑا آیا مجھے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھانے' جا یہاں سے رقم تیرے ہاتھ پر رکھ دوں ماڈل بنائے گا۔'' وہ تیز آواز میں بولی۔
''ٹھیک ہے بابا جار ہا ہوں ناراض کیوں ہوتی ہو۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا' وہ غصے میں بل کھا کر رہ گئی اور اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے کنڈی لگادی۔ اسی وقت دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی پروین نے جھٹکے سے دروازہ کھولا سامنے بشیر کھڑا تھا اس نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا' بشیر بولا۔
''کیا پپٹیرآیا تھا؟''
''ہاں۔''
''بڑی جلدی میں تھا میں نے اسے آواز بھی دی تو رکا بھی نہیں' کیا کہہ رہا تھا؟''
''بس اوٹ پٹانگ باتیں کرر ہا تھا۔''
''خداوند اسے عقل دے سمجھ دے۔'' نسرین بے چاری اس کی وجہ سے کس قدر پریشان رہتی ہے' کوئی کام

دھندہ تو کرتا نہیں' ویسے ہی اپنا وقت ادھر ادھر ضائع کرتا ہے۔"

"چل چھوڑ بشیر تو ہاتھ منہ دھولے میں اتنی دیر میں روٹیاں پکا لیتی ہوں گرما گرم۔" وہ دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جب پروین بولی۔

"سن بشیرا گلے مہینے تیری کمیٹی نکلے گی نا۔"

"ہونہہ۔" وہ نوالہ چباتے ہوئے بولا۔

اور کرسمس بھی آ رہی ہے' میں نے بھی محلہ میں ایک بیسی ڈالی ہوئی ہے وہ بھی اگلے مہینے مل جائے گی۔ پھر وہ کچھ دیر ٹھہر کر بولی۔ تو مجھے کیا لے کر دے گا؟" وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"وہ ہنسا۔ "او پنو میرا جو کچھ بھی ہے تیرے لیے ہی تو ہے جو دل کرے لے لینا۔"

"تو پھر سن مجھے سونے کا سیٹ لینا ہے۔"

"جھلی نہ ہو تو سارے پیسے تو سونے کے سیٹ پر خرچ کر دے گی تو ہم آنے والے مہمان کے لیے کیا کریں گے؟"

"میں کچھ نہیں جانتی اس کرسمس پر میں سونے کا سیٹ پہن کر ہی چرچ جاؤں گی بس۔" وہ ناراضگی سے بولی۔

"اچھا بابا جو تیری مرضی کر بس مجھے ایک اچھا سا جوتا دلا دینا۔ میرا جوتا ٹوٹ گیا ہے۔"

"ہاں ہاں لے دوں گی۔" وہ خوشی سے کھل گئی۔

ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کہ کسی نے زور زور سے دروازہ [illegible] دھڑ دھڑایا۔

"کون ہے ابھی آ رہا ہوں۔" بشیر کہتا ہوا دروازے کی سمت گیا۔

"ماموں جلدی چل۔" اس کا بھانجا جو دروازے پہ کھڑا تھا عجلت سے بولا۔ "پیٹر نسرین کو بہت مار رہا ہے۔"

"چلو میں ابھی آیا..... آ جا بھئی آ جا چل....." بشیر عجلت میں گھر سے نکل گیا۔ وہ اور اس کا بھانجا تیز تیز قدموں سے نسرین کی گھر کی طرف جا رہے تھے۔

نسرین کے رونے اور چیخنے کی آواز باہر تک آ رہی تھی اور بہت سارے محلے دار اس کے دروازے پر جمع تھے۔ بشیر راستہ بناتا ہوا اندر گیا تو دیکھا پیٹر نے نسرین کے بال پکڑے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اسے مار رہا تھا۔

"او بندہ بن رک جا پیٹر۔" بشیر کہتا ہوا پیٹر کو اس سے چھڑانے لگا۔

"زبان چلاتی ہے' مجھ سے زبان چلاتی ہے۔" غصہ سے پیٹر کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

"اوئے پیٹر چھوڑ اس کو اوشرم کر عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

"اتار لینے دے چاچا اسے اپنا غصہ اتار لینے دے یہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔" نسرین تیز آواز میں بولی۔

"دیکھ چاچا کیسی زبان چلا رہی ہے' آج میں اس کو بتاتا ہوں اپنے مرد سے کیسے بات کی جاتی ہے۔" پیٹر پھر نسرین کی طرف لپکا۔ بشیر نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"تو بھی ذرا خیال کر نسرین۔" بشیر نسرین کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور کیسے خیال کروں چاچا کسی بات پر تو میں اس کو روکتی ٹوکتی نہیں' اب یہی دو بالیاں رہ گئی ہیں کان میں یہ بھی اس کو دے دوں جوئے میں ہارنے کے لیے۔"

"اچھا..... تو یہ سارا جھگڑا بالیوں کا ہے۔" بشیر بولا۔

"اچھا تو چل اندر جا شاباش میں بات کرتا ہوں اس سے۔"

"آج تو تو بے غیرتی کی آخری حد [illegible] پیٹر۔ [illegible] تجھے [illegible] کمائی سے [illegible] اس [illegible] کمائی [illegible] چھینتا [illegible] تیرا اور تیرے بچوں کا پیٹ پالتی [illegible] تجھ [illegible] اس پہ ہاتھ اٹھایا تو تجھے نہیں چھوڑوں گا یاد رکھنا۔ او میری تو خداوند سے دعا ہے کہ تجھے سیدھا راستہ دکھا دے۔"

❀ ..... ❀ ..... ❀

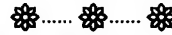
حاجی عبدالقدوس نماز بڑی پابندی سے پڑھتے تھے جب سے وہ وہیل چیئر پر تھے نماز گھر میں ہی ادا کرتے تھے لیکن جمعہ کی نماز وہ باقاعدگی سے اپنے گھر کے قریب واقع موتی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ وہ موتی مسجد کی انتظامیہ کے سرگرم رکن بھی تھے۔

موتی مسجد سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی بڑی پرشکوہ وسیع وعریض اور شاندار عمارت تھی۔ یہ حاجی صاحب کے

گھر کی اسٹریٹ اور اس سے ملحقہ ایک کمرشل اسٹریٹ کے سنگم پر واقع تھی۔ اس کمرشل اسٹریٹ پر بے شمار دکانیں ' میڈیکل اسٹورز اور ریسٹورنٹ واقع تھے۔ اسی وجہ سے اس اسٹریٹ پر لوگوں کا بڑا رش رہا کرتا تھا۔ یوں نماز کے اوقات میں موتی مسجد میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی اور خاص کر نماز جمعہ میں تو یہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی تھی۔

حاجی صاحب کا خانسامہ رشید ان کا کل وقتی ملازم بھی تھا۔ وہی حاجی صاحب کو نماز جمعہ کے لیے لاتا لے جاتا تھا۔ لیکن کبھی وہ مصروف ہوتا یا اور کوئی وجہ ہوتی تو بشیر یہ خدمات انجام دیتا تھا' جب تک حاجی صاحب نماز ادا کرتے وہ مسجد کے باہر سیڑھیوں کے قریب بیٹھا ان کا انتظار کیا کرتا تھا۔

بشیر مسیح کو مسلمانوں کی یہ عبادت گاہ بہت پسند تھی وہ دیر تک بیٹھا اس پروقار عبادت گاہ کو دیکھا کرتا تھا۔ اسے نمازیوں کا بلا امتیاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر ایک جیسے ارکان ادا کرنا بھی بڑا اچھا لگتا تھا لیکن وہ اکثر سوچتا تھا کہ یہ یک جہتی' اتحاد اور برابری صرف مسجد تک محدود کیوں ہے' ذاتی زندگی میں مسلمان فرقوں میں کیوں بٹے ہوئے ہیں؟ ان میں اتنے شدید اختلافات کیوں ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔



جب سے بشیر نے پیٹر کو سمجھایا تھا وہ کافی حد تک سدھر گیا تھا اور اب سنجیدگی سے ملازمت تلاش کر رہا تھا اور اپنے بیوی بچوں کا خیال بھی رکھ رہا تھا یہ دیکھ کر بشیر نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔

اس دن بشیر کو تنخواہ ملی تھی وہ خوشی خوشی نسرین کے بچوں کے لیے مٹھائی وغیرہ لے کر گلی میں پہنچا تو نسرین اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی مل گئی۔

''خیر تو ہے یہاں کیوں کھڑی ہے' یہ لے بچوں کو بانٹ دینا۔'' بشیر نے شاپر نسرین کو دیتے ہوئے کہا۔

''پیٹر صبح سے گیا ہوا ہے ابھی تک نہیں آیا مجھے تو بڑی فکر ہو رہی ہے۔''

''تو گھر میں جا میں دیکھتا ہوں۔'' کہتے ہوئے بشیر نے بائیک اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اسے اپنے گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھا پڑوسی ولسن نظر آیا اس نے بائیک ولسن کے قریب روکی اور اس سے پوچھا۔

''ولسن پیٹر کو کہیں دیکھا ہے؟''

''کچھ دیر پہلے تمہارے گھر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔'' وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

اس کا اس انداز میں کہنا بشیر کو بڑا عجیب لگا تھا۔ بہر حال وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا' گھر پہنچا تو بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا' وہ خاموشی سے اندر داخل ہو گیا' صحن عبور کر کے وہ برآمدے میں آیا' پروین اور پیٹر اسے کہیں نظر نہیں آئے۔ پھر اچانک برآمدے میں بنے باورچی خانے سے اسے پیٹر کی آواز آئی۔

''تم ابھی تک ناراض ہو مجھ سے...... اس دن میں مذاق کر رہا تھا...... اگر مجھے پتا ہوتا نا کہ تم ناراض ہو جاؤ گی تو کبھی مذاق نہ کرتا۔'' کچھ دیر بعد نسرین کی آواز آئی۔

''چل اب پتہ چل گیا نا آئندہ دھیان رکھنا۔'' وہ نرم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اسی وقت بشیر کچن میں داخل ہوا۔ پیٹر پروین کے قریب پیڑھی پر بیٹھا تھا اور پروین کھانا پکا رہی تھی۔

''لعنت ہے بھئی تیرے اوپر بیوی تیری وہاں پریشان ہو رہی ہے اور تو یہاں مزے سے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔'' اس نے اندر آتے ہی پیٹر سے کہا۔

''ارے میں ایسے ہی نہیں آیا تم سے ایک مشورہ کرنے آیا تھا۔''

''پھر کبھی کر لینا مشورہ ابھی جا یہاں سے۔'' وہ غصیلے انداز سے بولا۔

''تم سن کیوں نہیں لیتے شاید کوئی کام کی بات کر رہا ہو۔'' پروین نے کہا۔

''تو چپ کر اور میرے لیے چائے بنا...... اور تو چل تیری بیوی انتظار کر رہی ہے۔''

وہ دونوں بشیر کے اس رویے پر حیرانی سے اس کی شکل دیکھنے لگے۔ آخر پیٹر خاموشی سے اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔

''آج تو یہ آ گیا مگر آئندہ میری غیر موجودگی میں

یہاں آئے تو آنے نہیں دینا۔"
"یہ آج تم کس قسم کی باتیں کررہے ہو۔ تمہارا رشتے دار ہے خود منع کرو۔" وہ تڑخ کر بولتی ہوئی کچن سے باہر چلی گئی۔
اس سے پہلے کبھی بشیر نے اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ پھر وہ کئی دن اس سے روٹھی رہی تھی۔ بشیر نے بھی اس بار اسے منانے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ تو پروین کی ایک منٹ کی خاموشی بھی بشیر پر گراں گزرتی تھی اور وہ اسے منانے کے لیے سیکڑوں جتن کرتا تھا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیسی گرہ پڑی تھی کہ اس کا رویہ ہی بدل گیا تھا' پروین سوچتی اور کڑھتی رہتی۔
اس شام بشیر شام سات بجے گھر آ گیا۔ اس وقت وہ اسپتال کی ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ پروین اسے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔
"خیریت تو ہے آج اس وقت کیسے آ گئے؟"
"طبیعت ٹھیک نہیں تھی' جلدی چھٹی لے کر آ گیا۔" وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ "یہ بتا پیٹر تو نہیں آیا۔"
"لے وہ کیوں آنے لگا ادھر روز روز۔"
"او ناراض کیوں ہوتی ہے' میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔"
یہ اتوار کا دن تھا بشیر چرچ جانے کی تیاری کر رہا تھا اس نے پروین کو آواز دی۔
"پینو جلدی سے تیار ہو جا چرچ جانا ہے۔"
وہ جو برآمدے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی بولی۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں تو چلا جا۔"
"ہر وقت کمیٹیوں کی ادھیڑ بن میں لگی رہتی ہے کوئی کمیٹی خداوند کے پاس بھی ڈال دے یقین کر جب وہ کمیٹی کھلتی ہے نا تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔"
"کیوں؟" اس نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرلیں وہ باہر نکل گیا۔
وہ عبادت کے بعد چرچ کے باہر فادر کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا' کرسمس پر وہ چرچ پر نیا رنگ و روغن کروانا چاہتے تھے' کہ اسی وقت انہوں نے گوگی چیمپئن کو اس کے چھ سات ساتھیوں کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا۔
"بشیر یہ گوگی کب رہا ہوا؟ یہ ہماری طرف آرہا ہے خداوند رحم کرے۔" فادر تشویش زدہ لہجے میں بولے۔
"پتا نہیں فادر یہ بدمعاش کب رہا ہوا' واقعی یہ تو ادھر ہی آرہا ہے۔"
"فادر جی آپ کو کس نے یہاں چرچ بنانے کی اجازت دی ہے۔ یہ پلاٹ میرا ہے میں کچھ دن کے لیے ادھر ادھر کیا ہوا' آپ میرے پلاٹ پر قبضہ کرکے بیٹھ گئے۔" گوگی فادر کے قریب آتے ہی بولا۔
"ہم نے کوئی قبضہ نہیں کیا' اس کی قیمت ادا کی ہے تمہارے بھائی قادر کو۔ اس غریب بستی والوں نے چند اکر کے خریدا ہے یہ پلاٹ۔"
"فادر ٹھیک کہہ رہے ہیں گوگی بھائی ہم نے اس کی پوری قیمت ادا کی ہے۔" اس مرتبہ بشیر بولا۔
"یہ جگہ میرے بھائی کی نہیں' میری ہے میری۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولا۔
"ایک بات بتاؤ تمہارا بھائی قادر کہاں ہے؟ اسے لے کر آؤ پھر خود اس سے بات کرلیں گے۔" فادر نے کہا۔
"وہ نہ جانے کہاں ہے تم جیسے بہت سے لوگوں کو اس نے ٹوپیاں کروائی ہیں' خود میرے ساتھ فراڈ کرکے گیا ہے۔ پانچ چھ پلاٹوں کے جعلی کاغذات دے کر پیسے اینٹھ کر لے گیا ہے' جبکہ میں اس کا سگا بھائی تھا۔ وہ مجھے نہیں مل رہا تو تم لوگوں کو کیسے ملے گا؟"
"پھر تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں؟" فادر بے بسی سے بولے۔
"میں نہیں جانتا اپنا بوریا بستر سمیٹو اور نکلو یہاں سے میری جگہ مجھے چاہیے یہاں مجھے اپنا کروبار جمانا ہے۔ میں چلتا ہوں پھر آؤں گا۔" کہتا ہوا وہ چلا گیا۔
"فادر جی یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اب کیا ہوگا؟ کرسمس بھی آنے والی ہے؟"
"فکر کی کوئی بات نہیں جیسس رحم فرمائیں گے' اب سب سے پہلے ہمیں یہ کرنا ہے کہ بستی والوں کو ساری صورت حال بتانی ہے اور سب سے مشورہ کرنا ہے۔" فادر سوچتے ہوئے بولے۔
"ہاں فادر جی یہ ضروری ہے۔"
واپسی میں بشیر کچھ دیر کے لیے نسرین کے گھر چلا گیا'

نسرین اسے دیکھ کر خوش ہوگئی۔

"آؤ چاچا بڑے دن بعد آئے بیٹھو۔"

وہ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "پیٹر کہاں ہے؟"

نسرین کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں اور کہاں ہوگا پروین کے پاس بیٹھا گپیں لگا رہا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟ یہ تو کس لہجے میں بات کررہی ہے؟"

"میں کیا سارا محلہ اب یہی باتیں کررہا ہے' چاچا تمہیں ایسی بے جوڑ شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اتنی خوبصورت اور کم عمر لڑکی کو بیوی نہیں بنانا چاہیے تھا۔"

"یہ تو کیسی باتیں کررہی ہے نسرین۔" وہ اچنبھے میں رہ گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مرد بدنام ہوجائے تو اس کا کچھ نہیں جاتا لیکن عورت بدنام ہوجائے تو اس کا گھر ٹوٹ جاتا ہے۔ مجھے تو تم پر ترس آتا ہے چاچا۔"

"بس کر چپ ہوجا نسرین۔" وہ تیزی سے کہتا ہوا اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔

وہ جیسے ہی گھر پہنچا تو پروین نے کہا۔

"اتنی دیر کردی میں کب سے تمہارا انتظار کررہی ہوں۔ بہت بھوک لگی ہے میں نے تمہاری پسند کا کھانا بنایا ہے۔"

"پیٹر آیا تھا؟" بشیر نے ان سنی کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں آیا تھا' پر میں نے دروازہ نہیں کھولا اس سے کہہ دیا جب بشیر آئے تو آنا۔"

تیری طبیعت خراب تھی اسی لیے چرچ بھی نہیں آئی تھی۔ اس وقت تو تو ٹھیک لگ رہی ہے۔"

"ہاں اب ٹھیک ہے وہ کھانے کی پلیٹیں دستر خوان پر رکھتے ہوئے بولی۔

"تو میرے ساتھ خوش تو ہے نا پینو۔" بشیر نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ آج تو کیسی باتیں کررہا ہے؟"

"لوگ کہتے ہیں ہماری شادی بے جوڑ ہوئی ہے۔"

"لوگوں کا کیا ہے' ان کا کام ہی باتیں بنانا ہے' تو کھانا کھا۔"

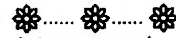
کچھ وقت اور گزرا یہ بشیر کے لیے بڑے کٹھن دن تھے' ایک طرف چرچ کا مسئلہ تھا تو دوسری طرف پروین تھی اس کی محبوب بیوی جس کے خلاف شک کا سانپ اس کے سینے میں کنڈلی جمائے بیٹھا تھا جو اسے کسی لمحے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ وہ وقت بے وقت گھر کے پھیرے لگا تا رہتا تھا' ڈیوٹی بھی صحیح طور پر انجام نہیں دے پاتا تھا۔ حاجی عبدالقدوس نے بھی اس میں رونما ہونے والی اس تبدیلی کو نوٹ کیا تھا۔

''بشیر گھر میں سب خیر تو ہے نا کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں تم بڑے چپ چپ سے ہو۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟''

بشیر ان کی دوا انہیں تھما رہا تھا جب وہ بولے تھے۔

''چھوٹی موٹی پریشانیاں تو چلتی رہتی ہیں سر کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''ہوں۔''



اس شام تین چار شکل سے بدمعاش نظر آنے والے نوجوان فادر کے پاس آئے اور کہا۔

''آپ نے اپنے لوگوں سے مشورہ کرلیا فادر؟ گوگی استاد نے ابھی آپ کو بلایا ہے ہمارے ساتھ چلیں۔ فادر نے بشیر اور ولسن کو بھی بلوالیا یہ تینوں جب گوگی کے اڈے پر پہنچے تو گوگی نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

''ہاں بھئی کب خالی کررہے ہیں ہماری جگہ۔''

''ہم چرچ کیسے ہٹا سکتے ہیں گوگی وہ ہماری عبادت گاہ ہے' کوئی تو حل ہوگا تمہارے پاس ہمارے اس مسئلے کا؟''

''اب تک اسی وجہ سے آپ سے رعایت کی ہوئی ہے کہ وہ آپ لوگوں کی عبادت گاہ ہے ورنہ اسے ہٹانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''کوئی تو حل ہوگا آپ کے پاس۔'' بشیر بولا۔

''ہاں' ہاں بالکل ہے۔'' گوگی بولا۔ ایک مہینے میں پلاٹ کی قیمت دس لاکھ روپے دو اور اپنی عبادت گاہ کو بچالو۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' ولسن نے کہا۔

''یہ قیمت تو میں نے چرچ کی وجہ سے کم کی ہے ورنہ اس پلاٹ کی قیمت تو پندرہ لاکھ ہے۔''

''تھوڑی سی مہلت اور دے دو گوگی' ہماری کرسمس آنے والی ہے' بستی کے لوگ عبادت کریں گے۔''

''اوہئیں جی نہیں' گوگی جلدی سے بولا۔ ''اب بالکل آپ کو مہلت نہیں مل سکتی۔ ایک ماہ کا مطلب ایک ماہ ہے یا تو پیسہ دیں یا جگہ خالی کریں بس۔'' اس نے کڑے تیوروں سے کہا۔

فادر نے اسی شام بستی کے لوگوں کو جمع کرکے یہ تمام حالات بتائے تو بشیر نے کہا۔

''فادر جی اس مشکل وقت کا سامنا تو کرنا ہی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت ہر بندہ اپنی اپنی پریشانی میں ہے۔ دیکھیں نا یوسف نے ایک مہینے پہلے ہی اپنی بیٹی کی شادی کی ہے' ولسن جھاڑو دے دے کر دمے کا مریض بن گیا ہے اور ویسے بھی فادر دس لاکھ کوئی چھوٹی رقم تو نہیں ہے کہ چٹکی بجاتے میں جمع ہوجائے آپ کو تھوڑا ٹائم گوگی سے اور لینا چاہیے تھا۔''

''تم اور ولسن تو ساتھ تھے تم نے دیکھا نہیں میں نے کتنی کوشش کی تھی مگر وہ مانا ہی نہیں' اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا کریں؟''

''کچھ بھی ہو فادر کرسمس کی عبادت تو اس چرچ میں ضرور ہوگی۔'' یوسف جوش سے بولا۔

''جیسس ہماری مدد فرمائیں۔ اب آپ لوگ جائیں اور دیکھیں کہ کون کتنا اور کیا کرسکتا ہے؟''

''یہاں آنے سے پہلے میں سب سے بات کرچکا ہوں فادر۔'' بشیر نے کہا۔

ان لوگوں کے حالات ایسے نہیں جو اتنی بڑی رقم اکٹھی کرسکیں۔ لوگ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ ہزار جمع کرسکتے ہیں' اس سے زیادہ یہ لوگ کچھ نہیں کرسکتے۔''

''ہوں پھر تو کچھ سوچنا پڑے گا۔'' فادر نے کہا۔

بشیر گھر پہنچا تو اس پریشانی کی تحریر اس کے چہرے پر لکھی تھی۔ ''پنو چائے بنا سر میں بڑا درد ہے۔'' بشیر نے کہا۔

''اچھا بناتی ہوں...... سن یہ محلے کی عورتیں باتیں کررہی تھیں چرچ کا کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ تو بڑا گھمبیر ہے۔'' بشیر نے تمام روداد اسے سنائی۔ اب ہم سب کو مل کر ہی اپنے چرچ کو بچانا ہوگا۔ سن

پتو ہماری کمیٹی بھی تو کھلنے والی ہے......اگر......"
"خبردار جو تو نے میری کمیٹیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا' دوسال میں پیٹ کاٹ کاٹ کر یہ پیسے جمع ہوئے ہیں۔ میں اس میں سے ایک پیسہ نہیں دوں گی' خداوند کا گھر ہے وہ خود اسے بچائے گا۔ دیکھ لینا تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔"
"بڑی آئی کمیٹیوں والی چرچ نہیں ہوگا تو کرسمس کیسے منائے گی؟"
دوسرے دن وہ اپنے اسپتال کے اکاؤنٹ آفس میں افسر کے سامنے قرضے کی درخواست لے کر گیا تھا' افسر نے درخواست دیکھتے ہی کہا۔
'بھئی تمہارا تو مکان پر لیا جانے والا پہلا قرضہ بھی پورا نہیں ہوا' یہ قرض نہیں مل سکتا۔"
"کچھ کریں سر میں نے آپ کو اپنی مجبوری بتادی ہے۔"
"کچھ نہیں ہوسکتا بشیر۔"
"اچھا اگر میں ریٹائرمنٹ لے لوں تو' میری گریجویٹی اور فنڈ مل جائے گا؟"
"اس سے بھی تمہارا مسئلہ فوری طور پر حل نہیں ہوگا۔ گریجویٹی وغیرہ ملنے میں تین چار ماہ لگ جائیں گے۔ دفتری کارروائیوں میں وقت لگتا ہے بشیر۔"
"کچھ تو کریں سر میں بڑی امید لے کر آیا تھا۔"
سوری بشیر اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ جاؤ یہاں سے میرا اور اپنا وقت ضائع نہ کرو۔" وہ وہاں سے بڑا دل گرفتہ مایوس چلا گیا تھا۔
پروین برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی جب نسرین اس کے گھر میں داخل ہوئی۔
"آجا نسرین بیٹھ بڑے دنوں بعد نظر آئی۔" پروین اسے دیکھتے ہی بولی' وہ اسے نظر انداز کرکے ادھر ادھر کمروں میں جھانکنے لگی۔
"یہ تو کسے تلاش کررہی ہے......" پروین نے اسے جو یوں کمروں میں جھانکتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔
"تجھے پتہ ہے کسے تلاش کررہی ہوں۔" وہ بولی۔
"پہیلیاں کیوں بجھوارہی ہے کھل کر بات کر۔"
"بات تو پورے محلے میں کھل چکی ہے اور کیا کھل کر بات کروں۔ تجھے اور پیٹر کو تو شرم ہے نہیں۔"
"زبان سنبھال کر بات کر جو جی میں آرہا ہے بکے جارہی ہے۔"
"بک نہیں رہی وہی کہہ رہی ہوں جو پورا محلہ کہہ رہا ہے۔"
"بھاڑ میں جا تو اور تیرے ہوتے سوتے' نکل یہاں سے۔" پروین آپے سے باہر ہوگئی۔ وہ غصہ سے کانپ رہی تھی۔
"تجھ جیسی آوارہ بدچلن کو میرا ہی شوہر ملا تھا۔ خداوند ایسی عورتوں سے بچائے جو دوسروں کے گھروں کو برباد کرتی ہیں۔"
"خبردار جو ایک لفظ بھی اور منہ سے نکالا تو خون پی جاؤں گی میں تیرا۔" پروین نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ کر نسرین کی گردن پکڑ لی۔ نسرین نے بھی اس کے بال پکڑ لیے وہ دونوں گتھم گتھا ہوگئیں۔ دونوں ہاتھا پائی کرتی ہوئی دروازے تک آگئی تھیں۔ جہاں محلے والے جمع ہوکر تماشا دیکھ رہے تھے۔ پروین نے اسے دھکا دے کر گھر سے نکال دیا۔ نسرین بکتی جھکتی اپنے گھر چلی گئی۔
کچھ دیر بعد بشیر گھر آیا تو گلی میں ولسن نے اسے روک لیا اور اس کے گھر میں پیش آنے والے جھگڑے کی تمام روداد اسے کہہ سنائی۔
"یسوع تم پر رحم کرے بشیر۔" ولسن نے کہا۔ بشیر انتہائی پریشانی کے عالم میں گھر کی طرف بڑھا۔
وہ کرسی پر سر پکڑے بیٹھا تھا پروین پانی کا گلاس لیے اس کے پاس آئی۔
"لے پانی پی لے پھر جو پوچھنا ہے پوچھ لینا۔"
بشیر نے پانی کا گلاس ہاتھ مار کے دور اچھال دیا۔
'کیوں کیا تو نے ایسا بول کیوں لڑی تو نسرین سے۔" بشیر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
"یہ سوال تو نسرین سے پوچھ میں نہیں گئی تھی اس کے پاس لڑنے وہ ہمارے گھر آئی تھی۔"
"وہ کیوں آئی تھی لڑنے یہی وجہ پوچھ رہا ہوں؟"
"تو وہی سوچ رہا ہے نا جو نسرین......" وہ بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
"میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے تو آج یہ بتادے

تیرے دل میں کیا ہے؟ تو کیا چاہتی ہے؟''
''یہ تو اب پوچھ رہا ہے شادی کے دو سال بعد۔'' اس نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ تو...... تو بھی اوروں کی طرح سوچ رہا ہے نا کہاں گئی تیری محبت جس کا تو اٹھتے بیٹھتے دم بھرتا تھا۔''
''پوری برادری کی نظریں مجھ پر لگی ہیں کہ میں کیا فیصلہ کرتا ہوں۔''
''تو کرنا فیصلہ کیوں نہیں کرتا...... مرد ہو کر فیصلہ کرنے سے ڈرتا ہے تو ٹھیک ہے پھر اس کمزور عورت کا فیصلہ سن میں ابھی اور اسی وقت تیری زندگی سے نکل رہی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے تجھ سے محبت نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ تیرا بھروسا مجھ پر سے اٹھ چکا ہے۔'' وہ رونے لگی۔
''اور جاتے جاتے ایک بات میں تجھے بتادوں' عورت کو بے وقوف سمجھنا اور بے وقوف بنانا آسان نہیں ہے۔ عورت اپنے رشتے نبھانا خوب جانتی ہے۔'' وہ جانے کے لیے پلٹی' تو بشیر اس کے پیچھے لپکا۔
''نہیں جا پونو رک جا۔''
''نہیں بشیر میں نہیں رکوں گی تو مجھ پر شک کرکے اپنا حق کھو چکا ہے۔'' وہ تیزی سے گھر سے نکل گئی۔ وہ وہیں دہلیز پر بیٹھ کر رونے لگا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

پروین اپنے ماں باپ کے گھر عیسیٰ نگری چلی گئی تھی۔ وہ کیا گئی کہ جیسے زندگی اس سے روٹھ گئی۔ دنیا بشیر کی آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی۔ کئی دن تو وہ ڈیوٹی پر بھی نہیں گیا' محلے والوں اور رشتے داروں سے ملنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ سارا سارا دن یا تو گھر پر پڑا رہتا یا چرچ چلا جاتا اور صلیب کے سامنے بیٹھا روتا رہتا۔
''پروین آئی؟'' اس دن فادر نے پوچھا۔
''نہیں فادر پہلے تو وہ کبھی اتنے دن مجھ سے ناراض نہیں ہوئی۔ ایک دو دن میکے رہ کر آجاتی تھی۔ یہ تو ایک ہفتہ ہوگیا اسے گئے ہوئے نہ فون اٹھاتی ہے نہ بات کرتی ہے۔ اس کی ماں بھی اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہے۔''
''یسوع نے چاہا تو وہ واپس آجائے گی۔''
''مجھ سے بڑا گناہ ہوگیا فادر...... اس پر شک کرکے وہ ایسی ویسی عورت نہیں ہے۔''

''خداوند معاف کرے' کل چرچ میں اسپیشل دعا کروائی جائے گی۔ پروین ضرور واپس آجائے گی۔ خداوند تم پر اپنا کرم کرے گا بیٹا' ہمت رکھو۔'' فادر سینے پر کراس بناتے ہوئے بولے۔ ''ادھر گوگی چیمپئن نے بھی تنگ کیا ہوا ہے روزانہ اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی آکر دھمکی دے جاتا ہے۔ اس کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے والی ہے۔''
''کوئی بندوبست نہیں ہوا نا۔''
فادر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہر کوشش کرکے دیکھ لی' پر بات بنتی نظر نہیں آرہی۔''
''پہلے صرف ایک فکر تھی فادر چرچ کی فکر اب تو ایک اور غم بھی لگ گیا ہے۔'' بشیر مایوسی سے بولا۔
''خیر تم جاؤ خداوند کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔'' فادر نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔
وہ سر جھکائے تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

حاجی عبدالقدوس کا خانساماں رشید ان کا پرانا ملازم تھا۔ وہ بشیر کے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ ان دونوں میں بڑی اچھی دوستی ہوتی تھی۔ بشیر اکثر اسے اپنے گھریلو حالات بھی بتادیا کرتا تھا۔
اس دن بشیر چھٹی کے بعد جانے کی تیاری کررہا تھا کہ رشید نے اسے روک لیا ''میں نے چائے بنائی ہے پی کر جانا۔'' وہ دونوں لان میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ بشیر کو پریشان دیکھ کر جب اس نے استفسار کیا تو بشیر نے تمام حالات اسے کہہ سنائے۔ اس نے رشید سے مشورہ کیا کہ اگر وہ حاجی صاحب سے قرضے کی درخواست کرلے تو کیا وہ مان جائیں گے؟ یہ سن کر رشید سوچ میں پڑ گیا' پھر وہ بولا۔
''یار حاجی صاحب اپنے اصولوں کے بڑے پکے ہیں۔ وہ ہم ملازموں سے ایک ایک پیسے کا حساب لیتے ہیں اور پھر تمہیں یہاں ملازم ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے وہ انکار کردیں گے۔''
بشیر مایوسی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد رشید بولا۔
''اگر تم ہمت کرو تو ایک آئیڈیا ہے میرے پاس چرچ کا مسئلہ چٹکی میں حل ہوجائے گا اور میرا اور تمہارا بھی بھلا

ہو جائے گا۔'' وہ ادھر ادھر دیکھ کر رازداری سے بولا۔
''جلدی بتا کیا آئیڈیا ہے؟'' بشیر دلچسپی سے بولا۔
''تمہیں تو پتا ہے حاجی صاحب بہت بیمار اور بوڑھے ہیں' یہاں ان کا کوئی نہیں' گھر والے سب ملک سے باہر ہیں' وہ یہاں ہم ملازمین کے سہارے ہی زندگی گزار رہے ہیں۔''
''ہاں تو پھر؟''
''پھر یہ کہ حاجی صاحب بہت امیر ہیں' ان کے بیڈ کے سرہانے جو تجوری رکھی ہے اس میں انہوں نے بڑا مال اکٹھا کیا ہوا ہے' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سیروں کے حساب سے تو سونا ہی ہے نوٹوں کی گڈیاں الگ۔ تجوری کی چابی میں اڑا لوں گا' تو بولے تو آج ہی کارروائی ڈال دیتے ہیں۔'' اس نے نہایت دھیمی آواز میں اپنا فیصلہ اسے سمجھایا۔ بس تمہیں حاجی صاحب کو بے ہوشی کا انجکشن لگانا ہوگا۔'' یہ سنتے ہی بشیر بھڑک گیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
''او شرم کر لوٹ کے مال سے چرچ بچاؤں گا۔ لعنت ہے تیری اس گھٹیا سوچ پر تو مجھے چوری کرنے کو کہہ رہا ہے۔''
''میں نے تو تیری مدد کے خیال سے کہا تھا پھر بچالے چرچ میں بھی دیکھتا ہوں کیسے بچائے گا؟''



وہ دو دن سے بخار میں پھنک رہا تھا اور چارپائی پر بے سدھ پڑا تھا اسے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں پکارا۔
''او پینو پانی پلا دے۔'' وہاں کوئی ہوتا تو سنتا خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اسے ایک دم یاد آیا کہ پروین تو اس سے روٹھ کر چلی گئی ہے وہ اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رونے لگا۔
''لے چاچا پانی پی لے۔'' نسرین پانی کا گلاس لیے کھڑی تھی۔
''نسرین تو کب آئی؟''
''جب تو پانی مانگ رہا تھا۔''
''اچھا۔''
''تو رو رہا ہے؟''
''میں کہاں رو رہا ہوں۔'' بشیر اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔
''پروین کے لیے تیرے دل میں چھپا پیار تیری آنکھوں سے ٹپک رہا ہے چاچا۔'' پھر وہ ٹھہر کر بولی۔ ''مجھے معاف کر دے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ آگ میری لگائی ہوئی ہے جس کے شعلوں نے تیرے گھر کو جلا دیا چاچا تو ایک بار اسے لے آ میں پیر پکڑ کر اس سے معافی مانگ لوں گی' میرا شک بے بنیاد تھا۔''
''میرا بس چلے تو ابھی اسے لے آؤں پر اس نے دھمکی دی ہے کہ بشیر مجھے لینے آیا تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔ نسرین وہ ماں بننے والی ہے مجھے ڈر لگتا ہے کہیں وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ بتا کیا کروں اسے کیسے لاؤں؟''
''تو فکر نہ کر چاچا میں خود اس کے گھر جاؤں گی۔ اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گی اور کسی بھی طرح اسے منا کر لے آؤں گی۔'' ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پیٹر بھی آ گیا۔
''کیوں آیا تو یہاں اپنی منحوس شکل لے کر؟''
''کہہ لے چاچا کہہ لے جو تیرے جی میں آئے کہہ لے پچ تو یہ ہے کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی برائی نہیں تھی۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا چاچا اور پروین چاچی بھی بہت نیک اور بے عیب عورت ہے۔'' وہ اس کے پاس قدموں میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔
''اچھا تو اب اس کی نیکی کی گواہی مجھے تیرے منہ سے سننا پڑے گی۔ او بے غیرت تیری وجہ سے میں نے اپنی بے قصور بیوی پر شک کیا چلا جا کہیں غرق ہو جا' دور ہو جا میری نظروں سے۔''
''مجھے معاف کر دے چاچا میں شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے یہ سب ہوا ہے میں خود چاچی کو منانے جاؤں گا۔''
نسرین اور پیٹر دیر تک بیٹھے اسے دلاسا دیتے رہے۔
وہ جمعہ کا دن تھا' بشیر صبح سویرے حاجی صاحب کے گھر ڈیوٹی پر جانے کے لیے نکلا راستے میں وہ چرچ کے سامنے رک گیا اور بڑی حسرت زدہ نظروں سے اپنی عبادت گاہ کو دیکھنے لگا۔
موتی مسجد سے ظہر کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ حاجی عبدالقدوس نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد جانے

کے لیے تیار تھے۔ رشید غالباً سودا سلف لینے باہر گیا ہوا تھا اب بشیر کی ڈیوٹی تھی کہ وہ حاجی صاحب کو ویل چیئر پر مسجد لے جائے۔

وہ حاجی صاحب کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا مسجد کی سمت بڑھا...... نمازی جوق در جوق موتی مسجد کی طرف رواں دواں تھے۔ آج انہیں گھر سے نکلنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ بحرحال اس نے حاجی صاحب کو مسجد کے اندر پہنچایا اور خود باہر سیڑھیوں کے پاس جہاں گارڈ بیٹھا تھا زمین پر بیٹھ گیا۔

اس نے ایک نظر مسجد کی پرشکوہ عمارت کو پھر اس کے اندر صفیں باندھے ہوئے نمازیوں کو دیکھا جو نماز ادا کررہے تھے۔ اس کا دل بھر آیا' وہ دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب تھا۔

''اے مسلمانوں کے خداجی جیسے یہ آپ کا گھر ہے ویسے وہ بھی آپ کا گھر ہے جو گرایا جارہا ہے' پر میں بے بس ہوں کچھ نہیں کرسکتا' میں نے کوئی گناہ نہیں کیا اور ساری زندگی ایمانداری سے بسر کی ہے' چرچ کو بچانے کے لیے مجھے ہمت عطا کردیں' میری بے بسی دور کردیں' اس گھر کے صدقے اس گھر کو بچالیں۔ خداجی' ایک مسیحی نے آپ کو پکارا ہے...... میری پکار سن لیں۔ میری فریاد سن لیں۔ میں آج یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ وہ بڑے جذب کے عالم میں دعا مانگ رہا تھا۔

اسی وقت اس کی نظر اس موٹر سائیکل پر سوار لڑکے پر پڑی جو تیزی سے موٹر سائیکل روک کر اترا تھا اور عجلت میں مسجد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور وہ بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ اسی وقت اس نے سامنے سے کھلی ہوئی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ چیک کیا تھا...... اسی لمحہ بشیر مسیح کی نظر اس کی جیکٹ کے اندر چھپی تاروں پر پڑی' چشم زدن میں بشیر کے ذہن میں جھماکا سا ہوا' وہ یقیناً خودکش حملہ آور تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اس نوجوان کی طرف لپکا۔

''او بھائی ایک منٹ کہاں جارہے ہو رکو۔''

وہ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا بشیر نے اسے پیچھے سے پکڑلیا۔

''چھوڑو مجھے۔'' وہ زورآزمائی کرنے لگا۔

''نہیں چھوڑوں گا...... اندر نہیں جانے دوں گا۔'' اس نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور آگے بڑھا ہی تھا کہ بشیر نے سنبھل کر اس کی جیکٹ کا کالر پیچھے سے پکڑتے ہوئے اسے کھینچا۔ نہ جانے اس وقت بشیر میں اتنی طاقت کیسے آگئی تھی کہ اس نے نوجوان کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر دور پھینک دیا۔ گارڈ حیران پریشان دیکھتا رہ گیا اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی جیسے مفقود ہوگئی تھیں۔

نوجوان کے باہر گرتے ہی کان پھاڑ دینے والا ایک زوردار دھماکا ہوا بشیر بھی جھٹکے سے دور جاگرا پھر اسے ہوش نہ رہا۔

شہر بھر کی سائرن بجاتی ایمبولینس' فائر بریگیڈ اور پولیس کا عملہ جائے حادثہ کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز آرہی تھیں اور یہ خبر چند ہی لمحوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ ڈیفنس میں واقع موتی مسجد پر خودکش دھماکا ہوا ہے۔ دہشت گرد جس گاڑی پر جا گرا تھا وہ مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھی۔ دہشت گرد نے گرتے گرتے اپنی خودکش جیکٹ کا بٹن دبادیا تھا جس کے نتیجے میں یہ زوردار دھماکا ہوا تھا۔ اس دھماکے کی آواز کئی کلومیٹر دور تک سنی گئی تھی۔ آس پاس عمارتوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ بشیر' گارڈ اور ایک دوراہ گیر زخمی ہوئے تھے جس میں بشیر مسیح سب سے شدید زخمی ہوا تھا۔ اسے فوری طور پر قریبی اسپتال لے جایا گیا تھا جہاں اسے طبی امداد دی جارہی تھی۔ آپریشن تھیٹر میں اس کا آپریشن جاری تھا' اس کا ایک بازو کئی جگہ سے فریکچر تھا اور چہرے اور گردن پر بھی گہرے زخم آئے تھے باقی زخمیوں کو بھی طبی امداد دی جارہی تھی۔

پروین کو بھی کسی نے فون کردیا تھا۔ وہ فوری طور پر اسپتال پہنچ گئی تھی اور اس وقت آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھی زاروقطار رو رہی تھی۔ بشیر کی برادری کے بہت سارے لوگ بھی باہر موجود تھے۔

''نہ رو چاچی ...... ڈاکٹر نے بتادیا ہے چاچا کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

''سچ سچ بتا نسرین وہ بچ تو جائے گا؟''

''وہ بالکل بھلا چنگا ہے' آپریشن کے بعد اس کا بازو ٹھیک ہوجائے گا۔ تمہاری دعاؤں سے وہ بچ گیا ہے۔ ایک تو تم روئے جارہی ہو' دوسرے تم نے اسے چھوڑ بھی رکھا تھا۔

سچ کہہ رہی ہوں چاچی وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے ہر وقت وہ تمہیں یاد کرتا تھا تم نے اسے بڑی سزا دے دی ہے۔''
پروین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
آپریشن ہوئے چوتھا دن تھا' بشیر کو وارڈ میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ پروین آج اس کے لیے اس کی پسند کا کھانا بنا کر لائی تھی اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلا رہی تھی' جب چند افراد کمرے میں داخل ہوئے' ان میں سے نورانی چہرے اور لمبی سفید داڑھی والا ایک شخص آگے بڑھا اور بشیر کی خیر و عافیت دریافت کی پھر کہا۔
''بشیر مسیح تم نے جس طرح اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے اللہ کا گھر اور سیکڑوں قیمتی جانوں کو بچایا ہے اس نے ہمارا دل جیت لیا ہے۔ اس لیے حاجی عبدالقدوس اور مسجد کی انتظامی کمیٹی کے باقی ارکان نے تمہیں یہ رقم دینے کا فیصلہ کیا ہے جو اگرچہ تمہاری ہمت اور شجاعت کے سامنے کچھ بھی نہیں لیکن بہرحال اس پر تمہارا حق ہے۔'' انہوں نے تین لاکھ خطیر رقم کا چیک بشیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''نہیں سرجی یہ تو میرا فرض تھا۔ میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔''
''یہ رکھو بشیر یہ ہم اپنی خوشی سے تمہیں دے رہے ہیں۔'' انہوں نے رقم کا چیک بشیر کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''حکومت کی طرف سے جو انعام ملے گا یہ اس کے علاوہ ہے۔ بزرگ شخص نے بشیر کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا پروین منہ کھولے حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
ان کے جاتے ہی اخباری رپورٹرز اور ٹی وی چینلز والوں نے یلغار کردی۔ بشیر تسلی سے انہیں واقعہ کی تفصیلات بتاتا رہا۔ چہار سو اس کی ہمت' بہادری اور شجاعت کی داد دی جارہی تھی۔
سہ پہر کو فادر بشیر کا حال احوال پوچھنے اسپتال آئے ہوئے تھے اور اس کے پاس بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ اسی وقت ایک ایم این اے بمعہ اپنے لاؤلشکر کے بشیر کے پاس آئے اور بشیر کی خیریت دریافت کی پھر کہا۔
''حکومت کی طرف سے انعامی رقم کا چیک ایک دو دن میں تمہیں مل جائے گا اور بتاؤ مزید ہم تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں؟''
بشیر نے کہا۔ ''نہیں کچھ نہیں جی یہ کیا کم ہے کہ آپ لوگ اتنا اچھا میرا علاج کروا رہے ہیں۔''
اسی وقت فادر نے کہا۔ ''بیٹا اب میں چلتا ہوں' شام کو گوگی چیمپئن اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئے گا' آج اس کی دی ہوئی مہلت کا آخری دن ہے۔ چرچ ہمارے ہاتھ سے چلا جائے گا۔'' ان کے لہجے میں گہری اداسی تھی۔
''خداوند پر یقین رکھیں فادر اس سے ایک دو دن کی مہلت اور لے لیں' رقم کا انتظام ہوجائے گا۔''
''کیا بات ہے بشیر؟'' ایم این اے بولے۔
''کچھ نہیں صاحب۔'' بشیر نے کہا۔
''فادر آپ بتائیں یہ گوگی چیمپئن کون ہے؟ اور چرچ کا کیا مسئلہ ہے؟''
فادر انہیں تفصیل سے آگاہ کرنے لگے۔ تمام تفصیلات سن کر وہ بولے۔
''پاکستان میں رہنے والی تمام اقلیتوں کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کا حق حاصل ہے' یہاں کسی عبادت گاہ کو مسمار نہیں کیا جاسکتا' فادر آپ بے خوف ہوکر اپنی عبادات کریں گوگی چیمپئن وغیرہ کو دیکھ لیا جائے گا' اس بات کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔''
اسی شام گوگی چیمپئن کو اس کے ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا گیا تھا اور علاقے میں موجود اس کے جوئے اور منشیات کے اڈے مسمار کردیئے گئے تھے۔ دو دن بعد کرسمس تھی علاقے کے تمام افراد خوشی سے نہال تھے۔ بشیر مسیح صحت مند ہوکر گھر آچکا تھا۔
''دیکھو پو کیسی کمیٹی کھلی میری۔'' بشیر نے ہنستے ہوئے پروین سے کہا۔
''کمیٹی سے یاد آیا' میری کمیٹی کے پیسے کہاں ہیں؟ جلدی نکال مجھے کرسمس کے لیے سونے کا سیٹ اور کپڑے لینے ہیں اور تیرے لیے نیا جوتا بھی تو لینا ہے۔'' وہ زور سے ہنس پڑا۔
''قسم خداوند کی پو میں نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا' وہ اندر پیٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔''
''ہاتھ لگا کر دیکھنا نا پھر بتاتی تجھ کو۔'' وہ ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔



ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 18

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔





شہاب نے عین کو شیشے میں اتارنا چاہا تھا۔ مگر عین نے نظریں نیچی کیے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔

''اوہ بہن مجھے اندازہ ہے آپ مشکل میں ہیں آپ کا بھائی آپ کے مسائل حل کرنا چاہتا ہے ایک موقع دیجیے۔'' شہاب مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ عین فوراً اٹھی تھیں اور چلتی ہوئی کیمپ کی طرف بڑھ گئی تھیں ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا خوف کے مارے برا حال تھا ایک تو تیمور کی خبر نہیں تھی عین نے کسی طرح شہاب کے سامنے اس حیرت اور خوف پر قابو پالیا تھا مگر اب کیمپ میں آکر ان کا مارے خوف کے برا حال تھا۔

''یا اللہ ہم کس مشکل سے دوچار ہونے والے ہیں، یہ کیسی نئی آزمائش ہے؟'' انہوں نے خوف کے مارے سر پر ہاتھ رکھا تھا دل کی دھڑکنوں میں اتنا خوف تھا کہ جیسے دل ابھی باہر آجائے گا وہ حیران تھیں شہاب کے اچانک سامنے آجانے پر وہ زندہ کیسے بچا تھا وہ نہیں جانتی تھیں۔ مگر وہ اسے سامنے دیکھ کر بہت زیادہ حیران ہوئی تھیں۔

''تیمور، آپ کو ہمارے ساتھ ہونا چاہیے تھا آپ نے اتنی سی بات پر ہم سے منہ کیوں پھیر لیا، کہیں واقعی آپ واپس تو نہیں لوٹ گئے، اگر آپ واپس لوٹ گئے تو ہم یہاں کیا کریں گے، آپ نے ہمیں اس قدر تنہا کیسے کردیا تیمور، اس وقت میں کیوں چھوڑا جب ہمیں آپ کی انتہائی ضرورت تھی۔'' وہ بے حد الجھ کر رہ گئی تھیں دل جہاں خوف سے بھرا تھا ذہن یکدم مفلوج ہوگیا تھا۔



''آپ کی دوستی ایک ماں کے دل کے آڑے آگئی ماں کے دل کو مشکل میں ڈال دیا ہے آپ نے حکمت صاحب، نواب صاحب سے دوستی کا حق آپ نے تو ادا کردیا، مگر ہم کیا کریں ہمارا اکلوتا، جوان بچہ، دور ہوگیا کیا کریں کچھ کیجیے، کسی رابطے کی گنجائش نکالیے کوئی خیر خبر پتا تو چلے کہ ہمارے سپوت کہاں ہیں۔'' بیگم حکمت نے شوہر سے کہا تھا۔ حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''بیگم صاحبہ آپ نے منصوبہ سازی کا رخ بدلا اگر ہم ہندوستان میں ہیں تو آپ کی وجہ سے آپ پاکستان جانے کو تیار نہیں تھیں۔'' حکمت صاحب نے بیوی کو الزام دیا تھا۔

''آپ ہمارے لیے نہیں، اپنے جگری دوست کے باعث یہاں ہیں اگر آپ پاکستان روانہ نہیں ہوئے تو اس کی وجہ نواب صاحب ہیں آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا کہ آپ جلال کے ہمراہ رہنا چاہتے تھے۔'' بیگم حکمت نے الزام دیا تھا حکمت خاموش ہوگئے تھے اور پھر آہستگی سے بولے تھے۔

''ہمارا ارادہ تھا کہ ہم پاکستان جائیں گے اور وہاں تیمور کے ساتھ رہائش اختیار کریں گے مگر آپ نے اس قدر دباؤ ڈالا کہ ہم نے ارادہ بدل دیا یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے جلال کی فکر اور نواب صاحب سے دوستی میں یہ قدم اٹھایا مگر اس میں آپ کی رائے بھی شامل رہی، دوسری بات یہاں کرنے کا مقصد اللہ تبارک و تعالیٰ پر یقین ہونا تھا کیونکہ ہمارے منصوبے اور ارادے اللہ کی مرضی کے سامنے کچھ نہیں ہمیں نے آپ کی رائے کے ہمراہ جلال کے بارے میں سوچ بچار کر کے یہ فیصلہ لیا اور اس کو اللہ کی رضا جان لیا، ہم اللہ کی مرضی کے سامنے سر جھکانے والی قوم ہیں بیگم اللہ کی اطاعت ہی زندگی کا مقصد ہے ہم نے یہاں رک کر کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور باقی معاملات کو اللہ پر ڈال دیا بے شک اللہ کی ذات ہی اسباب بنانے والی ہے تیمور ایک سمجھدار نوجوان ہے زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر ہم تیمور پر بھروسہ کرتے ہیں اللہ نہ کرے وہ کسی خطرے میں پڑے ہوں یا کسی آنچ نے بھی انہیں چھوا ہو اللہ ان کے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہے گا ہم نے تیمور کی حفاظت کا ذمہ اپنے رب کو سونپا ہے ہمارا دل مطمئن ہے تیمور لوٹ کر صحیح سلامت آئے گا ہمیں اس کا یقین ہے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا۔

''اللہ پر یقین ہمیں بھی ہے حکمت صاحب مگر ہمارا دل ماں کا دل ہے ماں کا دل بچے سے دوری پر کیسے تڑپتا ہے یہ آپ نہیں جان سکتے اللہ ہمارے بچے کی حفاظت فرمائیں ہم اپنے بچے کی سلامتی کے لیے دعاگو ہیں مگر ہمارا دل ان سے دور پر کتنا ہے یہ فطری احساس ہے دل پر پتھر رکھے بیٹھے ہیں ہم آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتے مگر ہم دل کا کیا کریں دل پر جبر کیے بیٹھے ہیں۔'' بیگم حکمت کی آنکھیں آنسوؤں سے

بھر گئی تھیں۔

''آپ فکر مت کیجیے بیگم ہم ہائی کمیشن میں بات کریں گے ضرور کوئی نہ کوئی سرا ہاتھ لگے گا۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور ان کے یہ الفاظ پتا نہیں ماں کے دل کو دلاسہ دے سکے تھے کہ نہیں مگر بیگم حکمت خاموش اپنے خاوند کو دیکھنے لگی تھیں حکمت صاحب نے یقین دلانے کے لیے سر ہلایا تھا مگر بیگم حکمت کچھ بولی نہیں تھیں۔



شہاب کا خوف اس کے اوسان خطا کر رہا تھا وہ اپنے رگ و پے میں ایک سنسنی سی محسوس کر رہی تھی اگر تیمور ساتھ ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی مگر اب جبکہ تیمور کی کچھ خبر نہیں تھی اور مرزا حیدر سراج الدولہ کا بھی کچھ اتا پتا نہیں تھا تو وہ مزید دہشت میں گر گئی تھی، فرط خوف سے اس کا برا حال تھا۔

''تیمور آپ اتنی چھوٹی سی بات پر ہمیں اکیلا کر کے کیونکر اور کیسے جا سکتے ہیں آپ نے وعدہ کیا تھا ذمے داری لی تھی پھر وعدہ ایفا کیے بنا آپ راہ سے بدل سکتے ہیں۔ ذمے داری پوری کیے بنا راہ کیسے بدل سکتے ہیں؟'' وہ بھیگتی آنکھوں سے سوچ رہی تھی جب پشت سے آواز ابھری تھی۔

''آپ کچھ غمگین ہیں؟'' وہ لہجہ وہ آواز شہاب کا تھا عین جو رخ پھیرے کھڑے تھی اس نے سیاہ چادر کے کونے سے چہرہ چھپالیا تھا اور پلٹے بنا سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

''کوئی مدد درکار ہو تو حکم کیجیے خاتون ہم خود ماں بہنوں والے ہیں عورت کی عزت اور توقیر کے معنی سمجھتے ہیں۔'' شہاب اسے اجنبی جان کر شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا وہ شاید نہیں پہچان پایا تھا کہ اس چادر کے اندر لپٹی عین ہے عین کو یہ جان کر تسلی ہوئی تھی اور اندر کا خوف کچھ تھما تھا مگر شہاب کا اس کے گرد موجود رہنا کسی خطرے سے خالی نہ تھا اس کے ارد گرد رہنے کا مطلب تھا اس کا گھیرا تنگ کرتے جانا اور اپنے مقاصد کے اصول کے لیے جال بچھاتے رہنا عین نے گہری سانس لے کر جیسے ہمتوں کو مجتمع کیا تھا اور دانستہ بھاری لہجے میں بولی تھی۔

''ہمارے خاوند کسی کام سے گئے ہیں بھیا آپ یہاں سے جائیے وہ آ گئے تو قیامت اٹھا دیں گے قدرے شکی مزاج ہیں ہمارے گرد کسی کا سایا برداشت نہیں کرتے ہو سکے تو کرم کیجیے ہمارے تعاقب میں دوبارہ مت آئیے ورنہ ہمارے خاوند ہمارے کردار پر الزامات کی بوچھاڑ کر دیں گے معافی چاہتے ہیں مگر موصوف ایسا ہی مزاج رکھتے ہیں۔'' اس نے دانستہ کہانی گھڑی تھی وہ شہاب کو اپنے ارد گرد نہیں چاہتی تھی سو بولی تھی شہاب نے اس کے پیچھے کھڑے اس کی پشت کو بغور دیکھا تھا وہ اسے پہچان سکا تھا یا نہیں عین یہ جان نہیں پائی تھی مگر وہ اس کی موجودگی اپنے گرد نہیں چاہتی تھیں تبھی محتاط رویے میں کہا تھا شہاب خاموشی سے جانے کیوں عین کو دیکھتا رہا تھا۔ پھر آہستگی سے بولا تھا۔

''بہن جی بے فکر رہیے میں تو بس آپ کی مدد کرنا چاہ رہا تھا ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے ہم بھی ماں بہنوں والے ہیں عزت کا خیال کرنا جانتے ہیں۔'' شہاب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا جانچتی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور پھر جانے کیا سوچتا ہوا پلٹ گیا تھا عین نے اس کے جانے کا یقین کیا تھا دھڑکنوں میں واضح خوف تھا ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا تھا شہاب جا چکا تھا اس نے سکون کی ایک گہری سانس خارج کی تھی وقتی طور پر ہی سہی خطرہ ٹل گیا تھا مگر دل کے اندر جو دھڑکا تھا وہ جوں کا توں موجود رہا تھا وہ اس کا سبب نہ جان پائی تھی مگر ایک خوف دل میں مسلسل گھر کیے رہا تھا۔

''تیمور کہاں ہیں آپ ہم آپ کے بارے میں نہیں جانتے اگر آپ کو جانا تھا تو ہمیں آگاہ کر کے تو جاتے ہم ایک اجنبی جگہ پر بے یار و مددگار کیا کریں گے، آپ کو برا لگا تھا یا دل دکھا تھا تو ہم سے کہہ دیا ہوتا۔

ہمیں اس طرح بے سہارا تو نہ چھوڑا ہوتا اب اس غیر جگہ پر غیر لوگوں کے درمیان ہم کیا کریں گے؟ ایک تو مرزا حیدر کا کچھ اتا پتا نہیں اس پر شہاب کی آفت بھی نازل ہو گئی، ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہم بہت اکیلے پڑ گئے ہیں ہم کیا کریں یا اللہ ہماری مدد فرما ہم اس شہاب کا سامنا دوبارہ کرنا نہیں چاہتے۔'' وہ بے دلی سے خود سے مخاطب ہوئی تھیں ان کی آنکھوں میں بہت سی سوچیں تیرتی دکھائی دی تھیں۔



''بھیا ہم کہہ رہے ہیں ہم بارڈر کے اس طرف سے

ہجرت کر کے آئے ہیں ہم امراء میں سے ہیں آپ سے بھیک نہیں مانگ رہے اپنی جائیدادیں گھر بار آباؤ اجداد کی قبریں اور کئی اثاثے وہاں چھوڑ کر آئی ہیں اپنا حصہ چھوڑ آئے ہیں اور یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی؟'' مرزا حیدر نے کلیم کی کوشش میں زچ ہو کر کرسی پر بیٹھے نئی گردن والے شخص سے کہا تھا اس نے سر ہلا دیا تھا۔

''بھیا آپ کی بات میں دم ہے مگر میاں یہاں کلیم کرنے والے تھوڑے نہیں ہیں، قطار در قطار کھڑے ہیں ہم اتنے وسائل نہیں رکھتے کہ جان سکیں کون سچا ہے اور کون جھوٹا مگر ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ کلیم کرنے والے کی درخواست پر ہر صورت میں غور کیا جائے اور ہم اپنی سی کوشش بھی کر رہے ہیں، ہمیں کون سا اپنی جیب سے دینا ہے دیتے ہوئے تکلیف نہیں ہے ہمیں اللہ کا شکر ہے پاکستان کا دل بہت بڑا ہے ہم اپنے مہاجر بہن بھائیوں کی قربانیوں سے آگاہ ہیں اسی لیے تو ہم یہاں بیٹھے ہیں آپ درخواست دیں ہم اس پر عمل ضرور کریں گے حساب کتاب سے دیکھ کر آپ کو ان اثاثوں سے مطابقت رکھتے اثاثے آپ کے نام الاٹ کر دیے جائیں گے بھیا حکومت کے کام ہیں زبانی کلامی تو ہونے سے رہے لکھت پڑھت ہوتی ہے آپ ان اثاثوں کی مالیت کے مطابق تفصیلات فراہم کر دیں ہم آپ کو ان تفصیلات سے ملتی جلتی جگہیں الاٹ کر دیں گے اتنا بڑا پاکستان ہے ہم نے اراضی اور املاک جیب میں ڈال کر تھوڑا نا رکھنا ہے نہ ہم جیب سے کچھ دے رہے ہیں۔'' کرسی پر بیٹھے کلرک نے مسکراتے ہوئے معقول جواز دیا تھا حیدر میاں نے گردن ہلا دی تھی۔

''مگر محترم جو کرنا ہے جلدی کیجیے اتنی سست روی سے کام کرو گے تو ہماری اگلی نسلیں ہی اس کلیم کو وصول کریں گی۔'' مرزا حیدر سراج الدولہ کے کہنے پر کلرک کی باچھیں کانوں سے جا لگی تھیں۔

''میاں ایسے سانحہ نہیں ہونے دیں گے ہم مگر جو ہوگا قاعدے سے ہوگا آپ اپنی جائیداد اور اثاثوں کی تفصیلات بتا دیجیے ہم زبانی کلامی کام نہیں کر سکتے ہماری بھی مجبوری ہے آپ کی مدد کو ہی یہاں بیٹھے ہیں ہر ممکن کوشش کریں گے۔'' کلرک نے یقین دلایا تھا حیدر میاں نے سر ہلا دیا تھا اور رجسٹرڈ پر جھک کر اپنے اثاثوں کی تفصیلات درج کرنے لگے تھے۔



''شکر ہوا بھیا تم نے ٹرین سے گرتے گرتے دروازے کو زور سے تھام لیا، ورنہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا ٹک کے کہیں بیٹھیں گے تو ہاتھ سے صدقہ خیرات کریں گے اللہ نے نئی زندگی بخشی ہے آپ کو ٹرین کے دروازے میں جا ہی پڑے تھے کہیں نیچے لڑھک جاتے تو ہم اماں ابا کی روح کو کیا منہ دکھاتے اماں ابا نے تو چھوٹے بھائی کی ذمہ داری ہمیں ہی سونپی تھی نا اگر تمہیں کچھ ہو جاتا ہم تو خود کو معاف بھی نہ کر پاتے۔'' بہن نے مکمل خیال کرتے ہوئے بھائی کا ماتھا چوما تھا شہاب مسکرا دیا تھا۔

''آپا آپ نے زندگی بخشی ہے بس اب جو بھی حماقتیں کی ہیں ان کو نہیں دہرانا۔'' شہاب نے پیلے دانتوں کی نمائش کی تھی۔

''میرا پیارا بھائی۔'' بہن نے بھائی کی بلائیں لی تھیں اور اچانک چونکتی ہوئی بولی تھیں۔

''یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ تم نے دروازے کو تھام لیا مگر تم تو باقی ماندہ سفر میں دکھائی بھی نہیں دیے ہم کیسے فکرمندی میں گھر گئے تھے کچھ پتا ہے کیا تم اتنی دیر تک اسی دروازے سے لٹکے رہے تھے ہم تو کئی بار بیت الخلاء کی سمت گئے دروازے میں تو نہ دیکھا آپ کو۔'' بہن کے پوچھنے پر شہاب مسکرا دیا تھا۔

''ہم کسی طرح ٹرین کی چھت پر سوار ہو گئے تھے سو آپ سے رابطہ ممکن نہیں ہو سکا مگر ہم محفوظ رہے آپ کو اسی پر خوش ہونا چاہیے۔'' شہاب شرارت سے آنکھ دبا کر بولا تھا تو ہمشیرہ مسکرا دی تھی۔

''شیطان کہیں کے یوں بھی شیطان کی رسی اللہ میاں لمبی چھوڑ دیتے ہیں۔'' ہمشیرہ نے مسکراتے ہوئے بھائی کو چپت لگائی تھی شہاب کھلکھلا کر ہنس دیا تھا۔



''آپ نے ہائی کمیشن سے رابطہ کیا کچھ پتا چلا؟'' بیگم حکمت نے پوچھا تھا، حکمت صاحب نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

''نہیں ایسا ممکن نہیں ہوسکا ہم نے پوچھ گچھ کی تھی مگر کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا نئی مملکت بنی ہے روابط اگرچہ موجود ہیں اور وہ ریاستوں کے درمیان معاملات اور روابط کی راہ بھی ہے مگر اس طور فعال نہیں اس سب میں زمانہ لگے گا، تب تک انتظار کرنا ہوگا۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا بیگم حکمت نے پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا۔

''اب ہم تب تک کہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھیں رہیں گے چاہتے کیا ہیں آپ۔ ہم اپنے فرزند کو فراموش کر کے بیٹھ جائیں اور دو ریاستوں کے درمیان تعلقات اور روابط فعال ہونے کا انتظار کریں؟'' بیگم حکمت نے شوہر نامدار کو خشمگین نظروں سے دیکھا تھا تبھی حکمت صاحب مصلحت پسندی سے گویا ہوئے تھے۔

''ہم اپنی سی کوشش کر تو رہے ہیں بیگم، مگر اتنی جلد تفصیلات نہیں ملتیں مہاجرین کی تفصیلات درج کرنے کا ایسا کوئی مناسب بندوبست نہیں ہے مگر ہم پھر بھی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا بیگم حکمت نے حکمت صاحب کو بھیگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''کہے دیتے ہیں ہم حکمت صاحب آپ نے کچھ نہ کیا تو ہم خود ٹرین میں سوار ہو کر پاکستان کے لیے روانہ ہو جائیں گے کچھ بھی ہو ہم اپنے لاڈلے سپوت کو آپ کی دوستی کی نذر نہیں کر سکتے، ہماری جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے ہم اپنے بچے کی صورت دیکھنے کے لیے کتنے بے تاب ہیں آپ سوچ نہیں سکتے ہماری روح غمگین ہے سوچ کر نیند نہیں آئی جانے کس حال سے گزر رہا ہوگا ہمارا بچہ جانے کیا گزر رہی ہوگی اس پر۔'' بیگم حکمت نے آنسوؤں کے ساتھ کہا تھا حکمت صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے پھر مدہم لہجے میں بولے تھے۔

''آپ فکر مند نہ ہوں بیگم ہم بھی آرام سے نہیں بیٹھے جوان بیٹے کی ہمیں بھی اتنی ہی فکر ہے ہم بھی پریشان ہیں، ہم کوشش کر رہے ہیں رابطے کی کوئی صورت ضرور بنے گی۔'' انہوں نے بیگم کو تسلی دی تھی۔

''آپ کے پاکستان جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اس سے قبل کوئی نہ کوئی خبر مل جائے گی۔'' حکمت صاحب نے سمجھایا تھا انہوں نے بیگم کو تسلی دینا چاہی تھی مگر وہ بھڑک اٹھی تھیں۔

''سن سن کے کان پک گئے ہیں ہمارے اپنی دوستی کی سزا اپنی اولاد کو تو مت دیجیے حکمت صاحب آپ کو کیا خبر ایک ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے جانے کس حال میں ہوں گے تیمور، آپ تو یوں غافل بنے بیٹھے ہیں کہ کان پر جوں تک نہیں رینگتی، ہم خود جا رہے ہیں پاکستان بھاڑ میں جائیں آپ کے اثر و رسوخ اور ہائی کمیشن۔'' بیگم حکمت دھمکاتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں حکمت صاحب خاموشی سے دیکھ کر رہ گئے تھے۔



عین کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی جب اس کی نظر مرزا حیدر سراج الدولہ پر پڑی تھی وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھے مگر جیسے ہی عین نے ان کو پکارا تھا وہ پلٹ کر آگے بڑھنے لگے تھے اب حیدر نے سنا نہیں تھا یا جان بوجھ کر ان کی آواز سن کر نظر انداز کی تھی وہ جان نہیں پائی تھیں مگر وہ تیز تیز چلتی ہوئی آگے بڑھی تھیں دل جانے کیوں مزید بے چین ہو گیا تھا وہ ایک جست میں حیدر میاں کے قریب پہنچ جانا چاہتی تھیں مگر اچانک پاؤں پتھر سے ٹکرایا تھا اور وہ چکرا کر زمین پر آ رہی تھیں، نگاہ اٹھا کر دیکھا تو تو حیدر میاں ہجوم میں غائب ہو چکے تھے پاؤں پر ٹھوکر لگنے سے جو چوٹ لگی تھی اس سے خون رسنے لگا تھا عین ایک سسکی لے کر زخم کی نوعیت دیکھنے لگی تھی، انہیں اندازہ نہیں تھا شہاب ان کے کتنا قریب کھڑا تھا وہ جھکی زخم دیکھ رہی تھیں جب شہاب کی آواز کان میں پڑی تھی۔

''محترمہ کیا ہوا، کسی مدد کی ضرورت ہے؟'' شہاب کی آواز سنتے ہی اس کے تمام اوسان ایک لمحے میں چونکے تھے اس نے اسی طرح جھکے جھکے سیاہ چادر کے کونے سے منہ کو چھپایا تھا۔

''شکریہ، ہمیں کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بادل ناخواستہ کہہ کر اس طرح سے اٹھی تھی کہ ان کا رخ شہاب کی سمت نہ رہے اٹھ کر وہ چلنے لگی تھی مگر پاؤں مڑنے سے شاید موچ آ گئی تھی سو وہ تکلیف سے کراہ کر رہ گئی تھیں، شہاب ان کے سامنے آن رکا تھا اور خاموشی سے بغور ان کو دیکھنے لگا تھا۔ عین نے دانستہ ان سے نگاہ نہیں ملائی تھی۔

''جانے کیوں لگتا ہے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے محترمہ۔'' شہاب اسے پہچان چکا تھا یا یہ محض قیاس تھا؟'' وہ نہیں جانتی تھی مگر اس نے تکلیف کو بھول کر بہت مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

''بھائی صاحب ہم نے کہا کہ ہمیں مدد کی ضرورت نہیں آپ جائیے یہاں سے دریافت کرنے کے لیے شکریہ۔'' وہ کہہ کر پلٹی تھی اور تکلیف بھول کر چلتی ہوئی کیمپ کی طرف آ گئی تھی شہاب اسے جاتا دیکھتا رہا تھا پھر جانے کیوں اس کے لبوں پر مسکراہٹ اتر آئی تھی۔



فتح النساء کو اس رشتے کی کوئی منزل دکھائی نہیں دیتی تھی وہ جلال سے محبت کرتی تھی مگر جلال اس محبت کو سمجھنے کو تیار نہ تھا سو بہت سوچنے کے بعد اس نے جلال سے بات کرنے کی ٹھانی تھی، وہ کوئی اہم دستاویز دیکھ رہا تھا جب وہ چلتی ہوئی ان کے قریب آئی تھی وہ بولی تھی۔

''ہم اس رشتے کا کوئی مستقبل نہیں دیکھتے سو اس رشتے کا کوئی بوجھ آپ پر لادنا نہیں چاہتے کہا سنا معاف کیجیے گا ہم وضاحت دے کر رشتے کو مزید کمزور کرنا نہیں چاہتے معذرت چاہتے ہیں مگر ہم اس رشتے کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔'' کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی تھیں۔

جلال نے ان کو روکا نہیں تھا نہ اٹھ کر ان کا ہاتھ تھاما تھا رشتہ بگڑ رہا تھا تعلق بکھر رہا تھا مگر شاید ان کی انا بہت بڑی تھی گھر میں ویرانی پھیل رہی تھی مگر وہ خاموش بیٹھے رہے تھے کافی دیر بعد وہ اٹھ کر باہر نکلے تھے تو بوا سامان سمیٹ کر جاتی دکھائی دی تھیں۔

''بوا۔'' جلال نے پکارا تھا بوا رک گئی تھیں اور پلٹ کر جلال کو دیکھا تھا پھر نرمی سے بولی تھیں۔

''بیٹا آپ نے بہت عزت دی اپنے محل میں جگہ دی بہت شکریہ، مگر اب اس جگہ سے دانا پانی اٹھ گیا ہے مزید قیام ممکن نہیں، آپ کے لیے دل سے ہمیشہ دعائیں نکلتی رہیں گی خدا آپ کو سلامت رکھے ہمیشہ خوش و خرم رہو۔'' کہہ کر انہوں نے دور کھڑے کھڑے جلال کی بلائیں لی تھیں اور چلتے ہوئے داخلی دروازے سے باہر نکل گئی تھیں، جلال کے پاؤں جانے کیوں بندھ گئے تھے۔



مرزا سراج الدولہ نے عدالت کی طرف سے آنے والے نوٹس کو پڑھا تھا اور غصے سے ان کی رگیں تن گئی تھیں جلال نے مقدمہ واپس نہیں لیا تھا عدالت نے ان کو پیش ہونے کا وقت دیا تھا انہوں نے غصے سے نوٹس کو پھاڑتے ہوئے وکیل کو فون ملایا تھا۔

''آپ نے کہا تھا یہ مقدمہ واپس لے لیا جائے گا مگر ایسا ہوا نہیں سو آپ کا کیا فائدہ؟ آپ اتنے بڑے وکیل ہیں آپ کو منتخب کرنے کا کیا مقصد تھا کہ آپ اس مقدمے کو بند کرا دیں گے جب آپ ایسا نہیں کر سکے تو پھر کیا وجہ رہ جاتی ہے آپ کو ساتھ لگائے رکھنے کی وہ کل کا لونڈا آپ سے زیادہ دماغ رکھتا ہے کیا، آگ لگا کر جلا دیجیے اپنی ڈگریوں کو آپ کی وکالت تیل بیچنے لائق ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔'' وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولے تھے وکیل صاحب ان کو مطمئن کرنے کو دوسری طرف مسکرائے تھے۔

''مرزا صاحب پرسکون ہو جائیے اتنی چھوٹی سی بات پر واویلا کرنا مناسب نہیں بچہ ہے دل خوش کر لینے دیجیے ہم تیل بیچنے والے نہیں تیل نکالنے والے ہیں ان محترم چھوٹے نواب کا ایسا حال کریں گے کہ ان کو بھاگتے ہی بنے گی دیکھتے جائیے آپ وہ آج کا لونڈا ہمارے دماغ کا مقابلہ کرنے لائق نہیں برسوں کا تجربہ ہے میاں ایسے کئی مقدمے چٹکیوں میں نبٹائے ہیں یہ موصوف کس کھیت کی مولی ہیں۔'' وکیل صاحب ہنسے تھے مرزا سراج الدولہ نے گہری سانس لی تھی۔

''ہم کہہ دیتے ہیں میاں ایسا کچھ نہ ہوا تو آپ کی خیر نہیں سیدھا گولی سے وار کریں گے آپ پر ہم تو ڈوبنے والے ہیں ہی کسی اور کو بھی تیرنے نہیں دیں گے ہمیں اس مقدمے کا فیصلہ حسب منشا چاہیے قانون کو خریدیے یا قانون کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیجیے مگر فیصلہ ہماری مرضی کا ہونا چاہیے گواہ خریدنا ہوں یا جج صاحب کو اپنی طرف کرنا ہے کچھ بھی کیجیے مگر جان رکھیے ہمیں سزا ہوئی تو ہم آپ کو بخشنے والے نہیں۔'' مرزا صاحب نے وکیل کو دھمکایا تھا وہ کھسیانے سے ہو کر ہنس دیے تھے۔

''اس کی نوبت نہیں آئے گی مرزا صاحب غصہ کم کیا

کریں، فشار خون بڑھ جاتا ہے دل پر دباؤ آنا حرکت قلب کو متاثر کرنے کا سبب بن سکتا ہے مزاج کو ٹھنڈا رکھا کریں مرزا صاحب۔'' وکیل صاحب مرزا کی حقیقت جانتے تھے جو اپنی جان بچانے کو ان کو پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ پر سکون نہیں ہوئے تھے۔

''ہم مذاق نہیں کر رہے وکیل صاحب ہم آپ کا حشر کردیں گے اگر اس مقدمے کا اختتام ہماری ہار پر ہوا جو کرنا ہے سوچ سمجھ کر کیجیے ہم اپنی شکست کو جھیل نہیں پائیں گے سلاخوں کے پیچھے بھی چلے گئے تو بھی آپ کی خیریت تو خطرہ لاحق رہے گا۔'' انہوں نے واضح انداز میں دھمکایا تھا۔ وکیل صاحب مسکرا دیے تھے۔

''پرانے دوست ہیں آپ، آپ سے مخالفت مول لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، اتنا یقین رکھیے ہمیں اپنی جان کو مشکل میں نہیں ڈالنا، سو فیصلہ آپ کے حق میں ہو گا اس کا یقین رکھیے اس لونڈے کو منہ کی کھانی پڑے گی وہ مثل تو سنی ہوگی آپ نے کہ سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر لینا ممکن نہیں ہوتا سمندر میں رہنا ہو تو انسان کا کتا بن جانا ضروری ہے جو کسی اور کی مرضی سے بھونکے اور کاٹے اور ہم اتنے سمجھدار تو ہیں بے فکر رہیے، آپ پر حرف بھی آنے نہیں دیں گے اپنی وکالت اور تجربے کی بنا پر جو کریں گے وہ وقت کا بہترین فیصلہ ہوگا آپ بس بے فکر ہو کر بیٹھ جائیں۔'' وکیل صاحب نے بلآخر مرزا صاحب کو مطمئن کر دیا تھا۔



بوا نے فتح النساء کو دیکھا تھا اور مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

''فتح النساء کیا آپ کا یہ فیصلہ حتمی ہے زوجہ اور خاوند میں ایسی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں رشتے کو وقت دینا ضروری ہوتا ہے۔'' بوا نے سمجھایا تھا فتح النساء ان کو خاموشی سے دیکھنے لگی تھیں، ان کی نظروں میں سکوت تھا کوئی حزن و ملال نہ تھا جیسے وہ ہر جذبے سے خالی تھیں بوا کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

''ایک بار چھوٹے نواب سے بات کر لیجیے ان کو اس طرح تنہا چھوڑ کر جانا مناسب نہیں، وہ بھی اسی کیفیت میں جب وہ بہت اکیلے کھڑے ہیں آپ کا فرض ہے ان کے ساتھ کھڑی ہوں، اس وقت میں مکمل اپنے کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے چاہے آپ دونوں میں کچھ بھی ٹھیک نہیں مگر آپ کو چھوٹے نواب کا ساتھ دینا چاہیے۔'' بوا نے سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی مگر فتح النساء نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

''چھوٹے نواب کو اس رشتے کی یا ہماری ضرورت نہیں ہے بوا انہوں نے ہمیں روکا نہیں۔ کچھ کہا نہیں سو ہمارے رکنے کی کوئی صورت نہیں رہتی، ہم نے جتنی اور جس قدر لچک دکھانا تھی ہم نے دکھادی اس رشتے کو آباد کرنے کی اپنی سی کوشش بھی کی ان کو سمجھانے کا راستہ بھی ڈھونڈنا چاہا جھک کرانا کو ایک طرف رکھ کر وضاحتیں بھی دیں اور غلط فہمیاں بھی دور کرنا چاہیں، مگر اس سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے بوا ایک ساتھ طمانچہ مار سکتا ہے تالی نہیں۔'' وہ بولی تھیں ان کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے بہے تھے اور رخساروں کو بھگوتے ہوئے بے قدر ہو کر سیاہ چادر میں جذب ہو گئے تھے۔

''ہم شاید رشتوں کے لیے بنے ہی نہیں ہوں، اللہ نے جانے کیا سوچ کر ہمیں تمام رشتوں سے محروم رکھا جن رشتوں سے انسیت رہی اللہ کی رضا سے وہ بھی دور ہو گئے، سیف چاچا اور چاچی پھر بھائی جیسی شفقت دینے والے تیمور اور اب جلال رشتے جیسے ہمیں راس ہی نہیں آتے۔'' وہ انتہائی غمزدہ لہجے میں بولی تھیں، بوا کچھ نہیں بولی تھیں، وہ جانتی تھیں فتح النساء کا دل دکھ سے بھرا تھا۔

''کاش میں اپنی بچی کا درد بانٹ سکتی، میں جنم دینے والی ماں مگر پالنے والی ماں ضرور ہوں مگر آپ کے اس دکھ پر میرا دل اس قدر کٹ رہا ہے جتنا سگی ماں کا کٹتا ہے۔'' بوا کی آنکھوں سے آنسو بہے تھے، فتح النساء نے ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھوں کو پونچھا تھا۔

''جنم دینے والی ماں بھی کرم نہیں دیتی بوا، ماں کی عظمت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ ماں ہے اللہ نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھ کر اسے افضل ترین کر دیا ہے سو ماں کا فقط ماں ہونا کافی ہے۔ آپ میرے دکھ سے اپنا دل برا نہ کریں یہ دکھ میری زندگی کا حصہ ہیں ہم ایسے خوش نصیب نہیں کہ کوئی خوشی ملتی ہمیں اپنے رب سے کوئی شکوہ نہیں ضرور اس میں کوئی مصلحت ہوگی ہمیں جلال سے محبت ہے

اور ہمیشہ محبت رہے گی چاہے وہ اس محبت کو قبول کریں نہ کریں، یقین کریں نہ کریں مگر یہ محبت ہمیشہ قائم رہے گی ہم ان سے محبت کرنا متروک نہیں کرسکتے۔'' کیونکہ محبت یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی اگر ہوتی ہے تو کبھی متروک نہیں ہوئی محبت کا واقع ہونا شرط ہے محبت آتی ہے تو ہمیشہ کے لیے آتی ہے دل میں گھر کرتی ہے تو قیام مسلسل اور مستقل ہوتا ہے۔'' وہ بھیگتی آنکھوں کے ساتھ بولی تھیں بوا کا دل فتح النساء کے دکھ پر کٹ کر رہ گیا تھا۔

''کاش ہم آپ کے لیے کچھ کرسکتے میری بچی۔'' بوا نے تڑپ کر ان کو ساتھ لگایا تھا۔

''بوا ہم پاکستان روانہ ہونا چاہتے ہیں کیا آپ ہمارے ہمراہ چلیں گی۔'' فتح النساء نے یکدم ہی فیصلہ سنا دیا تھا بوا حیران رہ گئی تھیں۔

''فتح یہ کیا بات ہوئی، آپ اتنا بڑا فیصلہ کیسے لے سکتی ہیں۔'' وہ بھی جلال کی مرضی کے بنا وہ آپ کے خاوند ہیں آپ ان کی رضا اور مرضی کی پابند ہیں ایسے ختم کردینے سے کوئی رشتہ ختم نہیں ہوجاتا، آپ ان کے نکاح میں ہیں اور یہ رشتہ شرائط کا پابند ہے۔'' بوا نے سمجھایا تھا فتح النساء کرب سے مسکرادی تھیں۔

''رشتہ شرائط کا پابند نہیں ہوتا بوا، محبت شرائط کی پابندی نہیں کرتی، محبت شرائط سے مبرا ہوتی ہے رشتوں میں قوانین کا نفاذ تک لاگو نہیں ہوتا جب تک فریقین محبت کو قبول نہ کرلیں ہمارے معاملے میں محبت کو قبول فقط ایک فرد نے کیا ہے یہ دوطرفہ محبت نہیں ہے محبت کا سود و زیاں ہمارے حصے میں آیا ہے ہم اسے قبول کیونکر نہ کریں؟ اگر ہم بھی دامن کھینچ لیں گے تو یہ محبت کی توہین ہوگی۔'' وہ آنسوؤں کے درمیان گویا ہوئی تھیں بوا بھی بھیگتی آنکھوں سے سرنفی میں ہلانے لگی تھیں۔

''میری سمجھ میں تیری باتیں نہیں آتیں میری بچی بس دکھائی دیتا ہے کہ میری بچی کا دل دکھ سے بھرا ہے اور وہ خوش نہیں ہے۔'' وہ دردبھرے لہجے میں بولی تھیں فتح النساء نے سرنفی میں ہلایا تھا۔

''آپ دل برا نہ کریں یہ ہمارے حصے کا ملال ہے محبت کی ایسی کیفیات بھی قسمت والوں کے ہاتھ لگتی ہیں ہمیں جلال سے گلا نہیں اگر وہ خوش ہیں تو ہم انہیں ہمیشہ خوش دیکھنے کے خواہاں ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا بات اطمینان بخش ہوگی کہ محبوب کا دل خوش ہے مطمئن ہے ہمارے ہاتھ جب بھی دعا کو اٹھیں گے ان کی سلامتی کی دعا مانگتے رہیں گے اللہ ان کو ہر خوشی سے نوازے میرا دل ان کی سلامتی کے لیے ہمیشہ دعا گو رہے گا۔'' فتح النساء نے کہا تھا بوا نے خاموشی سے انہیں دیکھا تھا پھر نرمی سے بولی تھیں۔

''کیا تم میرے کہنے پر ایک بار چھوٹے نواب سے مل سکتی ہو، میں چاہتی ہوں کسی بھی حتمی فیصلے سے قبل تم ایک بار چھوٹے نواب سے بات کرلو۔'' بوا نے انہیں سمجھایا تھا اور وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی تھیں۔



عین بہت افسردہ سی بیٹھی تھیں جب انہیں مدہم روشنی میں اپنے پیچھے کھڑا سایہ دکھائی دیا تھا اس نے پلٹ کر دیکھا تھا وہاں شہاب کھڑا تھا وہ سہم کر فوراً گردن موڑ گئی تھی اور چہرہ چھپا دیا تھا شہاب پشت پر کھڑا مسکرادیا تھا۔

''آپ کو پہچاننا ایسا دشوار کام نہیں تھا ہم نے جان لیا تھا کہ یہ آپ ہی ہوا ایسا حسن دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی تو پاگل تو نہیں بنا دیا تھا آپ نے ہمیں۔'' وہ مسکرا کر بولا تھا اس کی نظروں میں ہوس تھی وہ متواتر عین کی پشت کو دیکھ رہا تھا عین اپنی جگہ ساکت سی بیٹھی تھیں، جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

''آپ نے تو مار ہی ڈالا تھا مرتے تو ہیں آپ پر آپ کا حسن قاتل ہے جو پہلے سے مرے ہوں ان کو دوبارہ مارنا کہاں کی دیانت داری ہے؟'' وہ خباثت سے مسکرادیا تھا اور عین میں ہمت نہ تھی کہ پلٹ کر اسے دیکھتیں خون ان کی رگوں میں جیسے منجمد ہونے کو تھا وہ کوئی حرکت نہ کرسکی تھیں اور شہاب چلتے ہوئے سامنے آن رکا تھا اور بغور عین کو دیکھنے لگا تھا۔

''مر تو ہم گئے تھے آپ کے ایک اقدام سے جی گئے ہوتے مگر ہم نے کرم کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا وہ گریز پائی نہ ہوئی تو ہم جی اٹھے ہوتے۔'' وہ خباثت سے مسکرایا تھا عین نے بیٹھے بیٹھے پتھر اٹھا کر اسے مارنا چاہا تھا مگر شہاب نے ہاتھ تھام لیا تھا اور مسکراتے ہوئے عین کو بغور دیکھا تھا۔

''آپ کے ہاتھ میں پتھر نہیں اچھے لگتے پھول جیسے ہاتھ فقط چومنے کو بنے ہیں۔'' اس نے کہہ کر ہاتھ کو لبوں سے لگانا چاہا تھا جب عین نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا وہ ہنس دیا تھا۔

''آپ کی یہی ادائیں جان لیوا وار کرتی ہیں، ہم تو مرے جاتے ہیں اور آپ نگاہ کر کے زندگی بخشنے کو تیار نہیں، ایک بار مائل بہ کرم ہو جائیں تو دیکھیں ہم کس درجہ فریفتہ ہیں آپ پر۔'' وہ جیسے بے اختیار ہو رہا تھا عین نے خشمگین نظروں سے دیکھا تھا۔

''یہاں سے چلے جائیں اور دوبارہ اس کیمپ کی طرف مت آئیے گا ہم آپ کو دوبارہ یہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔'' وہ ڈرے سہمے بنا بولی تھیں مگر شہاب مسکرا دیا تھا۔

''آپ پر عمریں واری جا سکتی ہیں ہم تو مرجانا چاہتے ہیں آپ موقع دینے کو تیار نہیں۔'' وہ وہاں سے ہلے بنا بغور دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''ہم نے کہا چلے جائیں یہاں سے، ورنہ ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا، ہم آپ سے ڈرنے والے نہیں ہیں آپ کا وہ حشر کریں گے کہ آپ یاد رکھیں گے۔'' وہ دھمکاتے ہوئے سخت لہجے میں بولی تھی، وہ مسکرایا تھا اور سر ہلاتے ہوئے پلٹ کر وہاں سے چلتا ہوا چلا گیا تھا عین انتہائی خوف میں گر گئی تھی۔



''جلال بیٹا مرزا صاحب کے مزاج سے واقف نہیں آپ وہ چالیں چلنے میں ماہر ہیں ہم چاہتے ہیں آپ محتاط رہیں آپ پر ایک حملہ ہو چکا ہے کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے مثل تو سنی ہوگی آپ نے، ایسے انسان کی نا دوستی اچھی نہ دشمنی، نواب صاحب مرزا صاحب کو دوست سمجھتے رہے مگر اس دوستی کا کیا اجر ملا نہیں، ہم آپ کو مشورہ دیں گے کہ اس مقدمے کو واپس لے لیں۔'' حکمت صاحب نے نرم لہجے میں سمجھایا تھا، جلال خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے تھے وہ کسی قدر کھوئے دکھائی دیے تھے۔

''کیا ہوا، آپ کچھ متفکر ہیں کیا مرزا صاحب نے کچھ کہا ہے؟'' حکمت صاحب نے کہا تھا تب جلال نے چونکتے ہوئے سر نفی میں ہلایا تھا اور بولے تھے۔

''نہیں، حکمت چچا ایسا نہیں، ہم مرزا چاچا کی اصلیت سے بہت اچھے سے واقف ہیں ہم محتاط ہیں ہم ان کے باعث پریشان نہیں ہیں، اس پیشی پر ان کی تمام سازشیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔'' وہ یقین سے بولے تھے۔

''مرزا صاحب گھاگ ہیں وہ خود پر کوئی آفت آنے نہیں دیں گے سو جو بھی ہے اسے صیغہ راز میں رکھیے، وہ اپنی جیت کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' حکمت صاحب نے سمجھایا تھا جلال نے سر ہلایا تھا تبھی بہو بیگم کی غیر موجودگی محسوس کر کے حکمت صاحب نے پوچھا تھا۔

''ہماری بہو بیگم کیسی ہیں دکھائی نہیں دے رہیں؟'' جلال سر جھکا گئے تھے حکمت صاحب نے ان کو بغور دیکھا تھا جب جلال نے سر جھکائے نرمی سے جواب دیا تھا۔

''وہ یہاں سے چلی گئی ہیں۔'' وہ اس سے زیادہ نہیں کہہ سکے تھے حکمت صاحب نے چونکے تھے۔

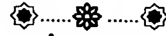
''چلی گئی ہیں، کہاں، کیا اس مقدمے کی پیش نظر آپ نے انہیں کہیں بھجوا دیا ہے، اگر ایسا تھا تو ہمارا گھر حاضر تھا۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا جلال نے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

''ہم نے ان کو حفظ ماتقدم کے طور پر نہیں بھجوایا مگر یہ بھی مناسب ہے کہ وہ ہم سے دور رہیں ہم نہیں چاہتے گھن کے ساتھ گیہوں بھی پس جائے ہمارے حصے کی آفتیں ہمارے لیے ہونا چاہیں، ہم ان پر کوئی آفت آنا نہیں دیکھ سکتے، سو اس سفر میں یہ ضروری تھا انہوں نے ہم سے دور جانے کی ٹھانی تو ہم نے ان کو روکا نہیں۔'' وہ مدہم شکستہ لہجے میں بولے تھے حکمت صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے پھر نرمی سے بولے تھے۔

''یہ مناسب اقدام نہیں تھا چھوٹے نواب، بہو بیگم ہمارے گھر قیام کر سکتی تھیں، مرزا کے ڈر سے اپنے آپ کو اکیلا اور کمزور کرنا کوئی مناسب عمل نہیں ہے۔'' حکمت صاحب نے سمجھایا تھا۔

''ہم کمزور نہیں ہیں حکمت چچا ہم عورتوں کو اس لڑائی میں زک پہنچتا نہیں دیکھ سکتے فتح النساء کا ہمارے ساتھ رہنا ہمیں کمزور بنا رہا تھا مرزا گھاگ انسان ہیں ہر صورت میں اپنی جیت یقینی بنانا چاہتے ہیں اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ فتح النساء یا بوا ان کی غلیظ چالوں کو جھیلیں سو ہم نے یہی مناسب

سمجھا۔'' انہوں نے مدھم لہجے میں کہا تھا اور حکمت چاچا ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔



''آپ چھوٹے نواب سے ملنا نہیں چاہتیں اتنا بڑا اقدام لینے سے قبل آپ ان سے اجازت طلب نہیں کرنا چاہتیں، آپ ان کے نکاح میں ہیں ان سے اجازت لینا ضروری ہے فتح النساء۔'' بوا نے ان کو ارادہ باندھتے دیکھ کر کہا تھا جب وہ خاموشی سے دیکھنے لگی تھیں۔

''ہمارا مشورہ ہے آپ کو ان سے ملنا چاہیے اس اقدام سے آگاہ کرنا چاہیے یہ کوئی معمول بات نہیں ہے آپ ان کی زندگی سے خود کو خارج کر رہی ہیں یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہے۔'' بوا نے کہا تھا مگر وہ تبھی گویا ہوئی تھیں۔

''ہم اتنے مضبوط نہیں ہیں بوا، آپ ہمیں منتشر مت کریں، ہم نے بہت مشکلوں سے خود کو سنبھالا ہے ہم پھر سے بکھرنا نہیں چاہتے ہمارا ان سے نہ ملنا اور دور جانا ہی مناسب ہے جس رشتے میں کچھ باقی نہ رہے اسے بوجھ کی طرح اٹھائے رکھنا مناسب نہیں ہم اپنے آپ کو چھوٹے نواب پر مسلط کرنا نہیں چاہتے اگر ان کو اس رشتے کی کوئی قدر ہوتی تو وہ ہمیں روک سکتے تھے ہماری وقعت ان کی زندگی میں نہیں تھی اگر ان کو ہمارے ساتھ رہنے سے فرق پڑتا تو وہ محل سے ہمیں نکلنے نہ دیتے، وہ رشتہ تبھی ختم ہو گیا تھا جب چھوٹے نواب کے دل میں زہر کا بیج آیا تھا آئینے میں بال آ جائے تو اعتبار باقی نہیں رہتا، ہمیں جلال سے گلہ نہیں ان کو اعتبار نہیں اور ہم ان کے اعتبار کو دوبارہ قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں، ہم نے اپنی سی کوشش کی تھی ان کو سمجھایا تھا مگر اس اعتبار کو قائم کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔'' وہ غمگین سی بولی تھیں بوا خاموش ہو گئی تھیں اور وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں۔

''ہم پاکستان کے لیے روانہ ہو رہے ہیں بوا یہ فیصلہ حتمی ہے اور اس سے پلٹنے کی راہ نہیں ہے۔'' فتح النساء نے کہا تھا اور بوا ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔



مرزا صاحب چلتے ہوئے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے جلال ان کو خاموشی سے دیکھنے لگا تھا جانے کیا سوچ کر مرزا مسکرائے تھے۔

''صاحبزادے دودھ کے دانت ابھی ٹوٹے نہیں اور آپ پھدکتے ہوئے پالنے سے باہر کودنے کو مچلنے لگے ہمارے تجربے اور عمر کا ہی لحاظ کیا ہوتا ہم رتبے میں معتبر ہیں اور آپ کے والد صاحب کے پرانے دوست ہیں اس رفاقت کا لحاظ کرنا بنتا تھا۔'' وہ مسکراتے ہوئے شکوہ کر گئے تھے جلال خاموشی اور انتہائی پرسکون انداز میں ان کو دیکھنے لگے تھے۔

''چچا جان انسان فقط اپنے رتبے اور عمر سے بڑا نہیں ہوتا انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ انسان بھی رہے ورنہ چچا غالب تو کہہ گئے ہیں کہ۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

وہ پرسکون انداز میں جواباً بولے تھے اور مرزا صاحب طیش میں آ کر ان کو گھورنے لگے تھے۔

''میاں کل کے لونڈے ہو لحاظ کر رہے ہیں ورنہ جانتے ہو نبٹنا کس قدر آسان ہے ہماری چالوں کو جھیلنے لائق نہیں ہیں آپ۔'' وہ عجیب غرور سے تنی گردن کے ساتھ بولے تھے اور جلال مسکرا دیا تھا۔

''بھیڑیے کو کھال سے باہر ہی تو لانا ہے یہی ثابت کرنا ہے کہ کتنی اور کس قدر چالوں کے موجب آپ رہے ہیں، یہ سب قصداً آپ کو بےنقاب کرنے کے لیے ہی ہے پیارے چچا جان۔'' جلال کا پرسکون لہجہ مرزا کو جیسے تیغ پا کر گیا تھا تبھی گویا ہوئے تھے۔

''اب بات کھل ہی چکی ہے تو ہم بھی کہے دیتے ہیں نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے ہم تو آپ کو ان چالوں سے بچانا چاہتے تھے اور خدا گواہ ہے آپ کو کسی طرح کا کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے مگر جان لیجیے ہماری عزت سے کھیلنے کا حق ہم کسی کو نہیں دیں گے ہم نے یہ نام برسوں میں بنایا ہے اسے اس طرح ڈوبنے تو نہیں دیں گے اس نام اور مرتبے کو بچانے کے لیے ہم سے جو بن پڑا کریں گے اس کا یقین آپ کو دلائے دیتے ہیں، دوسری بات آپ سے کہنے آئے تھے کہ...... چلیے جانے دیجیے آپ کو کچھ سننا ہی نہیں تو یہ معنی نہیں رکھتا۔'' وہ عجیب مسرور انداز میں بولے

خود داری

ریاض تبسم چوہان

آفس سے نکلتے نکلتے مجھے کچھ دیر ہوگئی، بہت چاہنے کے باوجود بھی تقریباً سورج غروب ہونے کا وقت ہوگیا تھا سردیوں کا سورج بھی تو جلد الوداع کہہ دیتا ہے، میں روڈ پر آیا تو شدید ٹریفک جام کا سا ماحول تھا میں اگر کوئی رکشہ لیتا یا ٹیکسی کراتا تو زیادہ دیر ہوجانے کا اندیشہ تھا سو میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدال ہی چاندنی چوک کی جانب چل پڑا سورج سارے دن کی مسافت کے بعد دور افق میں غوطہ زن ہو چکا تھا غروب کی اذان کی آواز پر چار سو گونج رہی تھی سو افق پر ابھی کچھ روشنی باقی تھی۔

مجھے جلد از جلد چاندنی چوک پہنچنا تھا جہاں ریسٹورنٹ میں وہ میرے منتظر تھے میرے دوست امجد فراز اور سلیم ہم سب دوست ہر ویک اینڈ کی شام اسی جگہ ملتے دیر تک وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے پھر اپنی اپنی منزل کی طرف چلے پڑتے تھے مجھے یقین تھا کہ میرے تینوں دوست وہاں موجود ہوں گئے اور مجھ پر برہم بھی ہو رہے ہوں گے لیکن میں بھی کیا کرتا نوکری ہی ایسی ہے آفس سے نکلتے نکلتے کافی دیر ہوگئی تھی سوانہی خیالات میں گم ریسٹورنٹ پہنچا وہ تینوں ہی مجھ سے پہلے سے وہاں پر موجود تھے اور ان کے چہروں پر ناگواری کے آثار نمایاں تھے لیکن میرے قریب جاتے ہی ان کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور یہ ہماری کمزوری تھی کہ ایک پل میں ہی سب گلے شکوے بھول جاتے تھے اسکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی ایک لمبا عرصہ ہماری اس دوستی کے پودے کو پہنچنے میں لگا تھا اس عرصہ میں بہت سے نشیب و فراز بھی آئے لیکن ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا میرے مقابلے میں وہ تینوں کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے ان کی ملازمتیں بھی اچھی تھیں ہماری ذات برادری اور زبانوں میں بھی فرق تھا لیکن ہماری سوچ ایک تھی اسی لیے ہماری دوستی قائم و دائم رہی ریسٹورنٹ ہماری ملاقاتوں کی واحد جگہ تھی جب سے ہم نے عملی زندگی میں قدم رکھا تھا ملازمت شادی بیاہ کی زنجیریں پاؤں میں پڑی تھیں، اور گردش دوراں نے ہمیں ایک دوسرے سے کچھ دور دور سا کر دیا تھا تب بھی ہم لوگ ہر ہفتے کی شام ریسٹورنٹ میں ملتے تھے ویسے بھی ہم نے کافی سالوں تک اس ریسٹورنٹ میں شاعری ادب تاریخ سیاست اور سائنس پر بحث مباحثے کرتے گزارے تھے کبھی بڑے بڑے قہقہے لگاتے تھے اور کبھی کبھی تو ایک دوسرے کو گلے سے لگا کر رو بھی دیتے تھے۔

ریسٹورنٹ میں دیر تک بیٹھنے کے بعد ہم لوگ اٹھے اور ریسٹورنٹ سے باہر آگئے میں نے سڑک کے پاس دیکھا جہاں امجد کی موٹر سائیکل فراز کی کار اور سلیم کی کیری کھڑی تھی تب میں نے اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھا تو میرا سر کچھ تن سا گیا چاندنی چوک شہر کا بھی مین چوک ہے وہاں سے ہم سب کے راستے الگ الگ ہوجاتے تھے ان تینوں نے میری طرف دیکھا میں نے مسکراتے ہوئے انہیں الوداع کہا وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے سڑک پار کر کے اپنی اپنی گاڑیوں پر سوار ہوکر اپنی اپنی منزل کو چل دیے میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور وہ دنیا دکرتا رہا جب وہ مجھے اپنے گھر تک چھوڑنے کے لیے زور دیتے لیکن میں انہیں منع کرتا اس لیے کہ آگے چل کر وہ مجھے بوجھ نہ سمجھنے لگ جائیں میں نے اپنے وجود کو ٹٹولا کہ کہیں کوئی احساس محرومی تو نہیں ہے لیکن اس کے برعکس ایک احساس خودداری تھا جس نے میرے سر کو اونچا کر دیا دوستی کچھ لینے کا نہیں کچھ دینے کا نام ہے اور دوستی اسی حالت میں قائم رہتی کہ دوست کو کبھی کسی آزمائش میں نہ ڈالا جائے لیکن خود کو ہر آزمائش کے لیے تیار رکھنا چاہیے میں نے کچھ دیر سرد ہواؤں کو اپنے اندر جذب کیا اور آہستہ آہستہ پیدل ہی اپنے گھر کی جانب چل دیا ایک عجیب سے احساس کے ساتھ۔



تھے۔
"مرزا صاحب ہر شر کا انجام ہے برائی جتنی بھی پھیل جائے بلآخر جیت سچ کی ہی ہوتی ہے۔" جلال نے جتایا تھا مرزا صاحب ہنس دیے تھے اور پھر ہاتھ بڑھا کر ان کے شانے پر رکھ کر پیار سے تھپکی دی تھی۔
"میاں ثابت ہوجائے گا دیکھ لیتے ہیں کس میں کتنا دم ہے اب مقابلے پر آ ہی گئے ہو تو پھر وقت کو اس جیت ہار کا فیصلہ خود آپ کرنے دیتے ہیں۔" وہ مسرور سے مسکرائے تھے جلال لحہ بھر کو خاموش رہے تھے پھر بولے تھے۔
"قانون خرید لیجیے چاہے گواہ، مگر فیصلہ پھر بھی آپ کے خلاف رہے گا، اس کا یقین ہم آپ کو دلائے دیتے ہیں اس بار جھوٹ نہیں جیت سکے گا ہمارے ابا جان مرحوم کی دوستی اور مراعات کا بہت فائدہ اٹھایا ہے آپ نے اس دشمنی کے بے نقاب ہونے کا وقت آن پہنچا ہے ہمارے ابا جان کا خون پکار رہا ہے اور حق اور انصاف ہو کر رہے گا آپ کا سامنا ایک دوست سے رہا اور آپ دوستی کا فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوتے رہے اس بار سامنا ہم سے ہے اور ہم آپ کو ثابت کردیں گے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا آپ کو سزا مل کر رہے گی، ہماری زندگی کا مقصد ہی آپ کو ہرانا ہے جیتنے کے جتنے جتن کرسکتے ہیں کرڈالیے جتنے داؤ پیچ یاد میں آزما ڈالیے جتنی چالیں آتی ہیں چل لیجیے مگر اس بار آپ کی شاطر بازی کام نہیں آنے کی اس بار آپ کو منہ کی کھانی پڑے گی۔" جلال کا لہجہ پریقین تھا مرزا صاحب ساکت رہ گئے تھے ڈر ان کی آنکھوں میں واضح دکھائی دیا تھا۔
"ایسا کیا ہے تمہارے پاس؟" وہ ششدر رہ گئے تھے جلال مسکرا دیا تھا ان کا ہاتھ شانے سے بہت اطمینان سے ہٹایا تھا اور پلٹ کر چلتے ہوئے وہاں سے نکل گیا تھا مرزا صاحب سلگ کر رہ گئے تھے۔



عین کیمپ میں سو رہی تھیں جب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ آنکھ کھولنے پر مجبور ہوگئی تھیں تاریکی میں دیکھا تھا کچھ فاصلے پر شہاب کھڑا تھا اسے جاگتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا عین فوراً اٹھ بیٹھی تھیں، شہاب ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اس کی نظروں میں چمک تھی۔
"چلیے ادھورے کاموں کو پورا کیے دیتے ہیں، جو ٹرین میں نہیں ہوسکا وہ یہاں کیے لیتے ہیں نیک کام کرنے میں دیر کیسی تنہائی ہے، موقع ہے سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی، سنا ہے کئی فائدہ اٹھا رہے ہیں سوچا ہم بھی اس نئی زمین پر ایک نیک کام کیے دیتے ہیں نیکیاں کمانے میں ہم کیوں پیچھے رہیں۔" وہ ہوس بھری نظروں سے عین کی طرف دیکھتے ہوئے بولے تھے عین نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے پورے زور سے دھکیل کر شہاب کو کیمپ سے باہر اچھالا تھا اور پھر اٹھ کر بھاگتی ہوئی کیمپ سے نکل گئی تھی۔



بوا بہت خاموش تھیں جب وہ لوگ دلی پہنچے فتح النساء نے ٹرین کی طرف بڑھتے ہوئے رک کر بوا کو دیکھا تھا۔
"بوا ہم پاکستان روانہ ہو رہے ہیں آپ اس فیصلے سے خوش نہیں یہ بات بھی جانتے ہیں اگر آپ کو واپس پلٹنا ہے تو آپ تشریف لے جاسکتی ہیں ہم تنہا آگے کا سفر طے کرلیں گے ہم زبردستی اس طرح رشتوں کو بوجھ کی طرح ڈھونا نہیں چاہتے نا اس رشتے کا بوجھ کسی اور پر لادنا چاہتے ہیں اگر آپ واپس جانا چاہتی ہیں تو ہم آپ کو روکیں گے نہیں۔" فتح النساء نے کہا تھا بوا نے ان کی طرف خاموشی سے دیکھا تھا اور پھر آہستگی سے سر ہلا دیا تھا۔
"نہیں فتح النساء ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے آپ کو گود میں لیتے ہوئے جو ذمہ داری ہم نے لی تھی وہ ابھی پوری نہیں ہوئی، ایک ماں اپنے بچے کو کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑتی ہم آپ کو خوش دیکھنے کے خواہاں تھے سو ہم چاہتے تھے کہ آپ جلال کی طرف واپس لوٹیں ہم آپ کے اس رشتے کو بچانا چاہتے تھے ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے چاہے آپ درست ہیں یا غلط، ماں کی نظر بچوں کی کوتاہیوں پر نہیں ہوتی، ماں کا دل بچوں کی محبت سے اس قدر بھرا ہوتا ہے کہ ہر غلطی کو نظر انداز کرکے ان کو خوش دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں جب تک زندہ ہیں آپ کس کا ساتھ دیتے رہیں گے آپ اکیلی پاکستان نہیں جائیں گے، ہم بھی آپ کے ہمراہ پاکستان روانہ ہوں گے۔" بوا بولی تھیں اور فتح

النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''اگر آپ کو جانا ہے تو جلال کے پاس واپس چلی جائیے وہ تنہا ہیں اس وقت ان کو آپ کی ضرورت ہوگی ہم آپ کو محل میں اسی لیے چھوڑ آئے تھے کہ آپ جلال کے ہمراہ رہیں۔'' فتح النساء بولی تھیں۔

''ہمیں جلال کا خیال ہے مگر جلال مرد ہیں وہ اپنی حفاظت آپ کر سکتے ہیں سو ہم آپ کے ہمراہ چلے آئے اللہ جلال کو اپنی پناہ میں رکھے ہم ان کی سلامتی کے لیے دعا گو ہیں۔'' بوا نے کہا تھا اور پھر فتح النساء کا ہاتھ تھام کر ٹرین کی طرف بڑھ گئی تھیں فتح النساء بوا کی سمت دیکھتی ہوئی ٹرین کی سمت بڑھنے لگی تھیں اور جانے کیوں آنکھیں بھیگتی چلی گئی تھیں ایک نئے سفر کے لیے وہ متفکر تھیں یا بات کچھ اور تھی ان کی نگاہ میں درج کہانی کو صاف پڑھا جا سکتا تھا۔



تاریکی میں بیٹھے ہوئے جلال جانے کیوں فتح النساء کے متعلق سوچتے گئے تھے فتح النساء کا چہرہ ان کی نظروں کے سامنے آن رکا تھا وہ بھیگتی آنکھیں وہ کپکپاتے ہوئے لب انہوں نے سر جھٹکا تھا اور اٹھ کھڑے ہوئے تھے جب قریب رکھا فون بجا تھا جلال نے چونکتے ہوئے گھڑی دیکھی تھی اور پھر بجتا ہوا فون آگے بڑھ کر اٹھا لیا تھا دوسری طرف چچا حکمت تھے۔

''خبر اچھی نہیں ہے جلال، سنا ہے مرزا صاحب نے انتہائی قدم لیتے ہوئے اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے قانون اور گواہوں کو خریدنے کی ٹھان لی ہے اگر ایسا ہوتا ہے تو آپ کی بڑی سبکی ہوگی اب آپ صرف نواب زادے نہیں ایک بڑی سیاسی شخصیت بھی ہیں سو اس مقدمے کے نتیجے سے قبل آپ کو اس بات کا تعین کر لینا ضروری ہے کہ آپ کا اگلا قدم کیا ہوگا۔'' حکمت چاچا ان کے لیے متفکر دکھائی دیے تھے۔

''فکر کی بات نہیں ہے حکمت چاچا ہم چاہتے ہیں مرزا صاحب ایسی کوئی بوکھلاہٹ کریں تاکہ ہمارے ہاتھ مزید کوئی ثبوت لگ سکیں اس بار مرزا صاحب جیت نہیں سکیں گے قانون اور عدالتوں کو خریدنا اتنا آسان بھی نہیں ابھی فرنگی سرکار کے کئی افسران یہاں ہیں جو قانون کے داؤ پیچ سکھانے اور انتظامات کی منتقلی کو یہیں رک گئے تھے نئے نظام میں ابھی ایسے لوگ ہیں جو انصاف کے اس نظام کو کھڑا کرنے میں دن رات محنت کر رہے ہیں مرزا صاحب چالاک ہیں مگر اب وقت گزر چکا ہے، انتظام منصفانہ ہے اور اثر و رسوخ کام آنے والا نہیں کانگریس والے بھی ان سے عاجز آئے بیٹھے ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ وہ کس قدر کمزور پڑ رہے ہیں سو اس ضمن میں وہ کوئی حماقت کرنا نہیں چاہیں گے اگر پھر بھی ایسا کوئی اقدام ان سے سرزد ہوتا ہے تو پھر یہ ہمارے حق میں سود مند ہوگا۔'' جلال نے پرسکون انداز میں کہا تھا۔

''معاملات اس قدر آسان دکھائی نہیں دیتے جلال آپ مثبت سوچ رکھتے ہیں آپ ایک منفی دماغ کی انتہا کو سمجھ نہیں پا رہے ہم چاہتے ہیں آپ تمام معاملات سے باخبر رہیں اور غفلت نہ برتیں، آپ کا قائل ہونا آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا یہ اپنی نوعیت کا ایک بڑا مقدمہ ہے ہر ایک کی نظر اس مقدمے پر ہے ہر جگہ اسے لے کر بات چیت کی جارہی ہے مرزا اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے ہر حد تک جانے کی کوشش کریں گے، ان کی ہار ان کی بہت بری سبکی کا باعث بنے گی اور اس باعث وہ یقینی جیت جانا چاہیں گے جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' حکمت چچا نے کہا تھا۔

''آپ بے فکر رہیے چچا جان ہم غافل نہیں ہیں آپ ہمارے ساتھ ہیں ہماری معاونت کر رہے ہیں آپ کے ہونے سے بہت ڈھارس ہے اس بار ہم مرزا چچا کو جیتنے نہیں دیں گے ہمارے ابا جان اور خاندان کا خون ایسا ارزاں نہیں کہ ہم بھول جائیں اور قدم واپس لے لیں ہمارا پلٹنا اصولوں کی ہار ہوگی، یہ سبکی مرزا صاحب کی اس سبکی سے کہیں زیادہ ہوگی، ہم ابا جان کی روح کو شرمندہ نہیں دیکھ سکتے ہماری زندگی کا مقصد اپنے والدین کی اموات کا بدلہ لینا ہے اور یہ بدلہ قانون کی مدد لے کر ہے ہمارے بزرگوں کے سامنے ہم سر اٹھانے لائق نہیں رہیں گے اگر اس موقع پر ہم نے قدم واپس لیا اب اس مقام پر واپسی کی نہیں سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے آپ ابا جان کے رفیق ہیں اور ہمارے ہمدرد آپ ہمیں کمزور مت کیجیے ہماری ہمت بڑھائیے آپ

ہمارے لیے اباجان کی طرح معتبر ہیں معذرت چاہتے ہیں آپ کے کہنے کے باوجود ہم قدم واپس نہیں لے رہے مگر اس بار ہم وہ کر رہے ہیں جو ہمیں ہمارے والدین کی ارواح کے سامنے سرخرو کردے زندگی موت کی خبر نہیں چچا جان ہم نہیں چاہتے کل ہم اس دنیا سے جائیں تو موقع یا مصلحت پرست کہلائیں ہمیں بزدلی کا ٹیکا ماتھے پر نہیں لگانا یہ ہمارے لیے بہت بڑی شرمندگی کا باعث بنے گا سو جو بھی ہو ہمیں یہ مقدمہ جیتنا ہے ہم نے بھی بازی جیتنے کی ٹھان لی ہے، اب واپسی ممکن نہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے تھے ان کا ارادہ بھانپتے ہوئے حکمت چاچا نے گہری سانس لی تھی۔

"اللہ تمہیں سلامت رکھے بیٹا، ہم آپ کو کسی خطرے میں پڑتا نہیں دیکھ سکتے ہر گھڑی آپ کے ساتھ ہیں۔" حکمت چاچا نے کہا تھا۔



عین سرپٹ دوڑتی جا رہی تھی اندھیرے میں اجنبی جگہ اجنبی مقام اور وہ تنہا یکدم وہ کسی سے ٹکرائی تھیں سر اٹھا کر دیکھا تھا اور ششدر رہ گئی تھیں، وہاں کوئی اور نہیں تیمور تھا ان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں غصے اور اذیت میں انہوں نے تیمور کے سینے پر مکے برسانے شروع کر دیے تھے تیمور نے ان کو روکا نہیں تھا نا ان کے ہاتھوں کو تھاما تھا جب تک چاہا تھا انہوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا تھا اور پھر ان کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں، تیمور نے ان کے گرد حصار نہیں باندھا تھا نہ ان کو چپ کرایا تھا مگر وہ خاموشی سے ان کی ڈھال بنے ان کے سامنے کھڑے رہے تھے عین جب تھک کر خاموش ہوئی تھیں تو سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا ہوش میں آتے ہی ان کو اس قربت کا اندازہ ہوا تھا سو قدم واپس لے لیے تھے؟

"کیا ہوا عین آپ ٹھیک ہیں؟" تیمور نے دریافت کیا تھا وہ جس قدر ہراساں تھیں اس سے وہ جان تو گئے تھے کہ وہ کسی مشکل سے دوچار تھیں مگر عین نے کچھ نہیں کہا تھا اور پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا تیمور کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ کس قسم کی صورت حال سے دوچار تھیں۔

"کیا وہاں شہاب تھا؟" تیمور نے اخذ کیا تھا۔

"وہاں کوئی بھی ہوتا مگر آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" عین نے غصے سے کہا تھا تیمور کو اپنی غلطی کا اندازہ تھا تبھی خاموش ہو گئے تھے۔

"آپ تو چلے گئے تھے نا، پھر لوٹ کر کیوں آئے؟"

"ہم آپ کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں آپ کو ایسا لگتا ہے آپ سے اگر کوئی مخالفت بھی ہوئی تو ہم اپنی ذمہ داری سے بھی غافل نہیں ہو سکتے اس سب کا جواب ہم آپ کو بعد میں دیں گے آپ یہ بتائیے کیا شہاب وہیں کیمپ میں قیام پذیر ہے۔" عین نے ان کی طرف دیکھا تھا اور پھر پلٹ کر چلنے لگی تھیں، تیمور تیزی سے چلتے ہوئے ان کے ہمراہ چلنے لگا تھا عین خفگی ظاہر کر رہی تھیں اور انہیں ایسا کرنے کا حق بھی تھا تیمور ان کو چھوڑ کر اکیلا کر گئے تھے چاہے کچھ پہروں یا قلیل مدت کے لیے ہی سہی مگر وہ بے یار مددگار ہو گئی تھیں ایک اجنبی مقام پر جہاں وہ کسی سے واقف نہیں تھیں وہاں تنہا گزارہ کرنا کیسا تجربہ رہا ہوگا اس کا اندازہ تیمور کو تھا تبھی وہ ان کے غصے کے باوجود ان کے ہمراہ چلتا رہا تھا۔

"آپ اب ہمارے ساتھ کیوں آ رہے ہیں جائیے وہیں جہاں گئے تھے۔" عین نے ان کو خفگی سے دیکھتے ہوئے کہا تھا تیمور جانتے تھے وہ بہت غصے میں ہیں اس لیے خاموش رہے تھے تب عین غصہ دیکھ کر بولی تھیں۔

"ہم نے حیدر میاں کو دیکھا وہ ہم سے قدرے تفاوت پر تھے وہ جائیداد کا کلیم کر رہے تھے جانے انہوں نے ہمیں دیکھا کہ نہیں مگر جب ہم نے ان کی طرف بڑھنا چاہا وہ چلتے ہوئے ہجوم میں غائب ہو گئے ہمیں اس وقت پاؤں میں چوٹ لگ گئی تھی سو ہم ان کے پیچھے جا کر ان سے بات نہیں کر سکے مگر اگر وہ ہمیں دیکھ چکے تھے تو پھر ہمیں نظر انداز کیسے کر سکتے ہیں؟" عین نے حیرت میں ڈوبے لہجے میں کہا تھا تیمور نے انہیں چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔

"آپ کو حیرت ہوگی ہم حیدر میاں کو ڈھونڈنے گئے تھے ہم نے بھی ان کو دیکھا تھا اور وہ ہمیں دیکھ کر غائب ہو گئے تھے ہم نے ان کا پیچھا کیا تھا مگر وہ دوبارہ نہیں ملے پھر ہمیں ان کے متعلق تجسس ہوا ہم نے ان کو کھوجنے کی ٹھانی تب علم ہوا وہ کیمپ میں قیام پذیر نہیں ایک دوست کے ساتھ ایک قریبی مقام پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔" تیمور نے بتایا تو وہ ششدر سی ہو کر تیمور کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

"اس کا مطلب ہے وہ یہاں ہماری موجودگی سے واقف ہیں اور جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں؟" وہ حیرت سے گویا ہوئی تھیں تیمور نے شانے اچکا دیے تھے۔

"ہم نہیں جانتے مگران کے اطوار باعث حیرت ہیں لگتا ہے وہ محض جائیدادیں کلیم کرنے کی غرض سے آئے ہیں ان کا مقصد یہاں رہنا یا زندگی گزارنا نہیں ہے ان کا مقصد جائیدادیں اپنے نام کرنا اور پھر کہیں اور نکل جانا ہے وہ کاغذی کارروائی کی غرض سے یہاں رکے ہیں کیونکہ جس کے ہمراہ وہ دکھائی دیے ہیں وہ ایک بڑے قانون ساز ہیں کسی ایسے شخص سے واقفیت بتاتی ہے کہ وہ پاکستان منصوبہ سازی کر کے آئے ہیں ان کے روابط یہاں تھے اور کوئی ان کو یہاں امداد دینے کے لیے پہلے سے موجود ہے بہرحال یہ ایک الگ معاملہ ہے مگر وہ آپ کے معاملے میں اس درجہ غفلت کیوں برت رہے ہیں؟ آپ ان کی منگیتر ہیں ان کے لیے آپ نے یہ ہجرت اختیار کی ہے اپنوں کو چھوڑ کر یہاں ایک اجنبی مقام پر فقط ان کے لیے آئی ہیں تو وہ اس طرح آپ کو نظر انداز نہیں کر سکتے، آپ سے ٹرین میں سوار ہونے سے قبل ہاتھ چھڑا لینا ٹرین پر سوار ہو جانا پھر یہاں پہنچ کر آپ سے نہ ملنا آپ کو تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا اور آپ کو دیکھ کر نظر انداز کرنا یہ سب کیا معنی رکھتا ہے کیا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں یا اس رشتے کو لے کر کوئی انسیت رکھتے ہیں، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے مگر انہوں نے دانستہ مقام بدل نہ لیا ہو تو آپ کو کل لے جا کر ان سے ملا سکتے ہیں۔" تیمور نے کہا تھا عین نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

"ہم ان سے ملنا چاہیں گے تیمور ہم اسی غرض سے پاکستان آئے ہیں ایک وعدے کو ایفا کرنے ابا جان کے حکم کی تعمیل کرنے ہم یہاں آئے ہیں ہم حیدر میاں سے ملنا چاہتے ہیں ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں یا کیوں کر رہے ہیں وہ جو بھی کر رہے ہیں ان کا ذاتی معاملہ ہے ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم نے ابا جان سے وعدہ کیا ہے ہم اس وعدے کو پورا کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد جو بھی ہو ہم اپنے سامنے سرخرو ہوں گے اور ابا جان کی روح کے سامنے بھی۔" عین نے کہا تھا۔ تیمور نے سر ہلایا تھا۔

"اسی غرض سے ہم بھی اس مشن پر نکل کھڑے ہوئے تھے ہمیں شک گزارا تھا سو محترم حیدر میاں کی حقیقت معلوم کرنا ضروری لگا بہرحال ہمیں اندازہ ہے جس مقصد سے ہم یہاں آئے ہیں اس کا پورا ہونا ضروری ہے۔" تیمور نے کہا تھا اور عین کا ہاتھ تھام کر چلنے لگا تھا۔

"جانے کیوں ہمیں وسوسے گھیر رہے ہیں تیمور، پتا نہیں، مگر دل جانے کیوں ڈر رہا ہے۔" وہ چلتے ہوئے بنا تیمور کی طرف دیکھے بولی تھی۔

"آپ کے دل میں جو بھی ڈر ہیں ان کو نکال کر ایک طرف رکھ دیجیے عین ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہم کچھ غلط ہونے نہیں دیں گے اگر آپ کسی وعدے کی قید میں ہجرت کر کے پاکستان آئی ہیں تو ہم بھی ایک وعدہ کر کے آپ کے ہمراہ پاکستان آئے ہیں ہم نے ہجرت یونہی اختیار نہیں کی آپ کی ذمہ داری لے کر یہ ہجرت اختیار کی ہے سو اس ذمہ داری کو پورا کیے بنا ہم کہیں نہیں جائیں گے یہ تو طے ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں گویا ہوئے تھے عین ان کو دیکھ کر رہ گئی دونوں خاموش ہو کر کیمپ کی سمت قدم بڑھانے لگے تھے تاریکی چپ چاپ ان کو دیکھتے ہوئے ان کے قدموں کی چاپ کو سن رہی تھی۔



ٹرین میں بیٹھے مسافر پرامید تھے کئی چہرے جانے کیا سوچ کر متفکر تھے ہر ایک کی اپنی فکریں تھیں اپنے دکھ تھے کئی آنکھیں بنجر اور ویران تھیں کسی کو خبر نہیں تھی کہ سفر کا آغاز ہونے کے بعد انجام کیا ہوگا یا اس ٹرین کے مسافروں کو کیسی صورت حال سے سابقہ پڑے گا مگر پھر بھی ٹرین مسافروں سے کچھا کھچ بھری تھی ایک ڈبے میں فتح النساء کھوئی کھوئی سی بوا کے ہمراہ بیٹھی تھی۔

چلو بانٹ لیں
ایک سو سولہ چاند کی راتیں
تم لے جاؤ
پلکوں کی منڈیروں پر بجی
نوخیز محبتوں کی مسکراہٹیں
میرے دامن میں ڈال دو

راتوں کی رگوں میں
گونجتی دوڑتی درد کی سرسراہٹیں تمہارے حصے آئیں
محبت کے چمن کی
ادھ کھلی کلیوں کی چہچہاہٹیں
میرے دامن میں ڈال دو
کہرے کی گرفت میں آئی
سورج مکھی کی کڑواہٹیں
تم رکھ لینا
الھڑ محبت کی بانکی
بے تھکان سنسناہٹیں
میرے دامن میں ڈال دو
بٹوارے کے کنگن کی
جدائی کا طواف کرتی گنگناہٹیں
میرے دامن میں ڈال دو
چلو بانٹ لیں
ایک سو سولہ چاند کی راتیں

دھیان، بھٹکتا ہوا پرندہ تھا جو بے ارادہ جلال کے خیال کی سمت اڑنے لگا تھا۔

"جلال کاش آپ کو محبت کا ادراک ہو سکتا آپ اس محبت کو جان سکتے جو محبت ہمارے دل میں اول دن سے آپ کے لیے موجود تھی کاش آپ اس محبت کو قبول کر سکتے اور جان سکتے کہ ہم نے صرف ایک شخص کو چاہا ہے اور وہ کوئی اور نہیں فقط آپ ہیں نواب زادہ جلال سیف الدین پٹوڈی، آپ کے علاوہ ہم کسی کو محبت کے لائق نہیں سمجھتے کاش آپ سمجھ سکتے کہ ہم نے بے وفائی نہیں کی آپ سے بے وفائی کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ کاش آپ ہاتھ نہ تھامتے کچھ کہتے نہ مگر کوئی ادھورا حوالہ دے کر ہمیں روک لیتے راہ میں آ کر نہ کھڑے ہوتے راستہ نہ روکتے مگر روکنے کا کوئی بہانہ تو کرتے مگر آپ نے ثابت کر دیا کہ محبت کی قدر آپ نہیں کرتے آپ کی خاموشی نہیں کچوکے لگاتی رہی الزام پر الزام اور ہم نے سزاؤں کو اپنے نام کرنے کی ٹھان لی۔

چلو بانٹ لیں
ایک سو سولہ چاند کی راتیں
بٹوارے کے کنگن کی
جدائی کا طواف کرتی گنگناہٹیں
ادھ کھلی کلیوں کی چہچہاہٹیں
کہر کی گرفت میں آئی
سورج مکھی کی کڑواہٹیں
الھڑ محبت کی بانکی
بے تھکان سنسناہٹیں
میرے دامن میں ڈال دو
ایک سو سولہ چاند کی راتیں
تم لے جاؤ
پلکوں کی منڈیروں پر سجی
نوخیز محبتوں کی مسکراہٹیں
تم لے جاؤ......!

آنکھوں سے کئی آنسو بہے تھے اور رخساروں پر پھیلتے گئے تھے۔

"آہ محبت، کیا ملا کیا دیا کیا لیا کبھی فرصتوں سے بیٹھیں گے تو سود و زیاں کا حساب کتاب کر دیں گے اس افراتفری میں کیا کہیں کیا سنیں کہ محبت سانس لیتی سنائی نہیں دیتی اور خسارے دروازوں میں لگی کائی کی طرح چھپ کر چپ چاپ تکتے جاتے ہیں۔" وہ دکھ سے نڈھال تھیں۔ بوا نے ان کو دیکھا تھا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا وہ چہرے کا رخ پھیرے بیٹھی تھیں کہ بوا کو ان کے آنسوؤں کی خبر نہ ہو مگر بوا ایسی بھی بے خبر نہیں تھیں ٹرین اپنی منزل کی سمت رواں دواں تھی فاصلے اجسام کو دور لیتے جا رہے تھے اور دل قریب تھے کہ نہیں فتح النساء بس اتنا جانتی تھیں کہ ان کو اس رشتے کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا کڑا ملال تھا مگر وہ اس کا مداوا نہیں کر سکتی تھیں۔



"آپ ہائی کمیشن گئی تھیں؟" حکمت صاحب نے پوچھا تھا بیگم حکمت نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تب وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے تھے۔

"بیگم ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے ہم نے بات کی ہے ان شاء اللہ کوئی اچھی خبر ضرور ملے گی والد ہونے کے ناتے ہمارا دل مطمئن ہے ہمیں اپنے بیٹے کی فکر نہیں ہے ایسا نہیں ہے مگر وہ خیریت سے ہے ایسا ہمارا دل کہتا ہے۔" حکمت

صاحب نے کہا تھا بیگم حکمت ان کو خفگی سے دیکھنے لگی تھیں۔
"دل مطمئن ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی اولاد سے غافل ہو جائیں گے وہ ہماری اکلوتی اولاد ہے آپ کو کیا لگتا ہے اپنے لعل کے بنا ہم سکون سے بیٹھ سکتے ہیں کلیجہ منہ کو آتا ہے یہ گھر ویران سا لگتا ہے وہ ہوتا تو ہم ان کے سر پر سہرا سجاتے بہو گھر لاتے کیا کیا ارمان ہیں ہمارے دل میں آپ کو کچھ خبر ہے آپ نے کسی کی خاطر اپنے بچے کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔" اماں حسب عادت شکوہ کر رہی تھیں۔ حکمت صاحب نے گہری سانس خارج کی تھی۔
"بیگم ہم نے تیمور کو پاکستان روانہ نہیں کیا یہ ذمہ داری نواب صاحب نے تیمور پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے سونپی تھی نواب صاحب جانتے تھے تیمور اس قابل ہے کہ اس پر ذمہ داری ڈالی جا سکتی ہے عین کو پاکستان لے جانا اور حیدر میاں کے سپرد کرنا نواب صاحب کو لگا تھا تیمور سے بہتر اس کام کے لیے کوئی نہیں ہے۔" حکمت بہادر یار جنگ صاحب نے بیگم کو سمجھانا چاہا تھا۔
"میں کچھ نہیں جانتی مجھے میرا بیٹا واپس چاہیے یا پھر مجھے پاکستان بھیجنے کا بندوبست کر دیجیے۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں اور پھر اٹھ کر چلتی ہوئیں وہاں سے نکل گئی تھیں، حکمت صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

❁......❁......❁

دل مبتلائے لذت آزار ہی رہا
مرنا فراق یار میں دشوار ہی رہا
احسان عفو جرم سے وہ شرمسار ہوں
بخشا گیا میں تو بھی گناہگار ہی رہا
کہتے ہیں جل کے غیر محبت سے داغ کی
معشوق اس کے پاس وفادار ہی رہا

چھوٹے نواب چپ چاپ بیٹھے تھے انہیں ایک ملازم نے آ کر بتا دیا تھا کہ فتح النساء بوا کے ہمراہ پاکستان روانہ ہو گئی ہیں ان کے چہرے پر بہت سکوت دکھائی دیا تھا انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ نہیں یہ کیفیت ان کے چہرے سے عیاں نہیں تھی مگر وہ کسی قدر بے کل سے دکھائی دیتے تھے ایک پرانے ملازم ان کے پاس آن رکے تھے۔
"آپ اجازت دیں تو کھانا لگوا دیں آپ کے لیے۔"
مگر چھوٹے نواب نے سر نفی میں ہلا دیا تھا ملازم عمر میں ان سے بڑے تھے سو فوری طور پر جانے کی بجائے رک کر ان کو دیکھنے لگے۔
"آپ تشریف لے جائیں ہمیں جب بھوک ہو گی آپ سے کہہ دیں گے۔" جلال نے کہا تھا ملازم نے سر ہلایا تھا اور نرمی سے بولے تھے۔
"چھوٹا منہ اور بڑی بات آپ کے معاملات میں مداخلت کرنے کی گستاخی ہم نہیں کر سکتے چھوٹے نواب مگر آپ کو اس طرح ادھورا تنہا دیکھ کر بھی اچھا نہیں لگ رہا آپ کو بٹیا فتح النساء کو جانے نہیں دینا چاہیے تھا ان کے دم سے محل میں زندگی کی لہر دوڑتی دکھائی دی تھی نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے جانے کے بعد گھر میں ایک زندگی کی رمق دکھائی دی تھی آپ کا نمک کھایا ہے نسل در نسل سے آپ کی خدمت گزاری کرتی رہیں ہم آپ کو کمزور دیکھنا نہیں چاہتے ہم سفر کے ہونے سے بڑی ڈھارس ہوتی ہے۔" ملازم نے آہستگی سے کہا تھا چھوٹے نواب نے ان کی طرف دیکھا تھا اور آہستگی سے بولے تھے۔
"ہم اکیلے نہیں پڑے ہم دم چاچا تا ہم کمزور ہوئے ہیں ہم اسی طور تنے کھڑے ہیں دراصل لڑائی ہماری ہے اور ہم اس لڑائی کے باعث کسی اور کی زندگی کو منتشر کرنا نہیں چاہتے۔" جلال آہستگی سے بولے تھے۔
"مگر ہم اس طرح آپ کو منتشر ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتے چھوٹے نواب تنکے کا سہارا بھی بہت معنی رکھتا ہے آپ پڑھے لکھے ہیں رشتوں کی اہمیت سے واقف ہیں کسی کی ہمراہی انسان کو کمزور نہیں کرتی اور مضبوط کر دیتی ہے۔" ملازم نے سمجھایا تھا۔
"ہمدم چاچا، بات اصولوں کی تھی سو ہم نے اصول نبھائے رشتے نبھانا ضروری ہوتا تو ہم رشتے نبھاتے مگر یہ سب بہر طور ہونا ضروری تھا اگر نہیں ہوتا تو بھی شاید سب کو ہم سے گلہ ہوتا اور کسی سانحے کے ہونے کے باعث ہمیں الزامات کا سامنا ہوتا بہر حال اس وقت میں جو سمجھا لگا ہم نے وہ فعل اختیار کیا اللہ فتح النساء اور بوا کا حامی و ناصر ہو وہ اس جگہ روانہ ہوئی ہیں جہاں انہیں ہونا چاہیے تھا وہ مقام اس وقت محفوظ ترین جگہ ہے اگر ابا جان زندہ ہوتے تو ہم

بھی آج اس سرزمین پر ہوتے مگر یہ ممکن نہیں ہوسکا۔'' وہ غمگین لہجے میں بولے تھے ملازم ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے اور خاموشی سے پلٹ گئے تھے چھوٹے نواب صاحب خاموشی سے چھت کو دیکھنے لگے تھے۔

بیان درد فرق کہنا کہ وہاں اپنی یہ حقیقت
جو بات کرنی تو نالہ کرنا نہیں تو وہ بھی کبھی نہ کرنا
بری ہے اے داغ راہ الفت خدا نہ لے جاتے
ایسے رستے
جو اپنی تم خیر چاہتے ہو تو بھول کر دل لگی نہ کرنا

ان کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے نکلے تھے اور بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔



مرزا حیدر سراج الدولہ کلیم کے قواعد وضوابط مکمل کر کے مسرور سے پلٹے تھے جب تیمور ان کے سامنے آن رکے تھے وہ چونکے تھے اگر نگاہ نہ ملتی تو شاید وہ خاموشی سے وہاں سے نکل جاتے مگر اب نگاہ مل چکی تھی سامنا ہو چکا تھا سو کنی کترا کر گزرنا ممکن نہیں تھا اور نظر انداز کیا نہیں جا سکتا تھا تبھی حیدر میاں بولے تھے۔

''آپ یہاں کیا آپ کے خاندان نے بھی ہجرت اختیار کی تھی اگر ایسا معاملہ تھا تو پہلے آگاہ کرتے ہم ایک وقت میں ہجرت اختیار کرتے۔'' حیدر میاں مسکراتے ہوئے بولے تھے تو تیمور نے ان کو دیکھا تھا اور بولے۔

''آپ یہاں اہل وعیال کے ہمراہ آئے ہیں کہاں قیام ہے؟'' وہ دانستہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہے تھے کہ وہ ان کی یہاں آمد اور دیگر معاملات سے واقف ہیں۔'' حیدر میاں مسکرا دیے تھے۔

''بس کیا کہیں ہجرت کرنا ضروری لگا وہاں ہندوؤں کی حکمرانی میں کیا کرتے ابا جان اور ہماری سوچ الگ ہے، حکمرانی کا جو نشہ ہے وہ غلامی میں رہنے والا ہی جان سکتا ہے ہم نے فرنگیوں کی غلامی سہہ لی تھی مگر ہندوؤں کی حکمرانی نہیں برداشت کر سکتے تھے ابا نے منع کیا کہ وہ کانگریس کا اثر ورسوخ رکھتے ہیں مگر ہم نہیں مانے سو پاکستان چلے آئے یہاں وہ اثر ورسوخ چاہے نہ ہو، وہ مراعات چاہے نہ ہوں مگر یہاں حکمرانی ہماری ہے یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور ہم یہاں آزادی سے سانس لے سکتے ہیں ہمارے آباؤ اجداد نے برسوں غلامی کو سہا ہے ہم اس غلامی کو مزید جھیلنا نہیں چاہتے تھے سو ابا جان کو بھی خیر باد کہہ کر چلے آئے ہم نے نواب چاچا سے اس متعلق بات کی تھی وہ نواب زادی عین النور کو ہمارے ہمراہ بھیجنے کے لیے تیار تھے سو ہم نے عین النور کے ہمراہ ہجرت اختیار کرنے کی ٹھانی مگر ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے ہجوم اس قدر تھا کہ ہمارا ہاتھ عین کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس کے بعد ہمیں خبر نہیں کہ عین ہندوستان میں ہی رہ گئیں یا پھر ہجرت کر کے یہاں آ چکی ہیں۔'' انہوں نے دانستہ جھوٹ کہا تھا تیمور نے افسوس کا اظہار کیا تھا مگر اس موقع پر ان کا سچ سے آگاہ کرنا بھی بہت ضروری تھا سو آہستگی سے بولے تھے۔

''ہم عین کے ہمراہ یہاں آئے ہیں نواب زادی کو آپ سے ملانے کی ذمہ داری ہمیں نواب چاچا نے سونپی تھی انہوں نے عین کو ہمارے ہمراہ روانہ کرتے ہوئے ہم سے وعدہ لیا تھا کہ ہم عین کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دینے سے قبل لوٹیں گے نہیں عین کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری انہوں نے ہمارے کاندھوں پر رکھی تھی۔'' حیدر میاں حیران ہو کر ان کو دیکھنے لگے تھے۔

''کیا نواب زادی عین النور یہاں پاکستان میں ہیں۔'' انہوں نے مصنوعی حیرت سے تیمور کو دیکھا تھا تیمور ان کی کیفیات اور تاثرات پر نگاہ رکھے ہوئے تھا سو انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔

''عین یہاں کیمپ میں ہیں۔'' تیمور نے مطلع کیا تھا۔

''اوہ، واقعی ہمیں اس کی خبر نہیں تھی۔'' وہ مصنوعی حیرت سے بولے تھے تیمور نے ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے سر ہلایا تبھی وہ اس مصنوعی حیرت کو جاری رکھتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔

''کہاں ہیں عین، بخدا ہم تو حیرت سے پاگل ہو رہے ہیں، عین ہم سے اتنی قریب ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں تھی، ہم جان ہی نہیں پائے ہماری منگیتر نے فقط ہمارے لیے ہجرت اختیار کی اور یہاں اتنی دور سب چھوڑ چھاڑ کر سرحد پار چلی آئیں، اس بے پناہ محبت کو دیکھ کر ہم پر تو رقت طاری ہو گئی دیکھیے ہمارا جسم کیسے کانپ رہا ہے یا اللہ ہماری عین ہمارے

اتنے قریب ہمیں تو لگا تھا ہم نے ان کو کھو دیا ہمیں لگا تھا ہم نے ان کو دہلی اسٹیشن پر گنوا دیا جہاں بھیڑ کے باعث ان کا ہاتھ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔'' وہ کسی نہ کسی طرح آنکھوں میں آنسو لانے کے قابل ہو گئے تھے تیمور نے سر ہلایا تھا اور مدہم لہجے میں انہیں جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

''محبت سچی ہو تو رنگ ضرور دکھاتی ہے مرزا حیدر سراج الدولہ، عین پاکستان آچکی ہیں اور خالصتاً یہ ہجرت آپ کے لیے کی ہے نواب صاحب کی خواہش تھی پاکستان میں آ کر رہنے کی وہ تو ہو نہ سکا مگر عین نے اپنے والد محترم کے کہنے پر یہ ہجرت کی ہے اور وہ اس وقت آپ کے بہت قریب ہیں آپ ان سے مل سکتے ہیں تیمور نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا تھا حیدر مسکرائے تھے اور آنکھیں پونچھتے ہوئے بولے تھے۔

''ہم عین سے ملنے کو بے تاب ہیں وہ ہماری زندگی کا مقصد ہیں ان سے فرصت سے وقت نکال کر ملیں گے۔'' انہوں نے تعرض برتا تھا تیمور نے خاموشی سے انہیں دیکھا تھا۔

''ہم چلتے ہیں آپ عین کو ہمراہ لے کر یہیں رہیے ہم ملاقات کے لیے آئیں گے۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ پلٹ کر چلتے ہوئے دور نکلے تھے تیمور ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔



''بیگم مہاجروں کے کیمپ بنے ہیں مگر ایسا کوئی انتظام نہیں کہ ان کا اعداد و شمار ممکن ہو سکے یا کسی طرح کی تفصیلات کا اندراج کیا گیا ہو اس باعث ہائی کمیشن بھی کسی طرح کا رابطہ رکھنے میں ناکام ہے ہم نے ہائی کمیشن میں بات کی ہے مگر وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ کسی طرح کا کوئی ریکارڈ نہ ہونے کے باعث وہ مہاجرین کی تفصیلات ورثا کو دینے میں ناکام ہیں، جب تک کہ خود کوئی وہاں سے رابطہ نہ کرے ایسا ممکن نہیں ہے عین ممکن ہے کہ تیمور وہاں ہائی کمیشن میں جا کر رابطہ کریں اور پھر وہ تفصیلات یہاں منتقل ہوں وہ پڑھے لکھے اور سمجھدار ہیں ایسا ہونا عین ممکن ہے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا بیگم نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا حکمت صاحب کو افسوس ہوا تھا۔

''ہم معافی چاہتے ہیں شاید ہم کسی لحاظ سے آپ کے مجرم ہیں جو ہوا ہمارے باعث ہوا مگر تیمور جتنے عزیز آپ کو ہیں اسی قدر عزیز ہمیں ہیں ہم بھی چاہتے ہیں تیمور ہماری آنکھوں کے پاس رہیں۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا بیگم نے کوئی بات نہیں کی تھی، تب حکمت صاحب نے بھی مزید بات کرنا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔



''آپ حیدر سے ملے آپ نے ان سے بات کی، ہمیں کیوں نہیں ملوایا ہم زیادہ دور تو نہیں تھے۔'' عین نے حیدر میاں کے بارے میں جان کر کہا تھا تیمور نے سر ہلایا تھا اور مدہم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''وہ آپ سے فرصت میں ملنا چاہتے ہیں غالباً ان کو ضروری کام تھا اور وہ فوری طور پر بات چیت کر کے وہاں سے نکل گئے بہرحال ہم ان کا ٹھکانہ جانتے ہیں اور آپ کی ملاقات ان سے کرا سکتے ہیں اب یہ ناممکن نہیں رہا۔'' تیمور نے کہا تھا عین نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا پھر نرمی سے سوچتے ہوئے بولی تھیں۔

''ہمیں کیوں لگ رہا ہے کہ وہ دانستہ گریز کر رہے ہیں اور ہم سے ملنا نہیں چاہیے۔'' عین نے کہا تھا مگر تیمور خاموش رہے تھے عین جیسے خود کلامی کے انداز میں بولی تھیں۔

''ایسے اتفاقات اس درجہ کثرت سے اور مسلسل واقع نہیں ہو سکتے۔'' وہ جیسے خود کو باور کرا رہی تھیں ان کا لہجہ مدہم تھا۔

''آپ اپنے دماغ پر زیادہ زور مت دیجیے یہ محض اتفاقات بھی ہو سکتے ہیں باقی اللہ بہتر جانتا ہے دلوں کا حال ہم نہیں جان سکتے آپ نے جو کیا وہ عمل ضروری تھا آپ نے اپنے والد محترم کی بات مان کر ہجرت اختیار کی ہے آپ ایک نیک اولاد ہیں جو آپ کے والد محترم چاہتے تھے آپ نے وہ عمل اختیار کیا ہے اس سے بڑھ کر مناسب کوئی عمل نہیں تھا۔'' تیمور نے ان کو تسلی دی تھی۔

''مگر ہم حیدر میاں کے طرز عمل پر حیران ہیں۔'' عین نے پوچھا تھا تیمور نے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ اس متعلق آج بات کیوں کر رہی عین اس کی

اب ضرورت باقی نہیں رہی۔'' تیمور نے تعرض برتا تھا عین نے خاموشی سے دیکھا تھا۔

''ہم جانتے ہیں ہم نے حقائق کو نظر انداز کیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم کوئی منفی سوچ فکر رکھتے تھے۔'' عین نے کچھ جتانا چاہا تھا تیمور نے شکوہ کناں نظروں سے دیکھا تھا۔

''عین ہمارے نظریات اور سوچ و افکار فقط ہمارے لیے نہیں ہوتے کہ ہم انہیں اپنے دفاع یا اپنے مفادات کے لیے استعمال کریں اگر یہ عمل اس طور پورا ہوتا ہے تو اسے خود غرضی کے زمرے میں رکھتے ہیں۔'' تیمور نے دانستہ باور کرایا تھا عین سر جھکا گئی تھی۔

''فتح النساء ہماری سہیلی تھیں ہمیں ان کے لیے حق کا ساتھ دینا چاہیے تھا مگر بخدا ہم نہیں جانتے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہم ان لمحوں کے سچ کے متعلق نہیں جانتے سو ہم کسی ایک کے حق میں رائے زنی نہیں کرسکتے۔ اگرچہ ہمیں اس کا پچھتاوا ہے کہ ہم نے فتح النساء کا ساتھ نہیں دیا ایک صنف نازک ہونے کے ناتے ہمیں ان کا ساتھ نہیں دیا ایک صنف نازک ہونے کے ناطے ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے تھا مگر سچ جانیے تو ہم ہمت ہی نہیں کر پائے ایک رشتے کے ہمراہ کھڑا ہونے کا مطلب تھا دوسرے کے مخالف کھڑے ہونا ہم حیدر میاں کی سچائی نہیں جانتے مگر ہم ان کے خلاف بھی نہیں کھڑے ہوسکے۔'' عین نے شرمندگی سے کہا تھا تیمور نے ان کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

''عین آپ نے ایک رشتے کو بچانے کے لیے اپنے بہت قیمتی رشتے کی قربانی دی ہے آپ فتح النساء کو بچپن سے جانتی تھیں آپ ان کے خلاف اگرچہ کھڑی نہ ہوں مگر آپ نے اپنی اس سہیلی کی طرفداری یا حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا آپ غیر جانبداری کی قائل رہیں مگر یہ عمل مناسب نہیں تھا۔'' تیمور نے اسے الزام دیا تھا عین نے نگاہ اٹھا کر انہیں ملال سے دیکھا تھا۔

''اگر کوئی ہم سے آپ کے متعلق کچھ کہے تو ہم یقیناً اس کا اعتبار نہیں کریں گے کیونکہ ہم آپ کو بہتر انداز میں جانتے اور سمجھتے ہیں دوستی بند آنکھوں سے اعتبار کر لینے کا نام ہے نواب زادی عین النور ہم اس کے لیے آپ کو الزام نہیں دے سکتے۔'' تیمور دانستہ خاموش ہوا تھا عین کو شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔

''اگر وہ آپ کی طرح نواب زادی ہوتیں تو آپ ان کی حمایت ضرور کرتیں نا، فتح النساء کے مقابلے میں ایک امرا کی بگڑی ہوئی اولاد تھی سو آپ نے اس بگڑے ہوئے انسان کا ساتھ دینا ضروری خیال کیا اور دوستی کو قربان کردیا۔'' تیمور سچ کہنے سے رہ نہیں پایا تھا نا چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ سخت ہوگیا تھا عین خاموش رہی تھیں، تیمور بھی خاموش ہوگئے تھے تبھی چند لمحوں بعد عین النور گویا ہوئی تھیں۔

''ایسی بات نہیں تھی تیمور مگر یہ معاملہ ہم سے زیادہ جلال بھائی سے مشروط تھا آپ کی بات جلال بھائی پر بھی لاگو ہوتی تھی مگر انہوں نے فتح النساء کا اعتبار نہیں کیا۔'' عین مدہم لہجے میں گویا تھیں۔

''جلال نے فتح النساء جیسی لڑکی کو اپنی زندگی سے خارج کر کے اپنی زندگی پر خوشیوں کے دروازوں کو خود آپ بند کیا ہے عین النور، فتح النساء پر کوئی اور اعتبار کرے نہ کرے ہم ان کا یقین کرتے ہیں ہم واحد ان لمحوں کے چشم دید گواہ ہیں اس موقع پر جو بھی ہوا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سنا تھا ہم حق کا ساتھ نہ دیتے تو غلط ہوتا سو ہم نے گواہی دینے میں قباحت نہیں جانی کہ فتح النساء پاک دامن ہیں حیدر میاں کی اہلیت کون نہیں جانتا۔ شہر بھر میں ان کی شہرت سے ہر کوئی واقف ہے غالباً اگر کسی کو علم نہیں تو وہ نواب خاندان ہے؟'' تیمور نے طنز کیا تھا عین تڑپ کر رہ گئی تھیں۔

''ہم جانتے ہیں غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں مگر ہم وہ ایک تھے جو دانستہ اس معاملے میں کوئی رائے زنی کرنا نہیں چاہتے تھے ہم کون ہوتے ہیں کسی کے کردار پر بات کرنے والے، دانستہ چپ سادھ لینا جرم ہے تو ہم سے یہ جرم بہرحال سرزد ہوا ضرور ہے مگر ہم چاہتے تھے جلال بھائی اس ضمن میں قدم اٹھائیں مگر ابا جان کے مصلحت پسندی کے تحت کیے گئے فیصلوں نے عین کے متعلق ایک عجیب رائے قائم کرنے کی راہ دی بہرحال وہ اس نواب خاندان کی بہو تھیں اور عزت ہر انسان کی ہوتی ہے ہوسکتا ہے کوتاہیاں ہم سب سے ہوئی ہوں مگر ہم نے دانستہ ایسی کوتاہی نہیں برتنا چاہی دوسری بات ابا جان یا ہم ہی چاہتے تھے جو شک کا بیج

بھائی کے دل میں اگ آیا ہے وہ خود اس کا ادراک کریں اور اسے تناور درخت بننے سے قبل کاٹ ڈالیں مگر مرد کے اعتبار کا پیمانہ شاید مختلف ہے وہ اپنے سو گناہوں کی معافی طلب کر کے بری الذمہ ہو جانا اپنا فرض سمجھتا ہے مگر خود کسی کی ایک دعا کو بھی درگزر کرنے سے اجتناب برتتا ہے گویا دوسرے معنوں میں مرد اپنی آنکھ کے شہتیر کو بھی دیکھا نہیں چاہتا مگر عورت کی آنکھ کے تنکے پر بھی نگاہ رکھتا ہے اسے وہ ایک تنکا بھی کھٹکتا ہے یہ معاشرہ مردوں کا ہے تیمور بہادر یار جنگ آپ اس کا انکار نہیں کر سکتے اس کا ادراک ہمیں ہے اور آپ کو بھی ضرور ہوگا۔

بہر حال فتح النساء کے ساتھ جو بھی ہوا غلط ہوا جلال بھائی کو ان پر اعتبار کرنا چاہیے تھا اور رہی بات حیدر میاں کی تو ہم اس متعلق کوئی بات کرنا نہیں چاہتے۔'' وہ دانستہ بات کرنے سے گریز کرتی ہوئی چپ سادھ گئی تھیں۔

تیمور ان کی سمت بغور دیکھنے لگا تھا۔

''عین النور، محبت اعتبار کرنا جانتی ہیں اور ہر بات کی امید بھی رکھتی ہے جو اعتبار نہ کرے وہ محبت نہیں ہو سکتی۔'' تیمور نے جانے کیا جتانا چاہا تھا عین نگاہ پھیر کر دوسری سمت دیکھنے لگی تھیں۔

''ہمارے اعتبار کے پیمانے مختلف ہوتے ہیں تیمور ہم جو پیمانہ دوسروں کے لیے رکھتے ہیں اس سے اپنے لیے نہیں ناپتے اور جس پیمانہ سے دوسروں کو جانچتے ہیں اس کا اطلاق خود پر لاگو نہیں سمجھتے ہم معاشرتی حیوان ہیں اور حیوانیت کی حدود بندی ہم اپنے مفادات اور اپنے پیمانے کے مطابق کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔'' وہ تلخ لہجے میں گویا ہوئی تھیں تیمور ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا، تبھی وہ مدھم لہجے میں بولی تھیں۔

''ہم حیدر میاں کی اصلیت آپ سے جاننا چاہتے ہیں سب باتوں کو ایک طرف رکھ کر آپ اپنی رائے حیدر میاں کے متعلق دیجیے۔'' عین نے کہا تھا تیمور چند لمحوں تک خاموش رہا پھر بولا۔

''عین آپ کے لیے میری رائے اس مقام پر کیونکر ضروری ہے لوگ فیصلوں سے قبل رائے طلب کرتے ہیں یہاں وقت سرک کر آگے بڑھ چکا ہے ہم ہجرت کر کے ایک نئے مقام پر کیوں ہیں اس کا جواب آپ کو خود سے مانگنا چاہیے نہ کہ ہم سے۔'' تیمور نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا تھا عین تبھی بولی۔

''ہم جانتے ہیں ہم نے ہجرت کیوں کی اور آپ بھی جانتے ہیں ہم اس ہجرت کے متعلق بات نہیں کر رہے، ہم حیدر میاں کے متعلق بات کر رہے ہیں۔'' عین نے کہا تھا تیمور نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا پھر آہستگی سے بولا تھا۔

''ہم آپ کو کسی راہ سے ہٹانا نہیں چاہتے عین نا آپ کے فیصلوں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں آپ کے فیصلے کسی اور معتبر ہستی کے فیصلوں کے پابند ہیں۔'' وہ بہت الجھے ہوئے لہجے میں بولے تھے عین نے خاموشی سے دیکھا۔

''اگر آپ کی دوست کسی خطرے میں گرنے جا رہی ہو تو بھی آپ یہ زبان بندی جاری رکھیں گے؟'' عین نے پوچھا تھا تیمور خاموش رہا پھر قدرے توقف سے بولا تھا۔

''عین آپ خود بہت سمجھدار ہیں ہم جانتے ہیں کہ نواب چاچا کی رائے اور فیصلے آپ کے لیے کس قدر اہم ہے سو ہم ان فیصلوں کو متاثر کیونکر کر سکتے ہیں؟'' تیمور دانستہ کچھ کہنے سے گریز کر رہا تھا تب عین نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ کو لگتا ہے کہ حیدر میاں ہمارے قابل ہیں۔'' عین نے دریافت کیا۔

''آپ اپنے دل سے پوچھیے آپ کو حیدر میاں سے محبت ہے۔'' تیمور نے کہا عین خاموش ہو گئیں اور نگاہ پھیر لی۔

''محبت اس طور اندیشے نہیں رکھتی۔'' ان کا جواب مختصر تھا۔

''ہم محبت کے متعلق کوئی زیادہ گہرا زاویہ نظر نہیں رکھتے۔'' تیمور نے دانستہ جیسے پس و پیش سے کام لیا تھا عین خاموش ہو گئی تھیں، اور تبھی تیمور بولے تھے۔

''محبتوں کو اعداد و شمار ہماری سمجھ میں نہیں آتا عین لیکن سنا ہے محبت کے فیصلے بھی عقل کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ عقل دل کی پاسبان ہے عقل کا دل کے ہمراہ ہونا بہت ضروری ہے۔'' تیمور نے دانستہ گڑبڑ کرتی نگاہ سے دیکھا تھا

اورعین مسکرادی تھیں۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ڈاکٹر اقبال نے بھی عجیب نقشہ کھینچا ہے کہ دل کراہ کررہ جائے اگر دل کو تنہا ہی فیصلہ کرنا ہے تو پھر عقل کی پاسبانی کی کیا ضرورت؟'' وہ الجھی دکھائی دی تھیں تیمور نے ان کو بغور دیکھا تھا۔

''شاید دل کی پاسبانی کے لیے عقل کی ضرورت باقی نہیں ہوتی؟'' تیمور نے پوچھا تھا۔

عین خاموش ہوگئی تھیں تیمور نے بھی جیسے دانستہ خاموشی اختیار کررکھی تھی اور تبھی عین جانے کیا سوچتے ہوئے دھیان پھیر کر بولی تھیں۔

''محبت شاید کوئی لازمی جز و نہیں ہے محبت کے ہونے سے جو اضطرابی کیفیت رہتی ہے اس ایک انکار سے وہ اضطراب لمحہ بھر کو ہی سہی مگر ٹھنڈا پڑنے لگتا ہے کبھی کبھی محبت کے وجود کے لیے یہ مسلسل انکار کرنا ضروری ہوجایا کرتا ہے۔'' وہ عجیب سکوت بھرے لہجے میں بولی تھیں تیمور ان کو دیکھتے رہ گئے تھے۔



دودن بعد کورٹ کی تاریخ تھی اور مرزا صاحب کی جان پر بنی تھی۔

''وہ لونڈا بہت اترایا پھرتا ہے اس کے پاس ضرور کوئی ثبوت ہیں۔'' مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا وکیل مسکرادیے تھے۔

''جانے دیجیے میاں آپ کب سے بچوں سے ڈرنے لگے بڑے اور پرانے کھلاڑی ہیں آپ اور تجربہ یہ سکھاتا ہے کہ بچے جتنا بھی دماغ رکھتے ہوں وہ بزرگوں کے تجربات کے آگے صفر ہوتے ہیں وہ نوجوان صفر ہے مرزا صاحب ہم نے ان کے وکیل سے ملاقات کی تھی وہ بتارہے تھے بہت کمزور مقدمہ ہے اور ایک پیشی سے آگے جانے والا نہیں اس وکیل نے یہ مقدمہ محض اس لیے کیا کہ چھوٹے نواب نے ان کو بھاری رقم دی اب آئی لکشمی کیسے بری لگتی ہے؟'' وکیل صاحب مسکرائے تھے انہوں نے مرزا صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور بولے تھے۔

''مان لیجیے ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہیں بلوائیوں کا کیا ثبوت ہوتا ہے کوئی بلوائی آکر گواہی دینے سے تو رہا اور ہمارے پاس ثبوت ہے جب بلوائیوں کا حملہ ہوا تھا اس وقت چھوٹے نواب نشے میں دھت بے ہوش کوٹھے پر پڑے تھے وہ ایک غیر ذمہ دار بیٹے ثابت ہوں گے جس بیٹے کو خود اس لمحے اپنے والدین کی فکر نہیں تھی وہ مقدمہ آگے بڑھانے کو اہل نہیں دیکھیے گا آپ چھوٹے نواب کا مذاق بن کررہ جائے گا۔'' وکیل صاحب نے یقین دلایا تھا مگر مرزا سراج الدولہ مطمئن نہ ہوئے تھے۔

''آپ نہیں جانتے اس مقدمہ کے شروع ہونے سے ہماری کتنی جگ ہنسائی ہورہی ہے جہاں جاتے ہیں جس سے بھی ملتے ہیں ہر کوئی یہی پوچھتا ہے تھک گئے ہیں، ہم اس مقدمے کے بارے میں جواب دے کر بنی بنائی عزت کا جنازہ نکال دیا ہے اس لونڈے نے، ہر کوئی شک سے ہمیں دیکھتا ہے کئی لوگوں نے تو پوچھ لیا کہ مرزا صاحب آگ ہو تو دھواں اٹھتا ہے تباہی دیجیے معاملہ کیا ہے؟ جی چاہتا ہے اس لونڈے کو توپ سے اڑا دیں۔'' مرزا صاحب انتہائی اکتائے دکھائی دیے تھے۔

''بہرحال اگر آپ کو ہم پر اعتبار ہے تو آپ سکون سے بیٹھ جائیے ان لونڈے کے ہوش ٹھکانے لگا دیں گے۔'' وکیل صاحب پر جوش دکھائی دیے تھے مرزا صاحب خاموش ہوگئے تھے۔

❁……❁……❁

''وکیل صاحب ہمیں آپ پر یقین ہے، ہم پریشان نہیں آپ والد محترم کے پرانے رفقا میں سے ہیں ایسا نہیں کہ ہم آپ پر اعتبار نہیں کرتے یا آپ کو اچھا وکیل نہیں سمجھتے ہم اس مقدمے کو جیتنے کے لیے پرامید ہیں۔'' جلال نے کہا تھا وکیل صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''چھوٹے نواب پرامید رہنا اچھی بات ہے یہی امید یقین کی سمت چلتی ہے۔ ہم نے لمبے عرصے تک نواب صاحب کا ساتھ دیا ہے آپ کے اس مقدمے کو لے کر کام کرنا ہمارے ایک لیے اعزاز ہے خوشی ہے کہ نواب سیف الدین پٹوڈی کے بعد ان کی اولاد بھی ہم پھر اس طور بھروسہ کرتی ہے جس طرح پہلے آپ کا ساتھ دیا ہے اسی طور آگے

بھی دیں گے۔'' وکیل صاحب نے نرمی سے کہا تھا جلال نے ان کو دیکھ کر سر ہلایا تھا۔

''یہ خبر درست ہے کہ مرزا کے وکیل نے ہم سے بات چیت کی تھی مگر ہم نے زیادہ تفصیل فراہم نہیں کی، مرزا صاحب کافی خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں شاید ان کو ڈر ہے کہ وہ بے نقاب ہو جائیں گے مگر سچ زیادہ دیر چھپ نہیں سکتا۔'' وکیل صاحب نے کہا تھا اور جلال متفق ہوتے ہوئے بولے تھے۔

''ہم اس مقدمے کے کامیابی سے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں اس کے بعد ہمارا منصوبہ ہے کہ ہم پاکستان روانہ ہوں گے۔'' وہ مدھم لہجے میں بولے تھے وکیل صاحب چونکے تھے۔

''آپ پاکستان منتقل ہونا چاہتے ہیں؟''

''ابھی اس متعلق طے نہیں ہوا مگر ابا جان کا خواب تھا کہ وہ پاکستان میں مستقل ہوں، ہم نہیں جانتے ہم ایسی سعادت مند اولاد بن پائیں گے یا نہیں مگر ہمارے لیے ترجیحات جو ہیں وہ آپ بھی جانتے ہیں ہم مرحوم ابا جان کی روح کو سرخرو کرنا چاہتے ہیں تاکہ کل ہم ان سے ملیں تو ہماری نگاہ شرم سے جھکی ہوئی نہ ہو۔'' جلال کے کہنے پر وکیل صاحب بولے۔

''اللہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائے چھوٹے نواب اس متعلق آپ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کر سکتے ہیں بہرحال پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے جو بھی طے کرنا ہے آپ طے کر سکتے ہیں اس مقدمے کی فکر مت کیجیے زیادہ لمبا نہیں چلے گا اس پیشی پر نتائج سامنے آجائیں گے۔'' وکیل صاحب نے کہا تو جلال نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔



شہاب اس سمت آیا تھا مگر اسے تیمور کے ساتھ کھڑا دیکھ کر الٹے قدموں واپس پلٹ گیا تھا عین نے اطمینان سے گہری سانس خارج کی تھی۔

''کیا ہوا؟'' تیمور نے ان کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر دیکھا تھا۔

شہاب کو پلٹتے دیکھ کر انہوں نے عین کی طرف دیکھا تھا مگر ان کی نظروں میں کوئی خوف دکھائی نہیں دیا تھا۔

''آپ ٹھیک ہیں نا؟'' تیمور نے دریافت کیا تھا مگر عین نے کوئی جواب دیے بنا پوچھا تھا۔

''کیا ہم آج حیدر میاں سے مل سکتے ہیں؟'' تیمور ان کے سوال پر چونکا تھا۔ ''آپ جانتے ہیں نا وہ کہاں قیام پذیر ہیں؟'' عین نے پوچھا تھا۔ تیمور نے سر ہلا دیا تھا۔

''کیا آپ جائیداد کلیم کرنا نہیں چاہیں گی۔'' تیمور کے سوال پر وہ لحہ بھر کو خاموش ہوئی تھیں پھر مدھم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''تب تک نہیں جب تک ہم حیدر میاں سے ملاقات نہیں کر لیتے۔'' وہ جانے کیوں کسی گہری سوچ میں ڈوبی دکھائی دی تھیں، تیمور نے ان کو بغور دیکھا تھا شاید وہ کسی قدر متفکر تھیں اور تیمور ان کو مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا تبھی مزید کچھ نہیں کہا تھا۔

''آپ جائیداد یں کلیم نہیں کریں گے۔'' عین نے تیمور سے دریافت کیا تھا تیمور آہستگی سے مسکرا دیے تھے۔

''ہم آپ کے محافظ بن کر آگئے ہیں عین۔ یہاں مستقل قیام کی غرض سے نہیں آئے آپ کا نکاح حیدر میاں سے کرا کر ہم واپس لوٹ جائیں گے ہمارا وجود ایک پرندے جیسا ہے جو طویل مسافتوں کی ہجرت بنا کوئی منصوبہ سازی اختیار کرتا ہے اس ہجرت کا کوئی مصرف نہیں ہوتا نہ کوئی منصوبہ سازی۔'' تیمور بہت تاسف سے بولے تھے عین نے ان کی طرف بغور دیکھا تھا مگر دانستہ کچھ کہا نہیں تھا۔



مقدمے کی پیشی پر مرزا صاحب کے ہوش اڑ گئے تھے کیونکہ ان کے وکیل نہ تو قانون کو خرید سکے تھے یا کوئی تیر مار سکے تھے جلال کے وکیل نے نا صرف ثبوت پیش کر دیے تھے بلکہ دو گواہ بھی موجود تھے یہ نوجوان انہی بلوائیوں میں سے تھے جن کو مرزا صاحب نے نواب صاحب کا قتل کا مقدمہ بنا کر استعمال کیا تھا انہوں نے اپنے جرم کا اقرار اس صورت میں کیا تھا کہ ان کو عام معافی مل جائے گی مقدمے کا فیصلہ اگلی سماعت پر ملتوی کر دیا گیا تھا مگر یہ سماعت کوئی معمولی نہیں تھی سو اخباروں نے اسے خوب اچھالا تھا اور اگلے دن کی شہ سرخیوں کو دیکھ کر مرزا صاحب آگ بگولہ ہو گئے تھے۔

"ہم اپنی جیت یقینی چاہتے ہیں جو بھی ہو جیسے بھی ہو چاہے پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑے ہمیں اس مقدمے کو اختتام پذیر کرنا ہے اس مقدمے کا رخ ہر صورت میں بدلنا ہے جائز و ناجائز کسی بھی طریقے سے۔" انہوں نے اخبار کو مسل کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا تھا۔



"لیجیے اڑ گئے مرزا صاحب کے ہاتھوں کے طوطے کہا تھا نا آپ سے کہ یہ مقدمہ ایک نئی کروٹ لے گا مرزا صاحب کے چہرے کی رنگت دیکھنے لائق تھی گواہوں اور ثبوتوں کو دیکھ کر وہ تو ششدر ہی رہ گئے تھے اس ساعت کا لطف رہا۔" وکیل صاحب مسکرائے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے وکیل صاحب مگر آپ ان گواہوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب کیسے ہوئے دوسری بات ثبوتوں سے متعلق ہے ہم بہت حیران ہوئے تھے آپ واقعی ایک قابل وکیل ہیں۔ آپ کی قابلیت میں کوئی شبہ نہیں۔" حکمت صاحب مسکرائے تھے جلال نے سر ہلایا تھا۔

"وکیل صاحب کی قابلیت پر ہمیں یقین تھا ہم بالکل بھی خوفزدہ نہیں تھے سو ہم بس منتظر تھے مرزا صاحب کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے۔" جلال بہت مطمئن دکھائی دیے تھے۔

"بہرحال یہ بڑی جیت ہے جلال صاحب مبارک ہو اگلی ساعت میں مرزا صاحب سلاخوں کے پیچھے دکھائی دیں گے۔" وکیل صاحب نے کہا تھا اور حکمت صاحب مسکرا دیے تھے۔

"بے چارے مرزا صاحب انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا نواب صاحب نہیں مگر ان کی اولاد ان کو بے نقاب کردے گی انہوں نے نواب صاحب کی نرمی دیکھی تھی وہ ان کو باتوں میں قتل کرنا جانتے تھے اور نواب صاحب مرحوم اتنے اچھے دل کے تھے کہ ہر بار مرزا کو معاف کردیتے تھے۔" حکمت صاحب نے کہا تھا وکیل صاحب مسکرائے تھے۔

"بہرحال اب مرزا صاحب کو سزا مل کر رہے گی۔" وہ یقین سے مسکرائے تھے۔

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" حکمت صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا جلال گہری سوچ میں ڈوبے دکھائی دیے تھے۔



تیمور عین کو ہمراہ لیے حیدر میاں کی عارضی قیام گاہ کی طرف آئے تھے مگر دروازے پر تالہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے تھے۔

"یہ کیا، یہ گھر تو بند ہے۔" عین حیرت سے بولی تھیں۔

"ہم کسی سے پوچھتے ہیں۔" کہہ کر وہ پلٹے تھے اور ساتھ والی چھوٹی سی دکان پر رک کر اس مکان میں رہنے والے لوگوں کے متعلق پوچھا تھا مگر کوئی خاص جواب نہیں ملا تھا دکاندار نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا ایک تو برابر میں رہنے والوں سے اس بابت پوچھا تھا تو انہوں نے بھی اسی طور لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"مرزا حیدر سراج الدولہ اب یہاں قیام پذیر نہیں سو انہوں نے ٹھکانہ بدل لیا ہے۔" تیمور نے اخذ کرتے ہوئے کہا تھا عین نے پریشانی سے انہیں دیکھا تھا۔

"کیا یہ محض اتفاق ہے؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھیں، تیمور خاموش رہے تھے عین لب بھینچ کر تیمور کی طرف سے نگاہ بدل گئی تھیں دونوں واپسی کے رستے پر قدم ڈال چکے تھے دونوں گہری خاموشی میں ڈوبے تھے تیمور نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا آپ پریشان ہیں۔" اس نے پوچھنا ضروری خیال کیا تھا عین نے سرنفی میں ہلا دیا تھا اور مدھم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

"یہ سب کچھ اتفاقاً نہیں ہوسکتا۔" وہ مدھم لہجے میں بولی تھیں تیمور نے ارادتاً لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"شاید مگر ہم کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے۔" تیمور جیسے اس کی ہمت توڑنا نہیں چاہتے تھے اور عین کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اتر آئی تھی۔

"یہ محض اتفاق نہیں ہے تیمور ہم اس سے نتیجہ اخذ نہ بھی کریں تو بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ حیدر میاں جان بوجھ کر اس ملاقات کو ٹال رہے ہیں بھیڑ میں ہاتھ چھڑا لینا پھر دیکھ کر نظر انداز کردینا اور پھر آپ کے پوچھنے پر ٹال دینا اور آج اس عارضی قیام گاہ کو چپ چاپ چھوڑ جانا ان سب

واقعات کا ہونا تسلسل رکھتا ہے اور واقعات نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہیں۔'' عین دکھ کی کیفیت میں گھری تھیں۔

''جب حیدر میاں کو خبر ہوگئی تھیں کہ ہم یہاں کیمپ میں ہیں تو وہ آ کر مل سکتے تھے مگر وہ کنی کترا کر نکل گئے کیوں، کیونکہ وہ ملاقات نہیں چاہتے تھے اسٹیشن پر ہاتھ چھڑانے کا بھی یہی مطلب تھا اور اس کے بعد اب ٹھکانہ بدل لینا حیدر میاں کے دل میں کیا ہے؟'' وہ الجھنوں میں گھری دکھائی دی تھیں جو بھی تھا انہوں نے یہاں تک آنے کا قصد حیدر میاں کے لیے ہی کیا تھا وہ حیدر میاں پر یقین کرتی تھیں کہ نہیں یا وہ اعتبار کے قابل بھی تھے کہ نہیں یہ سراسر دوسرا معاملہ تھا سچ یہ تھا کہ وہ یہاں کھلے آسمان تلے بے سرو سامان خالی ہاتھ کھڑی تھیں تو اس کا سبب فقط ایک شخص تھا جانے کیا سوچ کر عین النور کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں تیمور ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے وہ ایک لحہ ہمیں بہت کم ہمت اور شکستہ دکھائی دیا تھا جیسے ان کی امید ایک لحہ میں ٹوٹی تھی، وہ لڑکھڑائی تھیں تیمور نے آگے بڑھ کر ان کو سنبھالا تھا۔

''عین آپ ٹھیک ہیں۔'' تیمور نے ان کو دیکھ کر تڑپ کر ان کو پکارا تھا عین نے سر ہلا دیا تھا تیمور ان کو بغور دیکھنے لگے تھے۔

''آپ اس قدر شکستہ کیوں ہیں عین، ہوسکتا ہے وہ یہیں کہیں قریبی مقام پر منتقل ہوگئے ہوں اور وہ تو جانتے ہیں کہ آپ یہاں کیمپ میں رہ رہی ہیں وہ آ کر آپ سے ضرور ملنا چاہیں گے۔ آپ ایک مثبت سوچ کے ہمراہ اس زمین کی طرف آئی ہیں اب اس طرح حوصلہ مت ہاریے آپ کے اس سفر کا مقصد حیدر میاں سے ملنا ہے اور یہ بہت سی ناممکنات کو بھی ممکنات میں بدل دیتی ہے اللہ کی ذات پر یقین رکھیے آپ نے پوری ایمانداری سے ایک مقصد کے لیے ہجرت کی ہے تو اللہ آپ کا یہ سفر رائیگاں نہیں کریں گے۔'' تیمور نے سمجھایا تھا۔

''بات اس ہجرت یا اس سفر کی نہیں ہم ان کے لیے یہاں آئے سوال یہ بھی ہے کہ وہ اس قابل ہیں بھی کہ نہیں کہ ہم ان کی خاطر یہ سب کرتے۔'' جانے کیا سوچ کر عین نے کہا تھا اور تیمور خاموش ہوگئے تھے عین سر جھکا کر بولی تھیں۔

''ہم نہیں جانتے حیدر میاں کے دل میں کیا ہے مگر ہم ان کے ہمراہ زندگی گزارنے کے لیے یہاں تک آئے ہیں ہم نے ایک وعدے کو ایفا کیا ہے ابا جان سے کیے وعدے کو نبھایا ہے ان کے حکم کو مانا ہے حیدر میاں کا یہ طور طریقہ ہماری سمجھ سے باہر ہے زمانہ ان کے متعلق کیا سوچتا رہا یا وہ کسی اطوار کے انسان ہیں ہم نے اس متعلق سوچنا بھی ضروری خیال نہیں کیا، ہم نے دنیا کی باتوں کی پروا کبھی نہیں کی، زمانے کے کانوں سے بھی نہیں سنا، کبھی جانچا نہیں کبھی انہیں کسی پیمانے پر رکھ کر پرکھا نہیں ناپا تولا نہیں ہم نے محض اس رشتے کی عزت کی ہے جو ان کا ہم سے رہا ہے ہم نے ہوش سنبھالتے ہی ان کو چاہا ان سے محبت کی ہم نہیں جانتے ان کے دل میں کون ہے یا کیا ہے مگر ہمارے دل میں ان کے لیے ایک خاص گوشہ رہا اور اس خاص گوشے کے باعث ہم آنکھیں بند کر کے ان پر اعتبار کرتے رہے ان کا یقین کرتے گئے زمانے کو رد کیا فقط ایک فرد کے لیے مگر اب سوچتے ہیں ہم ایسا کرنے میں حق بجانب بھی تھے کہ نہیں؟ وہ اس سب کے لائق بھی تھے کہ نہیں کیا وہ ہم سے منہ پھیر رہے ہیں دانستہ ہم سے بھاگ رہے ہیں یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔'' وہ آنسوؤں کے درمیان بولی تھیں۔

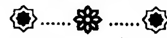
''نواب زادی عین النور آپ زیادہ سوچ رہی ہیں ایسے کم ہمت ہونا اور وہ بھی اس مقام پر جب آپ منزل کے قریب ہیں۔'' تیمور نے انہیں کم ہمت دیکھ کر سمجھانا چاہا تھا مگر عین نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''کون سی منزل، کس منزل کی بات کرتے ہیں آپ تیمور وہ منزل جو منہ چھپا کر بھاگ رہی ہے ہم سے کنی کترا رہی ہے۔'' عین غمگین دکھائی دی تھیں۔'' تیمور نے ان کی طرف بغور دیکھا تھا۔

''یہ محض اتفاق ہے عین، اس کے سوال کچھ نہیں یقیناً حیدر میاں اس بات سے واقف نہیں تھے کہ ہم ان سے ملنے جائیں گے وہ تو اس بات سے بھی واقف نہیں تھے کہ ہم ان کی اس عارضی رہائش گاہ کے متعلق جانتے ہیں۔''

تیمور نے ان کو مطمئن کرنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی عین خاموشی سے دیکھنے لگی تھیں۔

''ہمیں لگتا ہے وہ واقف تھے اور وہ جانتے تھے کہ آپ ان کی اس قیام گاہ کے متعلق معلومات رکھتے ہیں ایسا انہوں نے دانستہ کیا بہر حال ہم ان سے ضرور ملیں گے اور ان کو ہم سے ملنا ہوگا اس ملاقات پر ہماری زندگی کا دارو مدار ہے ان کی اس ملاقات پر ہماری زندگی کا اہم موڑ رکا ہوا ہے اس ملاقات کے بعد ہم طے کریں گے کہ یہیں رہنا ہے یا اس سے آگے کی راہ کیا ہے۔'' وہ آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی تھیں تیمور خاموش کھڑے تھے۔



ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے جانے کیوں جلال کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں کئی البم ان کے سامنے کھلے پڑے تھے کتنی یادیں تھیں تصویروں میں مقید مسکراتے چہرے، مسکراتے لمحے زندگی ایک جیسی کیوں نہیں رہتی، ایک ڈگر پر کیوں نہیں چلتی، زندگی میں خوشگوار لمحے ہمیشہ قیام کیوں نہیں کرتے، ماضی کی تصویریں دیکھتے ہوئے وہ سوچ جا رہے تھے۔

''اماں جان...... ابا جان...... دادا جان...... عین...... اور وہ خود...... کتنی یادگاریں تھیں کتنی مسکراتی تصویریں تھیں زندگی کس درجہ خوب صورت تھی۔

کیسی مکمل تھی کاش زندگی اسی طور مکمل رہتی مگر ایسا ہو نہیں سکا تھا، زمانے نے کروٹ بدلی تھی اور اس ایک کروٹ سے سب پلٹ گیا تھا انہوں نے ایک صفحہ پلٹتے ہوئے ماضی کے رنگوں کو ٹھہر کر دیکھا تھا بچپن کی ان تصویروں میں فتح النساء کسی شرارت کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہی تھیں کیا مسکراتا چہرہ تھا کیا زندگی تھی کیسی دلکشی تھی لڑکپن کی ان تصویروں میں جیسے زندگی کے سبھی رنگ تھے ان کو وہ واقعہ تو یاد نہیں تھا مگر بے اختیار وہ اس تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ماضی کے اس رنگ کو جیسے چھو کر محسوس کرنے لگے تھے۔

''زندگی اس سے بھی دلکش ہو سکتی تھی مگر ہم نے رنگوں سے ناتہ توڑ لیا، اس سے قبل کہ زندگی اپنے رنگوں کے ہمراہ ہماری طرف رخ کرتی ہم نے رخ پھیر لیا اور زندگی جیسے تھک کر قدم واپس لینے لگی۔'' ان کے لب بڑبڑائے تھے۔

''فتح النساء ہم نے غلط کیا آپ کو نظر انداز کیا آپ سے سختی برتی ناروا سلوک روا رکھا جس کی حقدار آپ یقیناً نہیں تھیں آپ اپنے دل میں جو محبت رکھتیں اس کا جواب ایسا کٹھور پن ہونا جائز نہیں تھا مگر ہم نے دانستہ یہ سختی برتی آپ سے فاصلہ رکھا ایسا اس باعث نہیں تھا کہ ہم آپ سے نفرت کرتے تھے جتنی محبت آپ کے دل میں ہمارے لیے تھی ہم اس کی عزت کرتے ہیں ہم نے آپ پر شک کیا آپ کا یقین نہیں کیا یہ ہماری خطا ضرور ہے مگر جب سے آپ اس محل میں ہمارے لیے واپس آئیں اور ہماری خطاؤں اور کوتاہیوں کے باوجود ہم کو معاف کیا۔ ہمارا ساتھ دینے کو ہمارے قریب رہیں آپ کی جگہ ہمارے دل میں بنتی گئی ہم آپ سے محبت کرتے تھے فتح النساء بے پناہ محبت ایسی محبت کے جس کے متعلق آپ سوچ بھی نہیں سکتی، ہمیں آپ سے شکوے تھے...... نفرت تھی...... غصہ تھا...... شک کرتے تھے...... مگر وہ کل کی بات تھی، آپ نے اس نفرت کا گلا گھونٹا اور سوئی ہوئی محبت کو واپس بیدار کیا مگر وہ لمحے ہمارے اپنے نہیں تھے ابا جان اور اہل خانہ کی وفات کے بعد ہماری زندگی پر جیسے ہمارا حق ختم ہو گیا ہے ہماری زندگی کا مقصد فقط سراج الدولہ کو ان کے انجام تک پہنچانا ہے ہم ان کو سزا دلوانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے ہم نے ہر شے کو پس پشت ڈال دیا۔

محبت
زندگی
ہر خوشی

آپ ہماری اولین خوشی تھیں فتح النساء ہم جو سمجھتے تھے کہ ہمیں خوشنما سے محبت ہے تو آپ نے اس محبت کے معنی بدل کر اپنے حق میں کر لیے آپ نے اس محبت کا رخ بدل کر اپنی طرف موڑ لیا اور ہم آپ کے عشق میں مبتلا ہوتے گئے بھی جب حیدر میاں کا قصہ اٹھا ہم نے آپ پر شک کیا ہم مرد ہیں ہم نے اس محبت کو شک کے دائرے میں رکھا مگر یہ فطری احساس تھا ایسا نہیں تھا کہ ہمیں آپ کا یقین نہ تھا مگر اس ایک احساس کے آگے ہر احساس ماند پڑ گیا

بہر حال آپ سے عشق تھا سو اب بھی قائم ہے آپ کا ہاتھ تھام کر روک نہیں سکے کیونکہ ہم دانستہ آپ کو جانے دینا چاہتے تھے ہم ان لمحات میں کمزور پڑنا نہیں چاہتے تھے آپ کی محبت ہمیں قریب رہ کر کمزور کر دیتی ہم نے جو راہ چنی تھی وہ مشکل تھی جس دن ہم پر جان لیوا حملہ ہوا اس دن کے بعد نے سوچا تھا کہ آپ اگر جانا چاہیں گی تو ہم آپ کو روکیں گے نہیں ایسا نہیں کہ ہم نے دانستہ نہیں روکا اور جانے دیا محبت کو جانے دینا کیا جان لیوا عمل ہے یہ ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے ہم نے اپنا نشیمن خود آتش کے حوالے کیا ہے زندگی رہی تو ہم بھی آپ سے ملنا چاہیں گے فتح النساء آپ کے روبرو کھڑے ہو کر آپ سے دو لفظ کہنا چاہیں گے ایک معافی اور دوسرا حرف محبت ہمارے پاس بس یہ دو لفظ ہیں فتح النساء آپ سے بہت محبت ہے مگر ہم بہت شرمندہ بھی ہیں معافی مانگنا چاہتے ہیں کہ آپ پر شک کیا ہم مرد ہونے کے ناتے سب روا کرنے میں حق بجانب نہیں ایسا ہم جانتے ہیں مگر بندہ بشر ہیں خطائیں ہم سے بھی ہوتی ہیں اور ہوتی ہیں کیا کریں۔'' فقط معافی ہی طلب کر سکتے ہیں مگر معافی مانگنے کی گھڑی بھی آئے گی کہ نہیں اور محبت ہے یہ جتانے کا لمحہ بھی نصیب ہوگا کہ نہیں ہم نہیں جانتے کیا کریں آپ سے دوری پر بیٹھے آپ کو کس درجہ یاد کرتے ہیں آپ کے بنا زندگی کے کوئی معنی نہیں بے پناہ عشق رکھ کر دوار رہنا کیا المیہ ہے یہ ہمارے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا، دانستہ ہجر مول لینا کیسی حماقت ہے مگر ہم سے سرزد ہوئی ہے کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے ہمارے گرد منڈلانے والے خطرات آپ کی سمت رخ کریں یا آپ کو بھی اپنی لپیٹ میں لیں سو ہم نے محبت کو خیر باد کہا اور وقت کو اس کی مخصوص چال چلنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا اب وقت ہے اور ہم ہیں وقت بھاری ہے دل پر پتھر کی سمت پڑا ہے اور سانس لینا دوبھر ہے مگر ہم وقت کے ہمراہ کھڑے رہ کر دل کو تسلی دینے کہ ہم نے جو فیصلہ لیا وہ آپ کی خیریت کے لیے ضروری تھا۔ جن خطرات سے ہم گزر رہے تھے ان کے حوالے آپ کو کر دینا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا آپ سمجھتی رہیں ہم آپ سے خفا ہیں متنفر ہیں یا آپ کو زندگی میں نہیں چاہتے اور ہم نے آپ کو ایسا سوچنے کے لیے جانے دیا آپ جہاں بھی رہیں گی آپ کی یاد ہمارے دل میں باقی رہے گی اور یہ محبت بھی بڑھتی جائے گی۔'' جلال کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا کھٹکا ہوا تھا جلال نے پلٹ کر دیکھا تھا تاریکی میں کوئی کھڑا دکھائی دیا تھا۔

انہوں نے اٹھ کر دیکھنا چاہا تھا مگر اس سمت سے کسی نے پستول تان کر فائر کیا تھا جلال بے یقینی سے تاریکی میں کھڑے وجود کو دیکھ رہے تھے مگر اس شخص نے دوسرا وار کیا تھا دوسری گولی جلال کے وجود میں پیوست ہوئی تھی جلال آگے بڑھے تھے ان کے جسم سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے تھے مگر ان کا مضبوط وجود قدم قدم چلتا آگے بڑھ رہا تھا اور اس وجود کو جالیا تھا سامنے پستول تھامے کوئی اور نہیں مرزا سراج الدولہ کھڑے تھے تیمور نے ان کو حیرت سے دیکھا تھا سراج الدولہ مسکرائے تھے۔

''الوداع چھوٹے نواب جلال سیف الدین پٹوڈی آپ کا جانا بھی ضروری تھا آپ نہ جاتے تو ہماری عزت نیلام ہو جاتی الوداع۔'' انہوں نے کہا تھا اور ایک فائر مزید جلال کے وجود پر کیا تھا گولی جلال کے وجود میں پیوست ہو گئی تھی وہ بے یقینی سے مرزا سراج الدولہ کو دیکھتے ہوئے زمین بوس ہو گئے تھے سراج الدولہ مسکرائے تھے۔

''الوداع چھوٹے نواب آپ کا اپنے پیاروں کے پاس جانا ضروری تھا سو یہ مقدمہ بند ہو سکے اب دنیا کی نظر اس خبر سے ہٹا کر ایک بڑی خبر پر ہوگی اخبار میں شہ سرخی ہوگی کہ نواب زادہ نے تنہائی اور حالات سے گھبرا کر خود کشی کر لی مرحوم بہت قابل نوجوان تھے ان کی موت سیاست کی دنیا کا بڑا نقصان ہے۔'' سراج الدولہ ہنسے تھے اور جھک کر پستول جلال کے ہاتھ میں تھما کر سیدھے کھڑے ہو کر دستانے اتارے تھے اور مسکراتے ہوئے جلال کے بے جان وجود کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے پلٹ کر وہاں سے نکل گئے تھے جلال کا بے سدھ وجود زمین پر پڑا رہا تھا زمین ان کے خون سے تر ہوتی جا رہی تھی۔

گرم گرم سرخ رنگ خون، جلال بے سدھ پڑے تھے جیسے گہری نیند میں تھے جیسے ان کو کسی درد کا کوئی احساس نہیں تھا۔

"یا اللہ۔" فتح النساء چیخ کر گہری نیند سے جاگی تھیں کسی نے جیسے ان کا دل مٹھی میں لے کر دبوچا تھا اور مسل ڈالا تھا بوا نے ان کو چونک کر دیکھا تھا۔

"کیا ہوا فتح النساء آپ خیریت سے ہیں۔" انہوں نے پوچھا تھا فتح النساء نے سرنفی میں ہلایا تھا ان کا انداز کھویا کھویا تھا جیسے دل و دماغ کہیں اور تھا اور وجود اس ٹرین میں تھا۔

"بوا ہم پاکستان نہیں جانا چاہتے جلال کسی مشکل میں ہیں ہمارا دل بہت کانپ رہا ہے جیسے وہ کسی خطرے میں ہیں ہمیں واپس جانا ہے بوا۔" وہ کہتی ہوئی اٹھی تھیں بوا نے فوراً اٹھ کر ان کو تھاما تھا۔

"بیٹا آپ پاکستان جائیں گی اس کا فیصلہ آپ نے خود کیا تھا۔"

"وہ فیصلہ ہمارے دل کا نہیں تھا بوا ہمیں پاکستان نہیں جانا خدارا ہمیں چھوڑ دیں ہمیں جلال کے پاس جانا ہے وہ کسی خطرے میں ہیں ہم نے اچھا خواب نہیں دیکھا وہ مشکل میں ہیں ان کو ہماری ضرورت ہے ہمیں جانے دیجیے۔" وہ بدحواس سی بولی تھیں جیسے وہ اپنے ہوش وحواس میں نہ تھیں بوا بامشکل ان کو سنبھالے کھڑی تھیں۔

"جلال...... جلال......!" وہ دیوانہ وار پکارنے لگی تھیں۔

"یا اللہ جلال کی حفاظت فرما ان کو اپنے حفظ وامان مین رکھ میرے مولیٰ جلال کی مدد کر انہیں ہر خطرے سے بچائے رکھ۔" وہ بدحواسی میں چیخ رہی تھیں ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ کسی طرح اپنا وجود بوا کی گرفت سے چھڑ کر بھاگتی ہوئی ٹرین سے کود جائیں بوا مضبوطی سے انہیں تھامے کھڑی تھیں۔

"جلال ہم نے کیوں تنہا چھوڑا آپ کو، یا اللہ ہم نے کیوں نہیں سوچا آپ کس قدر تنہا ہو جائیں گے ہم نے آپ کو وہاں چھوڑا ہمیں آپ کے ہمراہ ہونا ہے جلال ہم نے فقط آپ سے محبت کی ہے ہم آپ سے دوری پر نہیں جاسکتے خدارا ہمیں جانے دیجیے بوا ہماری زندگی جلال کے بنا بے معنی ہے ہم جلال کے بنا نہیں جی سکتے جلال کے بنا نہیں رہ سکتے جلال کو ہماری ضرورت ہے ان کی آواز ہماری سماعتوں میں گونج رہی ہے وہ جیسے ہمیں پکار رہے ہیں ہمیں مت روکیے ہمیں ان کے پاس جانے دیجیے کوئی روکو اس ٹرین کو۔ خدا کا واسطہ کوئی اس ٹرین کو روکے ہمیں ہجرت نہیں کرنی ہم نے جلال کے پاس جانا ہے۔" وہ دیوانگی کے عالم میں عجب بدحواسی سے چیخے جارہی تھیں بوا ان کی اس کیفیت پر حیران سی بامشکل ان کو سنبھال رہی تھیں۔



"کیا ہوا، آپ اداس ہیں نواب زادی؟" تیمور نے چائے کا پیالہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا تھا عین نے جیسے کھوئے کھوئے سے انداز میں سرنفی میں ہلا دیا تھا اور مدہم لہجے بولی تھیں۔

"ہم نہیں جانتے یہ اداسی کیسی ہے مگر جیسے ہماری پوری روح سوگواری میں لپٹی ہوئی ہے دل چاہ رہا ہے پھوٹ پھوٹ کر روئیں زار وقطار روئیں اس دن کی یاد آرہی ہے جب ہم ابا اماں کو چھوڑ آئے تھے جیسے کسی اپنے کی لاش گری ہو، جیسے کسی اپنے کا خون بہا ہو ہمارا دل بہت بے چینی میں گھرا ہے تیمور، اللہ ہمارے بھائی کو محفوظ رکھے۔" وہ بے چینی سے بولی تھیں تیمور نے سر ہلایا تھا۔

"آپ پریشان مت ہوں عین اللہ خیر کرے گا جلال اکیلے نہیں ہیں ان کے ہمراہ ہمارے والد محترم ہیں فتح النساء اور بوا بھی ان کے ہمراہ ہوں گے وہ اکیلے نہیں ہیں۔" تیمور نے سمجھایا تھا۔

مگر عین بہت غمگین تھیں تیمور نے سر اٹھا کر دیکھا تھا وہاں حیدر میاں کھڑے تھے عین نے غالباً ان کی طرف نہیں دیکھا تھا تیمور نے ان کی توجہ اس جانب دلائی تھی عین نے حیدر میاں کی طرف دیکھا تھا وہ عین کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے تھے اور آہستگی سے بولے تھے۔

"عین ہمیں آپ سے بات کرنا ہے۔" ان کا لہجہ عجیب گمبھیرتا لیے ہوئے تھا جیسے اس میں بہت سے راز تھے عین بے چین سی اٹھی تھیں اور ان کے ہمراہ چلتی ہوئی کچھ قدم کے فاصلے پر جارکی تھیں تیمور دانستہ ان کی سمت سے

نگاہ چرا گیا تھا مگر وہ اپنی سماعتوں کو بند نہیں کر پایا تھا حیدر میاں کہہ رہے تھے۔

''عین ہم آپ کی قدر کرتے ہیں دل سے احترام کرتے ہیں آپ نے ہمارے لیے یہاں تک کا سفر اختیار کیا اور بطور خاص ہم کو تلاشا ہم اس جذبے کو سراہتے ہیں آپ ایک بہت مخلص دوشیزہ ہیں ہم نے آپ سے ملنے کی ٹھانی ہے یہ بتانے کے لیے کہ ہم۔'' وہ رکے تھے عین کی سمت دیکھا تھا جو سر اٹھائے ان کی طرف خاموشی سے ساکت کھڑی دیکھ رہی تھیں۔

''ہم آپ سے نکاح نہیں کر سکتے عین ہم اس رشتے کو جاری نہیں رکھ پائیں گے ہم مرد ہیں اور ہم خود کو یہ سوچنے سے باز نہیں رکھ سکتے کہ چاہے آپ نے یہ سفر ہمارے لیے اختیار کیا ہے مگر آپ نے طویل سفر کو اور کئی راتوں کو کسی اجنبی کے ہمراہ گزارا ہے ہم چاہ کر بھی آپ کا اعتبار نہیں کر سکتے۔ معذرت چاہتے ہیں آپ کو ہمارے لفظوں سے تکلیف ہو تو مگر ہمارا دل اتنا بڑا نہیں ہے ہم ایسی لڑکی سے نکاح نہیں کر سکتے جو کسی اور کے ہمراہ اتنے دن تک تنہا رہی ہو۔'' وہ بولے تھے اور عین اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی اور ساکت تو تیمور بھی رہ گئے تھے جی چاہا تھا وہ اٹھیں اور حیدر کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کریں اور ان سے کہیں کہ وہ ایک پاک دامن دوشیزہ کے دامن پر کیچڑ کیسے اچھال سکے؟ مگر ان کے پاؤں بندھ گئے تھے۔

حیدر دل کی بات کہہ کر مڑا تھا اور پلٹنے لگا تھا عین اس طور ساکت کھڑی تھی تیمور کو لگا تھا اگر اب انہوں نے اٹھ کر عین کو نہیں سنبھالا تو وہ زمین بوس ہو جائیں گی وہ چائے کی پیالی رکھ کر ان کی طرف لپکے ان کو تھامنے کو ہاتھ آگے بڑھے مگر عین نے ساکت کھڑے ہوئے ان کا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور اسی طرح ساکت سی مڑ کر چلتے ہوئے کیمپ کی طرف بڑھنے لگی تھی، تیمور نے ان کو جانے دیا تھا وہ چاہتا تھا وہ دل ہلکا کر لیں اور جب ان کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز آ رہی تھی تو وہ دانستہ قدم روکے کھڑے رہے تھے ان کے چہرے پر عجیب کیفیت تھی شاید وہ بہت زیادہ جبر کر رہے تھے۔



''عجیب ہوتی ہیں عورتیں بھی ان کے دل میں محبت کا بیج ایک بار بو دو تو پھر وہ تناور درخت بنتا جاتا ہے پھر چاہے کتنا بھی جھٹکو دامن چھڑاؤ وہ جان ہی نہیں چھوڑتیں ایسا ہی کچھ نواب زادی عین النور کی بابت ہوا ہم ان سے کنی کترا رہے تھے اور وہ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں آخر کر کھل کر بتا دیا اور سن کر ایسے بت بن گئیں جیسے جسم میں خون نہیں رہا ایسی بے غیرتی ہوتی ہے جناب کہاں انہوں نے کسی اور کے ہمراہ اتنی راتیں اتنے دن گزار لیے ہم کیا ایسے چغد ہیں کہ ان کو جان کر بھی قبول کر لیں گے آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے میاں؟'' وہ سامنے بیٹھے اپنے اس دوست سے بولے تھے جس کے گھر قیام تھا تیمور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تھا حیدر ان کو سامنے دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے تیمور نے کچھ کہے بنا ان کے سامنے رک کر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا تھا حیدر حیران رہ گئے تھے۔

''آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ نواب زادی کے لائق نہیں تھے حیدر میاں انہوں نے ایک وعدے کا مان رکھا اور سفر کر کے آپ کے لیے یہاں آئیں مگر آپ ان کے ہمراہ زندگی گزارنے کے قابل نہیں تھے دنیا آپ کے لیے انگلی اٹھاتی رہی اور آپ نے اپنی غلاظت کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک پاک دامن لڑکی کے دامن پر کیچڑ اچھال دیا، آپ نے عین پر انگلی اٹھائی؟ آپ کی اصلیت کون نہیں جانتا؟ ساری دنیا آپ کی بدکرداری کے متعلق بات کرتی رہی اور نواب زادی آپ پر آنکھیں بند کیے اعتبار کرتی رہی، کچھ کہنے سے قبل آپ کو اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت تھی مرزا حیدر سراج الدولہ۔'' تیمور کہہ کر پلٹا تھے اور حیدر کو ساکت چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے تھے۔



عین نے شاید جتنے آنسو بہانے تھے بہا لیے تھے وہ خاموش اور ساکت تھیں۔

''ہمیں ہائی کمیشن میں اطلاع دینی ہے جلال بھائی کے متعلق پوچھنا ہے کیا آپ ہمارے ساتھ چلیں گے؟'' عین تیمور سے نگاہ ملائے بنا بولی تھیں تیمور نے سر ہلا دیا تھا اور ان کے ہمراہ چل پڑے تھے۔

’’ہم سوچ رہے ہیں واپس ہندوستان چلے جائیں۔‘‘ عین نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا تیمور چونکے نہیں تھے۔

’’یہاں کیا رکھا ہے ایک اجنبی دیس ہے بس وہاں ہمارے اباؤ اجداد کی قبریں ہیں نشانیاں ہیں ہمارے بھائی ہیں ہم ان کی طرف واپس لوٹ جانا چاہتے ہیں تیمور۔‘‘ عین جیسے اپنے طور پر فیصلہ کر چکی تھیں تیمور خاموشی سے ان کو سن رہا تھا ان کے پاس جیسے الفاظ نہیں تھے یا وہ کچھ نہیں چاہتے تھے یا وہ عین کا مان باقی رکھنا چاہتے تھے تبھی بنا ان کی طرف دیکھے مدہم لہجے میں بولے تھے۔

’’حیدر میاں کے عمل پر کوئی حیرت نہیں وہ آپ کے لائق نہیں تھے۔‘‘

’’وہ ہمارے لائق تھے کہ نہیں اس کے متعلق ہم بات نہیں کرنا چاہتے تیمور۔‘‘ وہ ان کی بات کاٹ کر بولی تھیں تیمور خاموش ہو گئے تھے ہائی کمیشن پہنچ کر اپنی تفصیلات مہیا کی تھیں اور اس طرف کا حوالہ بھی دیا تھا۔

’’ہمارے بھیا جلال کو مطلع کر دیجیے کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں مگر ہم واپس ہندوستان آنا چاہتے ہیں ان کا نام جلال الدین پٹوڈی ہے وہ لکھنو کے نواب سیف الدین پٹوڈی کے بیٹے ہیں اور ہم ان کی ہمشیرہ۔‘‘ کہتے ہوئے عین کی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے اور بہتے ہوئے رخساروں پر جا نکلے تھے تیمور نے اپنے متعلق تفصیلات درج کرائی تھیں اور عین کے ہمراہ باہر نکل آئے تھے۔

’’آپ نے ٹھان لی ہے آپ واپس ہندوستان جائیں گی؟‘‘ تیمور نے کوئی اور ذکر کیے بنا ان کے اگلے اقدام کے متعلق بات کی تھی، عین نے سر ہلا دیا تھا۔

’’عین۔‘‘ تیمور نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کی ہمت کی تھی اور پھر جانے کیا سوچ کر لب بھینچ لیے تھے عین ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں تب تیمور کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔

’’عین حیدر میاں نے جو بھی کہا وہ آپ کے لیے معنی نہیں رکھنا چاہیے آپ خود ان کی حقیقت جانتی تھیں اور......!‘‘

’’تیمور کیا بہتر نہ ہوگا کہ ہم اب حیدر میاں کی کوئی بات نہ کریں۔‘‘ عین نے تیمور کی سمت دیکھے بنا کہا تھا وہ جیسے حیدر کے الفاظ پر انتہائی شرمندہ تھیں اور تیمور سے نگاہ بھی نہیں ملا رہی تھیں حیدر ان کی کیفیات سمجھ رہا تھا مگر وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا شاید اس متعلق کھل کر بات کر کے وہ عین کو مزید شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا تبھی وہ خاموش ہو کر چپ سادھ گیا تھا۔

’’کچھ سفر کا ہم خود آغاز نہیں کرتے قسمت ہم سے کراتی ہے یہ سفر ہماری قسمت میں تھا ہم نے جب یہ سفر جس مقصد سے کیا اس کو بھول جانا ضروری ہے۔‘‘ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں تیمور نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

’’اور آپ کے والد محترم کی مرضی اس میں شامل رہی بہرحال اس متعلق بات کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، اس واقعے کو خواب سمجھ کر بھول جانا مناسب ہے۔‘‘ تیمور نے مشورہ دیا تھا وہ سر ہلانے لگی تھیں۔

’’مگر المیہ یہ ہے کہ وہ خواب نہیں تھا خواب ہوتا تو بہتر تھا ملال باقی نہیں رہتا۔‘‘ وہ چپ ہوئی تھیں تیمور ان کی مرضی کے مطابق اسٹیشن کی سمت روانہ ہوئے تھے مگر ٹرین میں سوار ہونے سے قبل جانے کیا سوچ کر عین نے نفی میں ہلایا تھا۔

’’ابا جان چاہتے تھے وہ پاکستان جا کر رہیں یہ ملک ان کا خواب تھا اور یہاں آ کر زندگی گزارنا ان کا مقصد سو ہم ان کے خواب کو فراموش نہیں کر سکتے ہم پاکستان چھوڑ کر نہیں جائیں گے ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہم یہیں رکیں گے اگر آپ کو جانا ہے تو آپ چلے جائیں۔‘‘ عین عجیب میکانکی انداز میں دیوانہ وار قدم الٹے واپس لینے لگی تھیں۔

’’ابا جان، اماں جان دادی جان ان کا خون رائیگاں جائے گا اگر ہم واپس ہندوستان چلیں گے وہ ایسا نہیں چاہتے تھے ابا جان ایسا کب چاہتے تھے وہ تو پاکستان کو اوڑھنا بچھونا بنائے بیٹھے تھے وہ تو پاکستان کے خواب دیکھتے تھے مسلم لیگ سے جڑ کر انہوں نے پاکستان کی جدوجہد میں کتنا حصہ ڈالا کس قدر کام کیا ہم اپنے پیاروں کی قربانیوں کو رائیگاں کیسے کر سکتے ہیں ہم ہندوستان واپس نہیں جائیں گے ہم ہندوستان لوٹ گئے تو ان

قربانیوں کا مقصد ختم ہوجائے گا ابا جان نے جس وعدے کے تحت یہاں روانہ کیا تھا وہ محض حیدر میاں کے ہمراہ زندگی گزارنا نہیں تھا ان کا کہنا یہ تھا کہ ان کی اولاد پاکستان میں آباد ہو وہ ہماری آنے والی نسلوں کو اس زمین پر آباد دیکھنا چاہتے تھے وہ وعدہ مکمل نہیں ہوگا اگر ہم اس زمین پر آ کر واپس لوٹ جائیں وہ خواہش پوری نہیں ہوگی ہمیں اس سرزمین کو اوڑھنا بچھونا بنانا ہوگا یہیں کی خاک میں جینا ہوگا اور یہیں مرجانا ہوگا تب وہ وعدہ ایفا ہوگا۔'' وہ عجیب کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی تھیں اور ٹرین سے دوری پر نکل گئی تھیں تیمور نے ان کو ہاتھ تھام کر روکا تھا وہ الٹے قدم چلتیں رک گئی تھیں اور تیمور کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ نے ہمارا ساتھ دیا یہاں تک ہمارے ہمراہ آئے ہمارے ہمراہ رہے ہماری حفاظت کی ہمیں محفوظ رکھا اس کے لیے ہم شکر گزار ہیں مگر ہم مزید آپ کو اپنے ساتھ باندھ کر نہیں رکھنا چاہتے آپ واپس لوٹ سکتے ہیں تیمور۔'' وہ عجیب کھوئے لہجے میں بولی تھیں مگر تیمور نے ان کا ہاتھ چھوڑا نہیں تھا عین حیران ہو کر ان کو دیکھنے لگی وہ بغوران کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''آپ بھول رہی ہیں عین ہمارے والد محترم بھی آپ کے ابا جان کے ساتھ اس جدوجہد آزادی میں پیش پیش رہے ہیں اور ان کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ پاکستان آ کر رہیں اور اپنی آئندہ نسلوں کو یہاں پھلتا پھولتا دیکھیں یہ فقط زمین نہیں ہے عین یہ محض ملک نہیں ہے یہ نظریاتی زمین ہے یہ ہجرت نظریات کی ہجرت ہے اور یہ قیام ان نظریات کے حقائق کی مدلل دلیل ثابت ہوگا آپ اکیلی نہیں رکیں گی ہم بھی آپ کے ہمراہ یہاں رکیں گے۔'' تیمور نے مضبوط لہجے میں کہا تھا عین نے حیران ہو کر دیکھا تھا۔

''مگر آپ کے خاندان والے، وہ سب شاید وہ تو پاکستان روانہ نہیں ہوئے آپ جذباتی فیصلے کیوں کررہے ہیں آپ کو واپس لوٹ جانا چاہیے۔'' وہ بضد ہوئی تھیں مگر تیمور نے نفی میں سر ہلا دیا تھا اور بغوران کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔

''ہم چاہ کر بھی واپس نہیں لوٹ سکتے عین اس زمین پر رہنا ہمارا خواب بھی ہے اور سچ پوچھیے تو ہم یہاں اسی نیت سے آئے تھے جب نواب چچا نے ہم سے وعدہ لیا تھا تو ہم یہی ٹھان کر نکلے تھے کہ زندگی اس زمین پر بسر کریں گے اب ہم اس پاک سرزمین پر ہیں تو واپس کیسے لوٹ سکتے ہیں اور پھر آپ بھی تو یہیں قیام کرنا چاہتی ہیں ہمارے خواب اور خواہش ایک ساتھ مل رہے ہیں تو ہم منہ واپس کیسے موڑ سکتے ہیں یہاں زندگی گزارنا ہمارا مقصد تھا تو آپ کے ساتھ زندگی گزارنا بھی ہماری خواہش تھی۔'' تیمور کے کہنے پر عین نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا اور تیمور سر ہلاتے ہوئے بولے تھے۔

''عین آپ کتنی معتبر اور کس درجہ پاکیزہ ہیں، خدا کے بعد ہم جانتے ہیں آپ کی پاک دامنی پر ہمیں کبھی کوئی شک نہیں رہا ہم آپ سے محبت کرتے تھے اور اب اس سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں اس متعلق آپ کو بتانا نہیں چاہتے تھے مگر اب بتانا جیسے ناگزیر ہوگیا تھا سو دل کی بات کہہ رہے ہیں ہم آپ کا ہاتھ تمام عمر کے لیے تھامنے کے خواہاں ہیں کیونکہ یہ محبت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم یہاں آپ کو تنہا چھوڑ کر واپس لوٹیں قدرت کو بھی یہ سفر اور ساتھ ضروری لگتا ہے سو ہم اور آپ چاہ کر بھی اس سے انکار نہیں کرسکتے۔'' تیمور نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے عین کا ہاتھ تھاما تھا اور چلتے ہوئے کیمپ کی طرف بڑھنے لگے تھے عین حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں ایک سو سولہ چاند کی راتیں اپنے اختتام کی سمت گامزن تھیں اور منزل ان کی منتظر تھی۔

(ختم شد)



نومبر

تنویر خلیل

نئے افق کی روایتوں سے ہٹ کر محبت کا ماتم کرتی تحریر ایک حسینہ کی روداد، اس سے محبت جیسی عظیم غلطی سرزد ہوگئی تھی۔
تنویر خلیل کے قلم سے محبت کا مرثیہ

جو حساس دلوں کے تار چھیڑ دے گا

''آسمان پر کسی نو آموز خطاط نے لفظ ''قصیدہ'' لکھا اور ''نگرنسواں'' میں اس تمثیل کی عبادت ہوتی رہی۔''

سلفورڈ قیس' دی لیوری کی بے مثال آرٹ گیلری کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوں' اوورکوٹ پر شام کی سسکیاں دم توڑ رہی ہیں' بے آواز آسمان آنسو بہا رہا ہے۔

''تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں شارلٹ! بالکل ہمارے وطن کی جھیل سی۔'' آسمان کے قطرے میرے آنسوؤں سے شرط باندھنے لگے تھے' برف میں دبی' بے بس چڑیا سرد ہوچکی ہے۔

''یہ میرا نہیں ہوسکتا۔'' بازگشت میں فرعون سی گرج تھی' آسمان نے سر جھکا کر اپنا سر تسلیم خم کردیا' بے نوری نور کا مینار دیکھ لیا تھا۔

''میں تم سے...... جبران احمد' تم سے شارلٹ' تم سے محبت کرتا ہے۔''

''میں تمہیں کیسے ملاؤں گا تم عیسائی ہو۔''

''ہاں میں تمہارے لیے دنیا میں آگ لگادوں گا' اے بغاوت پر اکسانے والی کیا میرے ساتھ رہو گی؟''

''عیسائی عبث ہے اور ہم ''عبث'' سے رشتہ جوڑ کے نجس نہیں بننا چاہتے۔'' شو ختم ہو رہا ہے' پاپ کارن ہاتھ میں تھامے اوورکوٹ پہنے' مفلر لپیٹے اور اونی ٹوپی پہنے میں بالکل اسٹیچو بن گئی ہوں۔ میرا ہاتھ ہوا میں معلق ہے جو اس بات کا ضامن ہے محبت کے راستے میں' میں راستہ کھو بیٹھی ہوں۔

میں اٹھی اور فٹ پاتھ پر سہمے سہمے چلنے لگی' محبت کی مغنیہ دور کہیں مغموم نغمہ سرائی میں مگن تھی اور وقت ٹھہر رہا ہے۔

''جبران احمد! محبت کے اس کھیل میں کون جیتا ہے' کون ہارا ہے اس کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟ محبت تو آفاقی جذبہ ہے اور آفاقی جنم پر قدرت کو خاکسار کا قابض ہونا مذاق سے بھی نیچ لگتا ہے۔ سناد والے مانچسٹر کی ہواؤں' اہل بر ہا میں ایک اور مراتی (دیوانہ) کا اضافہ ہوچلا ہے' سنادینا' ہاں رلا دینا۔'' آہستہ آہستہ میں فٹ پاتھ پر بیٹھتی چلی گئی' برہا سے چُور' محبت کا ماتم کنائی پر ابابیلوں کی رفتار میں اس طرح کمی واقع ہوئی ہے کہ جیسے پروں سے پرواز کی طاقت کھینچ لی گئی اور مژدہ سنادیا گیا ہو ''نومبر سے آداب ملاحظہ''۔

نومبر کی اس کھوکھلی صبح میں کہیں سے رات کی ظلمت آن ٹھہری ہے' فٹ پاتھ پر بیٹھی شارلٹ عظیم مرثیہ نگار کی شاہکار ''مرثیہ'' معلوم ہوتی ہے۔ دور کہیں گٹار پکڑے ضد کا پکا ایک منچلا لڑکا گٹار کی نئی نئی دھنیں نکالی رہا تھا اور ''No'' کی مشقوں سے نومبر کے حالات زار سنا رہا تھا۔

No Son--- No Moon
No Morn---- No Noon
No Down----- No dlisk--- No



Proper time Of day
NO Sky---- No earthly view
Nodistance Looking blue
No Road--- No Street----
No"t' Other Side the

مانچسٹر میٹرو پولیٹن یونیورٹی پر سنہری السائی دھوپ سے مخمور صبح بھیگ چکی تھی' طلباء گرم گرم ملبوس آتے جا رہے تھے۔ فائن آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ سے نکل رہی تھی شارلٹ' سنہرے گندم کے خوشبوں جیسے بال' جھیل سی آنکھیں' قندھاری انار سے ہونٹ' وہ حسن کی دیوی تھی۔ حسن اس کی پوجا پاٹ کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔

''ایما! اگر تمہیں پچھلی کافی کی یاد ستائے جارہی ہے تو ابھی سے بتائے دیتی ہوں' میں آج کل بہت غریب ہوں۔'' اس نے ساتھ چلتی ننھی چوہیا کو دیکھ کے دانت نکوسے۔

''اوہ ڈیئر جیسے میں جانتی نہیں' دی لیوری کے تھیٹر میں آج پرفارمنس دینی ہے تمہیں۔'' ایما نے حساب برابر کیے' ایسے طنزیہ بھوئیں اچکائیں کہ جیسے کسی ماہر شکاری نے شکار کو گھائل کرنے کے لیے تاک کے نشانہ بنایا ہو۔

''مجھے تو نہیں پتا ہے۔'' اس نے انجان بننے کی اداکاری کی حالانکہ وہ ایک اداکارہ تھی۔

''شام کو ہے اور ہم تو جیسے تمہیں جانتے نہیں۔''

''ہاں بس بکواس بند کرو اور چلو چوہیا' پلادیں تمہیں پیٹرول۔'' کیفے ٹیریا پہنچ کے اس نے ایسی گھوریوں سے ایما کو نوازا تھا کہ جیسے اس نے شارلٹ سے اس کی پیاری بلی مانگ لی ہو لیکن نہیں' اگر ڈھیٹ پن کی آخری حد نہیں ہے تو ایما وہ حد پھلانگ چکی ہے۔۔

''تمہیں ایک معذور لڑکی کا رول کرنا چاہیے۔'' ایما نے مشورہ دیا۔

''لیکن نہیں' اس سے پہلے مجھے تمہیں معذور کردینا چاہیے۔''

''اوہ! کیا تمہارا اگلا رول فائٹر کا ہے؟''

''نہیں میرا اگلا رول ایک ننھی چوہیا کا ہے جو بریڈ چوری کرنا بھول چکی ہے اور آج کل دوسروں سے بھیک مانگ کے کافی پیتی ہے۔''

''اوہ تو ننھی چوہیا! تمہارے لیے نیک تمنائیں' ویسے تم رول اچھی طرح کرلو گی کیونکہ تمہیں بننے کی ضرورت بھی نہیں۔''

''ایمان تمہیں کافی ختم کیے پانچ منٹ ہونے کو ہے' چلو میں نے ریہرسل بھی کرنی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی' بنفشے کے پھولوں نے اس کی قدم بوسی کی اور اعلانیہ ''محبت زادی'' کہتے ہوئے قطبین میں بکھرتے چلے گئے۔

''ہاں چلو' مگر یاد ہے نا؟'' ایما نے رک کے پوچھا۔

''جی یاد ہے' پرفارمنس کے بعد آداب جالاتے سے کہنا ''بنام ایما'' اب چلو بھی۔'' وہ دونوں روش پر چلتے مدھم مدھم سروں میں گنگنا رہی تھیں' السائی ہوئی دھوپ میں سر سنگیت کی لہریں موجزن ہونے لگیں اور سرسرگم نے سارے ماحول پر سارے' گاماسی بکھیر دی تھی۔

''ایک سوال پوچھوں؟'' ایما نے ہاتھ ملتے کہا' سنہرے بالوں والی لڑکی نے جھیل سی آنکھیں اس پر مرتکز کی۔

''ہاں مگر میرے رول کے بارے میں نہیں۔'' نتھنے پھلائے۔

''تمہارا رول کوئی فیری ٹیل کا پری والا نہیں ہے کہ میں بار بار اس کا سوال پوچھوں۔''

''ڈیئر ننھی چوہیا! اب پوچھ بھی چکو۔''

''محبت تمہاری نظروں میں کیا ہے؟'' سوال نے برگد کی بزرگی کو خود سے باندھے' فرشتوں کو عبادت میں مات دیتے' الہام الٰہی کی فصاحت لیے ''شارلٹ'' پر نزولیت کی اور خاموشی وقت میں' محبت نے اپنا صحیفہ کھولا اور ست رنگی موقلم سے ''محبت زادی'' کی تمثیل بنانے لگی۔

''کچھ نہیں' رومیو اور جیولٹ سے منسلک یہ افسانوی بات مجھے کوئی زیادہ نہیں پسند' سو معذرت۔'' محبت کے صحیفے پر آفاقی افشاں گرنے لگی اور تمثیل مکمل کر کے ''اہل محبت'' کی نگری اور پرواز کر گئی' لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بے سود۔''

''اور بے سود چیزیں کیا ترک نہیں کی جاتیں؟'' شخص اس کے گرد گھوم رہا ہے' دائرہ در دائرہ......

''مجھے بھولنے کا بے سود طریقہ ترک کر دینا چاہیے۔'' اس نے اعتراف کیا ہے' گٹار کی دھن نے لے بدلی اور پیانو بھی ساتھ دھنیں بکھیرنے لگا۔

''تو پھر چلو ماریہ! میری یاد تمہاری منتظر ہے۔'' وجیہہ شخص اوپر کو اٹھتا ہے' اٹھ رہا ہے اور لڑکی ڈھے ہو رہی ہے۔ یکدم دھڑاک سے ڈھے ہو جاتی ہے' شخص نیچے اترتا ہے اور اس کے گرد چکرانے لگتا ہے۔ ہلکی ہلکی سی دھند لڑکی اور لڑکے کے گرد اٹھنے لگی ہے' یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ شخص ہوا میں چل رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے' وہ مسکرا رہا ہے۔

''تو ثابت ہوا ماریہ کہ میری یاد نے تمہاری محبت کا مقابلہ نہیں کیا' تمہاری محبت کی شدت نے ہواؤں کو حکم سنایا کہ زمین زادوں میں منادی کر دی جائے کہ محبت نے ایک اور انسان کا دل گم کر دیا' کیا دل کے گم ہو جانے میں سرور نہیں؟'' وجیہہ شخص اڑ رہا ہے...... اڑ رہا ہے ......اور نیچے چت لیٹی ماریہ کے لب ہل رہے ہیں۔

''ہاں' دل کے گم ہو جانے میں سرور ہے۔'' پردے گرا دیے گئے' روشنی سمٹی' تاریکی چھائی اور یکدم پھر روشنی چھائی' تالیاں گونج رہی تھیں۔

تماش بینوں میں ایک لڑکا مبہوت سا اسٹیج کی اور بس دیکھتا جا رہا تھا' وقت نے بیوپاری نظریں بھانپ لی تھیں۔ بیوپار نظریں محبت کے عطر دان سے دوچار ہوئی اور عطر دان سے خوشبو اڑی اور مرگھٹ کی منحوس باس پھیل گئی۔

فرض کرو ہم تارے ہوتے
اک دوجے کو دور دور سے دیکھ دیکھ کر جلتے بجھتے
پھر ایک دن
شاخ فلک سے گرتے اور تاریک خلاؤں میں کھو جاتے
دریا کے دو دھارے ہوتے
اپنی اپنی موج میں بہتے
اور سمندر تک اس اندھی' وحشی اور منہ زور مسافت کے جادو میں تنہا رہتے
فرض کرو ہم بھور سمے کے پنچھی ہوتے
اڑتے اڑتے ایک دوسرے کو چھوتے......اور پھر کھلے گگن کی گہری اور بے صرفہ آنکھوں میں کھو جاتے
ابر بہار کے جھونکے ہوتے
موسم کے ایک بے نقشہ سے خواب میں ملتے ملتے اور جدا ہوتے
خشک زمینوں کے ہاتھوں پر سبز لکیریں کندہ کرتے
اور ان دیکھے سپنے بوتے
اپنے اپنے آنسو رو کے چین سے سوتے
فرض کرو جو کچھ اب ہیں وہ نہ ہوتے؟

❁......❃......❁

جیکسن باف' جس نے جیک کا رول کیا تھا کو الوداع کہتے ہوئے وہ اپنا کراس بیگ لیے بس اسٹاپ کی جانب جا رہی تھی۔ ہواؤں میں بھید بھری خاموشی کی مہک تھی۔

''رکیے مادام!'' کوئی زور سے چلایا تھا۔

اس نے گردن موڑ کے دیکھا' سیاہ جینز پر گہرے سبز رنگ کی شرٹ پہنے ایک خوب صورت سا لڑکا اس کی جانب دوڑ رہا تھا۔ شرٹ پر خوب صورتی سے ''نومبر'' لکھا تھا۔

''رکیے مادام!'' اس کے قریب پہنچ کے اس کا سانس پھول چکا تھا' گہرے گہرے سانس لیے گہری نظریں اس پر جما دیں۔

''کیا خوب صورتی آپ کی کنیز ہے؟'' جب سنبھل چکا تو آہستہ آہستہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا' ایسی معصومیت سے پوچھا کہ شارلٹ کے اوسان خطا ہوئے۔

''یقیناً نہیں۔'' اس نے اوور کوٹ میں ہاتھ دھنسائے تو اس کی دیکھا دیکھی اس لڑکے نے بھی جینز میں ہاتھ اڑس لیے۔شام نے اپنی گلابی اوڑھنیاں سنبھالیں' سرد نومبر سے آشیر باد لیا اور محویت سے ان دونوں کے گرد محو رقصاں ہوئیں۔

''آپ اداکارہ نہ ہوتیں' کسی نگر کی راج کماری ہوتیں۔''

''اوہ یقیناً میں نہ ہوتی۔'' اسٹریٹ لائٹس روشن کیے جانے لگے۔

''آپ مانچسٹر کی ہی ہیں؟''

''جی میں مانچسٹر کی ہی ہوں۔''

''تو ثابت ہوا کہ مانچسٹر نے اپنا حسن دان کر دیا ہے۔''

''ویسے آپ ایشیائی ہیں؟'' اس نے رک کر مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''تو کیا ایشیائی ایسے مشکوک نظروں سے دیکھنے کے لائق ہیں؟'' اس نے تسلیم کیا کہ وہ واقعی ایشیائی ہے۔

''یقیناً اگر آپ پاکستانی ہیں تو پاکستانی عورتوں نے آپ کو اپنی زبان دان کر دی ہے۔'' رک کر اس نے طنزیہ اس کے حساب برابر کیے اور پاکستانی عورتوں کے زبان کا ''سفیر'' ہنس دیا' کھلکھلا کر شام بھی ہنس دی تھی۔

''ہاں میں پاکستانی ہوں۔'' چلتے چلتے وہ ایک کیفے کے قریب پہنچ گئے تھے' اسٹریٹ لائٹس کی روشنی بھیگ رہی تھی' ٹھنڈک پھیل رہی تھی اس نے مفلر کس کے لپیٹا۔

''کیا آپ کے ہاں کافی کی پیشکش نہیں کی جاتی؟'' کیفے کے پاس رک کے اس نے کہا تھا' شارلٹ نے ایسی شکل بنائی کہ جیسے کہہ رہی ہو۔

''اچھا آپ کا موڈ ہے' چلو آپ کی مرضی۔''

''نہیں کی جاتی۔'' اس نے ہنسی دباتے کہا۔

''قبول بھی نہیں کی جاتی۔''

''ہاں' قبول کی جاتی ہے۔'' دونوں کیفے داخل ہوئے' قدیم طرز کے بنے اس کیفے میں خاموشی سر نیہواڑے بیٹھی تھی' سرد خاموشی' پس منظر میں چلتی دھنیں' روشنیاں نومبر کی اس شام میں بھیگی سی تھی۔ ویٹرس نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا' کافی کے مگ دیئے اور مسکراتی چلی گئی تھی' وہ سمجھی کہ پریمی جوڑا ہے۔

''آپ پاکستان میں کہاں رہتے ہیں؟'' کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے لڑکے پر مرکوز کیے' ہاں وہ ایک اچھی اداکارہ ہے۔

''پھولوں کے شہر میں۔'' مسکرا کر جواب ملا۔

''پھولوں کا شہر کون سا ہے؟''

''پشاور۔''

''اوہ گوش' تو آپ کا نام''

''جبران احمد۔''

''اچھا' مل کے خوشی ہوئی۔''

''اور مجھے خوشی کے ساتھ ''وہ'' بھی مل گئی جس کا میں بار اٹھاؤں گا' مستقبل میں ویسے ابھی تک تو آپ کھٹے طنزیہ جوابات دے رہی تھیں۔ یہ افتاد کہاں سے آپڑی کہ آپ نے پورا انٹرویو لے ڈالا۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی' وہ رخصتی کے لیے نشست چھوڑ چکی تھی۔

''پھولوں کے شہر کے اے پھول سے لڑکے' اب الوداع۔'' وہ فٹ پاتھ پر جا رہی تھی' لب مسکراہٹ میں ڈھلے تھے' دروازے میں کھڑے ہو کے اس نے چلا کر کہا۔

''مگر مادام! آپ کا تعارف قرض رہا۔'' وہ رکی اور چلائی۔

''اور مجھے مقروض رہنا پسند نہیں' اگلی ملاقات کا انتظار کرو۔''

❀......❀......❀

شارلٹ کو ایک اسٹور میں بل بنانے کی جاب مل گئی

تھی' دی لیوری کے تھیٹر کے اسٹیج پلو کا معاوضہ اگرچہ پرکشش ہوتا ہے مگر اسے اتنی دیر سے ملتا ہے جس میں ایک عدد دن محض سینڈوچز' چاکلیٹ اور کافی پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ صبح یونیورسٹی جانے سے پہلے وہ مسز رچل کے لیے ناشتا تیار کر کے جاتی تھی جس کے اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔ اب مستقلاً جاب ملنے پر بہت خوش تھی' سو ایما بھی حاضر تھی اس کے اپارٹمنٹ میں' ٹریٹ کی اتنی بھوکی چوہیا آج پہلی دفعہ دیکھی تھی۔

''مجھے شک ہو رہا ہے ایما کہ تم نے مجھ میں کچھ ٹریس لگایا ہے۔'' اس نے مشکوک نظروں سے دیکھا' ایما کو تشویش ہونے لگی۔

''اوہ پلیز' وہ کیوں۔''

''کیونکہ تم تو کوئی گاڈ نہیں یا کوئی فرشتہ نہیں کہ تم پر وقت سے پہلے وحی آئے کہ شارلٹ جین کو اسٹور میں جاب مل گئی۔'' ایما نے پہلے اس کی صورت دیکھی پھر گھونسلے کے سے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہا۔

''تم بھول چکی ہو' تمہارے حافظے کو سلام' صبح تمہارا ہی ٹیکس ملا تھا۔''

''اوہ گوش! میں بھول گئی تھی۔'' ایما ہنسی' ایسے کہ چلو ماں جی معاف کیا۔

''اچھا اب ٹریٹ دو۔''

''ٹریٹ؟'' سوچتے ہوئے اس نے نظریں اٹھائیں۔

''آل سینٹس پارک میں پلادوں گی ایک مگ کافی۔''

''ایک مگ کافی؟'' اتنی زور سے ایما اچھلی کہ جیسے چھپکلی نے اس سے دوستی کرنے کے لیے دم آگے کی ہو۔

''تو اور کیا؟''

''منہ دھو رکھو مسز جین۔''

''یہ جو تم دھوتی ہو ہر وقت احسان ہے مجھ پر۔''

''دیکھو شارلٹ' شرافت سے مجھے ایک ریسٹ واچ گفٹ کردو ورنہ......'' انگلی اٹھا کے ایسی دھمکی دی تھی کہ شارلٹ نے ''ہینڈز اپ'' والے انداز میں ہاتھ اٹھا لیے تھے۔

''اچھا بابا! یہ شکل دیکھو پلیز صحیح کرلو ورنہ میں صدمے سے فوت ہو جاؤں گی اور تمہیں پتا ہے نا' مجھے نہیں مرنا۔''

ایما ہنس دی تھی۔ شرافت سے' شارلٹ سے' ایک ریسٹ واچ لے کر سینڈوچ کھا کے' کیفے میں بیٹھے کافی پی کر' دی لیوری میں شیڈو ڈانس انجوائے کر کے' جب وہ گھر جانے لگی تھی تو ایما نے کہا۔

''ویسے شارلٹ! جو نیا بوائے فرینڈ بنا ہے' قسم سے ایک دم ٹام کروز ہے مگر نہیں' ٹام کروز نہیں۔ یونانی دیوتا' اوہ گوش! ایسے منہ کے زاویے نہ بگاڑو' سویٹ ڈریمز!''



وہ صبح اتنی ہی اجلی تھی' جتنی کہ شارلٹ کے دل میں خوشی' اس صبح آسمان بالکل صاف تھا۔ سورج کی سنہری شعاعیں من کو تمازت دینے کا اہتمام کر رہی تھی' روشنی ہی روشنی تھی۔ اوہ مجھے اس روشنی کو سمیٹ لینا چاہیے۔

سب وے سے جاتے' کراس بیگ لٹکائے وہ مٹک مٹک کر مستانی چال چل رہی تھی۔

بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرتی رہی جب بس آچکی تو بیٹھ گئی۔ کراس بیگ گود میں رکھے وہ جیسے ہی فائل درست کرنے لگی تھی' اس کی نظر اخبار پر پڑ گئی۔ اخبار سے ہوتے ہوئے اخبار بین پر پڑی اور حیرت نے اسے دیکھ کے بڑی دلنشین مسکراہٹ اچھالی تھی۔ اخبار والے نے اخبار مروڑا اور اس کی نظریں بھی شارلٹ کی نظروں سے دوچار ہوئیں۔

''اوہ مادام! انتظار کا سے ختم ہو گیا۔'' وہ بدقت مسکرائی۔

''جی آپ کا قرض لٹانے کا وقت آ گیا ہے۔''

''حسن آتش کی مالک کا نام۔''

''شارلٹ جین! دی شارلٹ۔''

''مصروفیات......فیملی؟''

''یونی جاتی ہوں اس کے بعد دی لیوری میں

اداکاری کرتی ہوں اینڈ ممی' ڈیڈی کی ڈیتھ کو ہوئے پانچ سال ہوئے ہیں۔''

''اوہ......سن کے افسوس ہوا۔''

''افسوس کرنے کی ضرورت نہیں پھولوں کے شہر کے باسی! ہر انسان کو مرنا ہے۔'' وہ تائیداً سر ہلاتا رہا' دونوں چند پل خاموش رہے تھے' شیشے کے پار سنہری صبح بھیگ رہی تھی' ہجرتی پنچھیوں کی میٹھی بولیاں سی گونج رہی تھیں' یہ اس شخص کی قربت تھی یا اسیر موسم کی دلفریبی کہ جس نے مانوس کر دیا تھا۔

''یونی میں کیا کرتی؟'' اخبار لپیٹ کے وہ پورا پورا اس کی جانب متوجہ تھا' اسے یہ توجہ بھائی۔

''جیب کاٹتی ہوں۔''

''اوہ خدایا!'' بے اختیار جیب پر ہاتھ ڈالا پھر مسکرا دیا۔ ''چلو جی میری جیب محفوظ ہے مگر وہ محفوظ نہ رہ سکا جس کی حفاظت پر میں مامور تھا۔ مانچسٹر کا حسن سموئے' گل گلال سی لڑکی نے ایک دفعہ پھر سے حیرت کا کورس کیا۔

''اچھا لگا جبران! آپ کا قرض اتار کر گڈ بائے۔'' وہ اتر رہی تھی جبران جلدی سے مڑا اور بس کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

''پھر ملاقات ہو گی۔'' وہ رکی اور سرد لہجے میں کہا۔

''امید ہے آئندہ ملاقات نہیں ہو گی۔'' یونی میں بزنس ڈیپارٹمنٹ آ کر اس نے ایما سے کہا تھا۔

''ایما! محبت کا فلسفہ سمجھ آنے لگا ہے' کیا میں اس کے بارے میں سوچوں؟''

''سوچو نہیں' اوہ ڈیئر! تم سوچ چکی ہوں۔''

❁......❁......❁

بس اسٹاپ سے شروع ہونے والی اس محبت کو اس نے دی لیوری میں سلایا اور اپارٹمنٹ آ کر جگایا۔

''میں نے اسے سرد لہجے میں کہہ کر اپنے لیے امتحان گھڑ لیا ہے اور اس امتحان کا وہ خوشی خوشی سے تیاری کرنے لگی' محبت ایسی چیز ہے۔ ہاں! امتحان میں ڈال کے امتحان لیتی ہے۔ آسمان چپ کا لباس اوڑھے ہوئے ہے' چاند کے گرد دھند کے مرغولے دائرہ بنا بنا کے فضا پر طلسم کا چادر ملفوف کرنا چاہتا ہے اور اس چاہ کے لیے وہ کتنا جنونی ہے' ہاں اسے یہ کرنا چاہیے۔

اس نے گلاب ڈائری میں رکھ لیا تھا' سرخ گلاب کے سوکھ جانے میں بھی سے ہے' اس سے کا لحاظ کیا جائے۔ پنچھی نے فجر کو اڑان بھرتے آسمان سے ایک حکم باندھ دیا' آسمان وفادار نکلا' سر تسلیم خم کر گیا۔

اس کا پہلا سمسٹر شروع ہونے والا تھا' رات کو اسائمنٹس پھیلا کر اس نے جیسے ہی یاد کرنے کی ابتداء کی' جبران کی یاد نے اس کی انتہا کر دی تھی۔

''ایما کیا میں تمہیں محبت کا فلسفہ سنا دوں؟'' صبح یونی آ کر اس نے بے بسی سے انگلیاں مروڑتے ہوئے ایسے بے بس لہجے میں کہا تھا' ایما نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کی آنکھوں تلے حلقے بہت گہرے ہیں' گھونسلے سے بال ٹھس سے نظر آتے' وہ ''سمسٹر ماری' ہنس دی تھی' شارلٹ بے بسی سے مسکرا دی تھی۔

''تمہیں پتا ہونا چاہیے شارلٹ کو سمسٹر کے اس سنگین موقع پر کسی چڑیا دل معصوم حسین لڑکی کو ایسی خطرناک باتیں بتانا کون سی عقلمندی ہے؟'' وہ پاؤں پٹختی چلی گئی' یونی کے بعد وہ مسز ریچل کے پاس گئی۔

''محبت کرنے والوں کی پہچان کی کیا علامت ہے؟'' مسز ریچل نے مسکرا کر اس کی بلی کو تھپکا دیا۔

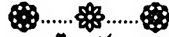
''کیا تم علامت کے بارے میں پوچھ رہی ہو حالانکہ میں تمہیں علامات بتا سکتی ہوں۔''

''بس ایک علامت بتا دیں۔''

''میرے سامنے کھڑی شارلٹ جین!'' اور اس نے تن فن کرتے ہوئے مسز ریچل سے بلی لی اور واک آؤٹ کر گئی۔

گیندے کے پھول اب سانس لے لے کر فضا کو معطر کرنے کی کوشش میں مستغرق تھے' بے خوفی' لاچاری پر مجبور کرتی محبت نے اس وقت کے سامنے کھڑے ہو کر

سوال کیا جو نافرمان ہی اور اس کی فرماں برداری کی کوئی گارنٹی نہیں۔
''شارلٹ جین کو پھولوں کے شہر کے باسی جبران سے محبت ہوگئی۔''



رات کو وہ اسٹور سے نکلی ہی تھی کہ اسٹریٹ لائٹس کی روشنیوں میں بھیگا وہ ساحر دو عدد کافی کے مگ لیے اس کا منتظر تھا' اسے یاد آیا کہ بس میں اس نے تو قطعاً ''اسٹور'' کے بارے میں نہیں بتایا تھا اگر بتایا تھا بھی کہ اسٹور میں جاب کرتی ہے مگر یہ تو نہیں بتایا تھا کہ کس میں؟
کافی کا مگ لے کر اس نے شکریہ کہا اور فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی' سردی میں خاموشی کا دم گھٹ رہا تھا۔
''کیا میں نے تمہیں بتایا تھا' اسٹور کے بارے میں؟'' کافی کا سپ لے کر اس نے پوچھا وہ دونوں اب فٹ پاتھ پر سنگی بنچ پر بیٹھ چکے تھے۔
''نہیں میں نے خود ڈھونڈ لیا تھا۔'' اس نے مفلر کس کے لپیٹا' برف باری ہو چکی تھی اب شدید ٹھنڈ میں وہ دونوں کسی جوگیوں کی مانند لگ رہے تھے' بے خوف' جامد' شل' ضدی۔
''تم نے کیسے ڈھونڈا؟'' سوال کا جواب ملنے پر سوال ہونے پر وہ گڑبڑا سا گیا اور شارلٹ کو یہ گڑبڑاہٹ اچھی لگی۔
''میں نے تمہارا تعاقب کیا تھا۔''
''اور تم نے میرا تعاقب کیوں کیا تھا؟''
''کیونکہ تم نے میرا دل چرا لیا ہے' کیا واپس نہیں کرو گی؟'' سردی میں دبتی' دم توڑتی خاموشی نے سسکاری بھری۔ برگد کا ہم نشین منحوس برزن بوم بے ہنگم چیخنے لگا تھا۔
''اور کیا دل دینا اتنا آسان ہے؟''
''یقیناً نہیں۔'' اب دونوں اپنے خالی دل کے کانوں میں تبدیل احساسات لیے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے' ہواؤں میں کچے چکوترے کی بالیں پھیلی ہیں۔
''عرصہ ہوا' میں نے کبھی جھیل سیف الملوک کو آنکھوں میں سموئے آنکھیں نہیں دیکھیں مگر دی لیوری کی آرٹ گیلری کی ساحر تھیٹر میں میں نے دیکھ لی تھی' ایک لڑکی کو جو ماریہ بنی تھی۔''
''کیا تم نے عبادت کی ہے؟''
''ہاں میں عابد ہوں۔'' شارلٹ نے مسکرا کر سر ہلایا اور پوچھا۔
''تو مجھے کب دعاؤں میں مانگو گی؟'' اور جبران احمد کے پاؤں زمین نے کھینچ لیے' زمین نے اپنا رخ پلٹایا اور دھسان بن گیا' وہ مسکرا دیا۔
''تم میری دعا ہو۔''
''اور میں مقدس مریم سے دعا مانگوں گی' پتا ہے کیا دعا مانگوں گی؟'' بھید بھرو وقفہ بڑا پُراسرار تھا۔
''کیا؟ مجھے نہیں پتا۔''
''میں اپنے لیے دعا مانگوں گی کہ اے مقدس مریم! محبت کروانے سے پہلے مجھے محبت کرنا سکھا دیں لیکن اس سے پہلے ایک بددعا بھی کروں گی؟''
''کیا؟ مجھے نہیں پتا۔''
''یہ کہ محبت احترام ہے اور بیوپار کرنے والا' خدا کو راضی نہ کر سکے اور بلاشبہ خدا کی ناراضگی سے بڑی کوئی سزا نہیں۔''

If it all falls apart
I Will Know deep it My
Heart...



پہلا سمسٹر ختم ہونے والا تھا' اب ایگزام میں اتنی غرق ہونے لگی تھی کہ ایک عدد سینڈوچ کافی کھا پی لیتی تھی۔ ایگزام ختم ہونے کے بعد اس نے فرانس جانا چاہا مگر جبران کی خاطر رک گئی تھی کیونکہ اس بے چارے کو بقول اس کے بہت نظر انداز کر دیا تھا' اب ازالے کے طور پر وہ آل سینٹس پارک میں بیٹھے تھے۔

''کیا تم نے مجھے پرچوں میں یاد کیا تھا؟''
''ہاں' میں خود بھول چکی تھی۔''
صبح کی روشنی ہجرتی پرندوں کی بھاشا سے لبریز ہونے لگی تھی' ماریہ بی اس لڑکی نے اپنے جیک کو نہ دیکھا تھا' جیک تھا ہی نہیں۔
''بہت کم ظرف ہو؟'' سوالیہ تعریف کی تھی۔
''اطلاع کے لیے شکریہ۔''
''تم کل رات فارغ ہو؟'' آل سینٹس پارک میں موجود ان دونوں نے ''دنیا و مافیہا بھول جانا'' سچ کردیا تھا۔
''ہاں تو...... لیکن ڈر ہے کہیں ایما نہ آ دھمکے۔'' ایما کا نام آتے ہی لبوں پر ایک مہربان مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔
''صحیح' تو یہ طے ہوا کہ تم مجھے اس کو اٹھا پھینکنے پر مجبور کر رہی ہو؟''
''کہیں تم اپنے بھنوؤں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو کیونکہ بھنویں اڑانا اس کا حسین مشغلہ ہے۔ ہائے داوئے' وہ اس میں ماہر بھی ہے۔'' شارلٹ نے ہنستے ہوئے کہا تھا' اس کی ہنسی کسی یاقوت کی سی تھی۔
''اوہ گوش!'' جبران نے اس کا تکیہ کلام اپنایا۔ ''تم مجھے ڈرا رہی ہو؟''
''جی نہیں' بتا رہی ہوں۔''
''بتانے سے کیا ہو جائے گا؟''
''بتانے سے تمہاری بھنویں محفوظ رہ جائیں گی کیا تمہیں اپنی بھنویں محفوظ ہونا پسند نہیں؟'' ایما سروس شروع تھی' اب جبران دوسری لے بدلنے والا ہے' کان کھڑے کیجیے اہل محبت کی بیوپار سے چند پل ملاحظہ کیجیے۔
''تمہاری برتھ ڈے کب ہے؟'' خوشنما پریوں نے مشاطگی کی اس وارکی۔
''پندرہ نومبر۔'' وہ مسکرائی۔
''آج کون سی تاریخ ہے؟''
''آج بارہ ہے۔''
''تو سنو اے گل گلال' اس وقت کا انتظار کرنا۔'' وہ ہنس دی تھی' آل سینٹس پارک نے رک کے اس ہنسی کا احترام کیا تھا اور جس کا احترام ہوتا ہے تو وہ معتبر ہوتا ہے۔
''شارلٹ...... محبت کرو گی؟'' بنفشے کے پھولوں نے اس سوال کو اڑایا اور سوال ''محبت'' بن کے شارلٹ سے لپٹ گیا۔
''بے وفائی نہیں کرو گی؟''
''ہاں نہیں کروں گا۔''
''بیچ راہ میں تو نہیں چھوڑو گے؟''
''نہیں چھوڑوں گا۔'' اعتراف کا سمے آن ٹھہرا ہے' سفید کبوتروں نے محبت کے پیام کو ہوا میں اچھالا اور گلابی پھولوں کی پتیوں نے یہاں وہاں بکھرنا شروع کردیا۔
''ہاں میں محبت کروں گی۔''
صبح یونیورسٹی جاکر' سیدھا بزنس ڈیپارٹمنٹ میں گھونسلے بالوں والی ایما کو گھسیٹ کے کیفے ٹیریا لائی اور تن کے اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔
''محبت مقدس راتوں میں بارش ہاتھوں میں تھما دی جانے والی وہ دعا ہے' جسے خدا نے ہر انسان کے لیے مقرر کیا اور اس کے قبول ہونے کی بشارت اس کے کرنے سے پہلی دی۔
''ڈیئر ایما! بشارت مبشر پر نازل ہو چکی' دعا شارلٹ کے لیے قبول ہو چکی۔



لیمپ پوسٹ کی روشنی میں رات کی سیاہی بے بس معلوم ہوتی ہے' آج اس نے چھٹی کرلی ہے اسٹور سے۔ اپارٹمنٹ میں سوئے اسے لگ رہا تھا کہ جبران اس کے پاس ہے' بہت پاس...... اتنا کہ حمزہ بابا کی شاعری کو لفظوں میں سمو کے وہ اس کی تعریف کر رہا ہے۔
ماریہ پر جیک کی یادیں حاوی ہوگئی کہ اسے اٹھنا پڑا' اوہ یہ تو صبح ہے' روشنی پھیل چکی ہے' جلدی سے ٹائم دیکھا

تو نوبج رہے تھے۔
''اوہ سوری مسز ریچل! آپ کے ناشتے کے لیے معذرت۔'' بغیر عذر کے وہ اس کا ناشتا جلدی سے تیار کرنے لگی تھی' وہیل چیئر دھکیل کے وہ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی۔
''تم رات کو سوتی ہو؟'' توس گرم کرتے' رک کے' ٹھٹک کے اس نے دیکھا۔
''ہاں تو؟''
''تمہاری آنکھیں رت جگوں کی غماز ہے' کیا تمہیں بیماری ہے؟''
''نہیں مجھے بیماری تو نہیں۔'' وہ جلدی سے کام کرنے لگی۔
''اچھا...... تو تمہیں لاعلاج مرض لگ گیا؟''
''لاعلاج؟'' بلی اتر کر ادھر اُدھر گھومنے لگی۔ ''نہیں تو۔''
''ہاں' شارلٹ دی فیری...... تمہیں پیار ہو گیا ہے۔''
کلاس میں وہ جتنی حاضر تھی اس سے اتنی ہی غیر حاضر ہے' پروفیسر مارک کی آنکھیں بار بار اس پر ٹک رہی تھیں' جبران نے اس پر ایسا سحر کیا کہ اسے اپنے سحر زدہ ہونے پر ناز ہونے لگا تھا۔
''کیا آپ کل سوئی نہیں شارلٹ؟'' پروفیسر مارک نے بالآخر لیکچر میں ذرا سی فرصت نکال ہی لی تھی' ننھی' چندھائیں ذہانت سے معمور نظریں اس پر ٹکی' ادھ سوئے جاگے اسٹوڈنٹس نے گردن موڑ کے دیکھا۔
''جی' میں کل رات سے بیمار ہوں۔''
''لیکن آپ کے چہرے پر تو نقاہت کا عنصر مفقود ہے۔''
''شاید ہو مگر میرا موڈ بوجھل ہے۔'' پھر پروفیسر مارک لیکچر دینے لگے' وہ پوائنٹس نوٹ کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ لیکچر کے بعد پروفیسر مارک نے ایک فلسفہ چھیڑا۔
''آپ میں سے کون کون جیولیٹ اور رومیو بننا پسند کریں گے؟'' تقریباً سارے طلباء نے ہاتھ کھڑے کیے تھے سوائے اس کے' نظریں واپس اس پر ٹکی اور شارلٹ کو دل ڈوبتا محسوس ہوا۔
''آپ کیوں نہیں بننا پسند کرتی ہیں؟'' اس نے شانے اچکائے' محبت کی منکرین بننے کی ادنیٰ سی سعی کی اور وقت نے اس اداکاری پر داد دی تھی۔
''بس' میں ان کے منکرین میں سے ہوں۔''
''کیا آپ پیار نہیں کرتیں؟''
''میں کرنا نہیں چاہتی۔''
''تو انتظار کیجیے شارلٹ جین! محبت کی دیوی کا سایہ آپ پر ہے۔'' مشک فام لمحوں میں کہیں سے کافور کی باس آن شامل ہوئی۔



''تم پچھلے ایک ہفتے سے مجھ سے چھپ رہی ہو' کیا میں یہ جان لوں کہ تم مجھے نظرانداز کر رہی ہو۔'' وہ صبح بس اسٹاپ جا رہی تھی راستے میں جبران اس کے عین سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دائیں طرف نکل کر جانا چاہا' برطانیہ کی یونانی شہزادی کا ہاتھ پاکستان کے پھولوں کے شہر کے ''خان'' کے ہاتھ میں ہے اور حیرانی سے غرق وہ منہ کھولے تکے جا رہی ہو۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی مزاحمت کی' جبران کو مزاحمت پسند آئی۔
''میں ذرا مصروف ہوں' کیا تم مجھ سے فرصت سے مل سکتے ہو؟'' ہاتھ چھڑا کر بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر اس نے ایسے بے بس لہجے میں کہا۔ محبت بے بس کر دینے والا امرتیا عطر دان ہے اور اس کا عطر آہ آہو کا شیدائی ہے۔
''تم فرصت کی بات کر کے یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ وقت میرا فرماں بردار ہے؟'' جینز کے پاکٹ میں ہاتھ ڈالے وہ سوال کر رہا تھا' مسز ریچل' ایما اور پروفیسر مارک نے صحیح کہا تھا کہ اسے پیار ہونے لگا ہے مگر ''ہونے لگا ہے'' میں نے لکھ کے غلطی کر دی ہے کیونکہ شارلٹ رو دی ہے اور جس کے لیے رویا جائے اس سے

پیار ہونے نہیں جانا بلکہ ہو چکا ہوتا ہے اور شدت پھلانگ چکا ہوتا ہے۔

''میری ایک دوست تھی سارہ! بہت خوب صورت لڑکی تھی' اتنی کہ کبھی کبھی عرب کی حسین عورتیں اپنے پاشاؤں کے ان پر فدا ہونے سے ڈرتی تھیں۔ اسے پیار ہو گیا ایک پادری سے' صبح سویرے وہ چرچ چلی جاتی تھی' مریم مقدس سے خوب باتیں کرتی' صحن کے احاطے میں جھاڑو لگاتی۔ پادری اس سے نالاں تھا' درحقیقت وہ ایک تنہائی پسند شخص تھا' سارہ نے اتنے اظہار کیے کہ اظہار کو اپنی بے اظہاری آنے پر صدمہ ہوا۔ وہ بیمار ہو گئی اتنی کہ ڈاکٹر جوزف نے اسے لاعلاج قرار دیا مگر اس کا علاج تو چرچ کے پادری جان کے پاس تھا۔ اب جان صبح سویرے دی گریٹ قبرستان جاتا ہے اور ایک عدد سرخ گلابوں کا بکے لے کر' سارہ کی قبر کے سرہانے رکھ کے کہتا ہے۔

''کاش کہ محبوب عاشق کا چہرہ دیکھ کے پگھل جایا کریں' کاش کہ محبت ایک سے ہوتی ہوا گر یہ ہوتا تو یقین مانو اے مٹی کی شہزادی! میں تمہارا ہوتا مگر میں وٹن سے پیار کرتا تھا' آہ......''

یہ کہہ کے وہ یونہی چلی گئی' چند کلاسز لیں اور لائبریری چلی آئی' چند لمحوں میں اسے پتا چلا کہ خاموشی اس کے اندر' باہر سے حرب پر اتری اور اس نے حیرت کے لیے کیفے ٹیریا جا کے دم لیا۔

کیفے بھانت بھانت کے نمونوں سے سجا ہے' ایک من چلا گروپ دائرہ بنائے گٹار سے ایسی ایسی دھنیں بکھیر رہے تھے کہ منحوس مشہور بوم (الو) کو اپنی کریہہ آواز بھلی لگ رہی تھی۔

پڑھاکو لڑکیاں میز پر کہنیاں جمائے' لیپ ٹاپ میں ایسی منہمک تھیں کہ جیسے سوات کی ندیوں پر حسین و چنچل لڑکیوں کا ٹولہ' مٹکا اپنے لچک دار کمر پر رکھے' بدری جمالہ کے قصے سنتے سناتے جاتی ہوں اور ایسے میں مولوی صاحب انٹری مارتا ہو' بے فکری' حسن' بے پروائی نے ان کا احاطہ کیا ہو کیونکہ علم کی سرزمین پر سوچ کے بیج اگا کے فکر کا پودا نکل کے' عمل کی جڑوں سے انہیں مضبوط کرنے والے ہیں یہ طلباء۔

ایک عدد کافی پی کے وہ نکل آئی تھی' یونی سے نکلی ہی تھی کہ سامنے ہی دیوار سے ٹیک لگائے' ماہتاب گردن ترچھی کیے' اٹھی ناک کے ساتھ وہ بہت وقار سے دیکھ رہا تھا' سورج مسکرا مسکرا کے شرما رہا ہے۔ محبوب کو دیکھ کے' وقت کے ٹھہر جانے کی دعا کی جاتی ہے اور شارلٹ نے وہ دعا کرلی ہے لیکن یہ دعا تو ہر وقت محبوب کو دیکھ کے ہوتی ہے۔

شارلٹ نے دعا کی اور قلم زندگی نے اس کے قبول ہو جانے کی دعا کی، دعا کو قبول ہونے دو' یہ سندیسہ ہے پریت ملن کا۔ دفعتاً ٹھہرا وقت رواں ہوا' عربی سلطان نے اسے دیکھ لیا تھا' جبران احمد اب اس کی اور آنے لگا تھا۔

''تو تم واقعی چھپ رہی ہو؟''

''نہیں' سچ کہتی ہوں جبران میں چھپ نہیں رہی' پتا ہے نا انسان اپنی تبدیلی میں اتنا بدل جاتا ہے کہ اسے اپنے آپ کی بھی خبر نہیں ہوتی۔'' جبران مسکرایا' اس کی مسکراہٹ میں شعروں کی حسین شاعری سمٹ آئی۔

''تو محبت نے تمہیں فلسفی بنا دیا۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ میں محبت کرنے لگی ہوں۔''

''ہاں' یہ صحیح ہے کہ مجھے کسی نے نہیں کہا ہے مگر انسان ہوں' عقل رکھتا ہوں۔''

''اُف مجھے برا لگا۔'' اب اس نے چھپنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سڑک کی روش پر چلتے چلتے اب دونوں مسکرا مسکرا کر بات کر رہے تھے کیفے جا کر کافی پی رہے تھے اور جبران اسے رحمان بابا کی شاعری کے بارے میں بتا رہا تھا۔ دفعتاً کافی کا مگ ذرا سا پھسلا' کافی چھلک پڑی۔

''گدھے!'' میز پر کہنی جمائے' شارلٹ نے آنکھیں مرچ سے بھر کے اسے کہا۔

''تم ایک انسان کو گدھا کہہ سکتی ہو شارلٹ۔''
''تم انسانوں والے کام کروتب ناں۔'' وہ ہنس پڑا' بنا رکے ہنستا چلا گیا۔
''دی لیوری نے تمہیں بھلا دیا۔''
''دی لیوری نے مجھے نہیں بھلایا۔''
''تم کسر نفسی سے کام لے رہی ہو۔''
''نہیں میرا اگلا رول ایک خوب صورت پرنسز کا ہے مگر غضب یہ ہے کہ پرنس نہیں مل رہا ہے سو کام اٹکا ہے۔'' نچلے ہونٹ کو دانتوں میں داب کے' آنکھیں چندھائیں' سنہری بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے کہا۔
''میں پرنس بنوں گا۔'' آنکھیں ابلیں' بھنوؤں نے آسمان سے مصافحہ کیا۔''کیا پشتون پرنس ہوتا ہے؟''
''نہیں وہ تو خان ہوتا ہے۔''
''تو چلو' رحمان بابا کے علمبردار تمہارا ڈیشن لیتی ہوں۔'' الرٹ ہو جانے کے اندر میں وہ سیدھی ہوئی تھی' بکواس کا لفظ ان دنوں ان میں بہت خاص ہے' بکواس بکنا' بکواس چلنا۔
''نہیں' یہ شاہکار میں ''دی لیوری'' کو دکھاؤں گا' ایسا نہ ہو کہ پرنس کے آجانے سے پہلے پرنسز اپنے حواس کھو بیٹھے۔'' نتھنے پھلا کے دائیں کندھے پر مکا رسید کر کے اس نے کہا تھا۔''جیران دی ڈینگی''



ہفتے کی رات ہے صبح سے یونی میں دھکے مار کے' منہ پھلا کے' پروفیسر کی عجیب وغریب حرکات پر مبنی لیکچر سن کے' بور اسٹوڈنٹس دی لیوری کے حسن پرست آرٹ گیلری کی اور آرہے ہیں' گرم کوٹ' گرم مفلر' گرم ٹوپیاں ہے اوران میں پوشیدہ نمونے بھی ہے۔ اس نے صبح سے اپنے رول کی بہت تیاری کی تھی' جبران نے آڈیشن دینا گوارا نہیں کیا تھا اور شارلٹ ''دی ڈینگی'' کہہ کے چپکے سے اس کی کافی میں شیمپو انڈیل دی تھی۔ اپنے ملک کے چپلی کباب پر وہ ایسے باتیں کر رہا تھا کہ جیسے اس نے اگلے ماہ میں اس پر ڈاکومنٹری بنانی ہو۔ گھونٹ بھر کے' چہرہ سفید' آنکھیں ابل یکدم گھونٹ باہر' پیٹ پر ہاتھ رکھ کے' وہ بہت دیر تک ہنستی رہی۔ وہ بھی منہ بسورتا رہا' اس نے مفلر لپیٹ کے ماسی مصیبتے کہہ کر باہر کی راہ لی تھی۔

پھر یہ شام کا قصہ تھا' ہلکی پھلکی سی پھوار برس رہی تھی' جبران پچھلے پندرہ منٹ سے گھنٹی بجا رہا تھا' دروازہ کھلا۔
''اوہ ڈینگی! سوری میں ذرا ریہرسل کر رہی تھی۔''
''کوئی بات نہیں۔'' مسکرا کر کہتے ہوئے وہ اندر چلا گیا' شرلٹ کو لگا کہ جیسے رابرٹ ہوک نے سیل ایجاد نہیں کیا تھا بلکہ حیرت کا انجکشن ایجاد کیا ہو' اب جبران وہ انجکشن اسے لگا چکا تھا جیسے......
''کافی پیو گے یا کچھ اور؟''
''کافی چھوڑو' مجھے ذرا اسکرپٹ دیکھا دو۔''
''کیوں؟''
''ذرا سا پڑھنا ہے تا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لوں کہ پرنس کا کردار کے میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے کہ کافی کے بجائے مجھے شیمپو پینا پڑا۔'' نہایت سادگی سے کہا گیا' اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسی دبائی۔
''اب منہ تو نہ دیکھو جلدی سے کافی بنا لاؤ اور ایک عدد برگر کے ساتھ۔'' درشت لہجے میں جبران نے کہا' وہ منہ بسورتی چلی گئی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد نکل آئی' پتا نہیں اس آدھے گھنٹے میں اس نے کیا کیا' بہر کیف جو بھی کیا' صحیح کیا کیونکہ اس آدھے گھنٹے نے اسے بہت سہولت مہیا کی۔

جی تو اب چلئے دی لیوری کے تھیٹر......
دبیر سرخ پردے اٹھنے کو ہیں' شائقین کی تعداد آج زیادہ ہے کیونکہ یونی سے آکے جاب سے آف کر کے' بہت سے طلباء آئے ہیں۔ پہلی رو میں جبران احمد بہت اطمینان سے بیٹھا ہے مگر اس اطمینان میں جو بے چینی ہے' اس کا صرف اسی کو پتا ہے' پردے اٹھ چکے ہیں۔
ایک عالی شان محل کا منظر ہے' ایک خوب صورت

سے خواب گاہ میں بہت نقاہت سے لیٹی ایک شہزادی ہے‘ کنیزیں ادھر اُدھر کھڑی ہے‘ شہزادی نے سفید فراک پہن رکھا ہے۔

''شہزادی!'' دفعتاً ایک سنہری پوشاک زیب تن کیے عورت اندر داخل ہوتی ہے یہ ملکہ ہے‘ بہت نازک‘ ذرا موٹی سی‘ سفید دودھیا تپتی چہرے والی۔

''ہماری شہزادی کو کیا ہوا ہے۔''

''ڈینگی نے ڈنک مار لیا ہے‘ وہ میں کیٹی کے کمرے سے اس کی باقی ماندہ کافی چرالائی تھی مگر پتا ہے ماں......'' شہزادی اٹھی۔ ''اس میں ڈینگی نے بہت سے انڈے دیئے تھے۔'' ملکہ عالیہ کا حیرت سے برا حال تھا‘ شائقین تالیاں پیٹ رہے تھے‘ وہ سمجھے تھے کوئی رومانس بھری کہانی ہوگی مگر......

(ماں مجھے شہزادے کے غم نے ادھ موا کر دیا ہے‘ اس نے ہم پر جو ظلم ڈھایا اس نے ہمارا بہت نقصان کیا ہے...... اصلی جملہ)

ملکہ عالیہ نے نرمی سے شہزادی کا ہاتھ پکڑا‘ آنکھیں نکال کے جیسے سمجھانے کی غلطی کی ہو۔

''یہ غم نہیں میری شہزادی۔''

''اوہو ماں!'' بیڈ پر پھسکڑا مار کے کہا۔ ''اب شیکسپیئر بننے کی ضرورت نہیں‘ پچھلے تین منٹ سے مغز کھا رہی ہو کہ ڈینگی نے مارا ہے۔''

(میری بھولی ماں...... محبت نے میرا مغز نہیں کھایا‘ یہ تو فطری امر ہے‘ شہزادے کو بلا لیجیے اس کے سوا میری سانسیں میرا حکم نہیں مانتی‘ چلتی ہی نہیں‘ بلا لیجیے ماں)

ملکہ عالیہ کا چہرہ سفید ہو چکا ہے‘ بہت سفید...... جی ہاں مانچسٹر کے برف جیسا۔

''رکو میں حکیم کو بلاتی ہوں‘ شہزادے کی ضرورت نہیں۔'' شہزادی غصے سے منہ پھیر لیتی ہے۔

''حکیم کو نہیں ماں‘ ڈاکٹر جوزف کو بلا لیجیے۔ اوہ گاڈ اتنا ہینڈسم ہے وہ۔''

(''حکیم کو نہیں ماں‘ شہزادے کو‘ آپ کو اپنی شہزادی کا غم کم لگتا ہے؟'') ملکہ عالیہ گہرے سانس لیتی چلی جاتی ہے‘ وہ اوندھے منہ لیٹ گئی ہے‘ چند منٹ خاموشی کے بعد......

دریچے کے ساتھ کھڑی کنیز کہتی ہے ''شہزادہ آ گیا ہے۔'' وہ خوشی خوشی اٹھ جاتی ہے‘ دریچے کے پار دیکھتی ہے پھر پلٹ کے منہ بسور لیتی ہے۔

''اوہ اسے بھی ڈینگی نے ڈنک مارا ہے‘ ڈینگی مارا!''

(''اوہ اسے بھی محبت نے مار لیا ہے‘ میرے محبت مارے پرنس!'' اصلی جملہ)

شہزادہ آ گیا ہے‘ یہ شہزادہ بہت خوب صورت سا ہے۔ برطانوی طرز کے اس نے شہزادوں والے کپڑے پہن رکھے ہیں‘ اسے دیکھتے ہی وہ منہ پھلا لیتی ہے۔

کنیزیں اپنی پوشاکیں دونوں ہاتھ میں تھام کے‘ جھک کے کورس میں کہتی ہے۔

''عالی جاہ! خوش آمدید۔'' سر ہلا کے اشارہ ہے کہ چلی جائیں‘ کنیزیں کھسر پھسر کرتی چلی جاتی ہیں۔

''دیکھو تمہاری محبت نے مجھے یہاں کھینچ لیا۔'' شہزادہ نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بیٹھتا ہے۔

''سفید جھوٹ...... تم اپنے تحائف لینے آئے ہو مگر یاد رکھنا‘ تحائف نہیں دے سکتی۔'' کندھے پر اس کے سر رکھ دیتی ہے۔

(''نہیں جھوٹ...... تم اپنا دل لینے آئے ہو‘ مگر یاد رکھنا دل نہیں دے سکتی۔'') ملکہ کی طرح پرنس کا بھی سفید چہرہ ہو گیا ہے‘ جی چونے جیسا......

''مجھے دل نہیں چاہیے‘ مجھے پرنس کی پرنسز چاہیے۔'' غصے سے کھڑی ہو جاتی ہے۔

''بے غیرت‘ لالچی‘ حاسد...... تم ڈینگی کا علاج تلاشنے آئے ہو‘ جب تمہیں پتا چلا کہ ہمارے حکیموں نے ڈینگی کی دوا تیار کر لی ہے‘ تو تم چلے آئے‘ آہ تم کتنے بے وفا ہو۔'' حیرت‘ تالیاں...... حیرت...... اُف سیٹیاں۔

(''تم سمجھتے کیوں نہیں‘ یہ نہیں مانیں گے انہیں جب

پتا چلا تو ہمیں اٹھا کے زندان میں بند کردیں گے یا تمہیں قید کر کے تمہارا انگر قبضے میں لے لیں گے۔ آہ! تم کتنے سادہ ہو۔'' اصلی جملہ)

دروازہ کھلا' بہت سے سپاہی اندر آتے ہیں' ان سپاہیوں نے تاریخی طرز کے سپاہیوں والا لباس زیب تن کیا ہے' ایک سپاہی جو اُن کا سپہ سالار ہے کہتا ہے......

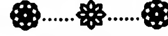
''اس باغی کو پکڑ لیا جائے۔'' بہت سے سپاہی اس کی اور دوڑتے ہیں اور اسے پکڑ کے لے جانے لگتے ہیں' پرنس چیخ رہا ہے۔

''ہمیں جدا نہ کرو' یہ الہامی جذبہ ہے توہین نہ کرو۔'' چند سپاہی شہزادی کو پکڑے ہوئے ہیں۔

''لے جاؤ بے غیرت کو' ڈیننگی مار دوا چرانا چاہتا ہے۔'' مزاحمت...... تالیاں' سیٹیاں' اُف...... حیرت۔ ایسے ہی چیخ و پکار میں وہ اسے لے جاتے ہیں۔

(''مت لے جاؤ' اسے میں نے بلایا تھا' آہ اسے چھوڑ دو۔'') اب وہ رو رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔''کتنا لالچی تھا آہ! میں نہ سمجھی۔'' (کتنا باوفا تھا آہ! میں نہ سمجھی)۔

دبیز پردے گر گئے تھے' شائقین اٹھ کے تالیاں پیٹ رہے ہیں' جبران پیٹ پر ہاتھ رکھے ہنس رہا ہے۔



کیا آپ نے مرچیں کھا کے غصہ کیا ہے؟ نہیں' اوہ تو کسی کو دیکھا ہے۔ نہیں تو چلئے آیئے' ڈرامے کے ڈائریکٹر جوڈ تھکے کمرے میں جو مرچیں کھا کے شارلٹ پر برس رہا تھا' شارلٹ سر جھکائے ہوئے تھی۔

''محترمہ! کیا میں نے جو اسکرپٹ آپ کو دیا تھا کیا آپ نے وہی لائنیں بولی تھیں؟''

''جی وہی بولی تھیں۔'' نحیف زدہ لہجہ' گاڈ یہ ظلم کس نے کیا۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ ٹریجڈی پلے تھے' فنی نہیں۔''

''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی' پتا نہیں' لائنیں کس نے تبدیل کی تھیں۔''

''اوہ تو آپ اسکرپٹ دوسروں کو بھی دکھاتی ہیں؟''

''نہیں...... نہیں' میرا مطلب ہرگز یہ نہیں۔'' بس اتنا کہہ کہ وہ رو دینے کو تھی' دروازہ ٹھاہ سے کھلا' دو تین لڑکے اندر داخل ہوئیں۔

''میم پلیز ایک سیلفی' آپ کی پرفارمنس نے ہمیں فدا کرلیا۔'' شارلٹ کی اڑی رنگت بحال ہوئی' کھا جانے والی نظروں کے ساتھ اس نے لڑکے کو دیکھا' سیلفی لے کر وہ چلے گئے۔

''آپ کا ڈرامہ محظوظ رہا لیکن......'' جوڈ تھ کے سامنے آ کر اس نے آنکھوں میں نظریں پیوست کیں۔

''لیکن اب مجھے معاوضہ ڈبل چاہیے۔'' سنہری بالوں میں انگلیاں چلاتی چلی گئی۔ دی لیوری کی سیڑھیوں میں بیٹھا تھا' معصومیت نے جیسے آ کر اسے آشیرباد دی تھی۔

''اوہ اتنا معصوم بچہ!'' شارلٹ نے اس کی گردن دبوچی۔

''اوہ گوش! میں نے تم پر اعتبار کر کے تمہیں اسکرپٹ پکڑایا۔'' کافی بنانے میں تاخیر کی جو سزا ملی' اس نے سہ لی تھی۔ سیڑھیوں میں لڑھک کے' وہ ادھ موا ہوا جا رہا ہے۔

'دی ڈیننگی پرانک!'' سڑک پر چلتے ہوئے وہ مسلسل اس پر خفا ہو رہی تھی' اپارٹمنٹ میں گھپ اندھیرا تھا۔ شارلٹ نے جیسے ہی دروازہ کھولا یکدم بتیاں جل اٹھیں' لاؤنج بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں کو بہت سے پھولوں سے سجایا گیا تھا' وسط میں ٹیبل پر کیک دھرا ہے کیک پر ہیپی برتھ ڈے لکھا گیا ہے۔ یکدم بتیاں بند ہوئیں' شارلٹ کسی شاک کے عالم میں تھی' ڈھیرے ڈھیرے پھولوں میں روشنی نمایاں ہونے لگی' روشنی...... روشنی اور......

Will You Marry me the Princess

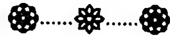
کیک کٹ گیا تھا یہ ایما اور جبران کی مشترکہ کاوش تھی'

جب جبران آ گیا' اسکرپٹ میں ردوبدل کیا تو اسی وقت ایما' مارتھا اندر آ چکی تھیں' وہ دونوں دی لیوری چلے گئے اور انہوں نے لاؤنج سجا دیا تھا۔ محبت ایک لفظ ہے لیکن...... ہزاروں داستان' اس میں قید ہے' قصے' کتھا' کہانیاں ایک لفظ میں سموئے ہوئے ہیں۔ محبت امر ہے' ہاں محبت کا مرن سے کوئی تعلق نہیں۔

''قصر عشق میں گل صد برگ سے سجی رتھ میں بیٹھی راج کماری کو سندیسہ سنا دیا گیا۔

''محبت ملن کا سمے ہے اور...... آکاش کی لوح پر پریم سے اس تمثیل کی نزولیت ہوئی۔

''محبت گل سبو ہے' اسے خوشبو بکھیرنے دو۔''



چرچ تک جاتے دروازے میں وہ سفید پوشاک پہنے آنسو سموئے پادری کے ساتھ کھڑے جبران کو دیکھ رہی تھی' نکھرا نکھرا سا' سوٹڈ بوٹڈ...... ایما مہمانوں کو ریسو کر رہی تھی' قطار میں اس کی تین شہہ بالیاں کیٹی' ایما' مارتا' ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے لیے ہوئے تھی۔

رکنی وائلن گروپ میں ہلچل پیدا ہوئی کیونکہ انہوں نے دلہن دیکھ لی تھی۔ ہواؤں میں وائلن کی ہلکی ہلکی دھنیں بکھرنے لگی۔ محبت کے صحیفے میں' محبت نے موقلم تھام لیا' محبت تمثیل پر بہت سے رنگ گرے' بھید بھرے' پراسراریت کا طلسم تھامے۔

''چلو جی تمہارا سمسٹر تو ختم' بھئی تم جبران سے ہنی مون کا نہیں کہوگی؟ اوہ نہیں ایسے نہ گھورو۔ لیڈی ڈیانا کی بہو نے تاخیر نہیں کی تھی' کارپٹ پر سفید پوشاک پھیلاؤ اور چلو۔'' ایما کان میں گھسی' کھسر پھسر کر رہی تھی' اس نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ دفعتاً سارے مہمانوں کی گردنیں پیچھے کو مڑی' ستائش وقت نے کی' دعا دل سے نکلی۔

اس نے بظاہر اسے اپنی خوشی کا اظہار نہیں کیا' بس کہہ دیا تھا' ایما کو یونی سے آف کروا کے وہ شاپنگ کے لیے جاتی تھیں۔ اپنی تین ماہ کے سارے پیسے اس نے خرچ کرلیے' اسٹور سے تین ماہ کا ایڈوانس بھی لے لیا۔ اسٹور کی منیجر مورگن ایک نفیس طبیعت کی مالک تھی۔ بہت خوب صورت سی' موٹی سی' شادی کا کارڈ جب شارلٹ نے دیا تو بہت وقت تک اس کا ہاتھ پکڑے وہ نہایت ملائمت سے دعائیں دیتی رہی۔ اس کی تو آنکھیں بھیگ گئیں۔

''کیا تمہاری پسند کی شادی ہے؟''

''نہیں میری پسند کی شادی نہیں ہے۔''

''تو کیا مام ڈیڈ؟''

''نہیں' میری محبت کی شادی ہے مورگن۔'' مورگن نے ایک دفعہ پھر سے دعائیں دی تھیں' وہ بہت خوشی سے نکل آئی۔

چرچ کی مانوس رمق نے لوگوں کے آنکھوں کو خیرہ کیے رکھا ہے' آسمان بلائیں لیتا' زمین دعاؤں میں مگن شارلٹ کی شادی میں شریک ہے۔ جبران کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے' شہہ بالیاں اور شہہ بالے اب پیچھے ہٹ کے قطار میں کھڑے ہیں۔

آداب ملاحظہ...... وائلن کا ساز گونج رہا تھا عہد نامہ دہرایا جا رہا ہے۔ پھولوں سے گھرے چرچ سے نکل کے وہ کار میں بیٹھے تو ایما نے گلدستہ اس گود میں پھینک دیا۔

''دیکھتے ہیں کہ مشرقی دلہا اور مغربی دلہن میں کب جھگڑے کی ابتدا ہوگی؟''

''اب جاسکتی ہے اور جھگڑے تو ہوتے رہیں گے۔''

ایما کے کان میں سرگوشی کرنے والا ہے جم تھا جی ہاں! جم ایما کے گھونسلے پر فدا ہے' کار چل پڑی ہے۔

''میں تم سے...... جبران احمد! تم سے محبت کرتی ہوں۔''

''کیا مجھے پتا نہیں تھا جی' محبوبہ' بیوی بن گئی ہے۔''

''میں تمہارے لیے کیا کروں؟''

''ہاں میں تمہارے لے دنیا میں آگ لگا دوں گا' اے بغاوت پر اکسانے والی' کیا میرے ساتھ رہو گی؟''

''تمہارے ساتھ ہی ہوں۔'' محبت کے صحیفے ''محبت تمثیل''، مکمل ہونے لگی ہے' ہورہی ہے۔



صبح ہوچکی تھی' وہ کچن میں گھسی' ایپرن باندھے' نظم گنگناتے ہوئے کام میں لگی تھی۔ خاصا روایتی پن آ گیا تھا' ہنی مون پیرس میں منا کے آ چکے تھے۔

''پتا ہے شارلٹ! ہمارے ملک کا ایک عظیم رائٹر ہے مستنصر حسین تارڑ۔'' کچن کے دروازے میں تائٹ سوٹ پہنے وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کارواں سرائے میں لکھتا ہے کہ ایک ایسی بیوی بہتر ہے جو کھانا پکا سکتی ہو لیکن پکاتی نہ ہو بہ نسبت ایسی بیوی کے جو کھانا نہ پکا سکتی ہو اور پھر بھی پکاتی ہو۔ سنہری بالوں والی لڑکی نے بے اختیار انڈہ اٹھا کے اس پر دے مارا۔ کڑچھ......

''ایسا شوہر کیوں نہ بہتر ہو' جو ہر وقت انڈے سے نہاتا ہو۔'' شانے اچکا کے حساب برابر والے انداز میں کہہ کے اس نے کہا۔

ماسی مصیبتے کہہ کے وہ چلا گیا' وہ صبح دو کام کر کے یونی جاتی تھی' بس آخری سمسٹر تھا' ناشتا بنا کے کروا کے پھر مسز ریچل کو دے کر وہ جاتی تھی' مسز ریچل کے جبڑے اسے دیکھ کے بند نہیں ہوتے۔

جبران اسٹور میں اس کے ساتھ کام کرتا تھا' جمعرات' ہفتہ کو وہ ڈی لیوری جاتی تھی۔ ہاں اب وہ معاملہ نہ رہا کہ جبران کو اسکرپٹ میں قینچی چلانی پڑے' ہاں بس ایسا ضرور کرتا ہے کہ جب وہ لائنیں یاد کرنے کے لیے اسکرپٹ اٹھاتی ہے تو اسکرپٹ غائب' اوہ! جبران دی گھوسٹ......لیکن بدلے میں شارلٹ بہت تاک ہے۔ کل صبح سویرے وہ اس کے پسندیدہ اور نئے شرٹس' جوتے چھپالیتی۔ مسز ریچل کو پکڑا کے کہتی ہے ''مذاق ٹائم'' اوہ مسز ریچل کے جبڑے بند نہیں ہو رہے۔

''میرے جوتے شارلٹ۔''

''اب میں نے نہیں کھائے۔'' سر میں ہاتھ گھسا کر آہ کھینچا۔

''میرا نیلا شرٹ۔''

''میں نے تو نہیں دیکھا۔''

شام ہو رہی ہے' دونوں شام کو کیفے چلاتے ہیں' انہوں نے کیفے کا نام ''لو کیفے'' رکھا تھا۔ ایک خوب صورت سا بورڈ دروازے کے ساتھ آویزاں تھا جس پر دو پریمی جوڑے مرتسم تھے۔ ایک خوب صورت سی پری سی برطانوی لڑکی نے نیلا گھرا فراک پہن رکھا ہے اور ایشیائی خوبرو سلطان کے کندھے پر سر رکھا ہے۔ اس کیفے نے بہت سی سہولت مہیا کی' بہت سے گاہک شام کو آتے ہیں اور وہ پریمی جوڑوں پر مشتمل ہوتا ہے اگر وہ دیکھ لیتے تھے کہ ایک لڑکی اکیلی بیٹھی اداس ہے یا لڑکا انجانے خیالوں میں کھویا تنہا بیٹھا ہے تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔

''ہائے پریٹی!'' اداس آنکھوں' بچھڑے محبوب کی وصل کی سرگوشیاں سرشک بن کے چھلک جاتے تھے' اداس نظریں نومبر کو پگھلا دیتی تھی۔

''وہ نہیں رہا' آہ میں جدائی میں تڑپ رہی ہوں۔''

اسے بولنے پر اکساتا' جب بولنے لگتی تو شارلٹ آ جاتی تھی۔ کافی پیش کرتی اور بیٹھ جاتی تھی۔

''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ صرف وقت گزاری کرنا۔'' کافی اٹھائی' گھونٹ بھرا' چاہتا...... آخ......آخ۔ گھونٹ باہر' کافی پرانک۔

''کیا ہوا ہے؟ اچھا' شیمپو اوہ میں سمجھی کہ چاکلیٹ انڈیل دیا' ہنستی گئی' لڑکی مسکرا دی تھی۔

''زندگی کی حقیقت خوش رہنے میں ہے کیا نہیں ہے؟ جب مسکراتی ہو نا پریٹی تو تمہارے ہونٹ ذرا سے کھلتے ہیں' صاف دانت بہت بھلے لگتے ہیں' بھنوؤں کی اٹھان بڑی خوب صورت لگتی ہے' ہنستی رہو' زندگی رونے کے لیے نہیں بنی۔'' ہم نصیحت تب کرتے ہیں جب ہم خوش ہوتے ہیں ورنہ غم میں تو ہمیں بھی نصیحت بری لگتی ہے۔

اگلے دن ایک نمونے کو حاضر کیے کہتی ہے ''ہے دس از جوزف! اوہ مائی لو۔''

❁......❁......❁

آسمان پر قافلہ رجوم کی روانگی ہورہی تھی۔ جبران نے اس سے کہا تھا' اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے اور وہ پاکستان جارہا ہے' اگلے ماہ تک انتظار نے اسے ستانا ہے۔ اس نے جبران کو جانے دیا اور انتظار کو آنے دیا۔

انسان اپنا روپ بدل دے مگر فطرت نہیں بدل سکتا ہے' فطرت ہوا سی ہے' اسے ایک جگہ میں قید نہیں کیا جاسکتا' اسے اڑنا ہے۔ کیفے اب بھی وہ چلاتی تھی' جوڑے خوش باش سے آتے تھے اور دوسروں کو نصیحت کرنے والی نصیحت نہیں سنتی تھی۔ اس چھ ماہ میں وہ بہت بدل گئی' اب وہ حاملہ تھی' کیفے چلاتی رہی' وہ بدل گئی۔

شام کا وقت تھا' وہ کیفے جارہی تھی' اس نے گہرا پیلا رنگ پہن رکھا تھا' ''اوپن'' کا بورڈ پلٹا کہ وہ اندر چلی گئی۔ اس نے تین لڑکیاں بھی رکھ لی تھی' جبران کی یاد نے اسے اتنا تھکا دیا کہ اسے کام کرنے میں ہوش نہ رہا۔ اس نے جاتے سمے کہا۔

''میرا انتظار مت کرنا شارلٹ!''

''انتظار محبت کی روح ہے جبران! اس کے ساتھ ساتھ' رواں دواں۔'' ہاں یہ صحیح ثابت ہوا' انتظار اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

اسے یکدم کلائمکس آن وارد ہوا کہ فلم زندگی بھی اباک ہوگیا' دی لیوری میں اب وہ اداس' غمگین رول کرنے لگی تھی۔ ایما' فیریا' ماریانا اس کی سہیلیاں ہفتے کی شب آتی تھیں۔ اسے لے کر آکسفورڈ کی سڑکوں پر گھما کے چند اچھی پکچرز دکھا کے کسی آئس پارلر میں' آئس کریم کھلا کے وہ انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتی تھیں مگر مشرق اور کسی نے اس کی روح چرالی تھی۔

''تم ہنسو' ایما کہتی ہے تم بہت بور ہوگئی ہو' اسے دکھا دو کہ شارلٹ اب بھی سیمابی مزاج رکھتی ہے۔'' وہ کھوکھلی ہنسی ہنس دیتی تھی' ہواؤں سے ہوتی ہوا سی......

''تم اب کافی بدمزہ بناتی ہوں۔'' چاکلیٹ انڈیل کے وہ مسکرا دیتی یعنی سارا کمال تو چاکلیٹ کا تھا' اب ہے' چلو جی مزہ لو۔

یہ شادی کے پہلے سال کا نومبر ہے' جمعرات کی شام تھی' سرد' جامد' ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سڑکوں کے دائیں بائیں' دکانوں کی بتیاں جل اٹھی تھیں' برف کی رداسڑک پر بچھی تھی' ''لوکیفے'' ایک لڑکی آئی تھی۔

''ہائے میں سوسن ہوں۔'' کاؤنٹر کے پاس آ کر سے ''آہ میں رو رہی ہوں'' والے لہجے میں کہا' حساب کتاب میں مگن شارلٹ نے سر اٹھایا۔

''محبت ہوگئی مجھے۔'' اب دونوں ہلکی ہلکی آواز میں ونڈو گلاس کے ساتھ والے ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔ ''اس کا نام باب تھا مگر وہ ایک حریص شخص تھا' میرا ایک پراجیکٹ تھا اس کی ساری پرافٹ وہ لے اڑا' ان چھ ماہ میں وہ مجھے فریب دیتا رہا' کیا محبوب فریبی ہوتے ہیں؟''

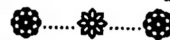
''چھ ماہ اور فریب'' نے اس کی امید پر بارش کردی' فریب چھ ماہ......

''انسان کے خمیر میں حرص ایسا گھل چکا ہے کہ جیسے آٹے میں نمک اور سوڈا گھل کے اسے روٹی بنادیتا ہے۔ انسان کا ضمیر ایک روٹی کی مانند ہے' حرص' نفرت' محبت' پیار' انا' غصہ' حسد' رشک' ضد' شفقت' بے رحمی سب کے سب اس میں گھل گئے ہیں اگر اس میں کوئی ایک عنصر میں کمی یا اس کی تعداد میں زیادتی پیدا ہوجائے تو روٹی باسی ہوجاتی ہے۔ پھیکی' کڑوی' کسیلی' نمکین اگر محبت کسی کے لیے زیادہ ہوجائے نا تو دوسروں کے لیے مقررہ محبت میں کمی واقع ہوجاتی ہے پھر ایسی محبت کا مطلب؟ جو انسان کے Akenebtrt Cannal میں جا کر اٹک کر سانس روکے' اداس پہروں میں' اداسی نے تنہائی کو خوش آمدید کہا۔ سے سمٹی ہوئی پنچھی کے پروں میں لک چھپ کھیل رہی تھی۔ انتظار کا دیا جو اس نے روشن کیا ہے' بارش کے عین نیچے ہے۔

''محبت میں ایسا ہوتا ہے سوسن! جس کو جتنا زیادہ گوندھو' اتنی ہی اچھی روٹی بنتی ہے۔ اس میں جانثاری' وفا

کا نمک ڈال کے' خلوص کے پانی میں گوندھو تو جو روٹی بنتی ہے۔اس سے عمر بھر کی بھوک ختم ہوجاتی ہے اس میں اتنی توانائی ہوتی ہے کہ ساری زندگی گزار سکتے ہیں محبت کی ایک روٹی پر۔'' رات کا وقت ہے' اظلامی نے رات کی تاریکی میں اور بھی راجدھانی قائم کرلی ہے۔ فلک خاموش ہے اور شہر محبت میں محبت کی مغنیہ کے ہاتھ میں مرثیہ تھمادیا گیا ہے' اسے ایک لفافہ ملا اور......

''سپر پیہم سر شک بہانے لگا' ہاں اسے بہانے دو۔ اس نے ایک دل میں بے وفائی اور دسرے دل میں برہا کا خزاں دیکھ لی ہیں۔''



No Son--- No Moon

No Morn---- No Noon

No Down----- No dsk--- No

Proper time Of day

NO Sky---- No earthly view

Nodistance Looking blue

No Road--- No Street----

No"t' Other Side the way-

آج پھر سے نومبر ہے' دی لیوری کی آرٹ گیلری میں سیڑھیوں پر بیٹھی ہے۔آنکھوں میں خزاں آن ٹھہرا ہے' اتنی اجاڑ' بے ویران' صحرا سی آنکھیں' برف میں دبی بے بس چڑیا سرد ہوچکی ہے۔

''میں تمہیں قصے خوانی میں گھماؤں گا شارلٹ! شفیع مارکیٹ سے نیا سوٹ خرید کر' صدر میں دماغ کھپا کر میں تمہیں پتوار لے جاؤں گا' پتوار بالا بہارم قریہ......

وہ اٹھی' کیفے کے پاس کھڑی ہوئی اور ایسی بے بس نظریں ڈالی کہ غم خمار میں مخمور ہوگیا۔لو کیفے کے بورڈ پر وہ ہاتھ پھیر رہی تھی' ایسے کھوئے کھوئے انداز میں' محبت اگر آپ کو وصل دیتی ہے تو بلاشبہ وصل کا خمار سر چڑھ کے بولتا ہے لیکن محبت آپ کو ہجر دے تو دنیا میں رہ کے' دنیا سے تعلق نہیں ہوتا۔

''یہ بورڈ میں نے اس لیے لگایا کہ لوگوں کو معلوم ہو' محبت امر ہے۔'' محبت مرن بن اس پر غالب ہے۔

روڈ پر کوٹ کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے' برستی بارش میں چلتے وہ روئے جارہی تھی۔

''میرے وجود میں پلنے والے اے مشرقی بے وفا کے خطا! خدا تمہیں خوار نہ کرے۔'' سنہری پریاں آج بہت رو رہی ہیں' اہل محبت میں محبت کے صحیفے میں محبت نے آنکھوں میں گہرا پیلا رنگ انڈیل دیا۔

رات میں ہی وہ یونی کے سامنے والی دیوار پر ہاتھ پھیر رہی تھی' وہ کیا کریں؟ وہ رو رہی ہے۔

''جبران میں لعنتی نہیں ہوں' میں تو تمہاری ایک خطا ہوں' خطا......خدا کرے یہ خطا جزابن کے تمہاری زندگی ویران کردے۔'' خالی نظریں دامن سپہر چھید رہی ہے' آہ آہو نے لوح یار پر پھینکی کسی اور بے خوابی کو مقدر ٹھہرایا۔

''تم مجھے ان سے ملواؤ نا تا کہ میں بھی دیکھوں گل مینہ کی سیمابی فطرت' درخانے کی بے تکان باتیں' مینا کی چاپلوسی' گل افنان کی بجلی۔ اوہ جب شام پتوار کے بڑے قبرستان پر اترتی ہوگی تو کھیتوں میں بڑے بڑے درختوں کی اوٹ سے ڈھلتے سورج کی کرنیں کیسا منظر پیش کرتی ہوں گی۔'' پیزا کھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

''میں تمہیں کیسے ملاؤں گا' تم عیسائی ہو۔''

''ہاں تو......ہم میاں بیوی ہیں۔''

''لیکن اسلام میں تو یہ شادی نہیں ہوسکتی کیونکہ شادی کے لیے دونوں فریقین کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔''

پتوار بالا کا ارمان دل میں دب گیا' صفحہ پلٹ گیا۔

No end to andy Row

No indications where the

Crescents go---

No top to andy Steeeple

No recognitions of Familiar

People
No Covrtesies for showing' em
No Knowing' em

''کتاب یار'' سے محبت کے عنوان پر سیاہی دوات الٹ گئی اور ''عنوان محبت'' سمٹ کے ''عنوان ہجر'' بن گیا۔

''جبران کیا ماں بننا عظیم رتبہ ہے؟''

''ماں......'' وہ چیخا۔ ''ماں جنت کی ضامن ہے امانت دار۔''

''تو جناب! شارلٹ نے جنت کی امانت داری سنبھال لی ہے اور جبران باپ بننے کی تیاری کرنا شروع کردیں۔''

''وہاٹ......'' وہ چیخا تھا۔

یعنی پکا بیوپاری تھا' جب اس نے یہ بات کی تو اس کے اگلے دو دن میں اس زیادہ باتیں نہیں کی تھیں' خاموشی سے پیکنگ کرتا رہا' جب وہ جانے لگا تب پتا چلا۔

''آہ وہ جا رہا ہے۔'' اس چھ ماہ کی رفاقت میں کبھی اس نے عیسائی ہونے کا طعنہ نہیں دیا' سو یہ ثابت ہوا کہ اسے کوئی ضروری کام تھا وہ صحیح کہہ رہا تھا اس کے گھر میں کوئی بیمار ہے' ہاں کچھ ہوا ہے۔ چھ ماہ کے بعد جب وہ دن گننے لگی تو دن گنتے ہوئے دوسرا مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ اُف ایما نے صبح سے اسے کہہ دیا تھا کہ تیار رہنا' پیرس چلے جائے' ذرا سا گھوم لیں' ایما دراصل اسے گھمانا چاہتی تھی ذرا سی پیکنگ کر کے وہ تیار تھی۔

شام پیرس کی معاون ہے' اسے اظلام سے بچائے رکھنا چاہ رہی ہے' شام' رات کو اترنے سے روک رہی ہے۔ سڑک پر چل رہی تھی اوور کورٹ کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ نمناک سڑک پر چل رہی تھی' ان آنکھوں میں ایک شبیہہ ہے۔ ایک محبوب کا' ایک باوفا کا' ایک سنگ مرمر کال رکھنے والے بہروپیا کا۔ ایما سے بچھڑ کر وہ ایفل ٹاور کی اور نکل آئی تھی' ہجوم میں چلتے ہوئے اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ ایک شخص بہت شتابی سے اس کے دائیں جانب نکلنے لگا تھا کہ ''شڑاپ'' سے اس کے ہاتھ سے چیزیں گر گئیں' وہ ''اوہ سوری'' کہہ کے جھک گئی اور جیسے جھکی ہی رہ گئی۔

آسمان کرچی کرچی لہو کے' آنکھوں میں سمٹ آیا' زمین نے دھسان اگلنے شروع کردیئے۔

''جبران!'' وہ چیزیں اٹھاتا جبران یکدم سیدھا ہوا۔ ''پنچھی'' کے پر کترنے لگے اور آہ سینے میں دم توڑنے لگی۔ شارلٹ اٹھی اس کے سینے سے جا لگی۔

''تم نے مجھے جدائی سے لگایا' تمہیں ترس نہ آیا؟''

جبران یکدم پیچھے ہٹا' ایسے انداز میں جیسے کوئی بے دھیانی میں سلگتے انگارے پر ہاتھ رکھ دے۔ حیرانی سے آنکھیں پھٹ پڑیں' یہ جبران تھا؟ پنچھی نے اس مورکھ کو دیکھ کے ''نہیں'' کا جواب اس پر پھینک دیا۔

''پلیز منہ بند رکھو؟''

''میں منہ بند کیسے رکھوں جبران! تمہاری بے وفائی' جدائی نے مجھے ادھ موا کردیا' دیکھو۔'' پیٹ پر خوشی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔

''اس نے تمہیں بہت یاد رکھا' یہ اب بھی تمہیں پکار رہا ہے۔'' دو قدم پیچھے ہٹ کے' اشتعال انگیز انداز میں آنکھوں میں نفرت سموئے اس نے کہا۔

''یہ میرا گناہ نہیں ہے' یہ میرا نہیں ہے' آہ یہ میرا گناہ نہیں۔''

''یہ تمہارا ہی ہے۔''

''جاؤ میں تم سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔''

''تم میرے شوہر ہو۔''

''میں تمہارا شوہر نہیں ہوں' میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں۔''

''تم نے...... ایسا ظلم کیونکر کیا؟'' آنسو نکل کے خشک ہونے لگے۔

''کیونکہ تم عیسائی ہو' عیسائی عبث ہے اور ہم عبث سے رشتہ جوڑ کے نجس نہیں بننا چاہتے۔'' چیزیں سمیٹ

کے وہ جانے لگا' اچانک کسی لڑکی نے اس کے بازوؤں میں بازو حمائل کیے اور آنکھیں بے نوری پر اتری' بینائی کھو بیٹھیں۔
بھری پھری سڑک کے عین وسط میں بیٹھی رو رہی تھی' بہت سے لوگ مڑ مڑ کے دیکھ رہے تھے' ہاں دنیا بہت بہترین تماش بین ہے۔ ایما اسے ڈھونڈتی ڈھونڈتی اس طرف نکل آئی۔
''تم رو رہی ہو۔''
''آہ! مجھے درد ادھ موا کر رہا ہے ایما۔''

No travelling at all- no locomotion
No inkling of the way--- no nation
No go--- by land or Ocean-
No Mail--- No Post---

گریٹ قبرستان پر صبح ایسے اتر رہی ہے کہ جیسے قدرت نے صفحہ پلٹ دیا ہے۔ صبح سے چھاجوں چھاج مینہ برس رہی ہے' چھتری تھامے وہ رو رہی ہے۔ رونا اس کی قسمت میں ایسے شامل ہو گیا ہے کہ جیسے سانس ہر کسی کے لیے اہم ہوتی ہے۔
''شکر کرتی ہوں کہ اس بے رحم دنیا میں تم نہ آئے مگر غم کرتی ہوں کہ قسمت نے مجھے ادھوری ماں کا اعزاز کیوں دیا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نجس ہوں تو اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ وہ معتبر ہے۔ وہ کہتا ہے ''تم میرے نہیں ہو'' شکر ہے کہ تم نہ آئے' میں تمہیں ادھورا دو حصوں میں بٹے کیسے دیکھتا؟''
''شارلٹ! کیا ہم چلیں؟'' عقب سے ایما نکل آئی۔ ''محبت کا ماتم کرنا' اچھا نہیں ہوتا۔''
''میں محبت کا ماتم نہیں کر رہی شارلٹ کی جان! میں نجس ہوں بس اس جملے سے ملے درد کو سہہ رہی ہوں ورنہ اس کی محبت تو ہوا سی تھی' یہاں آئی' وہاں چلی۔'' اب وہ دونوں فٹ پاتھ پر بیٹھی تھیں' دور سے کہیں ضد کا پکا ایک منچلا لڑکا گٹار کی نئی نئی دھنیں نکال رہا تھا No تھامس ہوڈ کی شاہکار نظم کی مشقوں سے نومبر کی حالت زار سنا رہا تھا۔
نومبر ہے
اب اک سے میں خزاں کا سماں ہے' زرد پتے ادھر ادھر بکھرے ہیں' جدائی کا موسم ہے' بے وفائی کا بیوپاری ہے۔
''سپہر پہ یہ سرشک بہائے جا رہا ہے' ہاں اسے بہانے دو کیونکہ زندگی تنویر خلیل کا کہنا ہے......
''اس نے نومبر کو دیکھ لیا ہے' نومبر' برہا کا موسم......''

No News form foreign Coast
No Park No ring no after noon gentility
No Company No Nobility
No warmth, No Cheerfulness, No Heatlhful Case
No Comfortable feel in any member
No Shade, No Shine, No Butterflies no Bees
No frutys, No Flowers, No Leaves, No Birds
November



ماں جایا

نفیسہ سعید

قدرت نے ہر شے کے لیے ایک قانون بنایا ہے اور ایک طریقہ کار منتخب کیا ہے وہ کسی بھی انسان کو اس کی بساط سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا بس ایک انسان ہی ہے جو نہ شکرا ہے اور اس کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

اولاد سے محروم ایک عورت کی روداد۔

جو قدرت کے قانون کو سمجھے بغیر ایک لڑکی کو بیٹی بنا کر گھر لے آئی تھی

شدید گرمی کے احساس سے آمنہ کی آنکھ کھل گئی' شاید لائٹ چلی گئی تھی اے سی بند ہونے کے باعث کمرہ حبس زدہ ہوگیا تھا' وہ بمشکل اپنے جسم کو گھسیٹ کر سیدھی ہوئی' پیاس کی شدت سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے' کوشش کرکے وہ آہستہ آواز میں چلائی۔

"عبیر...... عبیر......" جواب ندارد' قریب رکھا موبائل اٹھا کر اس نے روشنی کی' کمرے میں موجود دوسرا بیڈ خالی تھا۔

"یہ کہاں گئی؟" تشویش زدہ آواز میں وہ ہلکا سا بڑبڑائی جب اسی دم کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا' آمنہ نے دیکھا وہ عبیر تھی' موبائل کی دھیمی سی روشنی میں بھی عبیر کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ اسے دور سے بھی نظر آرہی تھی۔

"تم کہاں سے آرہی ہو؟" عبیر کو اس طرح مسکراتا دیکھ کر وہ اپنی پیاس یکسر فراموش کر بیٹھی۔

"انکل آئے تھے انہیں کھانا دینے گئی تھی۔"

اطمینان سے جواب دے کر عبیر نے جگ سے پانی بھر کر گلاس آمنہ کے ہاتھوں میں لا تھمایا مگر اس لمحہ وہ پیاس کے احساس سے یکسر غافل ہوئی تھی کیونکہ اس کا سارا دھیان عبیر کی جانب ہوگیا تھا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا نا کہ جب تمہارے انکل آئیں مجھے جگا دینا میں خود کھانا دے دوں گی پھر تم کیوں گئیں؟" اور وہ ارشد کہاں مر گیا تھا؟" آمنہ کے لہجے میں غصہ نمایاں تھا۔

"کیا ہوگیا ہے آنٹی آپ کو؟" عبیر نے حیرت کے مارے برا سا منہ بنایا۔

"وہ کب سے بیل بجا رہے تھے اور ارشد شاید سو گیا تھا اس لیے مجبوراً مجھے جانا پڑا اور ایسے میں جب انہوں نے کھانا مانگا تو کیا منع کرکے واپس آجاتی؟"

بستر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر آمنہ سے سوال کیا۔

"بہرحال آئندہ جب وہ آئیں تو مجھے جگا دینا تمہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" عبیر کی بات کا جواب دیئے بنا وہ رکھائی سے بولی کیونکہ جانتی تھی رات کے اس پل عام طور پر سعادت نشہ کی حالت میں گھر واپس آتا تھا ایسے میں عبیر کا اس کے سامنے جانا اور کھانا گرم کرکے دینا آمنہ کو قطعی پسند نہ تھا' اور یہی بات وہ اکثر عبیر کو بھی سمجھایا کرتی جو شاید اس کی سمجھ میں نہ آرہی تھی' عبیر بستر صاف کرکے لیٹ گئی تو آمنہ نے بھی آنکھیں موندلیں۔

آمنہ اور سعادت کی شادی کو پندرہ سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا تھا اور وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے جس کا سعادت کو تو کوئی احساس نہ تھا مگر اولاد کی کمی کی کسک آمنہ کے دل میں ضرور پائی جاتی جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار بھی کیا کرتی' آخرکار اس معاملے میں سعادت کی بے پروائی دیکھتے ہوئے آمنہ نے بچہ گود لینے کا فیصلہ کیا تاکہ گھر کی تنہائی دور کرنے کے لیے کوئی ساتھی میسر ہوجبکہ اس معاملے میں بھی سعادت کو کوئی اعتراض نہ تھا یہی وجہ تھی جب وہ چھٹیوں میں گاؤں گئی تو اپنے بڑے بھائی عبداللہ کی بیٹی گود لینے کا سوچ کر گئی' ویسے بھی عبداللہ کی پانچ بیٹیاں تھیں' بھائی کو بیٹے کی خواہش نے اپنی بیٹیوں سے لاتعلق کر رکھا تھا جس کے باعث عبداللہ آسانی سے بہن کو بیٹی دینے پر آمادہ ہوگیا ویسے بھی شہر اور گاؤں کی زندگی میں بہت فرق تھا اسی بہانے اس کی بیٹی شہر جا کر اچھی تعلیم حاصل کرسکتی تو بھلا عبداللہ کا کیا نقصان تھا' اب ہونا تو یہ



چاہیے تھا کہ آمنہ چھوٹی والی سیزا کو گود لیتی۔ جس کی عمر دو سال تھی مگر جانے کیا سوچ کر اس نے آٹھ سالہ عبیر کو گود لیا جس کی ایک وجہ تو شاید یہ بھی تھی کہ عبیر بچپن سے ہی اپنی پھوپھو سے کافی اٹیچڈ تھی دوسرے ویسے بھی چھوٹی بچی کے مقابلے میں نسبتاً بڑا بچہ پالنا اور سنبھالنا زیادہ آسان تھا مگر مشکل یہ ہوئی کہ آٹھ سالہ عبیر نے باوجود کوشش کے آمنہ کو امی اور سعادت کو بابا کہہ کر نہ دیا وہ شروع سے جو انکل آنٹی تھے عبیر کو گود لینے کے بعد بھی انکل آنٹی ہی رہے اب اس پر بھی سعادت کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر یہاں بھی آمنہ لفظ ماں کے لیے ترستی رہی' کچھ سال تو اس نے عبیر کے ساتھ بہت اچھے اور خوش وخرم گزارے بالکل اپنی سگی اولاد کی طرح عبیر اسے بے حد عزیز تھی جس کی ہر ضرورت کا خیال وہ بنا کیے رکھا کرتی تھی کیونکہ روپے پیسے کے معاملے میں اسے کبھی سعادت نے تنگ نہ کیا تھا اسی طرح عبیر میٹرک کر کے کالج جا پہنچی اور آمنہ کو شوگر کے ساتھ ہائی بلڈ پریشر' اور کئی بیماریوں نے گھیر لیا اور وہ بستر پر جا پڑی جوان ہوتی عبیر پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی جبکہ بڑھاپے کی طرف بڑھتی آمنہ کو بیماریوں نے وقت سے پہلے بوڑھا کردیا' اس کے مقابلے میں سعادت خاصا جوان اور اپنی عمر سے قدرے کم نظر آتا وجہ اس کا اپنی ذات پر بے حد دھیان دینا تھا' جبکہ اس معاملے میں آمنہ خاصی بے پروا ثابت ہوئی تھی' یہی وجہ تھی کہ آمنہ کی بیماری نے سعادت پر کوئی خاص اثر نہ ڈالا اور وہ اپنی زندگی کی بیرونی مصروفیات میں اس طرح گم ہوا کہ گھر پڑی آمنہ کو بالکل ہی نظر انداز کردیا جبکہ عبیر بھی اپنے دوستوں اور پڑھائی میں اتنی مصروف رہتی کہ آمنہ کو کم ہی وقت دے پاتی پھر بھی عبیر کی ذات آمنہ کو غنیمت محسوس ہوتی جو کم از کم رات کے وقت اس کی تنہائی دور کرنے کا سبب تو تھی سعادت نے اپنے گھریلو کاموں کے لیے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا رکھ لیا تھا جو باہر کے کام بھی سرانجام دیتا تھا اور گھر میں بھی آمنہ کے کئی کام کردیا کرتا' غرض بیماری کے سوا آمنہ کی زندگی میں کوئی اور مسئلہ نہ تھا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ اولاد کے جوان ہوتے ہی ماں باپ کے مسائل بھی جوان ہوجاتے ہیں تو شاید ایسا ہو چلا تھا سعادت تو شروع سے ہی بے پروا شخص تھا مگر آمنہ' عبیر کو اپنی سگی اولاد ہی سمجھتی تھی اس لیے اب عبیر کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے مسائل بھی اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے جن میں سب سے پہلا مسئلہ تو سعادت خود تھا۔ جس کی وجہ سے عبیر کی جوانی آمنہ کو خوف زدہ کررہی تھی ویسے تو وہ شروع سے ہی شراب پیتا تھا مگر آج کل رات گھر واپسی پر وہ اکثر نشہ میں ہوتا۔ جس پر آمنہ کے دل میں یہ خیال جگہ بنانے لگا کہ نشہ میں دھت شخص کبھی اپنا بھی نہیں ہوتا تو وہ دوسرے کا کیا ہوگا۔ جس کی بنا پر اسے عبیر کا سعادت سے بات کرنا اور خاص طور پر رات کے وقت جب وہ نشہ کی حالت میں گھر آتا بہت ہی کھٹکنے لگا۔ جس کے سبب وہ وقتاً فوقتاً عبیر کو سمجھایا کرتی تھی کہ وہ سعادت سے جس قدر ممکن ہو کم سے کم بات کرے لیکن وہ اسے کھل کر یہ نہ کہہ سکی کہ اس کا حساس دل' سعادت کی نگاہوں کو بدلا ہوا محسوس کررہا ہے کیونکہ کبھی کبھی یہ اسے اپنا وہم بھی لگتا جس کا تذکرہ کسی سے بھی کرنا فی الحال اسے ٹھیک نہ دکھائی دے رہا تھا اور بہتر یہ تھا کہ اس مسئلے میں عبیر کو اپنے اعتماد میں لیا جائے اور یہی بات اسے سب سے زیادہ مشکل دکھائی دے رہی تھی کیونکہ وہ جتنا عبیر کو سمجھا رہی تھی اتنا ہی عبیر اس کی کسی بات کو شاید اہمیت نہ دیتے ہوئے نظر انداز کررہی تھی یا شاید آمنہ کو ایسا لگ رہا تھا مگر جو بھی تھا پچھلے کچھ دنوں سے عبیر کا سعادت سے بات کرنا آمنہ کو خاصا ڈسٹرب کررہا تھا جیسے کہ اب بھی رات کے اس سمے عبیر کا کمرے سے باہر جانا اور سعادت کو کھانا دینا آمنہ کو بالکل پسند نہ آیا تھا اور اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ عبیر کو اس مسئلہ پر اچھی طرح کھل کر سب کچھ سمجھا دے گی۔

آج دوسرا دن تھا سعادت کو گھر واپسی پر آمنہ اپنے انتظار

میں جاگتی ملتی چونکہ ارشد جلدی سو جاتا تھا اسی لیے گرتی پڑتی آمنہ ہی اسے کھانا گرم کر کے دیا کرتی عمیر کو وہ صبح اس وقت دیکھتا جب وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو کر باہر وین کا انتظار کر رہی ہوتی اس کے علاوہ تو ایسا تھا وہ خود بھی سارا دن گھر نہ ہوتا اور جب رات گئے واپس آتا تو شاید وہ سو چکی ہوتی لیکن جو بھی تھا آج وہ آمنہ سے عمیر کی بابت دریافت کیے بنا نہ رہ سکا۔

"تم تو رات جلدی سونے کی عادی ہو پھر کیوں میرے لیے اتنی دیر تک جاگتی رہتی ہو عمیر کہاں ہے؟ اس سے کہا کرو مجھے کھانا گرم کر کے دے دیا کرے۔" بظاہر سعادت کا لہجہ بالکل عام سا تھا مگر جانے کیوں آمنہ چونک اٹھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا عمیر کو اس گھر میں آئے لگ بھگ دس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اتنے عرصے میں سعادت نے کبھی اس کی غیر موجودگی کا ایسے نوٹس نہ لیا تھا جیسے کہ آج' یا شاید بیماری نے آمنہ کے دل کو شکی کر دیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عمیر کی خوبصورتی اور جوانی نے دیگر ماؤں کی طرح اسے بھی محتاط کر دیا تھا لیکن جو بھی تھا اسے آج پتہ چلا کسی کی اولاد کو پال کر اپنے گھر میں جوان کرنا کتنا مشکل کام ہے بے شک آپ اسے اپنی سگی اولاد ہی کیوں نہ سمجھے پھر بھی لے پالک رشتوں میں محرم اور نامحرم کا چکر ضرور آ جاتا ہے وہ بھی اس صورت میں جب گود لیا جانے والا بچہ ساری حقیقت جانتا ہو یہی وجہ تھی جو ہمارے دین میں لے پالک کی کوئی گنجائش نہ تھی جسے جانتے ہوئے بھی ہم عمل کرنے کو تیار نہ تھے' وہ سوچوں میں گم تھی جب سعادت بول اٹھا۔

"میں نے کوئی اتنی مشکل بات تو نہیں کر دی جو تم اس طرح سوچوں میں گم ہو گئیں' سعادت آمنہ کے پرسوچ چہرے کو تاڑتا ہوا بولا' اس کی بات سن کر آمنہ جیسے چونک اٹھی۔ "ایسی بات نہیں ہے' دراصل اس کے امتحانات شروع ہونے والے ہیں اس لیے رات دیر تک جاگ کر پڑھائی کرتی ہے تو میں نہیں چاہتی کہ وہ ڈسٹرب ہو۔" اپنے تئیں اس نے سعادت کو مطمئن کر دیا جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا وہ جو کہتے ہیں نا کہ جب کسی بات پر پابندی لگا دی جائے تو اس کی جستجو بڑھ جاتی ہے تو بالکل ایسا ہی عمیر پر لگائی جانے والی پابندی اس کے ساتھ ساتھ سعادت کو بھی کھل رہی تھی۔ دونوں سمجھ نہ پا رہے تھے کہ آمنہ کو کس طرح نیچا دکھایا جائے جس کا موقع انہیں ایک دن قدرت نے خود ہی فراہم کر دیا۔

آج صبح سے ہی آمنہ کا بلڈ پریشر بہت ہائی تھا جس کی میڈیسن لے کر وہ جو سوئی تو سعادت کے بیل بجانے پر بھی اس کی آنکھ نہ کھلی' جبکہ عمیر نے ایک دو بار اسے جگانے کے لیے ہلکی آواز میں پکارا بھی مگر جواب نہ پا کر وہ خود ہی کمرے سے باہر نکل گئی اور اتنے دنوں بعد سعادت اسے اپنے سامنے دیکھ کر جہاں حیران ہوا وہاں ایک انجانی اور کمینی سی خواہش بھی اس کے چہرے پر بہار بن کر چھا گئی۔

"زہے نصیب آج پری کی جان اس بوڑھی جادوگرنی سے کیسے چھوٹ گئی۔" وہ عمیر کے خوبصورت سے چہرے کو دیکھتے ہوئے کھل کھلایا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ پھپھو جادوگرنی ہیں؟" جواباً عمیر نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں میں تمہیں پری کہہ رہا ہوں۔" عمیر سے بات کرنے میں سعادت کو مزا آ رہا تھا۔

"اچھا پھر ٹھیک ہے۔" ہنستی ہوئی عمیر نے اس کے سامنے کھانے کی ٹرے لا رکھی۔

ویسے یہ تو بتاؤ تم اتنے دنوں سے غائب کہاں تھی؟ تمہاری پھپھو کا بیمار چہرہ دیکھ کر تو میرا جی ہی اوب گیا تھا۔" ٹرے اپنے سامنے کرتا وہ ایک ادا سے بولا۔

"پھپھو نے منع کیا تھا کہ جب آپ آئیں تو میں دروازہ نہ کھولوں۔" آمنہ کی سمجھائی ہوئی تمام ہدایات کو قطعی نظر انداز کرتی وہ جلدی سے بول اٹھی۔

"ہوں۔"

عمیر کے جواب نے سعادت کو حیران کر دیا۔

"کیوں کہ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں' شراب پیتے ہیں اسی لیے پھپھو کا کہنا ہے کہ مجھے آپ کے پاس نہیں جانا چاہیے۔" آمنہ کی ایک ایک بات اس نے سعادت کے سامنے کھول دی کیونکہ بڑی مشکل سے اسے آج یہ موقع ملا تھا کہ وہ سعادت سے بات کر سکے جسے وہ گنوانا نہ چاہتی تھی۔

"بڑی کوئی جاہل عورت ہے۔" غصہ سے سعادت نے آمنہ کو ایک بڑی سی گالی بھی دے دی۔ "میں شراب نہیں بیئر پیتا ہوں' ویسے بھی قیمتی شراب پی کر کوئی اپنے حواس نہیں کھوتا میں کوئی ٹھیلے سے لے کر کچی نہیں چڑھاتا۔"

غصہ کی زیادتی سے سعادت کی سانس پھول گئی۔

"آپ کچھ بھی پیتے ہوں مجھے کوئی اعتراض نہیں ویسے بھی بھلا آپ نے مجھے کیا کہنا ہے میں آپ سے نہیں ڈرتی۔" بھولے پن میں جو چالاکی چھپی تھی وہ سعادت نہ سمجھ سکا۔

"اچھا میں کل گولیوں کا ایک پتہ لا کر فریج میں رکھ دوں گا نکال لینا اور جب وہ جادوگرنی سونے لگے تو ایک گولی اس کے دودھ میں حل کر کے پلا دینا کیونکہ میں سونے سے قبل اس کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"

"اچھی طرح سمجھ گئی جیسے آپ کہیں گے ویسا ہی ہو گا بس کبھی پھپھو کو کچھ بتایئے گا مت ورنہ یقین جانیں میری خیر نہ ہو گی۔" مصنوعی خوف زدہ آواز کے ساتھ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ایک بہترین اداکارہ ہے۔

"وہی ہو گا جو یہ چھوٹی سی پری چاہے گی۔"

سعادت اس کے بالوں کی لٹ چھوتے ہوئے مسکرایا اور

پھر اس دن کے بعد سے وہ روزانہ رات آمنہ کو دودھ میں گولی گھول کر پلانا نہ بھولتی جس کے نتیجے میں آمنہ ایسی گہری نیند سوتی کہ لاکھ سعادت بیل بجاتا اس کی آنکھ ہی نہ کھلتی اور وہ کافی عرصہ تک یہی سمجھتی رہی کہ رات سعادت کی واپسی پر دروازہ ارشد کھولتا ہے نیز اسے کھانا بھی وہی گرم کر کے دیتا ہے اور اس جھوٹ کے لیے سعادت نے ارشد کو بھی ساتھ شامل کر لیا تھا۔

آمنہ کی آنکھ کھلی تو صبح کے نو بج چکے تھے عبیر کالج جا چکی تھی بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتی وہ اٹھ بیٹھی پاس رکھی گھنٹی بجائی تاکہ ارشد اس کا ناشتہ لے آئے ویسے بھی آج کئی دنوں سے وہ صبح جب بیدار ہوتی تو سر جانے کیوں اتنا بھاری ہو جاتا کہ جاگنے کے بعد بھی کافی دیر تک اسے کوئی سدھ بدھ ہی نہ رہتی اس کے لیے سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ اس کی نماز فجر قضا ہو جاتی جس کا ملال وہ سارا دن اپنے دل پر محسوس کرتی یہی سوچتی پاؤں میں چپل پھنسائے وہ باتھ روم کی جانب بڑھی ہی تھی کہ پاؤں کے نیچے کوئی چیز آ کر چرچرائی آمنہ نے دیکھا وہ گولیوں کا خالی پتہ تھا لیکن یہ وہ گولیاں نہ تھیں جنہیں وہ استعمال کرتی تھی یہ پتہ کہاں سے آیا؟ جھک کر پتہ اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا پھر الٹ پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا وہ کوئی سکون دلانے والی میڈیسن کا پتہ تھا آمنہ کو حیرت نے آن گھیرا ایسے کسی پتے کا اس کے کمرے میں کیا کام اس کے دماغ میں کچھ کلک ہوا اور وہ ایک بار پھر سے شک کی کیفیت کا شکار ہو گئی جس کا مرکزی کردار سعادت اور عبیر تھے اسے محسوس ہوا گھر میں کچھ غلط ہو رہا ہے جسے جاننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ آج رات سوتے وقت دودھ کا وہ گلاس ہرگز نہ پیے جو روزانہ بستر پر جانے سے قبل عبیر اسے دیا کرتی تھی اور پھر رات اس نے ویسا ہی کیا عبیر کا دیا ہوا دودھ نظر بچا کر اپنے قریب موجود خالی گلدان میں انڈیل دیا یہاں تک کہ اس نے اپنی روز مرہ کی میڈیسن کی رات والی خوراک بھی استعمال نہ کی مبادا گہری نیند اسے اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔

دروازے پر بجنے والی گھنٹی دوسری بار سنائی دی عبیر نے اپنی گردن اٹھا کر آمنہ کے پلنگ پر ایک نظر ڈالی جہاں وہ گہری نیند میں ڈوبی دکھائی دی پھر بھی احتیاط ضروری تھا یہی سوچتے ہوئے اسے روزمرہ کی طرح آمنہ کو آواز دینا ضروری سمجھا۔

"پھپھو.....پھپھو....." جواب ندارد اب وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ چلتی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اس کے باہر نکلتے ہی آمنہ نے اپنی موندھی ہوئی آنکھیں کھول کر پورے کمرے کا جائزہ لیا جو عبیر کے وجود سے خالی تھا اس کا دل صدمہ سے نڈھال ہو گیا کچھ دیر بستر پر لیٹ کر اس نے انتظار کیا شاید عبیر بیرونی دروازہ کھول کر واپس آ جائے لیکن لاحاصل ......جانے والی ابھی تک لوٹ کر نہ آئی تھی۔ مطلب باہر کوئی ایسا کھیل کھیلا جا رہا تھا جس سے آمنہ لاعلم تھی جو بھی تھا اسے اپنی یہ غلط فہمی ہر حال میں دور کرنا تھی یہی سوچتے ہوئے وہ نہایت خاموشی سے اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی مبادا کوئی ایسی آواز نہ پیدا ہو جائے جو باہر والوں کو ہوشیار کر دے یہی سوچتے آمنہ نے دھیرے سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا سامنے ہی صوفے پر سعادت کے پہلو میں عبیر بیٹھی دور سے ہی دکھائی دے رہی تھی جس کے چہرے پر چھائی شوخی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ دونوں کی اس قدر نزدیکی ہرگز ویسی نہ تھی جو کسی محرم رشتہ کے درمیان پائی جاتی ہے آمنہ کا دل ڈوب گیا مارے صدمے اس کا پورا وجود لرز اٹھا بڑی مشکل سے اس نے اپنے حلق سے ابھرنے والی چیخ کو قابو میں کیا عبیر کے قریب ہی صوفہ پر ایک شاپنگ بیگ دھرا تھا جس میں شاید کوئی ایسا تحفہ تھا جو سعادت اس کے لیے خرید کر لایا تھا جسے دیکھ کر عبیر کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑا تھا اب مزید کچھ دیکھنے کی ہمت آمنہ میں ختم ہوئی اس نے آہستگی سے دروازہ واپس بند کر دیا اور اپنے قدم گھسیٹتی بمشکل بستر تک آئی اور پھر بستر پر گرتے ہی سسکیوں کے ساتھ اس نے جو رونا شروع کیا تو آنسوؤں کے راستہ دل کی جیسے ساری بھڑاس بہہ نکلی اتنا بڑا دھوکہ کوئی کسی کو کیسے دے سکتا ہے وہ بھی اپنے سگے رشتے جن میں ایک طرف شوہر اور دوسری جانب سگی بھتیجی تھی جسے اس نے ہمیشہ اپنی سگی اولاد ہی سمجھا اسے ایسے دھوکہ دے گی یقین ہی نہ آیا آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود آمنہ کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ عبیر ہی تھی اور پھر روتے ہوئے اس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا اور وہ فیصلہ تھا عبیر کو واپس اس کے والدین کے حوالے کرنے کا اور وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد یہ کام سرانجام دے اس سے قبل کہ کوئی بدنامی اس کے دروازے پر عبیر کی شکل میں دستک دے بہتر تھا اسے اس کے اصل وارثوں کے حوالے کر دیا جائے اور اسی میں ہی سب کی بھلائی تھی مگر اکثر ایسا ہوتا نہیں ہے کہ انسان جو سوچے وہ کام ویسے ہی ہو جائیں اور ایسا ہی کچھ آمنہ کے نصیب میں بھی لکھا جا چکا تھا جس سے وہ بے خبر تھی اس کی ایک وجہ شاید خدا کے بنائے ہوئے قانون کی روگردانی بھی تھی جو آمنہ سے ہوئی تھی۔

......☆☆......

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا پھپھو آخر ہم گاؤں کیا کرنے جا رہے ہیں؟ اور وہ بھی اتنے دنوں کے لیے؟" پریشان حال عبیر نے بھرے بھرے دو صندوق دیکھ کر آمنہ سے سوال کیا۔ "کتنے سال ہو گئے ہم گاؤں نہیں گئے تو اچھا ہے نا اب تمہاری سیکنڈ ایئر کی چھٹیاں ہوئی ہیں تو کافی وقت ہے ہمارے پاس کسی سے جا کر رہ لیں گے۔"

"مگر یہاں انکل کو کون دیکھے گا؟ ہمارے بنا تو وہ گھر میں اکیلے رہ جائیں گے؟"

عبیر کی بات سن کر آمنہ نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور نہایت غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم انکل کی فکر نہ کرو ان کے لیے ارشد ہے اور میرے ساتھ آ کر سامان پیک کرواؤ' کل رات کی فلائیٹ ہے اور ابھی ہماری تیاری ادھوری پڑی ہے۔" آمنہ کی بات سن کر عبیر سست روی سے اٹھ کھڑی ہوئی آمنہ نے دیکھا وہ چہرے سے ہی پریشان حال دکھائی دے رہی تھی اسے حیرت ہوئی ماں باپ سے ملنے کی ہلکی سی خوشی بھی اس کے چہرے پر دکھائی نہ دے رہی تھی شاید شہری آسائشوں کی عادی اپنا اصل فراموش کر بیٹھی تھی' ویسے بھی اکلوتی حیثیت سے پرورش پانے والی عبیر کے لیے ایک بھرے پرے گھر میں جا کر رہنا نہایت مشکل امر تھا اس سے زیادہ یہ فیصلہ آمنہ کے لیے بہت مشکل تھا کہ اتنے سالہ ساتھ کو دنوں میں ختم کر دینا مگر کیا کرتی وہ اس وقت بے حد مجبور ہو چکی تھی اگر ایسا نہ کرتی تو نتائج بھیانک صورت میں اس کے سامنے آتے جن سے خوف زدہ آمنہ کو اپنا دل پار کر عبیر واپس پہنچانی تھی وہ عبیر جسے آج تک اس نے اپنی بیٹی سمجھ کر پالا' لمحوں میں دوسروں کے حوالے کرنا آسان کام نہ تھا مگر یہ کام تو عبیر کی شادی کی صورت میں بھی ہونا ہی تھا تو کیوں نہ ابھی یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ عبیر کو بیاہ کر سسرال رخصت کر رہی ہے یہی سوچ کر اس نے اچھی خاصی رقم بھی اپنے ساتھ رکھ لی تا کہ اسے عبیر کی شادی کے اخراجات کے لیے عبداللہ کے حوالے کر دے کہ وہ کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر عبیر کو بیاہ سکے۔

☆☆......

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" آمنہ کے الفاظ تھے یا کوئی دھماکا جو عبداللہ اور اس کی بیوی کو اپنے آس پاس سنائی دے رہا تھا انہیں یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کہنے والی آمنہ ہے جو عبیر کو اپنی بیٹی بنا کر یہاں سے لے کر گئی تھی۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو عبداللہ میں بیمار رہتی ہوں' ایسے میں جوان بچی کی ذمہ داری نبھانا بہت مشکل ہو گیا ہے میرے لیے تو میں چاہتی ہوں کہ......"

"ایک بات بتاؤ اگر عبیر تمہاری سگی بیٹی ہوتی تو تم کیا کرتیں' کہاں پھینکتی اسے اپنی بیماری کی حالت میں۔"

یہ رابعہ تھی' عبداللہ کی بیوی' غصہ اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی چھلک رہا تھا۔

"میری سگی بیٹی کا باپ سعادت ہوتا جس سے مجھے وہ خطرہ نہ ہوتا جو اب ہے اور ظاہر ہے ماں کی بیماری میں باپ اپنی ذمہ داری نبھاتا جو کہ وہ اب نہیں نبھا رہا۔" آمنہ نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ہر بات سمجھانا چاہی اور ساتھ ہی اپنے بیگ میں موجود رقم کا لفافہ عبداللہ کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کچھ رقم ہے جو عبیر کے لیے ہے میں چاہتی ہوں تم کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دو۔"

"یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے جسے ہم خود حل کر لیں گے تم پریشان مت ہو۔"

عبداللہ نے اپنے سامنے موجود لفافہ کو ہاتھ لگائے بغیر برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ جواباً آمنہ خاموش رہی جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی قبول کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا جس میں آمنہ' عبداللہ' رابعہ اور عبیر سب شامل تھے ایسا سوچتے ہوئے وہ سعادت کو بالکل فراموش کر گئی جو اصل مسئلہ کی بنیاد تھا۔

سعادت کو یقین نہ آیا کہ دوسری طرف عبیر جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ ہے' آمنہ اپنی سوچ میں اس قدر گر بھی سکتی ہے اسے حیرت ہوئی اسے آمنہ پر اتنا شدید غصہ آیا کہ اگر وہ سامنے ہوتی تو جانے وہ اس کا کیا حشر کرتا' ایک ہی پل میں اس عورت نے اس کی عزت اتار کر پھینک دی تھی' اس سوچ نے سعادت کا دماغ اس بری طرح جکڑا کہ وہ غم و غصہ کی کیفیت میں گھرا انتقام کی آگ میں اتاؤلا ہو گیا سچ تو یہ ہے کہ معاملہ اتنا خراب نہ تھا جتنا اسے آمنہ کے بلاوجہ کے شک نے کر دیا تھا اور اب سعادت کے ساتھ ساتھ عبیر کے دماغ میں بھی صرف ایک ہی خیال تھا کسی طرح آمنہ کو ذلیل کیا جا سکے یہی سوچ کر سعادت نے عبیر کو تسلی دی۔

"تم فکر نہ کرو' میں جلد ہی تمہارے ابو سے بات کروں گا اور مجھے امید ہے کوئی بہتری کا راستہ نکل آئے گا۔"

فون بند کر کے اس نے بہت سوچا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے اس مسئلہ پر عبداللہ کو اپنے اعتماد میں لینا ہو گا جس کی کم عمر بچی کو بلاوجہ آمنہ نے بدنام کرنا شروع کر دیا ہے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ آمنہ کی کراچی واپسی سے قبل ہی عبداللہ کو فون کر لیا جائے اور پھر اسی رات اس نے عبداللہ کو فون کر دیا جو سعادت کی بات سن کر ہکا بکا ہو گیا۔

☆☆......

"میرا خیال ہے کہ اس میں سوچنے والی کوئی بات نہیں ہے آخر ہم نے ایک دن اس کی شادی تو کرنی ہے تو پھر کیوں نہ ابھی کر دی جائے ویسے بھی اتنا اچھا رشتہ نصیب سے ہی ملتا ہے۔"

آہستہ آواز میں بولتی رابعہ اپنے شوہر کے مزید نزدیک ہو گئی۔

"نیک بخت یہ بھی تو سوچ آمنہ کیا کہے گی؟"

"اس نے کیا کہنا ہے ہماری بیٹی ہے جو فیصلہ ہم کریں اس کے لیے وہی بہتر ہو گا پہلے آمنہ کے کہنے پر آ کر بچی اس کے حوالے کر دی کیا نتیجہ ملا' اپنے ماحول کا عادی کر کے اسے یہاں لا کر پھینک دیا سمجھو ہمارے منہ پر دے مارا' یہ ہے تمہاری بہن۔"

"اچھا اب تم چپ ہو جاؤ مجھے کچھ سوچنے دو۔" عبداللہ کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ نیم رضا مند ہے' جس کی مثال اس لمحہ ایک ایسے لوہے جیسی تھی جو ہلکی سی ضرب لگانے پر ٹوٹ

جاتا ہے اور ضرب اب عمیر کو لگائی تھی جس کے لیے وہ اسے ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔

☆☆☆......

عمیر دو دن سے گھر نہ تھی آمنہ کو حیرت ہوئی یہی وجہ تھی کہ وہ رابعہ سے پوچھے بنا نہ رہ سکی ویسے بھی وہ عمیر کی بہت زیادہ عادی تھی اس لیے اس کی غیر موجودگی جلدی محسوس کر لی۔

"عمیر کہاں ہے؟"

"اپنی خالہ کے گھر رہنے گئی ہے۔" رکھائی سے جواب دیتی رابعہ اندر کمرے میں چلی گئی اور پھر جب تک آمنہ گاؤں میں رہی عمیر واپس نہ آئی جس کی واپسی کا وہ روزانہ رابعہ سے پوچھتی ضرور جبکہ رابعہ اسے کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے پاتی اور اسی طرح عمیر کی واپسی کا انتظار کرتی وہ شہر واپس آ گئی لیکن عمیر سے ملاقات نہ ہو سکی البتہ اپنی واپسی کی اطلاع اس نے سعادت کو فون کر کے دے دی تھی جس کا رویہ ہمیشہ کی طرح بہت روکھا تھا پھر بھی آمنہ کو امید تھی کہ وہ اسے لینے ایئر پورٹ ضرور آئے گا مگر ایسا نہ ہوا اور ٹیکسی کروا کر اسی طرح گرتی پڑتی وہ اپنے گھر پہنچ گئی اسے امید تھی کہ عمیر کے بنا گھر کی تنہائی اسے جینے نہ دے گی مگر کیا کرتی مجبوری تھی اس کا یہ فیصلہ عمیر کے حق میں بہتر تھا اور اپنی اولاد کی بہتری کے لیے ہر ماں ایسا ہی قدم اٹھاتی ہے جس پر آمنہ کو کوئی افسوس نہ تھا یہی سب سوچتے ہوئے اس نے دروازے کے لاک میں چابی پھنسا کر گھمائی تو پتہ چلا دروازہ اندر سے بند ہے شاید گھر میں ارشد تھا یہی سوچتے ہوئے اس نے گھر کی گھنٹی بجائی مگر دروازہ کھول کر باہر نکلنے والی شخصیت کو دیکھ کر آمنہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کھڑے قد سے زمین پر آن گری ہو۔

"تم یہاں کیسے؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟" باہر نکلنے والی یقیناً عمیر تھی جس کی اپنے گھر میں موجودگی نے جیسے آمنہ کو بدحواس کر دیا جواباً عمیر صرف مسکرائی رہی آمنہ نے دیکھا وہ خوب تیار تھی نیا جوڑا اور نک سک سے کیا گیا میک اپ اسے اپنی عمر سے دوگنا بڑا ظاہر کر رہا تھا ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور کان میں لٹکتے آویزے۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں؟" اندر داخل ہوتی آمنہ نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"اور اگر یہی سوال میں آپ سے کروں کہ آپ یہاں کیوں آئی ہیں تو کیسا لگے گا آپ کو؟" عمیر کے بدلے بدلے انداز گفتگو نے آمنہ کو چونکا دیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم؟" وہ ہانپتے ہوئے چلائی۔

"بکواس نہیں سچ کہہ رہی ہے یہ تم یہاں کیوں آئی ہو جبکہ میں تمہارا طلاق نامہ دو دن قبل ہی بھیج چکا ہوں۔" یہ آواز سعادت کی تھی سفید کلف والی شلوار قمیص میں تازہ رنگے بالوں کے ساتھ وہ خاصا ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا ویسے بھی آمنہ اس سے تین سال بڑی تھی اور اب بیماری کی حالت میں تیرہ سال بڑی دکھائی دے رہی تھی اسے یقین نہ آیا کہ یہ الفاظ سعادت کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔

"میں تمہاری بات بھی نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

طنزیہ ہنستی عمیر کے چہرے سے بمشکل نظریں چرا کر آمنہ نے قریبی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا اسے خدشہ تھا کہیں وہ زمین پر ہی نہ گر جائے۔

"میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں میرا خیال ہے اب تو تمہیں میری بات سمجھ آ گئی ہو گی یا پھر سے کہوں؟"

"پلیز سعادت خاموش ہو جاؤ مت کرو میرے ساتھ ایسا مذاق جس سے میں مر جاؤں۔"

وہ آواز کے ساتھ رو رہی تھی۔

"یہ مذاق نہیں سچ ہے آمنہ اور اس کے لیے مجھے تم نے مجبور کیا وہ سب جو ہمارے دل و دماغ میں بھی نہ تھا اسے تم نے ہمارے ذہنوں میں جگہ دی تمہارے شک نے ہم سے وہ سب کروا دیا جو عام حالت میں شاید کبھی نہ ہو پاتا اور سوری تمہیں طلاق دینا میری مجبوری تھی کیونکہ ایک وقت میں پھوپھی اور بھتیجی نکاح میں نہیں رکھی جا سکتیں۔ دوسری صورت میں عمیر تمہاری بھتیجی نہ ہوتی تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا بے شک تم اس گھر کے ایک کونے میں پڑی اپنی زندگی کے دن گزار دیتیں لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تمہیں ابھی اور اسی وقت یہاں سے واپس جانا ہوگا عبداللہ سے میری ساری بات ہو چکی ہے وہ تمہیں اپنے گھر میں رکھ لے گا جس کے لیے اسے ہر ماہ میں ایک معقول رقم بھیج دیا کروں گا۔"

وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا جسے آمنہ نے نہ سنا اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سارے محلے کے گھروں کی کھڑکیوں سے لوگ جھانک رہے ہیں اس پر ہنس رہے ہیں اسے اپنے چاروں طرف ہنسی کی آوازیں سنائی دیں آمنہ نے گھبرا کر اپنا منہ چادر میں چھپا لیا اور تیز تیز چلتی مین روڈ پر آ گئی...... نہیں جانتی تھی کہ اب اس کی منزل کہاں ہے لیکن یہ طے تھا کہ اسے کسی بھی حال میں عبداللہ کے گھر نہیں جانا بہت سال قبل اپنے رب کے حکم سے روگردانی کرتے ہوئے اس نے ایک بچی گود لیتے سے یہ نہ سوچا تھا کہ اس عمل کی سزا اتنی کڑی ہو گی یا یہ اس کے شک کا نتیجہ تھا جو بھی تھا اسے ملنے والا نقصان ناقابل تلافی تھا جس کی تلافی شاید اس کی موت کی صورت میں ہی ہوتی جس کے لیے جانے اسے کتنا انتظار کرنا تھا یہی سوچتے ہوئے اس کے قدم ایدھی سینٹر کی جانب اٹھ گئے اور یہی شاید ہر بے گھر کی عورت کی منزل تھی۔



خواب

یاسین صدیق

خواب دو طرح کے ہوتے ہیں نیند کے دوران دیکھے جانے والے خواب بیداری کی حالت میں دیکھے جانے والے خواب ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ خواب انسان کی دبی ہوئی خواہشات کے عکاس ہوتے ہیں جو کچھ انسان عملی زندگی میں حاصل نہیں کر سکتا اسے خوابوں میں حاصل کرتا ہے۔

ایسے ہی ایک خواب کی روداد، معروف ادیب یاسین صدیق کے قلم سے





خواب سرمایہ حیات ہوتے ہیں۔خواب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک تو وہ جو دوران نیند دیکھے جاتے ہیں۔دوسرے کھلی آنکھوں سے آنکھوں میں سجائے جاتے ہیں۔نیند کے دوران دیکھے جانے والے خواب ٹوٹ جاتے ہیں اوران کے ٹوٹ جانے کا انسان کو دکھ نہیں ہوتا۔مگر جو خواب انسان بیداری کی حالت میں دیکھتا ہے یا اپنی آنکھوں میں سجاتا ہے۔وہ ٹوٹ جائیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔اتنا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری زندگی تلف ہو گی ہو۔میں نے بھی بہت سے خواب آنکھوں میں سجائے تھے۔ان میں سے ایک خواب تھا!کلثوم کو اپنا شریک حیات بنانے کا۔

دبلی پتلی ،لمبے قد ،کتابی چہرہ، گلابی رنگ ،غزالی آنکھیں، چاندی کے دانت ،سونے کا بدن رکھنے والی کلثوم کو اپنا بنانے کا خواب ۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کوئی خواب اتنی شدت سے نہ دیکھا تھا۔اس سے پہلے اس طرح کوئی آنکھوں کو بھایا ہی نہ تھا۔دل میں سمایا ہی نہیں تھا۔کچھ عمر بھی ایسی ہی تھی ۔اٹھتی جوانی یہ ہی کوئی سترہ برس تو ہوگی۔دسویں جماعت کا طالب علم تھا، شوخ چنچل، آزاد، کوئی غم ہی نہیں تھا،اب سوچتا ہوں کتنی اچھی تھی وہ زندگی۔خواب سی لگتی ہے۔ایسے دن بھی تھے کبھی زندگی میں صبح اٹھے، نماز پڑھنے چلے گئے ، ان دنوں مجھے یوگا کی مشقیں کرنے کا جنون تھا۔آلتی پالتی مار کر شمال رخ منہ کر کے تنفس کی مشقیں کرنا، میں نے یوگا کے موضوع پر ڈھیروں کتابیں خریدی تھیں اوران پر عمل بھی کیا کرتا تھا، شاید میرے ہر وقت خوش رہنے کا نکھرے نکھرے چہرے کا سبب یہی ہو، میں اسکول جاتا ، لائبریری سے کتابیں پڑھتا اور بس یہی میرے مشغلے تھے،کوئی خواب نہ تھا۔کوئی پریشانی نہ تھی۔کوئی دکھ نہیں تھا۔کوئی چاہت نا تھی۔کوئی منزل نہ تھی۔

پھر وہ دن آیا۔کاش وہ دن نہ آیا ہوتا،ایسا ہوتا نہیں ہے۔ایسے دن آ ہی جاتے ہیں۔کاش ایسا نہ ہوا ہوتا تو آج زندگی یکسر مختلف ہوتی ۔ وہ ایک عام سا دن تھا۔ دوسرے دنوں کی طرح سورج طلوع ہوا تھا۔میں اسکول سے واپس گھر آیا تو پتہ چلا کہ ہمارے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔میرے خالو صفدر علی ان کی زوجہ عائشہ بی بی ایک بیٹا ابوبکر جو میرا ہم عمر تھا کلاس فیلو بھی تھا۔کہتے تھے کہ ابوبکر جب پیدا ہوا تو بہت بیمار تھا بڑے تعویز دھاگوں سے جا کر بچا تھا اور ایک تھی کلثوم۔یہی کوئی سولہ برس کی ہوگی۔اس نے فراک پہنی ہوئی تھی۔اس فراک پر سفید اور سرخ رنگ کے پھول تھے،وہ خود بھی پھول ہی تھی ۔وہ میرے بھائی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔مجھے دیکھا تو چپ ہوگی، میں تو بس اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

اسے سلام کرنا بھی یاد نہ رہا تھا۔جب اسے خیال آیا تو وہ بوکھلائی ہوئی اٹھی اور مجھے سلام کیا،میری تو زبان ہی نے میرا ساتھ نہ دیا۔

بس اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔اس نے دوبارہ سلام کیا تو مجھے ہوش آیا تھا۔میں نے جلدی جلدی اس کے سلام کا جواب دیا۔پھر مجھ سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا۔میرا دل گھبرا رہا تھا۔مجھے پیاس لگی ہوئی تھی۔نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔خالو نے مجھے اپنے سینے سے لگایا تو کچھ سکون محسوس ہوا خالو کہتے رہے۔

”واہ بھی واہ۔خرم تو گھبرو ہو گیا ہے تین سالوں میں بڑا قد نکالا ہے۔“

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”کس کلاس میں ہو“ انہوں نے مجھے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔میں نے دسویں کلاس بتائی۔

انہوں نے میری پیٹھ تھپکی اور کہا ”شاباش تم خاندان کا نام روشن کرو گے۔“

خالو صفدر ایسے ہی تھے زندہ دل ،ہنس مکھ۔انہوں نے چھوڑا تو خالہ عائشہ نے میری بلائیں لیں،ماتھا چوما۔ابوبکر تو میرا ہاتھ پکڑے بیٹھ گیا،اور اپنے گاؤں سلطان آباد اور شہر فیصل آباد کے قصے سنا تا رہا۔میں ہوں ،ہاں کرتا رہا اور کلثوم کو دیکھتا رہا۔وہ گھر میں اڑتی پھرتی تھی ، کسی گڑیا کی طرح دل چاہا اسے ایک جگہ کھڑی کردوں اور بس دیکھتا رہوں۔

میرے تایا کی بیٹی رقیہ کی شادی تھی اور ابھی چار دن باقی تھا۔ابوبکر کی منگنی میری تایا زاد بشریٰ سے ہوئی تھی

۔یعنی ابوبکر اپنے ہونے والے سسرال جا رہا تھا۔ ہم اس وجہ سے اسے مذاق کا نشانہ بناتے رہے۔ ہمارا گھر پہلے آتا تھا اس لیے وہ پہلے ہمارے ہاں آگئے تھے۔ ابا جان کی تایا جان سے کچھ ناراضی تھی۔ اس لیے ہم نے شادی میں شرکت تو کرنا تھی۔ مگر شادی کے دن صبح جانا تھا اور شام کو آ جانا تھا۔ میں نے سوچا کاش تایا جان سے ابا جان کی لڑائی نہ ہوئی ہوتی تو ہم بھی چار دن پہلے چلے جاتے۔ مگر یہ تو صرف سوچا جا سکتا تھا۔ ایسا ممکن نہ تھا۔

رات ہوئی تو، ابا جان خالو اور خالہ جان تو بیٹھ کر خاندان بھر کی باتیں کرنے لگے کہ خاندان نے فلاں شادی پر فلاں بات کی تھی، اسے نہیں کرنا چاہیے تھی، ابا جان تایا جان کی اب تک تمام خامیاں نکال رہے تھے اور خالو جان چاہتے تھے کہ ابا جان اور تایا جان کی صلح ہو جائے۔ یہ موقع بہت اچھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جنوری کی سرد راتیں تھیں۔ کمرے میں الاؤ دہک رہا تھا۔ سب چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے دونوں بھائی حمید اور سعید کب کے بیٹھک میں سو گئے تھے میری بہن رابعہ اور کلثوم بیٹھی ہوئی بزرگوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ عورتوں کو دوسروں کے متعلق جاننے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ دونوں بڑے انہماک سے گفتگو سن رہی تھیں۔ جیسے ان سے امتحان لیا جانا ہو۔ ابوبکر ایک رسالہ پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔

سب سے برا حال میرا تھا۔ میں سب کے منہ تک رہا تھا، جو بھی بات شروع کرتا تو میں اس کو دیکھنے لگ جاتا۔ اس کی بات ٹوک کر دوسرا بات شروع کرتا تو میں اس کو دیکھنے لگ جاتا۔ اس دوران چپکے سے کبھی کبھی کلثوم کو دیکھ لیتا۔ اسے دیکھ کر دل میں ہلچل سی مچ جاتی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گی۔ آخر ابا جان نے ڈانٹ پلائی۔

''خرم جاؤ سو جاؤ کیا منہ تک رہو سب کے۔''

میں اٹھ کر بیٹھک میں آ گیا۔ بستر پر لیٹا تو دل چاہا پھر ان کے پاس چلا جاؤں اور کلثوم کو دیکھتا رہوں۔ عجیب بے چینی تھی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں تو سرِ شام ہی سو جایا کرتا تھا۔ آج نیند نہیں آ رہی تھی دل گھبرا رہا تھا، میں نے دو تین کروٹیں بدلیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سونے سے پہلے ورزش معمول تھی آج تو وہ بھی نہیں کی تھی نہ ہی نماز پڑھی تھی۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگا۔ اس کے بعد پھر لیٹ گیا۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ ایسے جیسے کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ کچھ چھن گیا ہو۔ میں نے خود پر بڑا ضبط کیا مگر سو نہ سکا تو اٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ کمرے میں ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ میں ٹہلتا رہا۔ خالہ جان کسی کام سے کمرے سے باہر آئیں، مجھے دیکھا تو پوچھا۔

''خرم تم جاگ رہے ہو۔''

مجھے ایسے لگا جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔

''نہیں۔ نہیں۔'' پھر اپنے بے تکے جواب کا خیال آیا تو جلدی سے کہا۔

''ہاں نیند نہیں آ رہی۔''

خالہ جان ہنس پڑیں، جیسے ان کو پتا ہو کہ میں کیوں جاگ رہا ہوں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی میں بیٹھک میں آیا اور رضائی اوپر تان لی۔ دل بھرا بھرا تھا، ایسے سوچتے ہوئے، سونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے رات گزرتی رہی، اس رات میں نے سونے سے پہلے جاگتی آنکھوں سے زندگی کا پہلا خواب آنکھوں میں سجایا تھا۔ کلثوم کو اپنا بنانے کا خواب۔ اور پھر علم نہیں کب نیند آ گی تھی۔



دوسرے دن صبح صبح ناشتے کے بعد ابوبکر وغیرہ تایا جان کے گھر تانگے پر بیٹھ کر چلے گئے اور میں اسکول۔ دو دن بعد جمعۃ المبارک تھا۔ ان دنوں جمعۃ المبارک کو چھٹی ہوا کرتی تھی۔ تایا جان ہم سے تین چار کلومیٹر دور ایک ڈیرہ میں رہتے تھے۔ یہ ساہیوال کے نزدیک ہی ایک گاؤں تھا۔ مگر اس سے پہلے ہمارا گاؤں آتا تھا۔ ہمارا گاؤں نام کا ہی گاؤں تھا۔ وہ تو اب شہر کا حصہ بن چکا تھا۔ ان دو دنوں میں نے بہت سے خواب دیکھے تھے کہ کلثوم ملی تو اسے یہ کہوں گا کہ تم بہت خوبصورت ہو، دل کش ہو، مجھے تم سے پیار ہے، میں نے سوچا تھا کہ

اسے ایک شعر بھی سناؤں گا۔

اجازت ہو تو لکھ لوں تیرا نام
ورق میرے دل کا سادہ ہے اب تک

میں نے تصور ہی تصور میں اس سے ڈھیروں باتیں کیں، وہ میرے سامنے کھڑی شرما رہی ہے۔ میری باتوں پر ہنس رہی ہے۔ایسے ہی دو دن گزر گے۔ جمعتہ المبارک کے دن میں نے سوچا مجھے ڈیرہ پر جانا چاہیے ۔میں نے امی جان سے اجازت مانگی۔

توانہوں نے کہا۔''چلے جاؤ لیکن اپنے ابو سے پوچھ لو۔''میں نے عرض کی۔''آپ ہی پوچھ دیں۔''

ابا جان ابھی کمرے میں ہی تھے۔جب میں نے سائیکل صحن میں نکال کر اس کی صفائی شروع کر دی۔امی جان ابو کے کمرے میں داخل ہوئیں تو میرا جسم کان بن گئے۔امی نے ابا جان کو بتایا کہ''خرم ڈیرہ پر جا رہا ہے۔''

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔اگر ابا جان نے انکار کر دیا تو۔۔۔آگے مجھ سے سوچا نہ گیا۔میں بے توجہی سے ہاتھ چلاتے ہوئے امی ابو کی باتیں توجہ سے سننے لگا۔ابا جان کی آواز آئی۔''جانے دو۔''میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔وہ ایک لمحہ رک کے پھر کہنے لگے۔''بچوں کو روکنے کا کیا فائدہ۔''

میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے، سائیکل تھوڑی دیر بعد ہواؤں سے باتیں کر رہا تھا۔تایا جان کی گلی میں آ کر جب ان کا گھر چند قدم کے فاصلے پر تھا میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔میں نے خود کو حوصلہ دیا اور ان کے گھر قدم رکھ دیا۔شادی میں ابھی دو دن باقی تھے۔مگر ایسے لگتا تھا جیسے آج ہی شادی ہو۔ گھر بھرا ہوا تھا تایا جان گھر میں نہیں تھے۔باقی سب ملے اور انہوں نے خوب آؤ بھگت کی۔تایا زاد بھائی کفیل، علیم عرف عالی اور ابوبکر تو خوشی سے نہال ہو گے۔تھوڑی دیر بعد میں نے ان سے کہا''ابھی تائی سے مل کر آیا۔''

تائی نے تو مجھے اپنے پاس ہی بیٹھا لیا۔خاندان کی کافی عورتیں وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔مجھے دیکھ کر سب ابا جان اور تایا جان کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔میں بور ہوتا رہا۔عورتوں کے پاس شاید باتیں کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا۔مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ابھی تک کلثوم نظر نہیں آئی تھی۔میرا دل چاہا خالہ عائشہ سے پوچھ لوں مگر پھر خود ہی ارادہ ملتوی کر دیا۔خدا خدا کر کے وہاں سے جان چھوٹی۔میں کافی دیر میں ادھر اُدھر گھومتا رہا اور سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔تایا جان کے گھر میں چار کمرے تھے۔تین میں اب تک دیکھ چکا تھا۔چوتھے میں محلے اور خاندان کی لڑکیاں جمع تھیں اور ان کی ہنسی کی آواز آ رہی تھیں۔میں نے سوچا وہاں کلثوم ہو گی۔میری تایا زاد بہن رقیہ کی شادی تھی اور سب لڑکیاں آپی رقیہ کے گرد جمع تھیں۔میں نے دھڑکتے دل سے کمرے میں قدم رکھ دیا''اللہ جی۔کون ہو تم۔''ایک لڑکی مجھ سے ٹکراتی ٹکراتی بچی اس نے غصے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے دل پر ہاتھ اور کلثوم پر نظر رکھتے جواب دیا اسے۔''خرم شہزاد''

لڑکیوں کے چہروں پر پھول کھل گے۔آپی رقیہ نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا ابوبکر کی منگیتر بشریٰ اور کلثوم رقیہ کی پشت پر کھڑی تھی، اس کی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔دو نقاب پوش لڑکیاں''اونہہ'' کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔

میں نے کلثوم سے پوچھا۔''کیسی ہو۔''اس نے کہا۔''ٹھیک ہوں۔''

ایک دو لمحے خاموشی کے آئے لڑکیوں نے سمجھا میں نے اب مل لیا ہے اس لیے اس کمرے سے جانا چاہئے لیکن میں ایسے کیسے چلا جاتا۔میں نے کلثوم کو دیکھا، وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

اس نے نظریں جھکا کر پوچھا۔''اور آپ کیسے ہیں۔''

میں نے کہا۔''خراب ہوں۔'' سب لڑکیاں ایک بار پھر کھل کھلا کر ہنس دیں۔کلثوم شرم سار سی ہو گئی۔ایک بار پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔اس کا صاف مطلب تھا کہ مجھے اب جانا ہو گا۔میں ٹھنڈی آہ بھر کر کمرے سے

باہر نکل آیا۔ برآمدے میں آ کر مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی اب کیا کروں۔ صحن میں تائی اور دوسری عورتیں تھیں ، بیٹھک میں تایازاد بھائی اور ان کے دوست ، دوسرے کمروں میں رشتے دار جو دوسرے شہروں سے آئے تھے ۔میرا تو کہیں جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے میں نے ایک ستون سے ٹیک لگا دی۔ اس گھر میں سب خوش تھے ۔شادی والا گھر جو تھا۔ لفظ شادی کا مطلب ہی خوشی ہوتا ہے۔ یہ سب جو قہقہے بکھیر رہے تھے اندر سے سب غمگین تھے۔ عارضی طور پر سب اپنے اپنے غم بھول کر خوشی منا رہے تھے۔ لیکن میں اداس تھا۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کی آواز نے خیالات سے باہر نکالا۔ ’’آپ کب آئے۔‘‘

یک دم میں گھوما میرے سامنے وہ کھڑی تھی۔ میری شوخی ایک پل میں پلٹ آئی۔ ’’سولہ سال پہلے۔‘‘

اُسے میری بات کی دیر سے سمجھ آئی۔

میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں کیسے کہہ دیتا کہ تم کو دیکھ کے میں خود سے بیگانہ ہو گیا ہوں۔ دو تین راتوں سے میں تیرے سپنے دیکھ رہا ہوں، میں تم کو اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ میں یہ سب کچھ سوچ کے ہی رہ گیا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ خوف اور جھجک نے میرا دامن تھام لیا۔

مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ اب اگر یہ وقت گزر گیا تو پھر شائد کبھی وقت نہ ملے۔ ایسا وقت جس میں صرف ہم دونوں ہوں۔ وہ بھی چپ تھی، کافی وقت گزر گیا آخر مجھ سے ضبط نہ ہوا، میں نے دھڑکتے دل سے اُسے پکارا ۔’’کلثوم۔‘‘

اس نے مختصر جواب دیا ’’جی‘‘ مجھ سے مزید کچھ نا کہا گیا۔

مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ خاموشی جان پر آ گئی تھی۔ وہ بھی خاموش تھی۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ میں نے ہمت کر کے اسے پھر پکارا۔ ’’کلثوم‘‘

میری آواز رندھی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا لہجہ خود اجنبی سا لگا اس نے پھر ’’جی‘‘ کہا۔ اب کے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی۔

میں نے ڈوبتے دل سے کہا۔ ’’میں۔۔میں۔۔تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

وہ چپ رہی، لیکن مسلسل مجھے دیکھتی رہی میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اس کا دیکھنا دیکھا نا گیا ، میں دوبارہ گویا ہوا۔ ’’سابقہ دو دن سے میں تم سے یہ بات کرنا چاہتا ہوں‘‘

یہ کہہ کر میں نے اسے دیکھا اور مزید کچھ کہنے کی ہمت کھو دی۔ اس کی آنکھوں میں رنگ تھے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھ سے کافی دیر کچھ نہیں کہا گیا۔ اس وقت وہ دو نقاب پوش لڑکیاں جو میرے کمرے میں جانے پر کمرے سے نکل گئیں تھیں دوبارہ آ گئیں۔ ہمارے پاس سے گزریں۔ اپنے اندر اس دوران میں نے ہمت پیدا کی ،خود کو دلاسا دیا۔ کلثوم نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے ٹٹولتی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

جیسے ہی وہ لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں اس نے کہا۔ ’’میں بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔‘‘

میں نے جھٹ پوچھا ’’کیا‘‘۔

’’پہلے آپ بتائیں۔‘‘ اس نے کھلکھلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

’’کیا تم جانتی ہو کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’مجھے علم ہے۔‘‘ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرا دل اوپر نیچے ہو رہا تھا جو بات کہنا چاہتا تھا۔ وہ بات اسے معلوم تھی۔ اب اور اسے کیا کہنا تھا۔ میرے پاس کہنے کے لیے بچا کیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

’’کیا پتہ ہے‘‘ وہ ہنس پڑی۔ میرے اردگرد جلترنگ سے بج اٹھے۔ اسی وقت تائی نے مجھے آواز دی ۔وہاں خالہ عائشہ تھیں ہم دونوں اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے پھر ہم نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ وہ چوری چوری مجھے دیکھتی رہی۔ یہی حال میرا تھا۔ جب اس سے نظر ملتی تو وہ نظر جھکا لیتی۔ وقت گزرتا رہا۔ میں تایا زاد بھائیوں کے پاس دو تین گھنٹے بیٹھا رہا انہوں نے مجھ سے کہا کہ ’’میں شادی سے ایک دن پہلے آ جاؤں‘‘ میں نے ہامی بھر لی شام سے ذرہ پہلے میں نے واپسی کی

تیاری کر لی۔ سب سے اجازت لے کر بوجھل قدموں سے گھر کی راہ لی۔ واپسی کا سفر طویل ترین ہو گیا تھا ۔ ہمارا گاؤں ہی نہیں آ رہا تھا۔ سارے راستے میں خود کو ملامت کرتا رہا کہ اسے سب کہہ دینا چاہیے تھا جو سوچتا رہا ہوں۔

شادی کا دن آیا۔ گزر گیا۔ خوب ہلا گلا رہا۔ اس میں یادگار وہ گانا تھا جس پر کلثوم اور بشریٰ نے ڈانس کیا تھا ۔ اور دونوں نے مجھے دیکھ دیکھ کر میرے سامنے، مجھے سنا سنا بلکہ دکھا دکھا کر کیا تھا۔ یہ شادی سے پہلے کی رات تھی ۔ سردی اپنے جوبن پر تھی ۔ ہم سب کزن دائرہ بنا کر کھڑے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے ۔ جب کلثوم اور بشریٰ اپنی کمر پر اپنا اپنا ڈوپٹہ باندھ کر آئیں ابوبکر کی منگیتر بشریٰ نے میرا بازو پکڑا مجھے دائرہ میں کھڑا کر دیا ابوبکر زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔

لٹھے دی چادر اتے سلیٹی رنگ ماہیا
آ بہہ سامنے کولوں دی رس کے نا لنگ ماہیا
وے ہیرے توں سٹیاں رسیاں
تساں پوچھیاں تے نا اساں دسیاں
لٹھے دی چادر اتے سلیٹی رنگ ماہیا

میں شرمسار کھڑا رہا۔ پہلے مجھے جو سردی کا احساس تھا رفتہ رفتہ وہ ختم ہو گیا۔ انہوں نے بل کھا کر کمر لہرا کر جیسے ڈانس کیا۔ دل اوپر نیچے ہوتا رہا۔

دوسرے دن شادی کے بعد شام کو خالو صفدر وغیرہ ہمارے ساتھ ہی ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ صبح پانچ چھ بجے چلے جائیں گے صرف ایک رات باقی تھی ، سب کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے میں اٹھ آیا۔ میرے پیچھے ابوبکر بھی اٹھ آیا۔ ہم دو تین گھنٹے بیٹھے باتیں کرتے رہے ۔ ہمارے خیالات ملتے تھے ۔ اس لیے دل بھی مل گئے ۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

حمید وسعید نے ابوبکر کو آواز دی تو وہ اٹھ کر چلا گیا ۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا "یہ ایک رات بھی کیا یوں ہی گزر جائے گی۔"

میری بے چینی بڑھ گئی۔ بیٹھک میں کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ اب اس سے کیسے بات کروں؟ ۔ کیا بات کروں؟ ۔ اور پھر اس کے بقول جو بات مجھے اس سے کرنا ہے۔ اسے معلوم ہے۔ کیا اسے واقعی معلوم ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے پھر بھی میں اس سے کہہ سکتا ہوں کہ تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گی۔ میں تم سے شادی کا خواہاں ہوں۔ مجھے اس سے یہ بھی کہنا چاہیے کہ میں تمہارے گھر آؤں گا، میرا انتظار کرنا۔ وہ مجھے خط بھی لکھ سکتی ہے۔ وہ نہم کی طالبہ ہے۔ ایسے ہی خیالات مجھے آتے رہے آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے کوئی نہ کوئی بات کرنا چاہیے۔ کیا خبر اسے کیا معلوم تھا اور میں کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔ پھر اسے بھی تو مجھ سے کچھ کہنا تھا۔ کم از کم اس سے یہ تو پوچھا جا سکتا تھا ۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ وہ سب بیٹھے تھے خالو جان شادی میں ہونے والی باتیں ابو جان کو بتا رہے تھے۔ درمیان میں خالہ عائشہ بھی معلومات کا اضافہ کر دیتیں۔ مگر وہاں کلثوم اور رابعہ نہیں تھیں۔ رابعہ کلثوم کو دوسرے کمرے میں صندوق سے نکال نکال کر کپڑے دکھا رہی تھی اور کلثوم تبصرے کر رہی تھی۔ پاس ہی سعید بیٹھا تھا اور ان کے کپڑوں کی خامیاں نکال رہا تھا۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا اور بڑی کوشش کی کہ کوئی بات کروں مگر، میری زبان پر کوئی بات نہیں آئی، ہر بات مجھے بے معنی سی لگتی۔

آخر کلثوم نے پوچھا۔ "خرم۔"

اس نے میرا نام لیا تو دل دھک سے رہ گیا میں نے لکنت زدہ زبان سے کہا "جی ۔۔۔ جی"

"آپ ہمارے گھر آ و گے ناں؟"

اس نے کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا۔ میں کل سے سوچ رہا تھا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں، ضرور آؤں گا۔"

میرے چہرے پر پتہ نہیں کیا تھا کہ ان دونوں نے غور سے مجھے دیکھا۔ رابعہ نے پوچھا۔ "بھائی آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "ہاں ۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"نہیں ۔۔ نہیں تو آپ کا چہرہ اتنا سرخ ہے۔؟"

میری ساری شوخیاں کہیں کھو گئی تھیں ۔ میں خاموش

رہا۔ ان دونوں نے مجھے دیکھا پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور کھل کھلا کر ہنس دیں۔ سعید بھی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ آیا۔ وہاں مزید بیٹھا بھی نہیں گیا۔ باہر آ کر ایسے لگا جیسے کسی جیل سے چھوٹ کر آیا ہوں مجھے سکون محسوس ہوا۔ رات کا کھانا نو بجے کھایا گیا۔ کھانے کے دوران بھی رابعہ اور کلثوم مجھے دیکھ کر مسکراتی رہیں۔ مجھے رابعہ پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر کیوں مسکراتی تھی۔ یہی حال سعید کا تھا۔ الو دیدے گھما کر مجھے دیکھتا تھا۔ میں باقی سب گھر والوں کی وجہ سے خاموش رہا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ سعید، رابعہ اور کلثوم ان دنوں میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ سچی بات ہے مجھے حسد سا محسوس ہوا۔

میں نے سوچا کہ کلثوم اور رابعہ ضرور میرے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہیں۔ رابعہ کو کلثوم نے بتا دیا ہوگا مگر اس نے کیا بتایا ہوگا۔ میں نے اس سے اب تک کوئی ایسی بات نہیں کی تھی، پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتی کیوں ہیں۔ سعید بھی تو ان میں شامل ہے خبیث کہیں کا، کیسے دانت نکال رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا جیسے ہی موقع ملا اس کے دانت ضرور توڑ دوں گا۔ پھر میں نے سوچا مجھے چپ ہی رہنا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ اب بازار جاؤں اور کوئی تحفہ لے کر کلثوم کو دوں۔ مگر کون سا تحفہ۔ پھر اب اجازت کیسے لوں گا، باہر جانے کی، ایسے ہی خیالات میں کھانا کھا لیا گیا، سب اٹھ کے چلے گئے، خالو نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور سگریٹ منگوائے۔ میں نے ان کو گلی سے سگریٹ لا کر دیئے۔ ابوبکر، سعید اور کلثوم اور رابعہ بیٹھ کر لڈو کھیلنے لگے۔ خالو ابا جان اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ کافی سردی تھی۔ گیارہ بجے سب سونے چلے گے۔ کلثوم اور رابعہ ایک ہی بستر میں لیٹی ہوئی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے پانی پیا اور کرسی پر بیٹھ گیا یہ کمرہ میرا تھا۔ اس میں سامان کم اور کتابیں زیادہ تھیں۔

بیٹھک بھی یہی تھی اور مطالعہ کا کمرہ بھی یہی تھا۔ کاش یہ میرا کمرا نہ ہوتا تو میں ان کے کمرے میں اس کے نزدیک تو سو سکتا تھا۔ اب صبح وہ جا رہے تھے۔ تب میرے دل میں خیال آیا کہ میں اسے خط لکھ دوں۔ یہ غالباً 1995 کی بات ہے ان دنوں دور دور تک موبائل کا نام و نشان نہیں تھا۔ خط کا طریقہ مناسب تھا۔ جو باتیں میں اس کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ خط میں لکھ سکتا تھا۔ میں نے کاغذ قلم اٹھایا اور اسے خط لکھنا شروع کر دیا۔ اس وقت جو بھی میرے دل میں آتا گیا میں لکھتا گیا میں نے لکھا۔

''کلثوم۔ جب سے تم کو دیکھا ہے۔ میرا حال بڑا خراب ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم ہو ہی اتنی خوبصورت۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کل یہاں سے جا رہی ہو۔ میں سوچتا ہوں میری زندگی کیسے بسر ہوگی۔ تمھیں دیکھا تو تیرے طلب گار بن گئے۔''

اتنا لکھ کر میں نے دوبارہ پڑھا۔ تو یہ الجھا الجھا سا لگا میں نے سوچا اسے خط ذرا تفصیل سے، ہر بات سمجھا کر لکھنی چاہیے تا کہ میرے خط کا اس پر دیر تک اثر رہے۔ میں نے وہ ورق پھاڑ دیا اور نئے ورق پر دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔

''پیاری کلثوم! گزشتہ پانچ ایام سے میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر کر نہ کر سکا۔

''پیاری کلثوم! کل تم یہاں سے جا رہی ہو۔ میں نے سوچا کہ آپ کو کچھ لکھ دوں۔ اور۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کو روک لوں جانے نہ دوں۔ آپ چلی جائیں گی تو میرا دل بھی آپ کے ساتھ چلا جائے گا۔ میں تم کو بہت پیار کرتا ہوں۔ تم بھی مجھے بھول نہ جانا۔

''کلثوم میں کوشش کروں گا کہ جلد آپ کے گھر آؤں۔ تم میرا انتظار کرنا مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔''

اتنا لکھ کر میں نے خود کو روک لیا میرا ہاتھ کانپ رہا تھا، میں نے دوبارہ پڑھا تو یہ خط پہلے سے بھی گھٹیا گھٹیا سا لگا۔ دماغ قلم کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ جو بات میں نے کہنی تھی وہ تو لکھ نہ سکا تھا، یہ سب باتیں مجھے سطحی سی معلوم ہوئیں۔ عام سی باتیں۔ مجھے تو اس کو جو خط لکھنا

تھا۔ وہ خاص ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس ورق کو بھی پھاڑ دیا۔ سوچا سب سے پہلے مجھے شعر لکھنا چاہیے اور مختصر سا خط کافی ہے۔ دیر تک میں شعر سوچتا رہا آخر ایک شعر مجھے یاد آ گیا میں نے لکھا۔

طیش میں آ کر تم میرا خط پھاڑ ڈالو
تمہارے قدم چوم لیں گے میری تحریر کے ٹکڑے

میں تم سے محبت کرتا ہوں، میں تمہارے گھر آؤں گا ۔میں تم سے شادی کروں گا۔ تم مجھے بہت یاد آؤ گی۔ خدا حافظ''

میں نے اس خط کو دو تین دفعہ پڑھا۔ یہ تو ایسے تھا جیسے کسی کے پتھر مار دیا جائے ۔نہ سلام نہ دعا نہ کوئی اس کا لقب اور پھر اتنا مختصر خط بھی نہیں لکھنا چاہیے۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں نے نئے سرے سے حوصلہ جمع کیا اور لکھنا شروع کیا، اب کے میں نے ٹھہر ٹھہر کر لکھا سردی سے میری انگلیاں ٹھٹھری جا رہی تھیں ۔میرا قلم اٹک اٹک رہا تھا۔ میں نے اسے لکھا۔

''جان سے پیاری کلثوم ۔ سدا پھولوں کی طرح مسکراتی رہو۔

السلام علیکم !کے بعد عرض ہے کہ رات آدھی گزر گئی ہے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میں نے بڑی دیر سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کیسے شروع کروں۔ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ آپ نے پوچھا تھا کہ ''میں آپ کے گھر کب آؤں گا'' تو میں بہت جلد آپ کے گھر آؤں گا۔ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں آپ سے شادی کروں گا اور اپنے گھر لے آؤں گا (میں نے لیلیٰ مجنوں فلم دیکھی تھی اس کا ایک شعر یاد آ گیا)

سنگ مرمر سے تراشا ہوا شوخ بدن
اتنا دل کش ہے کہ اپنانے کو جی چاہتا ہے۔

تم دل لگا کر پڑھا کرو۔ نماز پڑھا کرو۔ دعا کرنا اور خط میں اگر کوئی غلطی ہو تو معاف کر دینا۔

فقط تمہارا دیوانہ

خرم شہزاد

میں نے اس خط کو دوبارہ پڑھا تو خود کو چغد محسوس کیا۔ بھلا یہ بات پہلے ہی خط میں لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ پھر خاص بات لکھی ہی نہیں کہ تم جا رہی ہو میں تم کو بہت یاد کروں گا، میں نے اس خط کو بھی پھاڑ دیا، میرا دل چاہا کہ میں اپنا گریبان بھی پھاڑ دوں۔ کمرے میں موجود ہر چیز کو توڑ دوں، میرا غصہ عروج پر تھا۔ میں نے قلم کو توڑ دیا۔ جتنے ورق تھے سب کو پھاڑ دیا۔ کمرے میں میں اکیلا تھا اپنی چار پائی کو الٹا دیا۔ میرا دل چاہا دیواروں سے سر دے ماروں۔ کتنا نالائق ہوں کہ ایک خط نہیں لکھ سکتا۔ لعنت ہے ایسی تعلیم پر میں نے کتابیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیں اور دیواروں پر مکے مارنے لگا۔ میرا رونے کو جی چاہتا تھا۔ دل بھرا ہوا تھا۔ میرا خون رک رک کر گردش کر رہا تھا۔ اعصاب منجمد سے ہو گئے تھے۔ میں تھک کر چار پائی سیدھی کی بستر بچھایا اور اس پر بیٹھ گیا۔ سارے کمرے میں کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کو اٹھایا۔ ترتیب سے رکھیں اور خود لیٹ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔نہ جانے کب تک میں بے چین رہا اور کب مجھے نیند آ گئی مجھے نہیں معلوم۔ اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا جب میں نے محسوس کیا کہ مجھے کوئی جھنجوڑ رہا ہے ۔میں نے آنکھیں کھول دیں ۔کمرے میں اچھی خاصی روشنی تھی اور رابعہ مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔ میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ پہلا خیال آیا کہ کلثوم وغیرہ چلے گئے ہوں گے ۔رابعہ سے پوچھا تو اس نے تصدیق کر دی۔

''بھائی آپ سوتے رہے اور وہ چلی گئی۔ وہ کیا کہتے ہیں، لگی والیاں نوں نیند نہیں آوندی تیری کیویں اکھ لگ گی۔''

میں نے رابعہ کی گت پکڑی۔ ''تم نے مجھے بیدار کیوں نہیں کیا!''

اس نے ہنس کر کہا ''میں نے سوچا رات آپ جاگتے رہے ہو گے ابھی نیند آئی ہو گی چلو سو لینے دو۔'' میں نے اس کی گت چھوڑ دی۔

میرے رگ و پے میں اداسی کی لہر اتر گئی۔ ''میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے۔''

اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شوخی

تھی ۔میرا دل دھڑکنے لگا۔میں نے سوچا مجھے بے پرواہی اختیار کرنا چاہیے۔میں نے بے پرواہی سے کہا ”کیا ہے؟“۔اس نے میرا چہرہ غور سے دیکھا۔میں نے چہرے کو بے تاثر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔وہ اٹھ کر گئی اور دونوں ہاتھ پیچھے کیے ہوئے واپس آئی۔

”بھائی کیا آپ بتا سکتے ہیں؟“

”نہیں۔میں نہ تو ٹیلی پیتھی جانتا ہوں اور نہ ہی ایسا کوئی اور علم۔“ان دنوں ایک معروف رسالہ میں محی الدین نواب کی ”دیوتا“ شائع ہو رہی تھی اس کی بڑی دھوم تھی۔اس نے زیادہ تکرار نہیں کی اور وہ چیز میرے سامنے کر دی وہ ایک خط ہی تھا۔وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گی۔

میں نے اسے کھولا لکھا تھا۔

اسلام علیکم

پیارے خرم اللہ تعالیٰ آپ کو خوش وخرم رکھے۔مجھے آپ بہت یاد آئیں گے۔آپ ہمارے گھر لازمی آنا۔میں آپ کا انتظار کروں گی۔

چاندنی چاند سے ہوتی ہے ستاروں سے نہیں
دوستی ایک سے ہوتی ہے ہزاروں سے نہیں

آپ ضرور ہمارے گھر آنا۔آئیں گے ناں۔لازمی آنا۔میرا دل چاہتا تھا کہ آپ سے بہت سی باتیں کروں مگر مجھے شرم آتی ہے اس لیے خط لکھ رہی ہوں اور میں آپ کو بتاؤں مجھے آپ سے محبت ہے۔اس کا کسی کو نا بتانا۔اس خط کو پڑھ کر پھاڑ دینا۔اچھا میری طرف سے بہت سی دعائیں۔آپ کی دوست کلثوم۔

میرا دل چاہا کہ میں ناچنا شروع کر دوں۔کتنا سادہ سا،سیدھا سادہ خط تھا۔اور میں ساری رات اسے خط نا لکھ سکا۔اس سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ ان کے جانے کے وقت سوتا رہا اور جو سوتے ہیں وہ کھوتے ہیں۔میں نے بھی الوداعی ملاقات کھو دی تھی۔



کچھ خواب لاشعوری خواہشات پر مبنی ہوتے ہیں۔مثلاً ایک لڑکی کو دیکھا بڑی سندر ہے،اس کا گداز بدن، مرمریں ہاتھ آدمی اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔اسے اپنانے اور ملاقات کرنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔وہ لڑکی خوابوں کی رانی بن جاتی ہے۔ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔میں دن کو کھلی آنکھوں سے اور رات کو نیند کی حالت میں کلثوم کے خواب دیکھتا۔میں اس سے جی بھر کر باتیں کرتا۔باغوں میں ہم گھومتے۔انسانی دماغ بھی عجیب ہے جس چیز سے جتنا متاثر ہوتا ہے وہی چیز خیالات پر اثر انداز ہوتی ہے۔پھر وہی خواب بن جاتے ہیں اس بات کو یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ خواب خواہشات،ارادوں اور خیالات کے پابند ہوتے ہیں۔یہ بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔مگر اتنی بھی غلط نہیں ہے۔اکثر خواب خواہشات کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں۔معروف نفسیات داں فرائیڈ کا سارا فلسفہ یہ ہی ہے۔مگر کچھ خواب اس سے ہٹ کر بھی ہوتے ہیں مثلاً مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ایسے خواب نیک لوگوں کو ہی آتے ہیں۔خوابوں کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔کچھ خواب سچے ہوتے ہیں اور کچھ جھوٹے ہوتے ہیں اس میں انسان کے کردار کو بھی دخل ہوتا ہے۔اعمال کو بھی اور نیت کو بھی۔نیت بھی اصل میں سوچ ہوتی ہے لیکن اسے حاوی سوچ کہنا چاہیے۔جو ہر وقت،ہر لمحے اندر ہی اندر،دل ہی دل میں جاری رہتی ہے۔اب میری سوچوں میں کلثوم جاری ہو گئی تھی۔

زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ گزرتی رہتی ہے۔صبح آتی ہے گزر جاتی ہے۔شام آتی ہے گزر جاتی ہے۔دنوں سے ہفتے بن جاتے ہیں۔مہینوں سے سال بن جاتے ہیں۔میں فرسٹ ائیر میں تھا۔جب والد بیمار ہوئے۔پہلے تو گاؤں کے ڈاکٹر سے دوا لیتے رہے۔ان کو آرام آ جاتا۔ایک دو دن بعد پھر مرض لوٹ آتا۔ہر وقت بخار رہتا۔پہلے پہل تو ہم نے معمولی مرض سمجھا۔جب ایک ماہ گزرا تو سنجیدگی سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو شہر لے جا کر دکھایا۔انہوں نے مکمل توجہ سے معائنہ کیا اور چند ٹیسٹ لکھ کر دیے۔میں رپورٹ کروا لایا۔ایک بھیانک انکشاف منتظر تھا۔والد صاحب کو ٹی بی،شوگر اور معدے میں پتھری تھی۔ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ہمیں بتایا گیا کہ لاہور میں علاج ہو گا۔ہم نے تمام جمع پونجی

اکھٹی کی، کچھ قرض لیا اور بیس ہزار (اس زمانے میں بیس ہزار کی ویلیو تھی) جمع کر کے میں اور میرا بھائی سعید والد کو لے کر لاہور جا پہنچے۔ والدہ کو جب سے والد کی بیماری کا علم ہوا تھا وہ خود بیمار ہو گئی تھیں۔ بلکہ یہ کہنا مناسب تھا کہ والد سے زیادہ ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے حمید اور رابعہ کو ان کے پاس چھوڑ کر ہم لاہور جا پہنچے۔ یہاں ایک رشتہ دار عتیق صاحب کے ہاں دو دن رہے اور ٹیسٹ کروائے۔ پھر اسپتال میں ڈیرے لگا دیے۔ تینوں امراض ایسے تھے کہ ڈاکٹر کو بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی پہلے کس مرض کا علاج کریں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ معدے کی پتھری تھی۔ اس کا آپریشن کروانا تھا۔ گھر سے رابطہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ محلے میں ایک پی سی او تھا لیکن اس کے نمبر کا علم نہیں تھا۔ میں ایک شام سعید کو ابو کے پاس چھوڑ کر گھر جا پہنچا۔ والدہ کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ میں پی سی او کا نمبر لے آیا۔ اب سکون سے آپریشن کروایا جا سکتا تھا۔ چند دن بعد آپریشن ہوا جو کہ کامیاب رہا۔ ایک ہفتہ مزید وہاں رہ کر ہم گھر لوٹ آئے۔ ابو کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ میں ایک ماہ کے بعد کالج گیا۔ امتحانات قریب تھے۔ دن رات ایک کر دیا۔ دو ماہ ایسے ہی گزر گئے۔ ہم ہر پندرہ دن بعد لاہور جاتے اور ٹی بی و شوگر کی دوا لے آتے۔ چھ ماہ بعد ابو اچھے خاصے تندرست ہو گئے۔ اور دوبارہ کام پر جانے لگے۔ وہ ایک فیکٹری میں منشی تھے۔ پانچ چھ ماہ بعد کی بات ہے۔ میں امتحانات دے کر فارغ ہو چکا تھا۔ ابھی رزلٹ آنا تھا۔ میں سارا دن دوستوں کے ساتھ گزار کر جب واپس شام کو گھر پہنچا۔ ایک لرزہ خیز واقعہ میرا منتظر تھا۔ ابا جان صبح دس گیارہ بجے فوت ہو گئے تھے۔ اور میں شام پانچ بجے پہنچا تھا۔

میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ میرا حق بنتا تھا کہ میں چھوٹے بھائیوں اور بہن و امی کو دلاسا دیتا مگر وہ مجھے دلاسا دے رہے تھے۔ محلے اور خاندان کے بہت سے افراد اور خواتین جمع تھیں۔ امی کا حال سب سے برا تھا مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ امی میرے گلے سے لگ گی اور دیر تک روتی رہیں۔

میں نے بہن کو دیکھا اس نے اپنے ہونٹ زور سے بھینچے ہوئے تھے۔ اس کے بال بکھرے بکھرے تھے، اس کی رنگت زرد ہو گئی تھی۔

وہ میرے پاس آئی تو میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ہاتھ برف کی طرح سرد تھے۔ دوسرے لمحے میں نے چھوڑ دیے۔ وہ میرے سینے سے لگ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں بت بنا ہوا تھا۔ جیسے خود میں جان نہ ہو۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے آنسو ضبط کر سکوں مگر اب بھی نہ روئے گا تو ظالم مر جائے گا۔ میں خود اپنے اختیار میں نہ رہا۔ آنکھوں سے سیل رواں ہو گیا وہ دونوں بازوں سے مجھے بھینچے ہوئے تھی۔ میں نے یک دم محسوس کیا جیسے اس کی گرفت کمزور پڑ گئی ہو۔ اگر میں اسے تھام نہ لیتا تو وہ گر جاتی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ دو تین عورتوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے اسے تھام لیا میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تب میرا سر چکرا سا گیا نزدیک پڑی ہوئی چارپائی پر میں نے خود کو گرا دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کسی نے مجھے پانی پلایا۔ میں نے اسے دیکھا نہیں شاید نظر بھی نہ آتا تھوڑی دیر کے بعد میری طبیعت سنبھلی۔ جنازہ کا اعلان ہوا۔ جان سے پیارے ابا جان کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر ہم قبرستان لے کر گئے۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ جیسے ہم کوئی مشین ہوں۔ آج بھی سوچوں تو حیرت ہوتی ہے۔ اتنا حوصلہ کہاں سے آیا تھا مجھ میں۔ میں نے لحد کو خود قبر میں اتارا، مٹی ڈالی، کیسے کس ہمت سے گھر آ گیا تھا علم نہیں۔

ہم غریب گھر سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا کہ مڈل کلاس تھے کہ سفید پوشی کا بھرم بڑی مشکل سے قائم تھا۔ میں نے چند دن بعد ہی نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ میں بھائیوں کو پڑھانا چاہتا تھا۔ بہن نے تو میٹرک کر کے چولہا سنبھال لیا تھا۔ میں مختلف جگہ پر نوکریاں کرتا رہا، میرے ماں باپ نے مجھے بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھے تھے ڈاکٹر وغیرہ۔ مگر میں کچھ نہ بن سکا۔ کچھ بھی نہیں۔ روزگار حاصل کرنا کتنا مشکل ہے

یہ تو وہی جانتے ہیں جن کا بے روزگاری سے واسطہ پڑا ہو۔ ان دنوں لوگ مجھ کو مختلف مشوروں سے نوازتے تھے۔ایسے جیسے رزق حاصل کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہو۔اپنی بے روزگاری کے دنوں میں میرے اپنوں نے مجھ سے جو کچھ کہا۔وہ سب میرے دل پر نقش ہوتا رہا ۔اس سے میرے اندر ایک آگ سی سلگتی رہتی۔اس نے مجھے اداس بنا دیا ۔ مجھے بے وقوف ، نادان ، سمجھا گیا۔ذلیل کیا گیا۔میرے سامنے بھی دو راستے تھے ایک سچ کا ایک جھوٹ کا لیکن میں نے سچ کا راستہ چنا ۔ایمانداری کا راستہ چنا ۔اس راستے میں امتحان زیادہ تھے۔ مجھے اس بات کا علم تھا۔آج ابو نہ رہے تھے کل میں نے نہیں رہنا تھا۔تو بے ایمانی کیوں کرتا۔ مجھے مختلف جگہوں پر نوکریاں کرتے ہوئے تین برس گزر گئے ۔ان تین سال میں ارادے باندھتا رہا۔ٹوٹتے رہے۔وقت گزرتا رہا۔مگر میں کلثوم سے ملنے نا جا سکا۔ کوئی نہ کوئی مجبوری آڑے آتی رہی۔والد کی وفات پر وہ آئی تھی ۔ابوبکر اور کلثوم دو ہی بہن بھائی تھے۔اس لیے وہ سب کی لاڈلی بھی تھی۔سنا تھا اس نے ایف ایس سی کر لی تھی۔اب بی ایس سی میں داخلہ لے لیا تھا۔وہ ڈاکٹر بننے جا رہی تھی ابوبکر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔اس نے وہاں سے مجھے دو تین خط لکھے جواب نا پا کر اس نے خط لکھنے بند کر دیے۔ایک دن محلے کے پی سی او پر فون آیا ۔اطلاع ملی کہ ابوبکر شہید ہو گیا ہے۔

وہ میرا خالہ زاد تھا۔وہ کلثوم کا بھائی تھا۔وہ میری تایا زاد بشریٰ کا منگیتر تھا۔میرا بہترین دوست تھا۔بے شک ہمارا ساتھ کم رہا تھا لیکن اس سے میری بڑی حسین یادیں جڑی تھیں۔امی جان اور میں رات کے دس بجے ان کے گھر فیصل آباد کے ٹاون سلطان آباد جا پہنچے۔

میرے خالو صفدر علی نے مجھے گلے لگایا۔تو میری ہچکیاں بند ہو گئیں۔میں نے کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ ایسے موقع پر عام طور پر گنے چنے ہے جملے جاتے ہیں۔مرنے والے کی تعریف کی جاتی ہے۔اس کے لواحقین کو صبر کی تلقین کی جاتی ہے۔مگر کیا اس سے غم کم ہو جاتا ہے۔خالہ عائشہ کا حال سب سے برا تھا مجھ سے دیکھا نہ گیا۔امی جان نے آنٹی عائشہ کا کندھا تھپکا اور کہا۔

''سب کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ اپنے وقت پر جاتا ہے آگے نہ پیچھے ایک دن سب کو جانا ہے مجھے بھی تجھے بھی خرم کو بھی،سب کو۔''

کلثوم کی آنکھیں لبریز تھیں ۔وہ مجھ سے تھوڑی ہی دور کھڑی تھی ۔مجھ میں تو ہمت نہ تھی کہ اسے دلاسا دیتا ۔اس نے میری طرف قدم بڑھا دیے۔اس نے اپنے ہونٹ زور سے بھینچے ہوئے تھے۔وہ پہلے سے لمبی بھی کافی ہو گئی تھی اور موٹی بھی۔لباس پر بہت سی شکنیں تھیں ۔

وہ میرے پاس آئی تو میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔اس کا بھائی،اس کا مان،اس کا دنیا میں واحد سچا دوست،اس دنیا سے اٹھ گیا تھا۔اس کا ٹوٹ جانا بکھر جانا حق بنتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے آنسو ضبط کر سکوں مگر میں خود اپنے اختیار میں نہ رہا۔غم دینا،غم جاناں دونوں مل گئے۔اس کی خبر نہیں ہوئی کب وہ میرے گلے سے لگی وہ سسک رہی تھی۔میری آنکھوں سے سیل رواں ہو گیا۔وہ دونوں بازوں سے مجھے بھینچے ہوئے تھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے اس کی گرفت کمزور پڑ گئی ہو۔اگر میں اسے تھام نہ لیتا تو وہ گر جاتی۔وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔دو تین عورتوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے اسے تھام لیا۔

خالو صفدر کا گھر اچھا خاصا بڑا تھا۔مردانہ ایک طرف تھا اور زنان خانہ ایک طرف۔درمیان میں صحن تھا۔چار کمرے تھے ۔ایک باورچی خانہ تھا ۔ میں اس وقت زنان خانہ میں موجود تھا۔میرے علاوہ وہاں کوئی بھی مرد نہ تھا۔میں وہاں سے اٹھ آیا۔جاتی گرمیاں تھیں۔ہلکی ہلکی ٹھنڈ ہو رہی تھی یا مجھے محسوس ہو رہی تھی ۔ میں لان میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ بہت سے مہمان پہلے ہی لیٹے ہوئے تھے۔لیکن میں سب سے الگ پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔میرا دل نہیں کرتا تھا کہ کسی سے بات کروں۔مگر جہاں میں لیٹا ہوا تھا وہاں مردوں کی باتوں کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی اور

عورتوں کی بھی۔ نہ جانے لوگ اتنی باتیں کیسے کر لیتے ہیں۔ میں موت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ کتنی اٹل حقیقت ہے کہ آدمی نے مرجانا ہے۔ یہ محبتیں، یہ نفرتیں سب بے کار ہیں ۔یہ دولت کے لیے بھاگ دوڑ، دوسروں کو نیچا دکھانے کی تگ ودو کتنی بے معنی لگتی ہے۔ انسان کتنے خسارے میں ہے۔

انسان ان باتوں کے بارے میں کبھی سوچتا ہی نہیں ہے۔ایسا کوئی حادثہ ہوجائے تو چند لمحوں کے لیے اسے یہ خیال آتا ہے۔پھر دنیا کے ہنگاموں میں بھول جاتا ہے ۔مزہ تو تب ہے جب یہ حادثہ زندگی بدل دے۔رات کے گیارہ بج رہے تھے۔خاندان بھر سے رشتے دار آئے ہوئے تھے۔میری ساتھ والی چارپائی پر دو آدمی باتیں کررہے تھے۔ انکل مجید جو کہ ایک کالج میں پروفیسر تھے کسی سے باتیں کررہے تھے۔

''اللہ کی مرضی ہے۔وہ انسان کو اپنی مرضی سے پیدا کرتا ہے۔اس کا دل چاہے تو کسی امیر کے گھر پیدا کر دے۔اس کا دل چاہے تو کسی غریب کے گھر پیدا کر دے۔اب دیکھو اللہ نے صفدر کو سب کچھ دیا۔لیکن اب کیارہ گیا۔ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی شہید ہوگیا۔اب صرف ایک بیٹی رہ گی ہے۔سنا ہے بیٹے کی منگنی سلطان کی بیٹی سے ہوئی تھی۔''

میں کھلے آسمان کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ یہ ستارے صدیوں سے چمک رہے ہیں۔انہوں نے زمین پر بہت کچھ دیکھا ہے۔لوگوں کی خوشیاں دیکھی ہیں۔لوگوں کے غم دیکھے ہیں۔ دور بہت دور ڈیرہ میں یا شاید اسی گھر میں بشریٰ بھی کہیں ہے۔اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ بشریٰ جو کہ میری تایازاد،ابوبکر سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ابوبکر اس سے بہت محبت کرتا تھا۔وہ بھی اس کو دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک جایا کرتے تھے۔آج کتنی اداس ہوگی۔اس کی آنکھوں میں کتنے آنسو ہوں گے۔ یہ سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔جس دن میں کلثوم کو ملنے آپی رقیہ کی شادی سے دو دن پہلے گیا تھا۔

اس دن میں نے ابوبکر سے کہا تھا۔''تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا تھا اور کہا تھا۔

''سمجھا کرو یار۔ مجھے یہاں ہی رہنے دو۔''اس کی آواز میں خوشی رچی ہوئی تھی۔ میں نے کہا تھا۔

''میں خالہ جان سے پوچھ لیتا ہوں۔''اس نے گھور کر دیکھا تھا۔اور منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''دیکھو امی کے سامنے نہ کہنا۔ورنہ وہ کہے گی۔ چلے جاؤ۔ میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔''

میں مسکرادیا تھا مجھے علم تھا کہ وہ وہاں کیوں رہنا چاہتا تھا۔وہاں اس منگیتر جو تھی۔ میں نے پھر اس سے کچھ نہ کہا تھا۔اس دن وہ بشریٰ سے دور نہ جانا چاہتا تھا۔آج وہ کتنی دور چلا گیا تھا۔جس جگہ سے کوئی واپس نہیں آیا۔ وہ دن جب کلثوم اور بشریٰ نے مٹک مٹک کر ''لٹھے دی چادرا تے سلیٹی رنگ ماہیا''پرخوب ڈانس کیا تھا۔ کتنے زندگی سے بھرپور تھے وہ لمحے اور یہ لمحے اس زندگی کے منہ پر طمانچے مار رہے تھے۔ابوبکر سے میرا ساتھ بڑا کم رہا تھا۔اس نے دس پندرہ خط لکھے تھے۔ میں نے دو یا تین۔اس نے چند دن میرے ساتھ گزارے تھے۔ میں ان چند دنوں کو یاد کرتا رہا۔کبھی میرے خیالوں میں کلثوم آجاتی ۔کبھی سوچ بشریٰ کی طرف چلی جاتی ۔انہی سوچوں میں رات کالی کرتا رہا۔انکل مجید کی کسی سے بحث جاری تھی ۔اصل میں انکل مجید کچھ خود ہی بہرے تھے اس لیے ہمیشہ بلند آواز میں بات کرتے تھے۔ایسی ہی کچھ باتیں تھیں جو سونے سے پہلے میرے کانوں میں پڑیں تھیں ۔اس وقت صبح ہونے والی تھی جب میں نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔



علیم عالی میرے تایا زاد نے صبح مجھے اٹھایا۔ میں اٹھنے لگا تو اٹھا نہ گیا۔اس نے محسوس کیا کہ میری طبیعت خراب ہے۔میرا ہاتھ پکڑا اور بولا

''تم کو تو بخار ہے۔''دن چڑھ آیا تھا۔گھر میں قرآن خوانی ہورہی تھی۔ آج سوئم تھا ابوبکر کا۔میں اٹھ بیٹھا۔وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔میرے پوچھنے پر بتایا کہ ان

کے سب گھر والے آئے ہوئے ہیں۔ہم نے منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ کیا۔اور قرآن پڑھنے بیٹھ گئے۔

تین بجے تک تقریبا جتنے مہمان آئے تھے وہ سب ہی چلے گئے تھے۔ امی جان، خالہ عائشہ، خالو صفدر علی ،کلثوم،علیم عالی، بشریٰ، تائی، تایا سلطان وغیرہ سب نے ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا۔میں نے دیکھا۔ بشریٰ کا پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہونٹ بھینچ کر بیٹھنا۔کلثوم اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔خالو صفدر نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"اللہ نے دیا تھا۔اللہ کی راہ میں وہ شہید ہوا ہے ۔دشمن ملک سے لڑتے ہوئے، مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے ۔یہ تو ایک بیٹا تھا اللہ نے دس بھی دیے ہوتے تو سب ملک و اسلام پر قربان کر دیتا۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا۔حقیقت یہ ہے کہ سب نے مرجانا ہے۔ پھر کیا غم کیا خوشی۔بس جب تک زندگی ہے جینا ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد میں اور علیم عالی ابوبکر کے کمرے میں جا بیٹھے،اس کی باتیں کرتے رہے،تھوڑی دیر بعد بشریٰ چائے لے آئی۔میں اسے دیکھتا رہا۔اس کا منگیتر نہیں رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ یہ رونے اور راتوں کو جاگنے کی وجہ سے تھی۔ اس کے کپڑے بھی بدلے ہوئے تھے،وہ ہمارے پاس ہی بیٹھ گئی۔اس نے چائے میز پر رکھ دی تھی،اور اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔اسی وقت کلثوم بھی چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر وہاں آ گئی۔

"آپ یہاں بیٹھے ہیں میں نے سارے گھر میں دیکھا۔"

میں نے پوچھا۔"خیر تھی۔"اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا

"ہاں وہ کل آپ سب چلے جائیں گے تو۔تو گھر کتنا ویران ہو جائے گا۔میں اور امی سارا سارا دن ابوبکر کو یاد کیا کریں گے۔اب جتنی دیر آپ سب ہیں۔آپ کے ساتھ وقت گزار لوں۔ پھر کون سا آپ میں سے کسی نے ملنے آنا ہے۔"اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔ میں تمھارے پاس رہوں گا۔مجھے دنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔ میں فضول آدمی ہوں۔میں تمھارے کسی کام تو نہیں آؤں گا۔بلکہ شاید میں دکھ ہی دوں۔میں اکثر دوسروں کو دکھ دیتا رہتا ہوں ۔میرے پاس وقت بہت ہے۔ بلکہ یہ ہی وقت صرف ہے۔"

میری آواز میں دکھ تھا، بے بسی تھی۔ حالات کا کرب تھا۔وہ تڑپ گئی۔

"نہیں نہیں۔میرا مطلب تھا ہمارے ہاں رسم بن گی ہے کہ کسی کی شادی پر جانا ہے یا اس کی فوتگی پر،اس سے ویسے ملنے نہیں جانا۔اب بھائی عالی پہلی دفعہ ہمارے گھر آئے ہیں۔میرا بھائی فوت نا ہوتا تو کبھی نہیں آتے۔اسی طرح آپ نے کتنے وعدے کیے تھے کہ آؤ گے لیکن نہیں آئے۔میں نے کتنا انتظار کیا۔"میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میرے حالات کیسے رہے ہیں لیکن اس نے جلدی سے چائے کے برتن اٹھائے اور چلی گی۔ہم تینوں اسے دیکھتے رہ گئے۔دوسرے دن صبح چھ بجے ہم سب اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔اور بقول کلثوم اس کا گھر ویران ہو گیا ☆☆☆

اس سے اگلے دن کی بات ہے۔جس جگہ میں پہلے کام کرتا تھا وہاں گیا تو جواب مل گیا۔انہوں نے ایک نیا لڑکا کام پر رکھ لیا تھا۔میں چھ دن کے غیب کے بعد آیا تھا۔انہوں نے کام لینا تھا۔انہیں کام کی ضرورت تھی۔ بے روزگاروں کی کمی نہیں تھی۔ وہی کام جو میں 12000 پر کر رہا تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے 10000 روپے پر لڑکا رکھ لیا تھا۔میں منہ لٹکا کر آ گیا۔جو آدمی ان حالات سے گزرتا ہے وہی اس کرب سے واقف ہوتا ہے۔جو تن لاگے سو تن جانے۔پھر اس ناقدری اور بیکی کے احساس کو الفاظ میں بیان کرنا تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔دن گزرتے رہے اور میں کٹی پتنگ کی طرح ادھر ادھر اڑتا رہا۔میرے پاس سفارش نہیں تھی۔اور رشوت دینے کے پیسے نہیں تھے۔ اس بات سے تو سب ہی واقف ہیں کہ ناجائز کام ہو یا جائز کام ہو وہ رشوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔میرٹ،

ایمان داری، خلوص یہ صرف کتابی باتیں ہیں۔حقیقی زندگی میں یہ ناکامی کی علامتیں ہیں۔ہمارے معاشرے میں سچ بولنا تو ویسے ہی گناہ ہے۔

میں نے ٹیکسٹائل مل میں کام کیا۔کاٹن فیکٹری میں۔ویلڈنگ کی دکان پر، کریانہ اسٹور پر، وکیل کا منشی، اسٹامپ فروشی کا پھر ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کا اور ایسے ہی بہتا بہتا اس فیکٹری میں جا پہنچا جہاں ابو جان بطور کلرک یا منشی کے کام کرتے رہے تھے۔مالک اشرف صاحب اخلاق سے ملے۔تعارف کے بعد انہوں نے نوکری دے دی۔زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔کیا اس ٹھہراو کا نام سکون ہے تو کچھ سکون میسر آیا۔وہاں سب ابا جان کے دوست، ان کے ساتھ کام کرنے والے تھے۔اس وجہ سے میری کسی نے ٹانگیں نہیں کھینچیں۔تنخواہ بھی اچھی مل گئی پورے 18000 روپے۔میں سائیکل پر جاتا، معاشی طور پر یا نوکری کی طرف سے سکون میسر آیا تو کئی ایک ادھورے کام یاد آئے۔بھائی زیر تعلیم تھے۔ایک نے میٹرک دوسرے نے ایف اے کر لیا تھا۔بہن گھر میں بیٹھی تھی۔والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔میں نے ان کی ضروریات کی لسٹ بنائی اور رفتہ رفتہ ان کی ضروریات پوری کرنے لگا۔ایسے حالات میں بھلا کیسے کلثوم کے خواب دیکھتا لیکن رات کو سونے سے پہلے وہ خیالوں میں چلی آتی۔میں اس سے باتیں کرتا۔

تایا زاد بھائی کفیل سے ایک دن ملاقات ہوئی اس نے میٹرک مجھ سے ایک برس پہلے کیا تھا۔اور عرصہ چار برس تک ایک میڈیکل اسٹور پر کام کرتا رہا تھا اور اب چھ ماہ سے اس نے اپنا میڈیکل اسٹور کھول لیا تھا۔وہ ایک کامیاب آدمی تھا۔مجھے کام سے واپسی پر سرِ راہ ملا تو میرے ساتھ ہی ہمارے گھر آ گیا۔مجھ سے پوچھا ''آج کل کیا کر رہے ہو۔''

میں نے اپنا کام بتایا۔''یار تم بھی کوئی کام مستقل مزاجی سے نہ کرنا۔تیرے والد بھی پوری عمر کوئی کام نہ کر سکے۔تم بھی ویسے ہی زندگی گزار دو گے۔'' کفیل بھائی سچ کہہ رہے تھے۔مگر مجھے ایسے لگا جیسے کوئی گالی دے رہے ہوں۔میں نے ضبط کیا اور صرف اتنا کہا۔

''یہ آدمی کے اختیار میں کب ہوتا ہے۔'' اس نے اپنی مثال دی۔''اب اللہ کے فضل سے اپنا میڈیکل اسٹور ہے روزانہ 800 روپے کم از کم بچت ہے یہ صرف اور صرف محنت اور مستقل مزاجی اور درست منصوبہ بندی کے وجہ سے ہے۔''

وہ چپ ہوئے تو میں کہا ''بھائی مجھ کو تو سمجھ نہیں آتی کیا کروں''

انہوں نے کہا۔''بس عقل کی بات ہے۔اس دنیا میں صرف وہی کامیاب ہوتے ہیں۔جن میں عقل ہوتی ہے میری بات کا برا نہ ماننا۔تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔یہ بات میں لکھ کر دے دیتا ہوں۔''

میرا دل تو چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں مگر اس سے حاصل کچھ نہیں تھا۔اس لیے اس کی زہر بھری باتیں سنتا رہا۔جب برداشت نہ ہوئیں تو میں نے دلیل سے اپنے حالات بتائے۔

''آپ کو بھائی اچھا اسٹارٹ مل گیا تھا۔ایک واضح راستہ، آپ نے اس راستے پر محنت کی اور آپ کے پاس اتنے پیسے تھے کہ آپ نے میڈیکل اسٹور کھول لیا۔''

میں ایک لمحے کو رکا اسے غور سے دیکھا اور دوبارہ کہا۔''جب میں نے کام شروع کیا تو گھر کے حالات دگرگوں تھے۔مجھے والد کی ادویات خریدنا تھیں گھر کا چولہا جلانا تھا۔آپ کے ساتھ خدا کے فضل سے کوئی ایسی پرابلم نہیں تھی۔ابو کی وفات کے بعد ہم مقروض تھے وہ قرض اتارنا تھا۔آپ نے چار سال تک بنا تنخواہ کے کام کیا۔تب یہاں تک پہنچے۔اور میرے گھر میں چار ماہ تک گزارہ مشکل تھا۔''

مگر میری یہ دلیل ان کے سر پر سے گزر گئی۔کہنے لگے۔''تم اب بھی کوئی کام مستقل طور پر کر لو۔'' میں نے ان سے وعدہ کیا۔

امی جان نے چائے اور بسکٹ سے ان کی ضیافت کی۔وہ تکلف کرتے رہے۔پھر باتوں کا موضوع بدل گیا۔امی جان بھی وہاں موجود تھی جب اس نے بتایا۔''میں جلد امی ابو کو خالہ عائشہ کے گھر بھیج رہا ہوں تاکہ

کلثوم کا رشتہ پوچھ آئیں۔‘‘
میری تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دل چاہا کفیل کو مارنا شروع کردوں۔
کفیل میرے حالات سے بے خبر اپنی سنائے جا رہا تھا اور امی جان بھی سن رہی تھیں۔ امی جان کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا کلثوم سے کتنی محبت کرتا ہے۔ میری محبت کے بارے میں چند افراد کو ہی علم تھا۔ جن میں ایک بشریٰ تھی۔ کیا اس نے بھی کفیل کو نہیں بتایا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا کہ مذاق تو نہیں کر رہے۔ لیکن وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی کفیل بھائی سے میری بے تکلفی نہیں تھی۔ میں تو ان کے اسٹور پر بھی بہت کم جایا کرتا تھا۔ جب تک والد زندہ رہے ہماری تایا جان سے کشیدگی رہی۔ ان کی وفات کے بعد علیم عالی و بشریٰ اور تائی سے کسی حد تک تعلق قائم ہوا تھا۔ تایا جان تو ابا جان کی وفات کے بعد اب تک ہمارے گھر نہیں آئے تھے۔ کفیل بھائی امی جان سے کہہ رہے تھے۔
’’چچی میری بات پلے باندھ لیں۔ خرم کی شادی تب کرنا جب یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے کوئی کام کرنے لگ جائے۔ بعد میں اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔‘‘ مگر مجھے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا میں وہاں سے اٹھ آیا۔ میں گھر سے تو باہر نکل آیا تھا۔ مگر جاتا کہاں۔ کسی جگہ قرار نہ تھا۔ میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی تھی۔ میں واپس آ گیا۔ اس وقت کفیل اپنے گھر جانے کے لیے تیار تھے۔
رات ہو رہی تھی آج میں بہت اداس تھا۔ بہت اضطراب تھا۔ بہت بے چینی تھی۔ آج میں بہت اداس تھا۔ مجھے متلی سی ہو رہی تھی۔ دل گھبرا سا رہا تھا مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میرے ساتھ جو ہو رہا وہ درست ہو رہا ہے یا کہ غلط ہو رہا ہے۔ میرا دماغ خالی خالی سا تھا مجھ سے شام کا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ میرا تو سینہ بند ہو رہا تھا۔ رات بھر میں لیٹا چھت کو تکتا رہا۔
میں نے سوچ لیا تھا کہ کلثوم سے بات کروں گا کہ وہ کفیل کا رشتہ آئے تو انکار کر دے۔ وہ خود بھی مجھے پسند کرتی تھی۔ میری خامی یہ تھی کہ میں غریب تھا اور میرا کوئی خاص مستقبل نہ تھا۔ مگر کفیل سے میں خوبصورت زیادہ تھا۔ میری عمر بھی اس سے دو چار سال کم ہوگی۔ یوں مجھے ڈھارس بندھ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کلثوم مجھے پیار کرتی تھی۔ میں نے برسوں خیالوں میں اسے سوچا تھا۔
میں رابعہ کی شادی کر دیتا اس کے بعد مجھے کوئی فکر نہیں تھا۔ امی جان نے رابعہ کی پیدائش سے ہی اس کا جہیز بنانا شروع کر دیا تھا۔ رابعہ کے رشتے بھی آ رہے تھے۔ بس انتخاب کرنا تھا۔ امی جان میری اور رابعہ کی شادی ایک ساتھ ہی کرنا چاہتی تھی۔ مگر ابو کا خیال تھا کہ پہلے رابعہ کی کر دی جائے خرم کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اب ابو نہیں رہے تھے فیصلہ مجھے کرنا تھا۔ میں نے رابعہ کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔
سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ دھند گزشتہ کئی ایک سال سے زیادہ پڑ رہی تھی۔ سعید دو دن سے بیمار تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ اس رات اس کی بیماری میں اچانک شدت آ گئی۔ اس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا اور محسوس ہونے لگا کہ بس اب آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ میں گلی میں آن کھڑا ہوا۔ کار اسٹینڈ دور تھا۔ ایک رکشہ پکڑا۔ میں نے اور حمید نے اسے رکشہ میں بٹھایا۔ ساری رات اسپتال میں کٹ گئی۔ صبح طلوع ہونے کے ساتھ دو پریشانیاں تھیں۔ گھر جانے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ اور گھر میں بھی پیسے نہیں تھے۔ ابھی سعید کو مکمل آرام نہیں آیا تھا لیکن اب وہ یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ آرام محسوس کر رہا ہے۔ اس کے سینے کا درد اور بخار اچانک غائب ہو گئے ہوں۔ اور اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے کہا تھا اس کے سینے میں شدید انفکشن ہوا ہے۔ اسے اسپتال میں ہی داخل رہنے دو۔ میں نے حمید کو وہاں چھوڑا اور خود پیدل ہی گھر کی راہ لی۔ گھر تک سوچوں میں گم پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دینے سے پہلے خیال آیا ’’مجھے پیسوں کی ضرورت ہے اور گھر میں تو کوئی پیسے نہیں ہیں۔‘‘ اسی وقت دروازہ کھل گیا سامنے امی کھڑی تھی۔ اسے

کیسے علم ہوا کہ میں آنے والا ہوں ۔میں نے سوچا اور سلام کے بعد گھر داخل ہو گیا۔

’’کیسا ہے اب سعید۔‘‘اس نے پہلا سوال پوچھا۔

’’اب بہت بہتر ہے۔‘‘میں نے کہا۔رابعہ مصلے پر بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو قرآن پاک بند کر کے اندر رکھنے چلی گئی۔واپس آکر مجھ سے لپٹ گئی جیسے صدیوں کی بچھڑی ہو۔میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔آدھے گھنٹے بعد میں تایا جان کے گھر تھا۔میں نے صرف عالی کو حالات بتائے اس نے نہ صرف دو ہزار لا کر دیے بلکہ میرے ساتھ ہی چل پڑا۔وہ سیدھا اسپتال چلا گیا۔میں امی اور رابعہ کو تانگے پر ہسپتال لے آیا۔حمید باہر ہی مل گیا۔رات کو جاگ کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ہم سعید کے پاس پہنچے اب محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ پچھلے دو تین دن سے وہ بستر پڑا ہوا تھا اور اُس کی حالت سخت خراب تھی۔وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بستر پر بیٹھا تھا۔شام تک عالی اسپتال رہا۔اس کے جانے کے بعد میں نے حمید اور امی وغیرہ سے کہا کہ وہ بھی گھر چلی جائیں ۔کافی دیر سے سعید سو رہا تھا۔کمرے میں اب کچھ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ہم نے کافی دیر سے سعید کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی ۔اب جب امی جب گھر جانے سے پہلے اسے دیکھنے اس کے بستر کے پاس پہنچی اسے جگانے کی کوشش کی ،اسے ٹٹولا اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی ۔امی چونکی ۔مجھے آواز دی ۔رابعہ مجھ سے پہلے پہنچی ۔میں ڈاکٹر کو بلانے چل پڑا۔جب میں ڈاکٹر کو لے کر آیا۔امی جان ،سعید کے بستر پر اس سے لپٹ کر رو رہی تھی ۔نرس نے امی کو پکڑ کر الگ کیا ۔ڈاکٹر نے سعید کی نبض چیک کی ، سینے پر زور زور سے ہتھڑ مارے۔میری طرف مایوسی سے دیکھا۔اب کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔وہ جسے ہم سمجھ رہے تھے کہ سعید سو رہا ہے۔وہ اس وقت سے موت کی نیند سو رہا تھا۔



تین ماہ گزر گئے ایک دن کام سے چھٹی کے بعد میں سیدھا تایا جان کے گھر جا پہنچا۔علیم عالی مل کر بہت خوش ہوا۔عالی اور کفیل میں فرق یہ تھا کہ کفیل خود کو بہت بڑی توپ سمجھتا تھا۔اس میں غرور بھی پایا جاتا تھا۔علیم ایسا نہیں تھا۔حلانکہ دونوں بھائی تھے ۔عالی نے بی اے کرنے کے بعد زمین داری سنبھال لی تھی ۔مال مویشی رکھے تھے ۔دو ایکڑ ان کی اپنی زمین تھی۔باقی اس نے ٹھیکے پر لے رکھی تھی ۔تایا جان نے اب کام چھوڑ دیا تھا ۔حقہ ہوتا اور تایا جان ہوتے ،ان کے دوست ہوتے ،جوانی کے قصے ہوتے ۔تائی اس گھر میں سب سے ہمدرد خاتون تھی ۔بشریٰ تھی گھر میں رقیہ کی شادی ہو چکی تھی ۔تایا جان کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے سورج غروب ہو گیا۔ان کے ہر سوال میں کفیل کی طرح پیسہ لازمی ہوتا تھا۔اپنی تعریف لازمی ہوتی تھی ۔ہم اعلیٰ ہیں تیرا باپ گھٹیا تھا کیونکہ وہ غریب تھا۔

شاید یہ ہی وجہ تھی کہ ابا جان کی تایا جان سے بنی نہیں تھی ۔اب یہ خامی یا خوبی کفیل میں پائی جاتی تھی ۔میں بڑی مشکل سے ہر بات کے جواب میں بین السطور بتاتا رہا کہ

’’آپ اعلیٰ ہیں ،عقل مند ہیں ،پیسے والے ہیں،میرا والد بے وقوف تھا ،میں بے وقوف ہوں ۔کیونکہ ہم غریب ہیں۔‘‘

علیم بھی میرے ساتھ بور ہوتا رہا۔خدا خدا کر کے ہماری جان چھوٹی۔ہم گھر میں داخل ہوئے ۔دروازے پر علیم کہنے گا۔

’’آپ ابو کی بات کا برا نہ منایا کریں۔‘‘

’’مجھے علم ہے کہ ان کی عادت ہے ۔‘‘میں نے جواب دیا۔

تائی بڑے تپاک سے ملی ۔بشریٰ چپ چپ تھی۔وہ شوخیاں ،وہ تبسم ،وہ قہقہے نہ رہے تھے ۔جیسے ہی تنہائی کا وقت ملا کہنے لگی ۔’’خرم بھائی آپ کو ایک بات بتانا تھی ۔‘‘

میں نے کہا۔’’میں نے کب روکا ہے بتا دو۔‘‘

’’کفیل کہتے ہیں ،میں نے شادی کرنی ہے تو صرف کلثوم سے ۔میں نے اسے بتایا کہ کلثوم خرم سے محبت کرتی ہے ۔لیکن وہ سمجھ نہیں رہے۔‘‘

اسی وقت عالی بھی واپس آ گیا۔بشریٰ نے مایوسی

سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''آپ بات جاری رکھیں ۔''

وہ ہمارے پاس ہی بیٹھ گی۔ ''کفیل بھائی اور کلثوم میں اب موبائل پر روز بات بھی ہوتی ہے۔'' ان دنوں نئے نئے موبائل مارکیٹ میں آئے تھے۔ اور چند ایک ماڈل ہی دستیاب تھے۔ جن میں 3310 بھی شامل تھا جو بعدازاں بابائے موبائل کہلایا۔

''اچھا اگر یہ بات ہے تو میں کلثوم سے ایک بار بات کر لیتا ہوں۔'' میں نے عالی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم نے بھائی کو بتایا ہے کہ خرم اور کلثوم بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اور ان میں دوستی ہے لیکن وہ نہیں مان رہے، وہ کہتے ہیں......''

''کیا کہتے ہیں۔؟''

''کہتے ہیں، دوستی ہے تو کیا ہے کزن ہیں۔ بچپن کی محبت کچھ نہیں ہوتی۔ عورت کی زندگی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور.......''

اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں نے اس نے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور پوچھا۔ ''اور..... کیا کہتا ہے۔''

''نہیں کچھ نہیں بس۔''

''پھر بھی.....'' میں نے زور دے کر کہا۔ تو اس نے نظریں جھکا کر بتایا۔

''کہتا ہے، خرم کے پاس ہے کیا۔ نہ نوکری، نہ پیسے۔ صرف شکل صورت اور اچھی اچھی باتیں کرنے سے زندگی بسر نہیں ہوتی نہ پیٹ بھرتے ہیں اور نہ ہی اس معاشرے میں عزت ملتی ہے۔''

میں نے کہا۔

''بے شک کڑوا ہے لیکن سچ یہی ہے۔ پھر بھی دیکھتے ہیں۔ میں جلد فیصل آباد جاؤں گا۔ مجھے اپنی بہن کی زیادہ فکر ہے۔ اس کی شادی کی فکر ہے۔'' میں دل کی بات زبان پر لے آیا۔

''آپ فیصل آباد جائیں، پہلے کلثوم سے بات کریں۔ رابعہ کی فکر چھوڑ دیں۔'' عالی جو اب تک خاموش تھا اچانک بول پڑا۔

میں نے اس پر صرف عالی کی جانب دیکھا۔

''آپ نے اب تک کلثوم سے کوئی خاص رابطہ بھی تو نہیں رکھا۔'' بشریٰ کہنے لگی
''بھائی کفیل سابقہ چار ماہ میں چار مرتبہ فیصل آباد سے ہو آئے ہیں۔'' ہماری خاموشی پر بشریٰ نے ہی دوبارہ بتایا۔
ہم ایسی ہی باتیں کر رہے تھے جب تائی جان وہاں آ بیٹھی۔ پھر باتوں کا موضوع بدل گیا۔ ایک گھنٹا وہاں گزار کر میں گھر لوٹ آیا۔ علیم عالی باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ رات ڈھل گئی تھی جب میں گھر آیا۔ رابعہ نے کھانا دیا۔ حمید کو میں نے اپنے کمرے میں بلایا۔ ان سے تعلیم کا پوچھا۔ حمید اختر نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اس نے کالج میں داخلہ نہیں لیا تھا۔ جو پیسے میں نے اسے دے تھے وہ اس کے پاس تھے۔ وہ ایک الیکٹریشن کی دکان پر کام کر رہا تھا۔ اسے کام کرتے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ اب اسے پیسے بھی مل جاتے تھے روز کے بیس روپے۔ اس نے اس راز میں کسی کو شریک نہیں کیا تھا۔ وہ صبح کالج جانے کی تیاری کرتا۔ شہر دکان پر جاتا۔ وہاں کپڑے تبدیل کر کے کام کرتا۔ شام دوبارہ کپڑے تبدیل کر کے گھر واپس آجاتا۔ میں نے کچھ اور کہنے کے لیے بلایا تھا۔ لیکن بھائی کی یہ بات سن کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ مجھ سے تو کچھ کہا بھی نہیں گیا۔ مجھے خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔



میں نے اپنے دھڑکتے دل سے دروازہ پر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد کلثوم کی آواز آئی۔ ''کون ہے؟''
''ایک پردیسی۔''
''کون پردیسی۔'' آواز میں روکھا پن تھا۔
میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ لیکن دروازے کو پکڑے ہی رہی۔ یا پھر طاق چھوڑنے کا اسے خیال نہیں آیا وہ مجھے دیکھتی ہی رہ گئی۔ میں نے بھی اسے کافی عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ اس کا جسم بھر گیا تھا وہ موٹی نہیں تھی لگتی تھی۔ اس کا بدن کسا کسا سا تھا۔ یا اس نے کسا کسا سوٹ پہنا تھا۔ آنکھوں میں چمک پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے کبھی مجھے اس طرح ایک ٹک دیکھا بھی نہیں تھا۔
میں نے قدم اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ سامنے سے ہٹی نہیں۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسے سائیڈ پر کرنا چاہا۔ اس نے مجھے باہوں میں بھر لیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں نے ٹانگ مار کر اسے بند کیا۔ وہ پہلی مرتبہ میرے گلے نہیں لگی تھی۔ مگر اب کے بات اور تھی۔ مجھے یقین ہو گیا وہ مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہے۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہے۔ اس وقت میں نے سوچا اندر آنٹی ہو گی۔ وہ کیا سوچے گی۔ میں نے سرگوشی کی۔ ''خالہ کدھر ہے؟''
''وہ چچا اکبر کے گھر گئی ہے۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔
میں نے اسے چھوڑا تو اس نے دروازہ کو کنڈی لگا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
''میں تمھارا روز انتظار کرتی تھی۔ مگر تم تو مجھے بھول گئے۔ تم کو علم ہے کہ تم میری پہلی محبت ہو۔''
''دوسری محبت کون سی ہے؟'' میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے سب سے اہم سوال پوچھا۔
اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور بات بدل دی۔ ''آج سے پانچ برس پہلے جو میں نے رابعہ کو خط دیا تھا۔ کیا تم کو مل گیا تھا۔''
میں نے اقرار میں گردن ہلا دی۔
''تو تم نے جواب کیوں نہیں دیا۔''
''جواب کی بجائے میں خود جو آ گیا ہوں۔''
''بڑی جلدی آئے ہیں آپ۔''
کمرے میں آ کر اس نے بستر کی چادر درست کی۔ میں بیٹھ گیا۔ کہنے لگی۔
''بولو کیا کھاؤ گے۔ کیا پیو گے۔''
میں نے کہا۔ ''بس تم میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ تمھاری آنکھوں سے ہی پیوں گا۔''
''مجھ سے شادی کر لو۔ میں تمھاری ہو جاؤں گی۔''
میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس نے مزاحمت

نہیں کی۔ میرے ہاتھ جب حد سے آگے بڑھے تو اس نے مجھے روک دیا۔
"ابھی اتنا حق آپ کو حاصل نہیں ہے۔ یہ حق نکاح کے بعد ملتا ہے۔"
میں نے کہا "اچھا نکاح بھی ہو جائے گا۔"
"میں اس رات کا انتظار کرتی رہوں گی۔"
اس نے اپنے لباس کو درست کیا۔ بال سنوارے اور بھاگ کر منہ ہاتھ دھو آئی۔ تولیے سے منہ صاف کیا۔ گیلا تولیہ میرے منہ پر پھیرا اور کہنے لگی۔
"اب کوئی شرارت نہ کرنا۔ امی جان کسی لمحے بھی آسکتی ہے۔"
"میرے ساتھ آجاؤ۔ باورچی خانے میں۔ ہم باتیں کرتے ہیں۔ ورنہ امی ناراض ہو گی کہ میرے بھانجے کو کچھ کھلایا نہیں۔"
میں اس کے ساتھ باورچی خانے میں آگیا۔
"تم سے ایک بات کرنی ہے۔" اس نے مجھے دیکھا
۔
"تمہاری باتیں تو سننے کے لیے آیا ہوں۔"
"میرے رشتے آرہے ہیں۔ ابو جان کہہ رہے تھے کہ ہم نے کلثوم کی شادی وہاں کرنی ہے جو گھر داماد بن کر رہے۔" ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا اس دوران چائے بن گی۔ اس نے دو کپ بھرے۔ ایک میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر خود ہی خاموشی کو توڑا
"میں یہ بھی نہیں کہوں گی کہ تم میری خاطر یہ بات قبول کرلو۔"
"شاید یہ ممکن نہ ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا
"مگر میری خواہش ہے کاش تجھ سے شادی ہو جائے۔ تم جا کر اپنی امی کو بھیجو تو سہی۔"
"وہ تو میں بھیج دوں گا۔ لیکن سوچ لو۔ اب انکار کا دکھ ان سے برداشت نہ ہوگا۔"
"ایک بات اور کرنا ہے۔ تمھارے تایا جان ایک ماہ پہلے آئے تھے۔ انہوں نے کفیل کے بارے میں بات کی تھی۔ اس رات ہی ابو نے امی سے گھر جوائی رکھنے کا کہا تھا۔ اب ان کا کوئی بیٹا تو ہے نہیں۔ ایک لحاظ سے وہ ٹھیک ہی سوچتے ہیں۔"
"خالہ عائشہ ابھی تک نہیں آئیں۔" میں نے پوچھا
اس نے بتایا۔ "چچی سعدیہ کی طبیعت خراب ہے کوئی زچگی کا مسلہ ہے۔"
ہم چائے کے کپ پکڑے باورچی خانے سے باہر نکل آئے۔ برآمدے میں پڑی چارپائی پر میں بیٹھ گیا۔ سامنے ایک سٹول رکھ کر وہ بھی بیٹھ گی۔ ہم ابوبکر کی، سعید کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔
میں نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ خالہ عائشہ تھی اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گی۔ پھر مجھے گلے لگایا۔ اور کلثوم کا پوچھا۔ میں نے کہا اندر ہے۔
خالہ عائشہ اندر آئی اور میرے بارے میں پوچھا۔ "کب آئے۔"
"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"
"اچھا ہوا تم گھر میں ہو۔ مجھے دوبارہ جانا ہے۔ سعیدہ کو اسپتال لے کر جانا ہے۔ میں کلثوم کو لینے آئی تھی۔ کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں۔"
اتنی دیر میں کلثوم بھی کمرے سے نکل آئی۔ یہ ہی باتیں خالہ نے کلثوم سے کیں اور کہا۔ "خرم کو بازار بھیج کر گوشت منگوا لو۔ شام کا کھانا تیار کرلو۔ میں اسپتال جا رہی ہوں۔ شام کو تمہارے ابو آجائیں گے۔ تو اس کے ساتھ ہی تم دونوں بھائی اکبر کے گھر آجانا۔"
کلثوم نے کہا۔ "ٹھیک ہے امی۔ ویسے سعدیہ کیسی ہیں اب۔"
"دعا کریں۔" یہ کہہ کر خالہ دوبارہ واپس جانے کو مڑی تو کلثوم نے کہا ایک منٹ رک جائیں۔ وہ باورچی خانے میں گئی اور خالہ کو چائے لا کر دی۔ چائے پینے کے دوران خالہ تاکید کرتی رہی۔ "گوشت منگوا لینا، کھانا جی بھر کر کھانا۔ تمہاری امی کیسی ہے؟ رابعہ کیسی ہے؟ حمید کیا کرتا ہے؟"۔ میں انہیں ان باتوں کے جواب دیتا رہا۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے کلثوم سے کہا۔ "میں ابھی آیا۔" اور خالہ کے ساتھ ہی گھر سے نکل آیا۔ خالہ اپنے

دیورا کبر کے گھر کی طرف مڑ گئی اور میں بازار کی طرف۔ آدھے گھنٹے بعد میں گوشت لے کر واپس آ گیا تھا۔دن کے بارہ بج رہے تھے۔وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔اس کا لباس بھی بدلا ہوا تھا۔اس نے اس آدھے گھنٹے وقت ضائع نہیں کیا تھا۔اس نے آٹا گوندھا، روٹیاں پکائیں، دو انڈے پکائے میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔اس کے چہرے پر سکھ کے آثار تھے میں اسے تکتا رہا۔میں اس کے ساتھ ہی باورچی خانے میں بیٹھا اسے جی بھر کر دیکھتا رہا۔کہنے لگی میرے چہرے پر کیا دیکھتے ہو میں نے بتایا''میں تجھے دیکھنے کو ترس گیا تھا سوچا آج جی بھر کے دیکھ لوں پھر زندگی میں موقع ملے نہ ملے۔''

تجھے دیکھا ہے آج برسوں کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

اس نے بات بدل دی کہنے لگی''اپنے بالوں کا خیال رکھا کرو''اور مانگ بائیں طرف نکالا کرو۔''

میں نے کہا''میں اپنی طرف سے کافی بے پرواہوں۔تم میری ہو جاؤ گی تو مجھے اٹھنا بیٹھنا اور بن سنور کر رہنا آجائے گا۔''

کھانا کھانے کے بعد وہ میرا لایا ہوا گوشت دھونے لگی۔میں نے کہا۔''ابھی تو کھانا کھایا ہے۔''

اس نے شوخ نظروں سے دیکھا۔''یہ تو شام کے لیے ہے۔''

''شام تو ابھی بہت دور ہے۔''۔''دور ہے تو پھر کیا کریں۔''

میں نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔اس نے گوشت کو وہیں چھوڑا۔اٹھ کھڑی ہوئی۔مجھے کہنا نہیں پڑا۔خود ہی میرے گلے لگ گی۔

مجھ پر نشہ چھانے لگا۔میں نشے میں بہتا بہتا روشنی کے ساتھ ساتھ دور بہت دور نکل گیا۔مجھ پر روشنی کی برسات برس رہی تھی۔ہم بار بار اس روشنی میں خوب نہائے۔نہا دھو کر اس نے لباس بدلا۔وہ کلی سے پھول بن کر نکھر گئی تھی۔اس کی چال بھی بدل گئی تھی۔میں نے نہا کر اپنے ساتھ لایا دوسرا سوٹ پہنا بائیں طرف مانگ نکالی۔شیشے میں خود کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔بالوں کا انداز بدل دینے سے بھی آدمی کی شخصیت پر اثر پڑتا ہے۔اس بات کا مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا۔وہ گوشت پکا رہی تھی۔میں پاس جا بیٹھا۔مجھے دیکھ کر اس نے شرما کر گردن جھکا لی۔وہ تھوڑی دیر پہلے والی کلثوم لگ ہی نہیں رہی تھی۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں اللہ کرے تم سے شادی ہو جائے اور اگر بدقسمتی سے نہ ہوئی۔تو بھی میں تم سے محبت کرتی رہوں گی۔محبت کا مطلب شادی ہونا نہیں ہوتا۔محبت تو دور رہ کر بھی جا سکتی ہے۔تم مجھ سے وعدہ کرو مجھ سے ملتے رہو گے۔تمام عمر۔''

ایسا کہتے ہوئے مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو محسوس ہوئے۔تھوڑی دیر تک میں چپ رہا پھر میں نے اس سے کہا۔

''کلثوم میں ایسی محبت کا قائل نہیں ہوں۔جس میں تم مجسم میری نہ ہو۔اس محبت کا کیا فائدہ کہ تم کسی اور کی ہو جاؤ اور میں تمہاری یاد میں آہیں بھرتا رہوں۔باشعور انسان حقیقت کو دیکھتے ہیں کسی بھی لڑکی سے محبت اس کو اپنانے کے لیے کی جاتی ہے۔دور رہ کر یا لڑکی کسی اور کی ہو جائے اور محبت قائم رہے۔میں ان باتوں کا قائل نہیں کہ تم کسی اور کے تصرف میں رہو اور میری محبت کا دعویٰ کرتی رہو۔اس سے دھوکا کرتی رہو۔میں کسی اور سے شادی کروں، یاد تمہیں کرتا رہوں، محبت تم سے کرتا رہوں۔اس سے منافقت کرتا رہوں۔''

میں ایک لمحے کو رکا اسے دیکھا۔''اور تم سے شادی کیوں نہیں ہو گی۔تم نے ایسا سوچا ہی کیوں۔'' کلثوم کو شاید میرے اس جواب کی توقع نہیں تھی اس لیے اس کی آنکھوں میں سمندر بھر آیا۔جتنی وہ خود نازک تھی اس کے احساسات بھی اتنے ہی نازک ہوں گے۔مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔اس میں اس کی محبت کی بھی توہین تھی۔

وہ میری محبت تو ہوس بھی خیال کر سکتی تھی۔مگر میری اس بات اور ہوس میں فرق تھا۔اسے اداس دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔میں نے اسے پکارا۔

اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔میں نے اس کی

آنکھوں میں دیکھا۔ میں وہ لفظ ڈھونڈتا رہا جو کلثوم سے کہوں بہت سے خیالات میرے دماغ میں آئے میں نے رد کردیے۔ مجھے یہ قبول ہی نہیں تھا وہ کسی اور کی ہو جائے۔ اور جھوٹی تسلی اسے دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا وہ گھر والوں کو مجبور کردے۔ وہ اکلوتی تھی ایسا کرسکتی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اب کہتی بھی کیا۔ میں نے اس کے نہ ملنے کی صورت میں اس کی محبت سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ اگر مجھ سے شادی نہیں ہوتی تو میں نے بتا دیا کہ میں اس کی زندگی سے نکل جاوں گا۔ اور شادی کیوں نہیں ہو گی ؟ ہمارے درمیان طویل خاموشی حائل ہو گی۔ میں نے ہی دوبارہ پوچھا۔ ''جب اب ہم اتنے قریب آ گئے ہیں ۔ یہ بچپن کی محبت کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ اب کیسے تم کہہ رہی ہو کہ اگر ہماری شادی نہ ہوئی تو۔۔۔۔ یہ تم نے سوچا کیسے ہے؟۔''

''تم ایک مرد ہو اس لیے ایسا کہہ سکتے ہو۔ میں والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ تم ان مسائل کو جان بھی نہیں سکتے جو میرے ساتھ ہیں۔ لیکن یاد رکھنا مجھے تم سے محبت ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ کھانا تیار ہو چکا تھا ۔ شام پانچ بجے آنٹی اور خالو صفدر ایک ساتھ آئے۔ آنٹی سعدیہ اسپتال میں تھیں ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

......۞......۞......

وقت کی پابند ہیں۔ آتی جاتی رونقیں
وقت ہے پھولوں کی سیج۔ وقت ہے کانٹوں کا تاج
وقت سے دن اور رات۔ وقت سے کل اور آج
وقت کی ہر شے غلام۔ وقت کا ہر شے پر راج
آدمی کو چاہیے۔ وقت سے ڈر کر رہے
کون جانے کس گھڑی۔ وقت کا بدلے مزاج

زندگی کا کیا ہے یہ گزرتی ہے۔ دکھ آتے ہیں گزر جاتے ہیں۔ سکھ آتے ہیں گزر جاتے ہیں ۔ رات دن گزر جاتے ہیں۔ میں دل لگا کر کام کرنے لگا۔ چند ماہ بعد علیم عالی کے ماں باپ کے ہمراہ بشریٰ و کفیل ہمارے گھر آئے ۔ انہوں نے رابعہ کا رشتہ مانگا۔ ہم نے ہامی بھر لی۔ چند دن بعد ہی ان کی منگنی کر دی گی ۔ تایا جان نے بتایا کہ۔ ''وہ جلد فیصل آباد جائے گا۔ اور کفیل کے رشتے کے لیے صفدر سے بات کرے گا۔''

تائی نے بتایا کہ۔ ''وہ گھر جوائی رکھنا چاہتے ہیں ۔ اور کفیل بھی اس کے لیے تیار ہے۔''

کفیل کہنے لگا۔ ''فیصل آباد کون سا دور ہے۔ میں وہاں شہر میں ہی میڈیکل اسٹور بنالوں گا۔''

بشریٰ نے لقمہ دیا۔ ''خالو کا جو کچھ بھی ہے وہ ان کی بیٹی کا ہی ہے۔ اور بھائی گھر جوائی بن کر سب حاصل کر لیں گے۔''

میں نے بشریٰ کو دیکھا وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی جیسے وہ طنز کر رہی ہو۔ لیکن شاید اس بات کو صرف میں نے ہی محسوس کیا۔ باقی سب تو اپنی باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ حمید کو اپنی بہن کی منگنی کی بہت خوشی ہوئی۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں ۔ رابعہ شرمائی شرمائی بیٹھی تھی۔ تائی خوشی سے پھولے نا سما رہی تھی۔ میرے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ میں اٹھ آیا ۔ برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب کفیل سے کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ اب وہ بہن کے سسرالی بن چکے تھے۔ وقت کا مزاج بدل گیا تھا۔ شام کو سب مہمان چلے گے۔ میرے لیے یہ بات بڑی حیرت ناک تھی کلثوم کا رویہ میرے ساتھ ایسا تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کر سکتی ہے۔ بھائی کفیل میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مالی لحاظ سے زیادہ مضبوط تھا اس کا اپنا میڈیکل اسٹور تھا۔ پھر وہ فیصل آباد گھر جوائی بننے کے لیے بھی تیار تھا۔ وہ خوبصورت تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ وقت اس کے ساتھ تھا۔

میں نے سوچا کہ مجھے بھائی کفیل سے خود ملنا چاہیے اور اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔

کفیل سے زیادہ مجھے غصہ کلثوم پر تھا۔ چند ماہ قبل ہی وہ میرے ساتھ بڑے رنگین لمحات گزار چکی تھی۔ مجھے امید تھی اب وہ کہیں اور شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتی ۔ اکلوتی ہے۔ جو کہے گی گھر والے وہی مان لیں گے ۔ اس کی شادی زبردستی تو نہیں کر سکتے تھے۔ اسے کفیل

سے محبت تھی تو میرے سامنے اسے سچ بول دینا چاہیے تھا؟ مجھے اس نے کیوں دورا ہے پر رکھا تھا۔میری آنکھوں کو کیوں خواب سونپے تھے۔میرا دم گھٹنے لگا تھا۔دل میں کوئی جیسے آرے چلا رہا تھا۔غصہ بھی مجھے خود پر بھی بہت آرہا تھا۔غلطی ہماری تھی۔ہمیں بہت پہلے اس کا رشتہ پوچھ لینا چاہئے تھا۔اب تو بہت دیر ہوگئی تھی۔ ہم مناسب وقت کا انتظار کرتے رہے۔مجھے یاد آیا کلثوم نے مجھ سے کہا تھا کہ ''میرے والدین اس سے میری شادی کریں گے جو گھر داماد رہ سکے۔''

اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر میں اقرار کرلیتا تو۔یک دم مجھ پر سب کچھ روشن ہوگیا۔ہاں بالکل یہی بات تھی۔

اس نے کہا تھا''اگر ہماری شادی نہ ہوئی تو بھی مجھ سے محبت کرتی رہے گی۔''

آخر اس بات کا مطلب کیا تھا۔یہی مطلب تھا کہ اس نے پہلے سے سب کچھ سوچ رکھا تھا۔مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ اس کے والدین اس کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں کریں گے۔وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور اس سے اس کے والدین محبت بھی بہت کرتے تھے۔میں جتنا سوچتا رہا میرے سامنے کلثوم کھل کر آتی گئی۔اس نے یہ بھی کہا تھا کہ

''تم ایک مرد ہو اس لیے ایسا کہہ سکتے ہو۔۔تم ان مسائل کو جان بھی نہیں سکتے جو میرے ساتھ ہیں۔لیکن یاد رکھنا مجھے تم سے محبت ہے۔''

بات کا فیصلہ پہلے ہو چکا تھا۔اس نے خود کو سونپ کر اپنی طرف سے محبت کا قرض اتار دیا تھا۔

لیکن میرے لیے اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ جتنا میں اس موضوع پر سوچتا۔اتنا سر میں درد بڑھتا چلا گیا۔

پھر اس نے اپنا آپ مجھے کیوں سونپ دیا تھا۔کیا اس لیے کہ اس نے میرے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے تھے۔اس کا اس نے اقرار بھی کیا تھا۔اس نے اپنا خواب پورا کرلیا تھا۔میں نے تو ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔جیسا اس نے سوچا تھا اور اپنی سوچ کے عین مطابق اس نے مجھے استعمال کیا تھا۔میں اٹھ کھڑا ہوا۔کمرے میں ٹہلنے لگا۔میں اس کی پہلی محبت تھا۔یہ ہی اس نے کہا تھا۔اس کا مطلب ہے دوسری محبت بھائی کفیل تھا۔اس دن اس نے اس سوال کے جواب میں مجھے گھور کر دیکھا تھا۔



دوسرے دن کام سے واپسی پر میں بھائی کفیل سے ملنے اس کے پاس اسٹور پر چلا گیا۔وہ بڑے تپاک سے ملا۔باتیں عام سے موضوع سے شروع ہوئیں۔وہی گھسے پٹے سوالات۔کیسے ہو؟ کیا کررہے ہو؟ کتنی تنخواہ ہے؟ مجھے بعض اوقات وحشت ہوتی ہے ان سوالات سے کوئی بھی یہ نہیں پوچھتا تم کتنی نمازیں پڑھتے ہو؟ کتنے لوگوں کے کام آتے ہو؟ کیا خدمت خلق کرتے ہو؟اپنی زندگی سے خوش کتنے ہو؟

میں کفیل بھائی کے سوالات کے جوابات دیتا رہا۔ میرے دماغ میں تو ریت بھری ہوئی تھی۔میں اس سے کلثوم کے متعلق پوچھنے آیا تھا۔مگر کیسے بات شروع کروں سب کچھ دماغ میں گڈمڈ ہوگیا۔اب ان سے رشتہ بھی بڑا نازک سا ہوگیا تھا۔وہ میری بہن کے سسرالی تھے۔مجھے سوچ سمجھ کر بات کرنا تھی۔مجھے تو وہ الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔آخر میں نے اسے اسے مبارک باد دی کہ اس کی کلثوم سے منگنی ہوگئی ہے۔وہ ہنس دیا

''ارے واہ خرم تم نے بھی خوب کہی۔''

میں صرف اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''منگنی ہوئی کہاں ہے۔مگر ہو جائے گی۔دو مرتبہ والدین رشتہ پوچھنے گئے ہیں۔وہ کہتے ہیں تھوڑے دن اور بعد میں بتاتے ہیں۔نا جانے وہ ایسا کیوں کررہے ہیں۔حالانکہ میں ان کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔وہ شاید مجھے یہ سب کچھ سنانے پر تیار بیٹھا تھا اس لیے بولتا چلا گیا۔

میں شاید اس کی منت کرنے آیا تھا کہ وہ کلثوم اور میرے درمیان سے ہٹ جائے۔میں اس کے بناں ادھورا رہوں گا۔اس کا کیا ہے اس کو تو ہزاروں مل جائیں

گئیں۔مگر میں ایسا کہہ نہ سکا۔وہ بولتا جارہا تھا۔اس نے بتایا۔" ابھی تھوڑے دن پہلے اس کے دو لیٹرز بھی میرے نام آئے ہیں اس نے خط میں لکھا ہے کہ" ان خطوط کا کسی کو پتہ نہ چلے۔"اس نے ایک لمحے کو رکا سانس درست کی دوبارہ گویا ہوا۔

"تم کو بتارہا ہوں تم غیر تھوڑی ہو۔"

اس نے اٹھ کر مجھے اس کے خطوط دراز سے نکال کر دیے۔اس دوران چائے آگئی۔میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی محبوبہ کے کسی اور کے نام لکھے جانے والے خط کھولے اور ان کو پڑھا مجھ پر حول سا طاری ہورہا تھا۔میرے دماغ میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔آنکھوں کی روشنی اتنی ضروری نہیں ہوتی جتنی دماغ کی ہوتی ہے۔دماغ میں اندھیرا چھایا ہو تو آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتا۔خط کے الفاظ نظر نہیں آرہے تھے۔دل بہت گھبرا رہا تھا۔میں نے خط ہاتھ میں پکڑ کر چائے پینی شروع کر دی۔دکان پر ایک گاہک آیا۔کفیل اس سے مصروف ہوگیا۔میں نے خود میں حوصلہ پیدا کیا اور خط پڑھ ڈالے۔بڑی چابکدستی سے لکھے گئے تھے یہ خط۔ان میں کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جس سے یہ گمان ہوتا یہ محبت نامے ہیں۔گھر کے حالات اپنے گھر والوں کے بارے میں کفیل بھائی کی بہنوں اور والدین کے متعلق پوچھا تھا۔ایک لائن کو میں نے بار بار پڑھا لکھا تھا۔کلثوم نے نہ جانے یہ کیوں لکھا تھا" آدمی آدمیوں سے بے راز ہے اور آدمی کو آدمی کے بغیر چین بھی نہیں" یہ لائن میری بے چینی کو بڑھا گی۔آخر اس کا مطلب کیا تھا۔اس نے ایسا کیوں لکھا تھا۔وہ کفیل کو کیا اشارہ دینا چاہتی تھی۔دونوں خطوط میں صرف یہ ایک لائن ہی ایسی تھی۔میں نے اسے بار بار پڑھا اور خط بھائی کفیل کو واپس کر دیے۔جب میں خطوط کا مطالعہ کر رہا تھا تو وہ مسلسل بولتے رہے تھے مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

تھوڑی دیر مزید وہاں بیٹھ کر میں اٹھ آیا۔گھر جانے کی بجائے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔میرا کہیں بھاگ جانے کو ویرانے میں جا کر رہنے کو دل کرتا تھا۔میں نے کئی مرتبہ سوچا کسی گاڑی کے نیچے آجاؤں۔

اب مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کلثوم مجھ سے محبت کرتی تھی۔لیکن میری دوری اس سے بالکل رابطہ نہ رکھنے سے اس سے دور ہوتا چلا گیا۔بے شک ایسا میرے حالات کی وجہ سے ہوا۔اس دوران کفیل بھائی نے اس پر توجہ دی۔اور اب دوسری وجہ خالو صفدر کی داماد کو اپنے گھر رکھنے کی شرط تھی۔جس پر کلثوم ماں باپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔میں گھر جوائی بننے کی شرط کسی بھی طرح نہیں مان سکتا تھا۔اس بات کو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

رات گئے میں گھر واپس آیا۔رابعہ نے کھانا دیا میں نے یوں ہی لوٹا دیا۔میں چارپائی پر پڑا رہا اور میرے مساموں سے پسینہ پھوٹتا رہا۔میں کفیل سے کیا کہنا چاہتا تھا۔مگر وہ اس سے کہہ ہی نہیں سکا تھا۔اگر میں کہہ بھی دیتا تو کیا اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی؟ پھر یہ بھی تھا کہ کیا وہ بات مان بھی لیتا؟ مجھے خود سے ہی نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔اور اپنا آپ بھی گھناؤنا سا لگ رہا تھا۔ایسے ہی میں خود کو نوچتا رہا۔رات گزرتی رہی۔پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گی۔

بڑے عرصے کے بعد میں نے صبح کی نماز ادا کی اور سیر کے لیے نکل گیا۔اس دن میں نے پابندی سے نماز ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔اس کے بعد اس پر قائم بھی رہا۔ایک دن جمعہ پڑھنے مسجد گیا مولوی نے داڑھی بارے احادیث سنائیں اور ساتھ ہی اس کے سائنسی فوائد گنوائے میں نے داڑھی بھی رکھ لی۔ہمارے معاشرے میں نمازی کو طنزاً مولوی یا ملاّ کا خطاب دیا جاتا ہے اور لوگ خود کو اس سے اچھا خیال کرتے ہیں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کو فخر سے بیان کرتے ہیں۔میں کوئی اتنا پارسا نہیں تھا۔میں شاید ان سے زیادہ گناہ گار تھا۔میں نے کبھی کسی کو تبلیغ نہیں کی کہ وہ میرے ساتھ چل کر نماز پڑھیں۔بس جب نماز کا وقت ہوتا میں خاموشی سے چلا جاتا تھا۔مجھے کلثوم کی جدائی اور اس کی بے وفائی کا اتنا دکھ ہوا تھا کہ اگر میں نماز کا سہارا نہ لیتا تو شاید مر جاتا۔ابوبکر کی وفات کے بعد میں نے سوچا تھا کہ آدمی کتنا ناپائیدار ہے اور کلثوم کی

بے وفائی کے بعد سوچا تھا کہ دراصل محبت صرف اور صرف اللہ سے کرنی چاہیے۔لیکن یار لوگ مجھے مولوی کہنے لگے۔مولوی خرم میرا خود بخود نام پڑ گیا۔پہلے پہل تو مجھے عجیب سا لگا لیکن رفتہ رفتہ اس کا عادی ہو گیا۔اور ایک دن تو بہت برا ہوا۔وہ ایسے کہ ایک لڑکا ندیم میرے ساتھ ہی کام کرتا تھا وہ ہر وقت مسکراتا اور ہنستا رہتا۔ساتھ کام کرنے والے لڑکوں سے مذاق کرتا رہتا اس دن اس نے ایسا ہی کوئی مذاق کیا تھا۔مجھے نہ جانے کیا ہوا تھا۔میں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔سب نے مل کر اسے مجھ سے چھڑایا۔بعد میں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔میں نے اس سے معافی بھی مانگ لی۔دوسروں کی بات مجھے خود پر طنز لگنے لگی تھی۔جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو۔سچی بات ہے کہ میں کوئی نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔ساتھ کام کرنے والے مجھ سے دور دور رہنے لگے تھے۔جیسے میں پاگل ہوں ان کو کاٹ لوں گا۔تب مجھے اس بات پر غصہ آنے لگا۔وہ مجھ سے دور کیوں رہتے ہیں۔کیا میں آدمی نہیں ہوں؟۔بعض آدمی ادھورے بھی تو ہوتے ہیں۔یہ دنیا کی ایک اٹل حقیقت ہے کہ لوگ ہنسنے والوں کے ساتھ ہنستے ہیں رونے والوں کے ساتھ کوئی روتا نہیں ہے۔ندیم نے میرے کھوئے کھوئے رہنے کی وجہ ''روگ'' کہا تھا۔اس نے سچ کہا تھا۔میں اسے گالیاں دینے لگا تھا۔اس نے جواب میں گالی دی تو میں اس سے لڑ پڑا تھا۔

دوسرے دن کی بات ہے کہ مجھے دو لڑکوں نے سڑک پر گھیر لیا۔میں بازار سے کوئی چیز لینے نکلا تھا۔انہوں نے میرا نام پوچھا اور مجھ سے گتھم گتھا ہو گئے۔ایک تو میں بے خبر تھا دوئم ان سے ویسے بھی کمزور تھا۔قصہ کوتاہ میرا سر پھٹ گیا۔وہ دونوں یہ جا وہ جا۔سب مجھ سے پوچھ رہے تھے۔وہ کون تھے؟۔میں ان کو کیا بتاتا۔مجھے خود علم نہیں تھا۔تھوڑی دور ہی کفیل کا میڈیکل سٹور تھا۔ایک جاننے والا مجھے وہاں لے گیا۔وہاں سے اسپتال۔پٹی کروانے کے بعد میں گھر لوٹا۔بھائی کو علم ہوا تو وہ لڑنے مرنے پر اتر آیا۔لیکن حقیقت میں ان کو میری طرح علم ہی نہیں تھا کہ وہ تھے کون؟۔بہت بعد میں ندیم نے مجھے خود بتایا تھا۔جب وہ کام چھوڑ کر جانے والا تھا اس وقت اس سے دوستی بھی ہو گئی تھی اس نے غلطی کی معافی بھی مانگی تھی۔میں نے اسے دریا دلی سے معاف کر دیا تھا۔

ایسے ہی میں نے چار ماہ گزارے تھے اور کلثوم کو بھول نہیں سکا تھا۔وقت اور حالات کے تحت انسان کے نظریات وخیالات بدلتے رہتے ہیں۔میں نے کلثوم سے اس دن کہا تھا ''محبت کے لیے اس کا ملنا ضروری ہے جس سے محبت ہو۔''

اب سوچا کرتا تھا کہ ''کوئی ساری زندگی لے کر مگر کلثوم سے ایک مرتبہ جی بھر کے باتیں کر لینے دے، اس کو دیکھ لینے دے''۔

کہتے ہیں مجازی محبت وہ راستہ ہے۔جو عشق حقیقی کے کوچے کو جاتا ہے۔ٹوٹے ہوئے دل میں گداز پیدا ہو جاتا ہے۔پتھروں کو تو جونک بھی نہیں لگتی۔مجھے پتہ چل گیا تھا کہ کلثوم اور کفیل کی منگنی ہو گئی ہے۔میں نے اس بات کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا۔مگر اندر ہی اندر کوئی چیز ٹوٹتی رہتی تھی۔میرا دل دنیا سے اچاٹ سا ہو گیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ میں سب سے کھنچا کھنچا سا رہتا تھا۔ایک بات میں نے محسوس کی کہ بشریٰ مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔وہ خوبصورت تھی، اس قابل تھی کہ بندہ خود کو گنوا کر اسے حاصل کر لے۔اس کا رنگ گورا نہیں تھا لیکن خوبصورتی رنگ گورے سے کب مشروط ہے۔اس کا جسم ایک سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ایک بار دیکھ کر دوسری بار نظر کو روکنا مشکل ترین تھا۔جب بھی وہ ملتی۔میرا بڑا خیال رکھتی۔میں اس سے دور ہی رہتا۔لیکن اس سے اس کی خدمت میں کوئی فرق نہ پڑتا۔وہ جب بھی شہر آتی اپنی بھابھی سے یعنی رابعہ سے مل کر جاتی۔اکثر میرا اس سے سامنا ہو جاتا۔وہ کوئی نہ کوئی تحفہ میرے نام کا مجھے دے جاتی۔کبھی پرفیوم، کبھی رومال، ایک بار پرس بھی دیا۔جمعہ کا دن تھا مجھے چھٹی تھی۔جمعہ پڑھنے کے بعد میں گھر میں لیٹا ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا جب تائی اور بشریٰ آئیں۔وہ بازار شاپنگ کرنے آئی تھیں۔امی کو ساتھ لے کر جانا تھا۔امی

واش روم میں تھی۔ رابعہ چائے بنانے لگی ۔تائی نماز پڑھنے لگی۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گی۔

"آپ سے ایک بات کرنا تھی۔"

"میں نے کب روکا ہے۔"

"آپ کیا بننا چاہتے تھے؟"

"سچ بتاؤں۔"

"ہاں۔"

"مجھے خود اس بات کا علم نہیں ہے۔ میں نے کبھی دولت کو اتنی اہمیت نہیں دی۔ اور مزے کی بات بتاؤں ۔"

"جی۔"

"دولت نے بھی مجھے کبھی اہمیت نہیں دی۔" میری اس بات پر وہ کھل کھلا کر ہنسی۔

"مجھے پتہ ہے آپ میں یہی تو انفرادیت پائی جاتی ہے۔"

"ورنہ میں نے تو جتنے لوگ دیکھے ہیں۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں ۔ایک جیسی باتیں کرتے ہیں ۔ایک جیسی خواہشات ہوتی ہیں۔ دولت کے بچاری ۔" اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔

میں نے کہا "دولت اتنی بری چیز بھی نہیں ہے۔"

"ہاں آپ سچ کہتے ہیں۔"

"سب کچھ دولت نہیں ہے اور زندگی صرف دولت کے سہارے نہیں گزاری جاتی۔ خاص کر ایک لڑکی ایسا نہیں سوچ سکتی دولت مند آدمی ہر وقت دولت کی باتیں کرتا ہے۔ اسے اپنی دولت پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ وہ مزید دولت جمع کرنے کے لیے بھاگتا رہتا ہے۔ وہ بے حس ہو جاتا ہے۔ اسے رفتہ رفتہ اپنے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ انسانیت کا دکھ و کرب اس میں نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ عورتیں ہی زیادہ دولت کی پجاری ہوتی ہیں ۔مرد سے شادی کی بجائے ۔وہ مکانات ، بینک بیلنس ،کار دیکھتی ہیں ۔زمانے میں یہ ہی ہے ۔یہ ہی دیکھا جاتا ہے ۔باقی سب کہنے کی باتیں ہیں۔ لڑکیاں دولت کو دیکھتی ہیں ۔ان کو اپنے کپڑوں اور نمائش کا شوق ہوتا ہے اور یہ دولت کے بنا ممکن نہیں ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "سب ایسی نہیں ہوتیں۔"

میں نے ہاتھ چھڑا لیا۔ "تم ایسا کہہ سکتی ہو کیونکہ تم نے غربت دیکھی کہاں ہے۔"

اس نے میری بات سے اختلاف نہیں کیا۔

"میں تو اتنا جانتی ہوں۔ اصل چیز شوہر کی محبت ہوتی ہے۔"

"اچھا بابا تم کوئی غریب آدمی دیکھ کر اس سے شادی کرنا۔"

نہ جانے میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"میں نے ایسا مرد تلاش کر لیا ہے ۔وہ بہت اچھا ہے۔ سندر ہے۔ بہت محبت کرنے والا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کوئی اور بسا ہوا ہے۔ جو بسا ہے وہ اب اس کا نہیں ہے ۔لیکن وہ اب بھی اسی کا ہے ۔بے وقوف کہیں کا۔ ایک دن اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوگا ۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ لیکن وہ دروازے سے نکل گئی ۔میں نے کتاب کو ایک طرف رکھا اور ادھ کھلے دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ وقت نے مجھے بھی وقت دے دیا تھا۔



اس شام میں نے بشریٰ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارا گاوں شہر سے متصل تھا۔ بشریٰ کے گھر جانے کے لیے تین چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ علیم عالی وغیرہ جب بھی شہر آتے تو ہمارے گھر ہو کر جاتے ۔ہمیں ان کے گھر جانے کے لیے اسپیشل جانا پڑتا تھا۔ ۔اب اس سے ملنے کے پروگرام بناتا۔ ایسے ہی سوچتے ہوئے کہ اس جمعہ کو جاوں گا۔ جمعہ جمعہ کرکے کئی ماہ گزر گے ۔پھر ماہ رمضان آ گیا۔ روزہ رکھ کر کام پر جاتا ۔وہاں سے دو بجے چھٹی کر کے گھر آ جاتا۔ اس وقت تک روزہ بھی لگ جایا کرتا۔ یہ بھی جمعہ کا ہی دن تھا۔ عید میں چند دن باقی تھے۔

میں نے نہا کر کپڑے پہنے اور کلثوم کے بتائے ہوئے طریقے سے مانگ نکالی۔ اور دھوپ میں کرسی

نکال کر بیٹھ گیا۔ گھر میں ایک پرانی کتاب پڑی ہوئی تھی ۔میں اسے پڑھنے لگا۔اس کا نام اور ٹائٹل پھٹا ہوا تھا۔ اس میں بڑی حیرت انگیز باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ یہ ابو کی کتاب تھی۔اسے پڑھنے کے دوران میں نے سوچا میرا علم کتنا ناقص ہے۔ہم مادی وجود کو انسان خیال کرتے ہیں اس میں لکھا تھا۔ اصل انسان مادی وجود نہیں ہے بلکہ روح ہے ۔روح کا لباس مادی وجود ہے۔ مادی وجود ختم ہو جاتا ہے ۔جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا لباس مادی وجود ہے مادی وجود ختم ہو جاتا ہے۔جسم سے کیا چیز نکل جاتی ہے،اس میں سے روح نکل جاتی ہے۔ مصنف نے بڑی دلیلوں سے یہ بات ثابت کی تھی کہ انسان اصل میں روح ہے۔دوسرے باب میں بتایا گیا تھا کہ روح کیا ہوتی ہے۔نظر نہیں آتی ۔قرآن وحدیث نبوی ﷺ میں روح کے متعلق بتایا گیا تھا کہ روح اللہ کا امر۔''اے محمد ﷺ لوگ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں کہدو روح اللہ کا امر ہے۔پھر لکھا گیا تھا کہ ''اللہ کا امر یہ ہے کہ وہ جب ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے''(القرآن)۔میں نے پوری یکسوئی سے کتاب کا مطالعہ کیا اور یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ دنیا تمام کی تمام اللہ کا ارادہ ہے۔ اللہ کا ارادہ ہی اسے زندہ رکھے ہوئے ہے یہ انسان حقیقت میں روح ہے اور روح لباس بدلتی ہے۔دنیا میں اس کا لباس مادی جسم ہے۔قیامت کے بعد اسے لباس دیا جائے گا۔چونکہ یہ باتیں قرآن وحدیث کی رو سے تھیں اور سائنس کی روشنی ودلائل سے ثابت تھیں اس لیے بالکل سچ تھیں ۔کتاب پڑھنے میں میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے علم ہی نا ہو سکا کب بشری وغیرہ ہمارے گھر آئے تھے۔کب وہ میرے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔

''اب بس کریں آپ حفظ ہی کرنے لگے۔''علیم عالی کی آواز سن کر میں چونکا۔اچھی خاصی دھوپ چڑھ آئی تھی۔

ساتھ ہی رابعہ اور بشری کھڑے تھے۔اب علیم عالی بھی بہانے بہانے سے ہمارے گھر کے چکر لگایا کرتا تھا ۔ایک بار مجھے حمید نے کہا تھا کہ اسے روک دینا چاہیے ۔لیکن میں نے حمید کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔

''ہم نے اپنی بہن کی اس سے منگنی کردی ہے۔اب اگر وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں تو اس میں برائی کیا ہے۔ہمیں چاہیے کہ ان کی شادی جلد کر دیں ۔روک دینا اس مسئلے کا حل نہیں بلکہ یہ مستقبل کے لیے ایک مسئلہ بن جائے گا۔''میری بات بھائی کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

''مجھے پتہ ہی نہیں چلا آپ کب آئے۔''میں نے اٹھتے ہوئے عالی سے کہا۔

''مجھے اس بات کا بھی پتہ ہے۔آپ تو یہاں رہتے ہی نہیں۔خیالوں میں رہتے ہیں۔آپ کو اپنے اردگرد کا کچھ ہوش نہیں ہوتا۔ بیٹھے بیٹھے خیالوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ہمارے آنے کی خبر کیسے ہوتی۔''

بشری نے گہری چوٹ کی۔رابعہ ہنسنے لگی۔حمید نے اسے گھور کر دیکھا۔میں نے حمید کو۔عالی کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''اصل میں کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ کیا بتاوں۔'' میں نے انہیں ملتے ہوئے کہا۔''اس میں انسان ،روح،مادی جسم یعنی انسان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔''

''اس کا کسے علم نہیں ہے۔''عالی نے کہا۔

''مجھے علم نہیں تھا۔اس کا۔''میں سچ بولا

''چلو بازار چلتے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ہم سب کزن بازار میں تھے۔

میرے خیالوں میں اب کلثوم آتی تو ساتھ ہی بشری کا خیال آ جاتا۔ماہ رمضان گزر گیا۔وہ عید کا دن تھا جب ہم بھائی عید کی نماز ادا کر کے گھر آئے تو تائی جان ،بشری اور کفیل ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔رابعہ خوشی سے بھاگی پھر رہی تھی۔میں کفیل اور حمید امی کے اور تائی کے پاس جا بیٹھے۔بشری اور رابعہ کھانا تیار کرنے لگیں ۔اس دن میں بھی خوب ان سے باتیں کرتا رہا۔ہم نے جی بھر کر قہقہے لگائے۔ایسے ہی کسی کام کے سلسلے میں ہمارے پاس سے بشری گزر رہی تھی۔مجھ سے نظر ملی تو میں نے بائیں آنکھ بند کر کے کھول لی۔اس کو آنکھ مارنا

کہتے ہیں۔ یہ سوچ کر میں مسکرا دیا۔ بشریٰ کے چہرے پر حیرت بکھر گئی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ برسوں بعد ایسی شوخی مجھ میں لوٹ کر آئی تھی۔ بشریٰ سے میری اچھی دوستی تھی۔ وہ میری ہمراز بھی تھی اس کا منگیتر شہید ہو چکا تھا۔ جو میرا واحد دوست تھا۔ اس کے بعد عالی سے دوستی ہوئی تھی۔ میری محبوبہ کی کسی اور سے منگنی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں محبت کر چکے تھے۔ اور ایک کو حالات نے دوسرے کو قسمت نے شکست دی تھی۔ دونوں کا غم کسی حد تک مشترک تھا۔ میں نے اب اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اس سے اظہار ضروری تھا۔ جس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ اس کے بعد جب بھی کسی کام سے ہمارے پاس سے گزری مجھے گہری نظروں سے دیکھتی۔ میں شریری مسکراہٹ چہرے پر سجائے ادھر ادھر دیکھتا رہتا۔ کھانا کھانے کے دوران بھی میں نے ایک بار ایسا ہی کیا تو وہ اچھی خاصی کنفیوز ہو گئی۔ دوسری تبدیلی یہ آئی کہ آج اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ نا ہی میں نے کوئی بات اس سے کی۔ اس کے چہرے پر حیرانی، الجھن کے رنگ تھے۔ وہ اچھی خاصی بے چین ہو گئی تھی۔

جانے سے تھوڑی دیر قبل جب میں ان کو چھوڑ کر آنے کے لیے بائیک نکال رہا تھا۔ بشریٰ سب سے پہلے باہر آ گئی۔

"خرم۔"

"ہاں۔"

"آج بہت اچھے لگ رہے ہیں آپ ایسے ہی خوش رہا کریں۔" میں نے کہیں پڑھا ہوا فقرہ اسے سنا دیا۔

"آدمی ہی آدمی کے لیے بہار و خزاں ہوتے ہیں۔" اس کے چہرے پر حیرانی گہری ہو گئی۔ میں نے مزید کہا "اس دنیا میں آدمی بہت کم ملتے ہیں اور جب مل جائے تو پھر ایسے ہی بہار چہروں پر آ جاتی ہے جیسی آج میرے چہرے پر آئی ہے۔"

اس نے سٹ پٹا کر مجھے دیکھا۔ "میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کس سے۔" وہ جلدی سے بولی

"تم سے۔ امی کو بھیج دوں گا جلد۔" اس نے منہ پھیر لیا۔ کیونکہ دروازے پر کفیل نمودار ہو رہا تھا لیکن وہ آہستہ سے مجھے "اچھا" کہنا نہیں بھولی۔

انہی دنوں بشریٰ نے مجھے خط لکھا تھا۔ کافی لمبا تھا۔ میں یہاں خاص بات لکھ رہا ہوں۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے خود کو بدلنا شروع کر دیا ہے اور کافی بدل لیا ہے۔ میں آپ کے چہرے پر وہ مسکراہٹ دیکھنا چاہتی ہوں جو صرف میرے لیے ہو۔"

اس خط کے بعد میں نے خود پر نقاب ڈال لیا۔ اس نقاب پر یا اپنے چہرے پر جو چہرا سجایا اس پر مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ دوسروں کے لیے تھی۔ مجھے دوسروں کے لیے جینا تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ "جب انسان بہت زیادہ دکھی ہو جائے کہ دکھ ہڈیوں میں جسم سے گزر کر روح میں اتر جائے تو چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی ہے اس سے بڑھ کر کیا نقاب ہو سکتا ہے۔"

پھر سب کچھ بہت جلد ہو گیا۔ بشریٰ کے رشتے کا انتظار تھا۔ جیسے ہی وہ طے ہوا۔ ہمارے خاندان میں ایک ساتھ تین شادیاں ہوئیں۔ بس فرق یہ پڑا تھا کہ بشریٰ بیاہ کر ہمارے گھر آ گئی تھی۔ اور رابعہ تایا جان کے گھر چلی گی۔ لیکن کفیل بھائی سسرال چلے گئے۔

اس رات جس کو سہاگ رات کہتے ہیں میں نے بشریٰ نے خوب باتیں کیں، وعدے کیے۔ ساتھ رہنے کے خواب دیکھے۔ وہی باتیں جو دو پیار کرنے والے کرتے ہیں۔ جن باتوں میں کچھ نہیں ہوتا اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی خدمت ہمدردی، الفت، احساس، وغیرہ جیسے پاکیزہ اور انمول خیالات احساسات۔ اس کا خواب پورا ہو گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ خواب تو کفیل کا بھی پورا ہو گیا تھا اور کلثوم کا بھی۔ عالی اور رابعہ کا بھی۔ لیکن میرا خواب پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ خواب جو میں نے بہت شدت سے برسوں دیکھا تھا۔ اب اس بات کو پچیس سال گزر گئے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اس خواب کے پورا نہ ہونے کا دکھ جاگ جاتا ہے۔



گھر واپسی

عارف شیخ

وہ خود سماج دشمن تھا جیل کاٹ چکا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور بھی اس کی طرح بنے۔

مختصر لیکن دلچسپ انوکھے انجام کی کہانی

ٹرین نے طویل سفر کے بعد تھکے ہوئے انداز میں کراچی کینٹ پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ ریل کے رکتے ہی عوامی ہجوم پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ لال کپڑے پہنے قلی بھی اترنے والے مسافروں کی جانب لپک رہے تھے۔

وہ بھی ٹرین سے باہر آ گیا تھا۔ نوجوان عمر کا صحت مند لڑکا شلوار قمیص میں ملبوس اپنے مختصر سامان کے ساتھ متفکر نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ قلی اس کے نزدیک آیا ضرور لیکن اس کا مختصر سامان دیکھ کر وہ دوسری طرف نکل گیا۔ اس نے بھی انتظار نہیں کیا اور وہ لوگوں کی بھیڑ میں اپنی جگہ بناتا ہوا اسٹیشن سے باہر آ گیا اب اس کا سامنا سواری کے منتظر ٹیکسی ڈرائیوروں سے ہوا لیکن وہ ان چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسٹیشن کی حدود سے پیدل ہی کافی دور چلتا چلا گیا۔

اس نے فٹ پاتھ پر سامنے آنے والے شخص سے پوچھا۔ ''بھائی صاحب یہ سمندر کی طرف کون سی بس جائے گی۔''

اجنبی نے اسے بغور دیکھا۔ ''کون سا سمندر؟ یہاں تو کئی سمندر کے کنارے ہیں۔''

''جہاں کام مل جائے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مزدوری کی تلاش ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

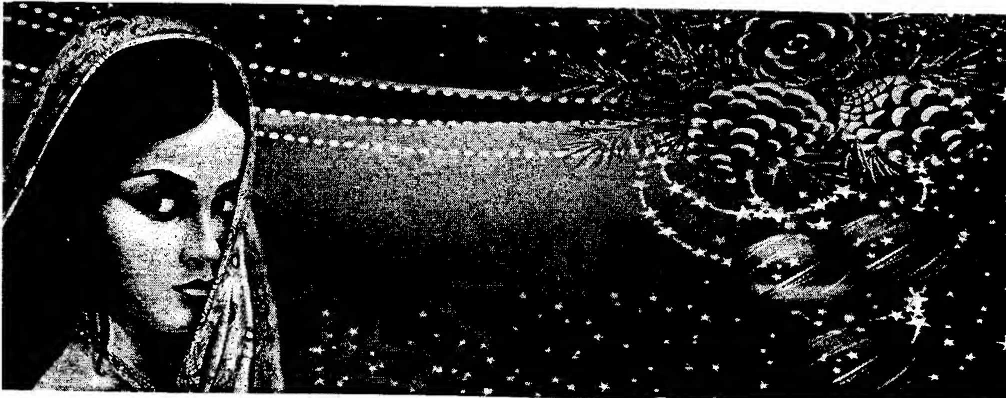
اجنبی نے اسے کیماڑی کی طرف جانے والی بس سے متعلق معلومات دی اور دونوں اجنبی اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔

وہ ایک گھنٹے کے بعد کیماڑی کے علاقے میں تھا جہاں اسے اپنے گاؤں کے ایک آدمی کو تلاش کرنا تھا' اس گاؤں والے سے متعلق لوگوں سے سوالات کیے تو اسے کچھ ہی دیر بعد پتا چل گیا کہ اس کے گاؤں کا رہبر جس نے اسے کام دلوانے کا وعدہ کیا تھا وہ تو گاؤں واپس چلا گیا تھا۔ یہ لمحہ اس کے لیے سخت پریشانی کا تھا لیکن وہ ناکام ہو کر گاؤں واپس نہیں جانا چاہتا تھا' وہ گاؤں جہاں اس کی ماں تھی' اس کے دو چھوٹے بھائی بہن تھے' جہاں وہ لڑکی تھی جس سے اسے محبت تھی اور اس کے ساتھ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ ان سب سے وہ وعدہ کر کے اس شہر میں آیا تھا۔ اسے اپنے وعدے پورے کرنے تھے اور پہلے ہی قدم پر اسے شکست ہوئی تھی۔

وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ جہاں سامنے سے گاڑیاں آ جا رہی تھیں اور پیچھے سے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنی دھن میں آ جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے جو اسے مایوسی کے سمندر میں لے جا رہے تھے۔

اس نے جوش سے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے آنسو خشک کیے اور خود کلامیہ انداز میں بولا۔ ''نہیں مجھے ناکام گاؤں نہیں جانا ہے' مجھے کوشش کرنا ہے۔'' وہ اتنے جوش میں تھا کہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اب وہ اس سمت بڑھ رہا تھا جہاں چائے اور کھانے کا ہوٹل تھا۔ جہاں اس کے خیال میں مزدور تھے وہیں اسے



کام بھی مل سکتا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر جا کر سیدھا سوال کیا۔

''مجھے مزدوری کرنا ہے کوئی کام مل سکتا ہے۔''

کاؤنٹر پر بیٹھا فربہ اندام شخص جو اس اچانک سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا بولا۔ ''بے روزگار ہو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مشکل ہے لیکن پورٹ کے گیٹ پر جاؤ وہاں کافی لوگ مزدوری کے لیے بیٹھتے ہیں' ٹھیکے دار آتا ہے مزدور کی تلاش میں' وہیں تمہارا کام بنے گا۔'' ہوٹل والے نے بتایا۔

اس نے مزید بات کرنے کی کوشش نہیں کی' وہ جانے کے لیے گھوما اور ایک لمبے تڑنگے شخص سے ٹکرایا۔

''معاف کرنا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''معاف کیا۔'' وہ ساکت چہرے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے آگے بڑھنے کے لیے راستہ بنانے کی کوشش کی لیکن وہ اجنبی جو شکل کے اعتبار سے بدشکل بلکہ بھیانک تھا وہ راستے میں حائل تھا۔

اس سے قبل کہ وہ سائڈ سے نکل جاتا' وہ بدصورت شخص بولا۔

''کام چاہیے۔''

اس خوفناک شکل والے شخص کے اس جملے نے اسے خوبصورت بنا دیا تھا۔

بے ساختہ اس کا سر ہاں میں ہل گیا۔ چہرے پر خوشی کی لہر کوندنے لگی۔ آنکھوں میں مایوسی کی جگہ زندگی لوٹ آئی۔

''کام کرنا ہے۔'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں...... ہاں۔'' وہ بولا۔

وہ بدشکل اجنبی اسے ہوٹل کے کونے میں موجود ایک میز پر لے آیا۔ ''میرا نام ابراہیم ہے۔'' اس نے تعارف کرایا۔

''میں صفدر ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

ان دونوں کے درمیان مصافحہ ہوا پھر ابراہیم نے کھانے کا آرڈر دیا اور صفدر کو کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ کھانے کے دوران دونوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔

''خوب تو گاؤں میں تمہارا پورا خاندان ہے۔'' ابراہیم نے کہا۔ ''میں تو اکیلا شخص ہوں۔''

''مجھے کام مل جائے گا۔'' صفدر مقصد کی طرف آیا۔

''مل گیا سمجھ۔'' ابراہیم بولا۔ ''کیا کرے گا شہر کی کمائی کا۔''

''میرا گھر کچا ہے بارش اور دوسری مصیبتوں میں وہ بھی ایک عذاب بن جاتا' سب سے پہلے گھر کو پکا کروں گا' پھر اپنے بھائی بہن کو اسکول داخل کرواؤں گا اور شادی بھی کروں گا وہ میرے انتظار میں بیٹھی ہے۔'' وہ رکا پھر بولا۔ ''لیکن میں پہلے لمبے عرصے شہر میں نہیں رہوں گا' مجھے گاؤں میں دکان کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''میں کب سے کام پر جاؤں گا۔''

''آج ہی رات سے۔'' وہ بولا۔

اس نے سوچا رات سے یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن وہ خاموش رہا اب اسے کام پر جانے کا انتظار کرنا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ابراہیم اسے لے کر اپنی کھولی پر آیا جہاں اسے سو جانے کا مشورہ دیا۔ وہ بھی کیونکہ تھکا ہوا تھا اور پھر ابراہیم نے اسے اچھا سا پیٹ بھر کھانا بھی کھلایا تھا اس لیے اس نے بھرپور نیند لی۔ وہ اس وقت جاگا جب ابراہیم نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔

''چلو کام پر چلنا ہے۔''

کام پر جانے کا سن کر اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں اس کھولی سے باہر آئے تو صفدر نے دیکھا کہ ان کی سواری کے لیے ایک موٹر سائیکل تیار کھڑی ہے۔ وہ لوگ اپنی سواری پر سوار ہو کر ایک سمت چل دیئے۔

صفدر نے دیکھا کہ وہ اکیلے ہی مسافر تھے' جو منزل کی طرف جا رہے تھے راستے کا سناٹا اس بات کا غماز تھا کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ اس کے دماغ میں کئی سوالات جنم لے رہے تھے لیکن وہ کوئی بات زبان پر نہیں لا رہا تھا۔

وہ دونوں ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سمندر تھا' دور دور تک ویرانی کا راج تھا۔ ان دونوں کے علاوہ کوئی جاندار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک مخصوص جگہ پر پہنچ کر موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا گیا تھا۔ اب انہوں نے چند فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کیا اس کی وجہ ریت تھی جس پر موٹر سائیکل نہیں چل سکتی تھی۔

ایک ٹیلے کے پاس پہنچ کر ابراہیم نے اپنے لباس میں چھپی ہوئی بڑی سی ٹارچ نکالی اور سمندر کی طرف رخ کر کے اسے جلانے بجھانے لگا' صفدر یہ سارا عمل بڑی حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سمندر کی طرف سے بھی اسی طرح روشنی جل اور بجھ رہی ہے تھوڑی دیر میں اسی سمجھ آ گیا کیونکہ ایک چھوٹی سی کشتی پانی کی لہروں پر چلتی ہوئی کنارے پہنچ گئی تھی اس کشتی پر دو افراد سوار تھے۔

وہ دونوں ابراہیم کے پاس آ گئے۔ ''یہ کون ہے اور تاجو کہاں ہے۔'' انہوں نے دو سوال کیے تھے۔

''تاجو سخت بیمار ہے وہ اس وقت کام کے قابل نہیں ہے۔'' ابراہیم نے تفصیل دی۔ ''یہ نیا ہے لیکن بھروسے کا ہے۔'' ابراہیم نے صفدر کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارے بھروسے کا ہے ہم کیسے بھروسہ کریں۔'' وہ صفدر کو گھور رہے تھے۔

''مجبوری ہے۔'' ابراہیم نے کہا۔ ''بھروسہ نہیں تو اپنا مال واپس لے جاؤ۔''

''غصہ مت کرو۔ ہمارے کام میں خطرہ ہوتا ہے اس لیے پوچھ گچھ ضروری ہوتی ہے۔ تمہارے اعتبار کا ہے تو پھر کام چلے گا۔'' ان دونوں میں سے ایک نے معاملہ سنبھال لیا۔ شاید وہ ابراہیم کے غصے سے واقف تھا۔

''مال کہاں ہے؟'' ابراہیم اب مقصد کی بات پر آیا۔

''ادھر ہے۔'' جواب آیا اور پھر ایک آدمی کشتی میں سے ایک بکس لے کر آیا بکس کے وزن سے اندازہ تھا کہ وہ کافی وزنی ہے۔

صفدر نے دیکھا کہ کشتی میں آنے والے دونوں اجنبیوں نے ابراہیم کو بکس دے دیا اور ابراہیم نے بدلے میں نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی ان کی حوالے کر دی۔ اس کے بعد وہ دونوں کشتی سوار وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔

''اس ڈبے میں کیا ہے؟'' صفدر نے آخر کار چپ کا روزہ توڑ ڈالا۔

''وہسکی کی بوتلیں۔''

''وہ کیا ہے؟'' صفدر کچھ سمجھا نہیں۔

''شراب کی بوتلیں۔''

''یہ تو غلط ہے۔'' وہ چونکا۔

''تمہارے گاؤں میں غلط ہوگا۔'' ابراہیم نے سمجھایا۔ ''یہ شہر ہے یہاں پر یہ کام برا نہیں ہے۔''

''پھر رات کی تاریکی میں چھپ کر کیوں کر رہے ہو؟''

''اب کوئی سوال نہیں ہوگا۔'' ابراہیم نے غصے سے کہا۔

صفدر نے کچھ اور پوچھنے کے لیے لب وا کیے لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ دونوں وہاں سے روانہ ہوئے تو ان کا سفر اس سنسان ساحل ہی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بیس منٹ کی مسافت کے بعد وہ لوگ سڑک کے کنارے ایک مقام پر پہنچ گئے جہاں ایک کار

موجود تھی۔ ابراہیم نے وہ بکس کار کی ڈگی میں رکھا اور کار وہاں سے چلی گئی لیکن جانے سے قبل کار کے مالک نے ابراہیم کو ایک لفافہ دیا تھا۔

ابراہیم نے ایک جگہ بیٹھ کر لفافے سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اسے گننے لگا' صفدر یہ سارا عمل دیکھ رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ بڑے نوٹوں کی شکل میں ابراہیم کے ہاتھ میں ایک بڑی رقم موجود تھی۔

''تم لکی ہو۔'' ابراہیم نے نوٹوں کی گڈی اپنی جیب میں ڈالی۔ ''تاجو میرا ساتھی اگر بیمار نہیں ہوتا تو تم بھی یہاں نہیں ہوتے۔''

''کیا تم کو پولیس نہیں پکڑتی۔'' صفدر نے پوچھا۔

''کئی بار جیل گیا ہوں' لیکن پھر واپس آ کر یہی کام کرتا ہوں۔'' ابراہیم نے کہا۔

صفدر کی زبان تو خاموش ہو گئی لیکن دماغ میں سوچوں نے ڈیرے ڈالے اور وہ خیالوں کے تانے بانے بننے لگا۔

''اگر ابراہیم کے پاس جو رقم ہے وہ مل جائے تو میں فوراً واپس گاؤں چلا جاؤں۔'' وہ سوچوں میں گم تھا۔ ''یہ اتنے پیسے ہیں کہ میرے تمام کام ہو جائیں گے۔''

ابراہیم نے خاموش صفدر کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر شاید اٹھارہ انیس سال ہو گی۔ وہ سوچنے لگا۔ ''اگر یہ جیل گیا تو کیا ہو گا۔

''میری ماں اور میری ہونے والی بیوی میرے شہر آنے کے خلاف تھیں۔'' صفدر مطلب کی بات پر آیا۔ ''میں اگر واپس لوٹ جاؤں تو سب خوش ہو جائیں گے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن میں ناکام واپس نہیں جانا چاہتا۔''

''کیا میں اس معصوم کو مجرم بنا دوں۔'' ابراہیم نے سوچا۔ ''یا پھر اس کی مدد کر کے اسے واپس اس کے گاؤں بھجوا دوں۔''

''میں اگر کسی طرح اس سے یہ رقم چھین لوں تو پھر میں اسی وقت یہاں سے گاؤں بھاگ جاؤں گا۔'' صفدر نے پلان بنایا۔

ابراہیم نے اب اپنی موٹر سائیکل کی طرف جانا شروع کیا۔ ''مجھے اس لڑکے کی مدد کرنی چاہیے۔'' وہ اپنے اٹھتے قدموں کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ ''میں تو مجرم ہوں جیل بھی جاتا ہوں' پھر دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے میں بالکل اکیلا ہوں۔ اس کی تو ماں اور چھوٹے بہن بھائی ہیں اور پھر اس کی شادی بھی ہونے والی ہے۔''

صفدر ابراہیم سے چند گز کی دوری پر اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ یہ میری مدد نہیں کرے گا' مجھے اس سے یہ رقم چھین لینی چاہیے' وہ اپنی سوچ کو فیصلہ دے رہا تھا۔ لیکن کیسے چھینوں یہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے' ہاں اگر میں پیچھے سے حملہ کر کے اسے زخمی کر دوں تو شاید یہ ساری رقم میرے ہاتھ آ جائے گی اور میں پہلی گاڑی سے گاؤں نکل جاؤں گا۔

مجھے اس لڑکے کو مجرم بنانے سے بچانا ہے۔ ابراہیم نے بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ میں تو پھر کما لوں گا۔ بس ٹھیک ہے میں اس لڑکے کو صبح کی پہلی ٹرین سے اس کے گاؤں بھجوا دوں گا۔''

صفدر بھی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور دو تین لمبے قدم بھر کر ابراہیم کی پشت پر پہنچ گیا۔ جیسے ہی صفدر نے اس کی پشت پر وار کیا اسی لمحے ابراہیم اسے یہ بتانے کے لیے گھوما تھا کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔

صفدر کا بھرپور وار ابراہیم کے سر پر پڑا' ابراہیم کا ہاتھ آگے آیا اس میں بڑے نوٹوں کی گڈی تھی جو صفدر کی طرف بڑھائی اور پھر ابراہیم لڑکھڑا کر گرا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

''یہ تو خود ہی مجھے یہ رقم دے کر گھر بھیج رہا تھا۔'' ابراہیم کمزور آواز میں بولا۔

''لیکن تم نے...... یہ لے'' اس نے نوٹوں کی گڈی صفدر کی طرف بڑھائی۔ ''گاؤں چلا جا جیل مت جانا۔''

اس واقعے کو کئی گھنٹے گزر گئے' ابراہیم مر چکا تھا' صفدر خود ہی تھانے آ گیا جو رقم ابراہیم اسے خود دے رہا تھا اس کی خاطر اس نے ابراہیم ہی کو مار ڈالا تھا' ابراہیم صفدر کو جیل سے بچانا چاہتا تھا لیکن صفدر ابراہیم کے قتل کے جرم میں جیل جا چکا تھا۔



آنچ

وسیم بن اشرف

محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے یہ جملہ آپ نے ہر عاشق کے منہ سے سنا ہوگا کیونکہ لوگ محبت میں خودغرض ہو جاتے ہیں ایسے میں انہیں اپنی ذات سے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔

ایک نوجوان کی روداد، اس نے اپنی محبت پانے کیلئے انوکھا منصوبہ بنایا تھا

ڈور بیل بجنے پر جیسے ہی صفدر نے دروازہ کھولا ایک خنجر بردار نوجوان نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا، چوکھٹ پر ٹھوکر لگی وہ گرنے سے بچ گیا، جونہی وہ دروازہ سے باہر آیا چٹاخ، پٹاخ، تڑاخ، کی آوازیں گلی میں گونج اٹھیں، نوجوان نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی، گھونسوں، ٹھڈوں اور ٹکروں سے اس کا انجر پنجر ہلا کر رکھ دیا، ابھی دھنائی جاری تھی کہ اڑوس پڑوس کے چند افراد وہاں جمع ہو گئے، کچھ راہگیر بھی تماشا دیکھنے کے لئے رُک گئے، محلہ داروں نے بمشکل بیچ بچاؤ کرایا۔ خنجر بردار اسے جان سے مارنے پر تلا ہوتھا، اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص بھی بندوق تھامے کھڑا تھا۔ صفدر سمیت کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ آخر بات کیا ہے؟ خنجر بردار کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا، بندوق تھامے جو شخص کھڑا تھا غصہ سے اس کی تیوریاں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔

"رفیق بھائی کیا ہوا" ایک محلے دار نے ادھیڑ عمر شخص کو پہچانتے ہوئے پوچھا۔

"اسی لوفر سے پوچھو، نہیں بتائے گا تو ہم اگلوا لیں گے" ادھیڑ عمر شخص کے بجائے خنجر بردار غصیلے لہجے میں بولا۔

"کیا بات ہے صفدر، کیوں یہ لوگ تمہیں مارنے پر تلے ہوئے ہیں" اس کے ہمسائے بابر انصاری نے پوچھا، صفدر اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے نظریں جھکائے کھڑا تھا، منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا یا تو زبان پر زخم آیا تھا یا پھر تابڑتوڑ مکوں سے ایک دو دانت اپنی جگہ سے ہل گئے تھے، اس نے ایک طرف منہ کر کے تھوک اُگلا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

"جج، جناب، مم میں کک کیا بتاؤں، اس نے منہ میں جمع ہونے والا خون دوبارہ تھوکا اور کچھ بولنے ہی والا تھا کہ ایک اسکوٹر پاس آ کر رُکا، صفدر کے والد عابد علی تھے، کسی نے انہیں فون پر اطلاع کر دی تھی، انہوں نے پہنچنے میں دیر نہ لگائی، لوگوں کی بھیڑ میں راستہ بناتے وہ آگے آئے تو بیٹے کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گئے، کپڑے لیرو لیر ہو چکے تھے، ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا، آنکھوں پر چوٹوں کے نشان نمایاں تھے، رخسار سرخ ہو چکے تھے۔

"کس نے کیا اس کا یہ حشر؟" وہ پریشانی کے عالم میں بولے۔

"ہم نے کیا۔" خنجر بردار نے دھڑلے سے جواب دیا۔

"مگر کیوں، کیا ہوا؟" وہ بھی دوسروں کی طرح حقیقت سے لاعلم تھے۔

"اپنے اس ہیرو بیٹے سے پوچھو۔" رفیق نے بندوق سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

عابد علی 55 سال کے زیرک شخص تھے، حالات و واقعات ایک خاص سمت اشارہ کر رہے تھے، "چلو بھئی جاؤ اپنا اپنا راستہ ناپو" انہوں نے راہگیروں کو چلتا کیا اور گھر میں داخل ہو کر بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

اندر آ جائیں، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" انہوں نے نوجوان، اس کے باپ اور محلہ کے جمع ہونے والے



معززین کو بھی اندر بلا لیا، بیٹھک میں پنچایت کا ماحول بن گیا۔ ''جاؤ منہ دھو کر کپڑے بدل کر آؤ۔'' انہوں نے بیٹے کو حکم دیا، 20 منٹ بعد صفدر بھی بیٹھک میں موجود تھا۔

بابر انصاری نے عابد علی کو بتایا ''یہ رفیق بھائی ہیں، مویشی منڈی میں جانوروں کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں، یہ ان کا بیٹا جاوید ہے، صفدر کے ساتھ ان کی مار پیٹ کی وجہ ہمیں نہیں معلوم، ابھی ہم نے بیچ بچاؤ کرایا ہی تھا کہ آپ پہنچ گئے، حقیقت تو یہی بتائیں گے''۔

''ہاں بھائی بتاؤ کیوں صفدر سے مار پیٹ کی۔'' ایک بزرگ محلے دار نے پوچھا۔

''دیکھو بزرگو، ایک بات بتاؤ! کیا بہن بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔'' رفیق بولا۔

''ہاں پتر تو درست کہتا ہے، عزت سب کی برابر ہوتی ہے'' بزرگ خورشید بیگ نے جواب دیا۔

لیکن اس لڑکے کو اس کے بڑوں نے شاید یہ بات نہیں سمجھائی۔'' رفیق نے بات جاری رکھی۔

''میری بیٹی یونیورسٹی جاتی ہے اور یہ روزانہ اس کے راستے میں ہیرو بن کر عشق جھاڑنے کھڑا ہو جاتا ہے، جو آج صبح ہوا وہ اسی کی زبانی سن لیں اور پھر یہاں موجود تمام لوگ خود ہی فیصلہ کر لیں کہ کیا غلط اور کیا صحیح ہوا''۔

''بتا پتر صفدر، جھوٹ بولنے کی تمہارے پاس گنجائش نہیں۔'' بزرگ نے کہا۔ وہ شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا، بالآخر بولا۔

''گلی میں سے جو لڑکی گزرتی تھی، مجھے بہت اچھی لگتی تھی، میں نے آج اس سے اظہار محبت کر دیا، لڑکی نے مجھے تھپڑ دے مارا اور اب جو ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔''

عابد علی کا سر اور جھک گیا۔ بیٹے کے کرتوت نے ان کی عزت کی دھجیاں بکھیر دی تھیں، محلے دار انور علی جو کسٹم میں

ملازم تھے بولے۔

''رفیق صاحب! اس لڑکے کی اس بے ہودہ حرکت پر ہم سب آپ سے معافی مانگتے ہیں، آئندہ آپ کو شکایت نہیں ملے گی، اس کو جو سزا مل گئی، میرا خیال ہے اس کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے، اب آپ اسے معاف کردیں''۔

''آپ سب معزز افراد ہیں، محلے دار بھی ہیں، ہم نے اسے معاف کیا لیکن یہ اپنی زبان سے میری بیٹی کو بہن بولے۔'' رفیق مشروط معافی دے رہا تھا، عابد علی گم صم بیٹھے تھے، اتنے میں ایک لڑکا مشروب کی بوتلیں لے آیا، سب کو پیش کرنے کے بعد چلا گیا، صفدر نے سب کے سامنے باپ بیٹے سے معافی مانگی اور لڑکی کو بہن بول دیا، معاملہ ٹھپ ہو گیا، رفیق اور اس کا بیٹا جاوید چلے گئے، بیٹھک میں بزرگ خورشید بیگ، انور علی، بابر انصاری رہ گئے۔

''صفدر تو نے اپنے باپ کی پگ کو داغ لگا دیا'' انور علی نے کہا۔

''محلہ میں، بازار میں تیرے باپ کی بہت عزت ہے، تو نے ساری عزت خاک میں ملا دی، کیا گزر رہی ہو گی تیرے باپ کے دل پر، پاؤں پڑ جا باپ کے اور توبہ کر کہ آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہ دے گا۔'' بزرگ خورشید بیگ نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا، صفدر اپنی جگہ سے اٹھا اور باپ کے پاؤں میں بیٹھ کر آنسو بہانے لگا۔

''ابا معاف کر دو، میں نے آپ کا دل دکھایا۔'' اس نے پاؤں پکڑ لئے، باپ کی آنکھیں بھی نم آلود تھیں۔

''آئندہ کبھی آپ کو دُکھ نہ دوں گا، ایک بار معاف کر دیں۔'' عابد علی نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے پاس بٹھایا اور غمگین لہجے میں بولے۔ ''جا اپنے چاچا بابر کے ساتھ، ڈاکٹر کو چیک کرا کے آ، کہیں کوئی گہری چوٹ نہ لگ گئی ہو''۔

''خورشید صاحب، بھائی انور آپ کا شکریہ، آپ نے بات بڑھنے سے بچا لی، غیرت کے نام پر لوگ مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں، یہ جب بھی آپ کو ملے تو اس کو سمجھاتے رہا کریں، میں نے باپ ہونے کے ناتے اس کو ہر اونچ نیچ سے آگاہ کیا، اولاد ناخلف ہو تو والدین کیا کریں'' دونوں محلے دار عابد علی کو دلاسہ دیتے ہوئے چلے گئے، عابد علی دکان پر نہ گئے۔ فون کر کے ملازمین کو دکان بند کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے، ذہن الجھا ہوا تھا، سوچوں نے یلغار کر دی، آنکھیں موند کر لیٹ گئے۔

......❁......❁......

عابد علی کی عمر 55 سال کے لگ بھگ تھی، بڑی آسودہ زندگی گزار رہے تھے، 10 سال قبل ان کو اس وقت زبردست شاک پہنچا جب ان کی شریک حیات داغ مفارقت دے گئیں، نیک بخت کو کینسر تھا، موذی مرض سے نجات کیلئے عابد علی نے پانی کی طرح پیسہ بہایا لیکن جان بھی گئی اور پیسہ بھی، بیوی کے اللہ کو پیارے ہونے کے بعد عابد علی نے غم بھلانے کیلئے اپنی ساری توجہ دونوں بچوں پر مرکوز کر دی، بیٹی رخشندہ کو ایم اے کرایا اور تین برس قبل اس کے ہاتھ پیلے کر کے اس فرض سے سبکدوش ہو گئے، ان کے لاکھ جتن کے باوجود بیٹا صفدر ایف اے سے آگے نہ پڑھ سکا، بالآخر اسے اپنے ساتھ کپڑے کی دکان پر لے جانا شروع کر دیا، مین بازار میں عابد علی کی کپڑے کی دکان تھی، کاروبار اچھا تھا، تین ملازم بھی رکھے ہوئے تھے، عابد علی کی بازار میں بہت عزت تھی اور محلے میں بھی ان کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ اہل محلہ ان کی بہت عزت کرتے تھے، گھر کے کام کاج اور کھانے پکانے کیلئے محلہ ہی کے گھروں میں کام کرنے والی ماسی نذیراں کو وہ ماہانہ 3 ہزار روپے دیتے تھے، گھر کی صفائی، کھانا پکانا، کپڑے دھونا ماسی کے ذمے تھا، چھوٹے موٹے کام باپ بیٹا خود ہی کر لیتے تھے، بیٹی پرائی ہو چکی تھی اور پرائے شہر میں ہی جا بسی تھی۔ صفدر 22 ویں سال میں داخل ہو چکا تھا، عابد علی محسوس کرتے تھے کہ پڑھائی کی طرح دکان میں بھی اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی، وہ آوارگی کی طرف مائل تھا، عابد علی کی عادت تھی کہ وہ صبح 9 سے ساڑھے 9 بجے دکان کھول لیتے تھے لیکن صفدر 12 بجے سے پہلے کبھی دکان پر نہیں آتا تھا اور رات کو دکان بند کرانے سے بہت پہلے ہی دوستوں کے ساتھ نکل جاتا،

عابد علی باپ ہونے کے ناتے اکثر اسے اچھے بھلے کی تمیز اور زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے رہتے تھے، خوف محسوس کرتے تھے بیٹا ہاتھوں سے نکل نہ جائے اور سختی اس لئے نہیں برتتے تھے کہ اکلوتی جوان اولاد تھی کوئی ایسا ویسا کام نہ کر بیٹھے جو ان کی سبکی کا باعث بنے، زندگی یونہی رواں دواں تھی۔



ڈاکٹر سے واپسی پر صفدر گھر پہنچا، باپ کے کمرے میں جھانکا، وہ لائٹ بند کر کے لیٹے ہوئے تھے، وہ پشیمان سا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا، صبح اس من موہنی، گلابی گال، کالے لانبے بالوں والی کے نرم و نازک ہاتھ کے تھپڑ کی کسک دور نہیں ہوئی تھی کہ شام کو اس کے بھائی اور والد نے سب کے سامنے اسے ذلت کے گڑھے میں دھکیل دیا، وہ خود کو باپ سمیت رسوائی کی دلدل میں دھنستا ہوا محسوس کر رہا تھا، وہ اس لڑکی سے محبت کا جرم کر بیٹھا تھا، محبت یکطرفہ تھی، دوطرفہ کرنے کا صلہ اسے مل گیا تھا، چوٹوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں تو دل میں ہول اٹھ رہا تھا کہ اب وہ گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر اسے دیکھ بھی نہیں سکے گا، انہی سوچوں کے دھارے میں بہتے بہتے وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔



عابد علی دوسرے کمرے میں اگرچہ آنکھیں بند کئے لیٹے تھے لیکن خیالات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، آج ان کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ صفدر دکان پر دیر سے کیوں آتا تھا اور جلدی کیوں چلا جاتا تھا، کاش اس کی ماں زندہ ہوتی تو شاید یہ دن انہیں نہ دیکھنا پڑتا، وہ کس منہ سے گلی محلے والوں کا سامنا کریں گے، بالآخر سونے سے قبل انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ وہ صفدر کی کڑی نگرانی رکھیں گے۔



حالات معمول پر آ گئے، دو ماہ گزر گئے، اس دوران صفدر نے اپنے کردار اور گفتار سے ثابت کر دیا کہ وہ ایک بھول تھی جو اس سے ہو گئی۔ اس نے تمام ملنے جلنے والوں پر اچھا تاثر چھوڑا، دکان پر وقت سے جانا اور آنا، باپ کی خدمت اور اطاعت میں کوئی کسر نہ چھوڑی، یہ سب ظاہر میں تھا، باطن میں کیا تھا یہ کوئی نہ جان سکا، اس کے اندر بھڑکی آگ اب الاؤ کی صورت اختیار کر چکی تھی، ان دو ماہ میں انتہائی خفیہ طریقے سے جو وہ کر چکا تھا اس کی خبر اس کے سائے کو بھی نہ تھی۔



جس محلے میں عابد علی کا گھر تھا، چند گلیاں چھوڑ کر عمران اور وقاص دو نوجوان رہتے تھے، ایک نمبر کے لوفر تھے، ہیروئن بھی پیتے تھے، کبھی ہیروئن کے پیسے نہ ہوتے تو چوری چکاری بھی کر لیتے تھے، دونوں نے جاوید سے مراسم بڑھانا شروع کر دیئے، تعلق دوستی میں بدل گیا، پھر دوستی دن بدن گہری ہوتی چلی گئی، ایک روز لوہا گرم دیکھ کر انہوں نے چوٹ لگا دی۔

''جاوید بابو، خالی خولی سگریٹ خاک مزا دیتا ہوگا۔'' عمران اپنی چرب زبانی سے اسے مائل کرنے لگا، کبھی ہمارے والے سگریٹ کے دو کش تو لے کر دیکھو، لذت اور سرور تو ایک طرف خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس نہ کرو پھر کہنا، چند کش ہی دنیا بھر کے غم بھلا دیتے ہیں۔

''نا بابا نا'' میں باز آیا ایسی سگریٹ سے جو خود سے بیگانہ کر دے۔ جاوید نے صاف انکار کر دیا، ''کیا بات کرتے ہو بابو'' وقاص نے لقمہ دیا، بندہ چند کش لینے سے بیگانہ نہیں ہوتا، صرف سرور کی لہر محسوس ہوتی ہے، ہاں دو چار سگریٹ اکٹھے پی لو تو پھر واقعی بندہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔

''نا بھئی، منہ سے بدبو آئے گی، کسی کو پتہ چل جائے گا'' جاوید کو نیم رضامند ہوتے دیکھ کر دونوں نے مزید کوئی بات نہ کی۔



ایک رات تینوں جاوید کی بیٹھک میں بیٹھے تھے، جاوید نے سگریٹ سلگایا، عمران اور وقاص نے بھی اس کی ڈبی سے دو دو سگریٹ نکالے، سگریٹ سے تمباکو نکال کر اس میں ہیروئن پاؤڈر ملایا، تمباکو دوبارہ سگریٹوں میں بھرا اور سلگا لئے، جاوید سے رہا نہ گیا انہیں سرزنش کے انداز میں بولا ''یار یہ تم کس گندے کام میں پڑ گئے ہو''

''پہلے ہم بھی اسے انتہائی برا سمجھتے تھے، لیکن گرو کی قسم

پی کر دیکھا تو محسوس ہوا دنیا میں اس سے مزیدار چیز ہی کوئی نہیں ہے" وقاص نے پراعتماد لہجے میں کہا۔
"لو ایک دو کش لگا لو" عمران نے اسے پیشکش کی۔
"نا بابا" ابا کو پتہ چل گیا تو بڑے چھتر پڑیں گے" جاوید نے انکار کر دیا۔
"نہیں پتہ چلے گا جاوید بابو، ہم گارنٹی دیتے ہیں" عمران نے اسے مائل کرنا چاہا۔ جاوید ہچکچا رہا تھا اور دونوں لوفر اسے چند کش لگانے کے لیے مجبور کیے جا رہے تھے، بالآخر ان کی چرب زبانی کے جال میں پھنس کر اس نے چند کش لے لئے، بربادی کا آغاز ہو رہا تھا، کانپتے ہاتھوں سے جاوید نے سگریٹ واپس کر دیا اور خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا، اس نے سوچا دونوں ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے، عاقبت نااندیش نہیں جانتا تھا کہ وہ تباہی کی سیڑھی کے پہلے زینے پر قدم رکھ چکا ہے۔
"بڑا مزا آ رہا ہے یارو۔" جاوید نے سگریٹ لے کر ایک اور کش لگاتے ہوئے کہا۔
"دیکھو! دوست آج تم نے پہلی بار ہیروئن پی ہے، رات کو چکر وکر آئیں تو گھبرانا نہیں" عمران نے اس کا حوصلہ بڑھایا، تھوڑی دیر بعد دونوں چلے گئے، جاوید بستر پر لیٹ گیا، اسے پسینہ اور چکر آنے لگے تاہم وہ گھبرانے کی بجائے سرور محسوس کرتا رہا، صبح وہ بیدار ہوا تو سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔

......❁......❁......

دن میں تینوں کی ملاقات نہ ہوئی، عمران اور وقاص دانستہ اس سے دور رہے لیکن رات کو پھر اس کے گھر آ دھمکے، "کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا، جاوید بابو" عمران نے پوچھا، "نہیں تو، بڑے مزے کی نیند آئی، صبح آنکھوں میں سرخی اور سر چکرا رہا تھا، ماں نے پوچھا تو میں نے سر درد کا بہانہ بنا دیا" جاوید نے بتایا۔
"پہلی سگریٹ پینے سے آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اس کے بعد کوئی سرخی شرخی نہ درد ورد، صرف مزہ ہی مزہ۔" عمران نے چسکورے لیتے ہوئے کہا۔ "یہ لو پیو، ہماری طرف سے تحفہ سمجھو۔" وقاص نے اس کی طرف سگریٹ بڑھایا۔ "یار یہ نشہ کہیں لگ ہی نہ جائے" اس نے ڈرتے ڈرتے سگریٹ لے لیا۔
"نہ جاوید بابو! کیسی بات کرتے ہو، جب دل کرے چھوڑ دو" وقاص نے اس کی ہمت بڑھائی، آج اس نے بربادی کی سیڑھی کے دوسرے زینے پر قدم رکھ دیا تھا، اس نے سگریٹ سلگایا اور گہرے گہرے کش لینے لگا، آج اسے گزشتہ روز سے بھی زیادہ لطف آیا۔

......❁......❁......

جاوید کی بیٹھک ان کا مستقل ٹھکانہ بن گیا۔ تیسرے روز دونوں جان بوجھ کر تاخیر سے آئے، تیلی تو دکھا چکے تھے اب دیکھنا چاہتے تھے چنگاری الاؤ بن رہی ہے کہ نہیں، جاوید اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس کر رہا تھا، اسے جمائیاں آ رہی تھیں، بے چینی اور ہیجان کی سی کیفیت تھی، دونوں کو دیکھتے ہی غصیلے لہجے میں بولا۔
"کہاں مر گئے تھے"
"جاوید بابو، جس سے خریدتے ہیں وہ کہیں گیا ہوا تھا، جیسے ہی آیا ہم لے کر پہنچ گئے" وقاص نے معذرت خواہانہ لہجے میں خوب اداکاری کی، "میں ایک گھنٹہ سے سولی پر لٹکا ہوا ہوں، بڑی تروڑ ہو رہی تھی، لاؤ دو سگریٹ" جاوید کی بات پوری ہونے تک عمران سگریٹ سلگا چکا تھا، اس نے ایک کش لے کر اس کی طرف بڑھا دیا، جاوید جیسے جیسے کش لے رہا تھا، طبیعت معمول پر آتی جا رہی تھی، نشے نے اثر دکھایا تو ایک اور سگریٹ ان سے لیا اور مزید میٹھا زہر اپنی رگوں میں اتارنے لگا، دونوں چلے گئے، جاوید کو اب کسی کی پرواہ نہ تھی، وہ سرور میں تھا۔ وہ تباہی کی سیڑھی چڑھ چکا تھا، واپسی کے راستے مسدود تھے، اس کے گھر والے اس ساری واردات سے لاعلم تھے، پہلے بھی اس کے دوست احباب آتے تھے لیکن انہوں نے کبھی پوچھ تاچھ کی نہ اس کے معاملات میں مداخلت کرتے تھے، اس کا باپ مویشی منڈی میں جانوروں کی فروخت کا کام کرتا تھا، مہینہ میں ایک دو بار وہ دوسرے شہروں میں جاتا، جانور خریدتا اور مقامی منڈی میں فروخت کر کے اچھا خاصا منافع حاصل کر لیتا تھا، ایسے معمولات میں جاوید جیسے ناپختہ ذہن کے لڑکوں کو بگڑنے اور بری عادتوں کو اپنانے کے مواقع خود بخود میسر آ جاتے ہیں، اسے ہیروئن کی لت

لگ چکی تھی، نہیں جانتا تھا کہ کوئی اسے بھسم کرنے پر تلا ہوا ہے۔



عمران اور وقاص اپنے مخصوص مقام محلے کے پارک کے ویران گوشے میں موجود تھے، دونوں کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، ”کام شروع ہو گیا، بابو۔“ عمران نے کہا۔

”بچہ اب تڑپے گا، اسے رات بہت طلب ہو رہی تھی۔“ وقاص بولا۔

”ہم نے اپنا مشن مکمل کر دیا سر جی“! عمران نے لقمہ دیا۔

”شاباش، اس کے ساتھ نتھی رہو، اسے دو چار اور پلاؤ، پاؤڈر خریدنے کیلئے یہ 500 اور رکھو۔“ اندھیرے میں موجود شخص نے ایک اور نوٹ ان کی طرف بڑھایا، وقاص نے جلدی سے جھپٹ لیا، ”میں تب چین سے بیٹھوں گا جب اسے شیرے کے ڈیرے پر پاؤڈر خریدنے جاتا اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔“ اس شخص کا لہجہ حد درجے زہریلا تھا۔



شام ڈھل چکی تھی، لوگوں نے بھی بازاروں کا رخ کر لیا، عابد علی، صفدر اور ملازمین گاہکوں کو ان کی پسند کا کپڑا دکھا رہے تھے کہ اچانک عابد علی کے چہرے پر شدید گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے، انہوں نے دل پر ہاتھ رکھا اور جھکتے چلے گئے، یہ دیکھ کر سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، انہوں نے عابد علی کو پانی پلانے کی کوشش کی تو ان کے جبڑے تکلیف کی شدت سے بھنچے ہوئے تھے پیشانی سے پاؤں تک سارا جسم پسینے سے شرابور تھا، عابد علی کی حالت دیکھتے ہوئے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر صفدر نے ساتھی دکاندار اور ایک ملازم کو ساتھ لیا، عابد علی کو کار کی پچھلی نشست پر لٹایا اور جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا قریب ترین اسپتال پہنچ گئے، انہیں فوراً ایمرجنسی میں لے جایا گیا، ڈاکٹر ان کی حالت دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ دل کا شدید دورہ پڑا ہے، مختلف انجکشن دینے کے ساتھ ساتھ ایک نرس مسلسل ہارٹ پمپنگ کر رہی تھی، بات نہ بنتے دیکھ کر انہیں الیکٹرک شاک دیئے گئے، سب بے سود، فرشتہ اجل اپنا فرض پورا کر کے جا چکا تھا، دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔

جاوید کا جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا، کبھی وہ خود کو بری طرح کھجانے لگتا اور کبھی سر کو دائیں اور بائیں بری طرح جھٹکتا، وہ انتہائی بے بسی کی کیفیت میں تھا، اس کے یاروں عمران اور وقاص کا دور دور تک پتا نہ تھا، اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا، پھر کانپتے ہاتھوں سے صوفے پر پھینک دیا، اسی اثناء میں بیٹھک کے دروازے پر دستک ہوئی، وہ لڑکھڑاتا ہوا گیا دروازہ کھولا باہر عمران اور وقاص موجود تھے۔

”ابے کمینو! کہاں مر گئے تھے۔“

”جلدی آؤ، جلدی کرو سگریٹ دو۔“ عمران کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی، اس نے سگریٹ لگا کر جاوید کو تھما دیا، اس نے سگریٹ یوں تھاما جیسے کوئی چھین ہی نہ لے، جلدی جلدی دو تین گہرے کش لینے کے بعد اسے قدرے سکون ملا۔ باقی کے بھی دو، دونوں نے اسے 5 سگریٹ اور دے دیئے، وقاص بولا۔

”جاوید بابو، آج رقم ختم“۔

”ایک ہزار میں 5 سگریٹ۔“ جاوید نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”بابو جاوید، کیمیکل ملا نہیں ہے اصل مال ہے اصل، دل چاہے تو خود جا کر شیرے کے ڈیرے سے لے آیا کرو۔“ عمران نے کہا، دونوں جو چاہتے تھے ہو چکا تھا، اب جاوید سے جان چھڑانے کے چکر میں تھے۔

”میں لے آیا کروں گا‘ جیسے ہی نشہ ٹوٹتا ہے مجھے طلب ہوتی ہے، تم کبھی روز آ جاتے ہو اور کبھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے ہو‘ مجھے شیرے کا ڈیرہ دکھا دو۔“

جاوید خود ان سے جان چھڑانے کا سوچ رہا تھا، ٹھکانہ دیکھ لے گا تو خود ہی جب طلب ہو گی اور حسب ضرورت لے آیا کرے گا، دونوں نے اگلے روز اسے شیرے کا ڈیرہ دکھا دیا۔

''پولیس کے چھاپے واپے کا خطرہ تو نہیں۔'' جاوید اپنا خوف دور کرنا چاہ رہا تھا۔

''کمال کرتے ہو بابو، باقاعدہ حصہ جاتا ہے وہاں، شیرے کے اوپر تک تعلقات ہیں۔ ایسے ہی بھرے پرے علاقے میں دھندا نہیں کررہا، پکڑنے والے نوٹ پکڑتے ہیں اسے نہیں۔'' وقاص نے اس کا خوف دور کیا اور پھر واقعی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح ایسے غائب ہوئے کہ جاوید کو کبھی نظر ہی نہ آئے۔



اس کی شیو بے تحاشہ بڑھ چکی تھی، نہانا، دھونا، کپڑے بدلنا، گھر والوں سے مل جل کر باتیں کرنا، کہیں آنا جانا، سب ختم ہو چکا تھا، وہ اپنی ہی دنیا میں مست رہتا تھا، صحت بھی روز بروز گر رہی تھی، رنگت اُڑی اُڑی سی رہتی تھی، اکثر اوقات وہ ہر چیز سے بیزار نظر آتا تھا، البتہ کبھی کبھار ہشاش بشاش بھی دکھائی دیتا تھا، اس کی ماں اور بہن نے اس کی ان کیفیات کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا تاہم انہوں نے جاوید کے بارے میں اس کے والد سے کسی بات کا ذکر نہ کیا، اس کے والد کو صورت حال کا ادراک تب ہوا جب پانی پلوں سے گزر چکا تھا، جاوید نے روزانہ کا خرچ 200 روپے مانگنا شروع کر دیا، چند روز بعد مطالبہ 5 سو روپے تک پہنچ گیا۔ گھر والوں نے اس کا خرچہ بند کر دیا، جاوید نے گھر میں فساد شروع کر دیا، لڑنا جھگڑنا، گھر والوں کو کاٹ کھانے کو دوڑنا اس کا معمول بن گیا، تب گھر والوں کو پختہ یقین ہو گیا کہ وہ نشہ کرتا ہے، جب یہ بات کھلی کہ وہ ہیروئن پیتا ہے، سبھی اپنا سر تھام کر بیٹھ گئے، اکلوتے بیٹے کی حالت نے ان کے اوسان خطا کر دیئے، جب بھی اسے ہیروئن نہ ملتی تڑپتا اور اپنے جسم کو کاٹنے لگتا، رفیق احمد نے گھر والوں کو سختی سے منع کر دیا کہ اسے ایک پیسہ بھی نہ دیا جائے مرتا ہے تو مرے، منتوں، مرادوں سے یہ پیدا ہوا تھا، اس نے یہ دن بھی دکھانے تھے'' رفیق احمد غصے میں بھرے پاؤں پٹختے گھر سے نکل گئے۔



دو روز بعد پورے گھر میں اس وقت صف ماتم بچھ گئی جب یہ اطلاع پہنچی کہ رفیق احمد جس ٹرک میں جانور خرید کر لا رہے تھے اس کی ٹکر ایک بس سے ہو گئی، مرنے والے کئی افراد میں رفیق احمد بھی شامل تھا، اس المیہ کا بھی جاوید پر کوئی اثر نہ ہوا، اہل علاقہ اور رشتہ دار کفن دفن کا بندوبست کر رہے تھے۔ بیوی اور بیٹی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں، جاوید نشے کی تروڑ میں تھا اور ہیروئن لینے کے لئے گھر سے نکلا ہوا تھا، میت کو نہلانے کے بعد کفن میں لپیٹ دیا گیا، سبھی انتظار میں تھے کہ وہ آئے اور باپ کے جنازے کو کندھا دے، مگر وہ تو خود گلی محلوں میں کوئی سہارا ڈھونڈ رہا تھا جو اسے پیسے دے دے اور وہ اپنا نشہ پورا کر سکے۔ بالآخر طویل انتظار کے بعد رفیق احمد کو سفر آخرت پر روانہ کر دیا گیا، بدبخت آخری بار باپ کا چہرہ بھی نہ دیکھ پایا، جس نے 20 سال اسے پالا پوسہ تھا وہ دوسروں کے کندھوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔



رات گئے وہ نشے میں دھت، ہوش سے بیگانہ گھر پہنچا تو ماں اور بہن چند رشتہ دار دری بچھائے، آنسو بہانے کے ساتھ پڑھائی میں مصروف تھے، ماں اسے دیکھتے ہی تڑپ کر اٹھی اور گریبان پکڑ کر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

''چلا گیا تیرا باپ ہمیشہ کیلئے ہمیں تنہا چھوڑ کر، کس کے سہارے جئیں گے' ہم تو جیتے جی مر گئے، بولتا نہیں بدبخت چپ کیوں ہے۔'' ماں اسے جھنجوڑ رہی تھی۔

''چلا گیا، مگر کیوں گیا، کہاں گیا، میں نے تو انہیں کچھ نہیں کہا، آ جائے گا، صبح آ جائے گا۔'' وہ نشے میں اول فول بک رہا تھا، کوئی اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، کوئی اس پر ترس کھا رہا تھا بہن خاموش بیٹھی آنسو بہائے جا رہی تھی، لیکن وہ یوں کھڑا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، پھر لڑکھڑاتا ہوا بیٹھک میں اپنے بیڈ پر جا گرا اور ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا، اس کے خراٹے ماں اور بہن کے سینوں میں زہریلے تیروں کی طرح پیوست ہو رہے تھے۔



جو خود سے بیگانہ ہو اسے گھر میں سوگ یا افسوس سے کیا لینا دینا، باپ کو مرے ایک دن ہی ہوا تھا، اس نے ماں اور بہن کا پیسوں کے لئے جینا حرام کر دیا، اس کی بگڑتی

حالت دیکھ کر ماں کو ترس آ گیا اور اسے پیسے دے دیئے، یہ معمول بن گیا، جمع پونجی ڈھیرے ڈھیرے ہیروئن کی نذر ہونے لگی، رشتہ دار اور چند اہل محلہ نے اسے انسداد منشیات سنٹر میں داخل کرانے کا مشورہ دیا، اسے پتہ چلا تو کسی اڑیل گھوڑے کی طرح بدک اٹھا اور گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا، ڈھیرے ڈھیرے زیور بکنا شروع ہو گیا، ماں اور بہن کے کان اور بازو زیور سے خالی ہو گئے، گھر والوں کو راشن پانی کی فکر نے دہلا کر رکھ دیا، جوان بیٹے کے دکھ نے الگ سے پریشان کر رکھا تھا، کب تک، بالآخر گھر سے بھی پیسے ملنا بند ہو گئے، ماں کو برا بھلا کہتا، بہن سے مار پیٹ کرتا، آخر ایک دن وہ گھر سے نکل گیا، اور کئی روز نہ آیا، کسی نے اسے یاروں دوستوں سے بھکاریوں کی طرح پیسے مانگتے دیکھا تو اس کی ماں کو بتا دیا، بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر ماں کا دل ڈوبنے لگا، لیکن کوئی راستہ نہ سجھائی دے رہا تھا، بالآخر ایک سیانے نے مشورہ دیا کہ چند رشتہ داروں کو بلا کر اسے زبردستی انسداد منشیات سنٹر داخل کرا دیا جائے۔

......❁......❁

اب وہ تھا، اس کے نشئی دوست تھے اور ہیروئن کا زہر، اس کی قابل رشک صحت قابل رحم ہو چکی تھی، وہ اپنی رگوں میں ناسورا تارتا، غلیظ موت کی راہ پر گامزن تھا۔ جاوید کے دوست احباب اور رشتہ دار اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے وہ جان چکے تھے کہ سلام دعا کے بعد جاوید کسی فرضی ایمرجنسی کے بہانے رقم ادھار مانگے گا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی حالت بدتر ہوتی جا رہی تھی، جب ہیروئن خریدنے کیلئے کہیں سے بھی پیسوں کا بندوبست نہ ہوتا تو نشئی دوستوں سے مل کر چھوٹی موٹی چوری چکاری کی وارداتوں کو معمول بنا لیا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی، ایک دن شہر کے نسبتاً سنسان علاقے میں پانی کا پمپ کھولتے پکڑے گئے، خوب درگت بنی، چوکیدار اور گلی والوں نے پٹائی میں بالکل بھی کنجوسی کا مظاہرہ نہ کیا، اس سے پہلے کہ پولیس کے حوالے کیا جاتا جاوید اور اس کا ساتھی مار کھاتے کھاتے تاریکی میں فرار ہو گئے۔

......❁......❁

ایک دن وہ حواس میں تھا، ماں اور بہن کی یاد آئی تو گھر کا رخ کر لیا۔ گلی کی نکڑ پر پہنچا تو وہاں ایک تھڑے پر صفدر بیٹھا تھا، وہ صفدر کے پاس چلا آیا۔

''کیسے ہو صفدر بھائی؟'' اس نے شرمسار لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔'' صفدر نے کہا۔

''وہ آپ سے ایک کام تھا۔''

''ہاں بتاؤ کیا بات ہے۔''

''وہ دراصل دوا لینی تھی لیکن پیسے نہیں ہیں۔''

''چلو میں دلوا دیتا ہوں۔''

''نہیں...... نہیں آپ تکلیف نہ کرو، پیسے دے دو، میں لے لوں گا۔''

صفدر نے جیب سے 500 روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے، وہ ندیدوں کی طرح نوٹ پر جھپٹا۔

''سنو۔''

''جی بھائی صفدر۔''

''جب بھی دوا وغیرہ لینی ہو مجھ سے پیسے لے لیا کرو۔''

''شکریہ، شکریہ صفدر بھائی۔''

''کوئی بات نہیں، جب ضرورت ہو آ جایا کرو۔'' صفدر نے کھلی پیشکش کر دی تھی۔

جاوید کو پیسے ملے تو اس نے گھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور شیرے کے ڈیرے کی طرف چل پڑا، اس کے دو دن کے نشہ پانی کا اہتمام صفدر نے کر دیا تھا۔ دو دن بعد جاوید پھر صفدر کے دروازے پر تھا، صفدر نے اس بار بھی اسے مایوس نہ کیا اور 500 کا نوٹ اسے تھما دیا۔ جاوید کو لسی والا گھر مل گیا، ہر دوسرے تیسرے دن وہ صفدر کے دروازے پر ہوتا تھا، صفدر بھی حاتم طائی بنا ہوا تھا۔

......❁......❁

رات کے 8 بجے تھے، سردیوں کے دن تھے، صفدر دکان بند کر کے گھر لوٹا ہی تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی، دروازہ کھولا تو جاوید کھڑا تھا۔

''اندر آ جاؤ۔''

''آپ کو زحمت ہو گی، بس کچھ پیسے مل جاتے تو۔''

''کہا نہ اندر آ جاؤ۔'' صفدر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''پیسے بھی مل جائیں گے۔''

وہ اندر آ گیا، صفدر نے اسے بیٹھک میں بٹھایا اور بازار سے جو کھانا اپنے لئے لایا اس کے سامنے رکھ دیا۔

''کھانا کھا لو، پھر بات کرتے ہیں، جاوید صدیوں سے بھوکے شخص کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا سب صفا چٹ کر کے قمیض سے ہی ہاتھ صاف کر لئے۔

''سنو جاوید، صفدر نے اسے مخاطب کیا ''میں کئی ماہ سے مسلسل تمہیں پیسے دے رہا ہوں، ہر بار تم نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنایا، لیکن میں جان چکا ہوں تم، ہیروئن کا زہر اپنے اندر اتار رہے ہو، میں تمہیں آئندہ بھی پیسے دیتا رہوں گا، تم اپنا نشہ پانی کرتے رہنا، لیکن ایک کام میرا بھی کرنا ہوگا۔''

''آپ حکم کرو صفدر بھائی۔''

''سوچ لو۔''

''سوچنے والی کیا بات ہے؟''

''میری شرط منظور ہو تو ٹھیک ورنہ چپکے سے نکل جانا اور پھر ادھر کا رخ نہ کرنا۔''

''جاوید شش و پنج میں پڑ گیا کہ نہ جانے کیسی شرط ہو گی، صفدر جس طرح اسے باقاعدگی سے رقم دے رہا تھا، اس کے تو وارے نیارے ہو گئے تھے، یہ گھر وہ کسی صورت بھی گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

اسے شش و پنج میں دیکھ کر صفدر بولا ''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''جی جی آپ حکم کرو۔'' جاوید جلدی سے بولا۔

''صفدر آہستہ آہستہ اسے کچھ کہنے لگا، جاوید بھڑک اٹھا ''تم...... میں بے غیرت نہیں ہوں، نشہ کرتا ہوں لیکن......''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' صفدر نے اسے ٹوکا۔

''میں تمہیں مجبور تو نہیں کر رہا، ہاں! یہ بات ذہن میں بٹھا لو اب میرے دروازے کا رخ نہ کرنا''۔

''جج، جی، ٹھیک ہے!'' بالآخر وہ مان گیا، صفدر دوسرے کمرے میں گیا ایک جرسی اٹھا لایا...... ''لو یہ پہن لو، باہر سردی بہت ہے'' ساتھ ہی ہزار کا ایک نوٹ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دیا، خوشی سے جاوید کی باچھیں کھل گئیں۔

......❁......❁......

سرِ شام ہی سردی بہت بڑھ گئی تھی، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، اس وجہ سے تاریکی نے وقت سے کچھ پہلے اپنا راج قائم کر لیا تھا۔ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے گلیوں میں اندھیرا تھا، صرف ان گھروں میں روشنی نظر آ رہی تھی جہاں یو پی ایس نصب تھے، الیکٹرانکس لائٹس آن تھیں یا پھر کہیں کہیں جنریٹر چلنے کی بھدی آوازیں ماحول کا سکوت غارت کر رہی تھیں، صفدر آج وقت سے گھنٹہ پہلے ہی دکان بند کر کے گھر آ کر رضائی لپیٹ کر لیٹ گیا، یو پی ایس چل رہا تھا، اس نے صحن کی لائٹ آن کر رکھی تھی، کمرے میں زیرو واٹ کا بلب جل رہا تھا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ جاوید ایک لڑکی کے ہمراہ کھڑا تھا، لڑکی نے خود کو گرم چادر سے ڈھانپ رکھا تھا، وہ فوراً دونوں کو اپنے بیڈ روم میں لے گیا، جاوید چند لمحوں بعد ہی چلا گیا، صفدر باہر کا دروازہ بند کر کے کمرے میں آیا تو ہکا بکا رہ گیا۔

جاوید کی بہن راحیلہ ابھی تک کھڑی تھی اور اس نے چادر اتار پھینکی تھی۔ سفاک نظروں سے صفدر کو گھور رہی تھی۔

''آؤ، آؤ کھڑے کیوں ہو۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

''بدکردار، حرص و ہوس کے غلام، آگے بڑھو، اپنے عشق ناتمام کو تمام کر لو، اپنے اندر کے درندے کی ہوس مٹا لو۔'' اس کے ہونٹ اور آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں، صفدر پتھر کا بنا اسے گھورے جا رہا تھا، وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دہاڑی۔ ''اس بے بس جسم کو روندتے کیوں نہیں؟ میرا منہ کیا تک رہے ہو، اتنے عرصہ خیالوں میں پامال کرتے رہے ہو گے۔ اب زندہ سلامت سامنے کھڑی ہوں تو قدم کیوں نہیں اٹھ رہے، جن بہنوں کے بھائی نشے کی لت میں رشتوں کا تقدس بھول جائیں ان کی بہنوں کے نصیب میں میری طرح ہی لٹنا، بکنا اور بے بسی کی زندگی گزارنا ہوتا ہے۔'' صفدر کچھ نہ بولا۔ جب وہ دل

کی بھڑاس نکال چکی تو آگے بڑھا اور چادر اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے بولا۔

''لو پہلے اسے اوڑھ لو، پھر میری بات بھی سن لینا۔''

''چادر کیا اوڑھ لوں؟ بڑی تمنا تھی نا تمہیں مجھے زیر کرنے کی، تو کرلو۔''

''بند کرو اپنا یہ لیکچر، صفدر کو بھی غصہ آ گیا، سخت لہجے میں بولا، چادر اوڑھ کر آرام سے بیٹھو، ورنہ......''

''ورنہ کیا......؟''

''ورنہ یہ...... اس نے اس کے سرخ گلابی گالوں پر ہلکے ہاتھ کا تھپڑ جڑ دیا۔ اس کے رویئے نے راحیلہ کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی سلب کرلیں، صفدر نے آگے بڑھ کر گرم چادر اس کے سر پر ڈالی، شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا، اسے پینے کو پانی دیا، جب اس کے حواس بحال ہوئے تو صفدر نے کہنا شروع کیا ''راحیلہ میں نے تمہیں چند باتیں کرنے کیلئے بلایا تھا، لیکن تم نے اس بلاوے کا غلط مطلب نکال لیا''۔

''کیا بلانے کا یہ شریفانہ طریقہ ہے'' صفدر کے رویہ سے اس کا خوف دور ہو رہا تھا۔

''یہاں نہ بلاتا، اور اس وقت نہ بلاتا تو کیسے تم سے بات کرتا، گھر میں تمہاری والدہ مجھے تم سے ملنے دیتیں؟ یا باہر کہیں ہم مل سکتے تھے، میں نے یہی بہتر جانا کہ تمہیں گھر بلا کر بات کروں، صفدر انتہائی شائستگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''ایم سوری، تمہیں برا بھلا کہا، بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' راحیلہ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''میری بات غور سے سننا اور ہوش و حواس کے ساتھ سمجھنا، میں تب بھی تمہیں دل سے چاہتا تھا جب تمہارا تھپڑ مجھے تحفے میں ملا تھا اور تمہارے مرحوم ابا اور بھائی مجھے مارنے آئے تھے اور اب بھی تمہیں چاہتا ہوں، ہاں! مجھے تمہارے ابا کے انتقال پر بہت افسوس ہوا، میں جنازے میں بھی شریک ہوا، پھر مجھے تمہارے بھائی کے نشے کی لت میں پڑنے کا معلوم ہوا، تمہارے گھرانے پر جو گزر رہی ہے، مجھے اس کا احساس بھی ہے اور ادراک بھی، میری بات کو ان معنوں میں نہ لینا کہ میں تم پر یا تمہارے گھر والوں پر ترس کھا رہا ہوں، یا کوئی احسان کرنے جا رہا ہوں، تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد صفدر نے حواس مجتمع کیے اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا ''راحیلہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، میرا بھی آگے پیچھے کوئی نہیں سوائے ایک بہن کے، جب کہو گی تمہارے گھر بھیج دوں گا'' راحیلہ نے نظریں اٹھا کر صفدر کو دیکھا، اور آج پہلی بار غور سے دیکھا، نین نقش خوبصورت تھے، قد مناسب تھا، سلیقہ سے گفتگو کرنا جانتا تھا، ''مجھے کچھ وقت دو سوچنے اور والدہ سے بات کرنے کیلئے'' راحیلہ اب مکمل شانت ہو چکی تھی۔

''کوئی جبر یا زور زبردستی نہیں، اگر تمہارا دل مجھے قبول کرے اور تمہاری ماں بھی راضی ہو تو مجھے بتا دینا، میری بہن تمہاری والدہ سے بات کرنے آ جائے گی، دو، چار، چھ دن تم اچھی طرح سوچ بچار کرلو'' صفدر نے یہ کہتے ہوئے گھڑی دیکھی اور بولا اس سے پہلے کہ بجلی آ جائے اور گلیاں روشن ہو جائیں، میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں، جاوید نہ جانے کہاں ہوگا، یہ میرا موبائل نمبر لے لو، اس نے ایک چٹ پر نمبر لکھ دیا، راحیلہ نے چٹ لے لی، صفدر نے گلی میں جھانکا، سنسان پڑی تھی، ایک لوڈشیڈنگ اوپر سے سردی، کون ایسے میں مٹر گشت کرتا ہے، صفدر اسے انتہائی احترام کے ساتھ اپنی بائیک پر چند لمحوں میں اس کے گھر اتار کر آ گیا، بستر پر لیٹتے وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس نے جو پتہ پھینکا تھا، یقین تھا کہ اسے جیت دلائے گا، اس نے دو برس سے زائد صبر اور جبر کے جو گھونٹ پیے تھے، اب اس کا صلہ زیادہ دور نہیں تھا، اس کی لچھے دار باتیں ایک بے بس گھرانے کو لبھانے کیلئے کافی تھیں، وہ جانتا تھا سب بات کھوٹی، پہلے دال روٹی۔



راحیلہ کے گھر پہنچتے ہی ماں نے اسے رحم طلب نظروں سے دیکھا، پھر گم صم سی کمرے کی چھت کو گھورنے لگ گئی، آج گھر میں نقب لگ گئی تھی، کل کیا ہوگا؟ ابھی وہ انہی خیالات میں غلطاں تھی کہ جاوید بھی سردی میں ٹھٹھرتا گھر داخل ہوا، اسے دیکھتے ہی ماں کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں، آؤ دیکھا نہ تاؤ جوتا اتار لیا، جاوید کو کالر سے پکڑ کر اوپر تلے اس کی ٹھکائی شروع کر دی، نشہ ہرن ہونا شروع

ہواتو جوتے کھاتا دیوار سے جالگا۔
''ہوا کیا ہے ماں؟''
''ماں! کون ماں؟ کیسی ماں! جو رشتوں کے تقدس کو بھول جائے، بہن کی عزت کا سودا کرآئے، ایسے بیٹے سے بہتر تھا کہ ہیجڑا پیدا ہو جاتا جا بہن کو بیچ چورا ہے بیچ دے، ایک ہی دفعہ اس کے روپے کھرے کر لے، رنڈی بنا دے اسے، کسی کوٹھے پر بٹھا دے، طوائف بنا دے، بے غیرت، کمینے، اب ماں بہن کو بیچے گا اپنے نشے کیلئے، نکل جا اس گھر سے، مر گیا تو میرے لئے، نہ تو میرا بیٹا، نہ میں تیری ماں۔ جہاں سہاگ نہیں رہا، وہاں تو بھی نہیں رہے گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا''۔ زہرآلود لہجے کے ساتھ ماں نے ایک پائپ اٹھالیا اور اس کی طرف بڑھی، جاوید کچن کی طرف لپکا اور آن ہی آن میں چھری اٹھالایا۔
''ماردوں گا اس کمینے صفدر کو، نہیں چھوڑوں گا''، وہ بیرونی دروازے کی طرف لپکا، راحیلہ نے اس کی قمیص پکڑ کر کھینچی۔
''چھوڑ دے تو مجھے، یہ نہ ہو اس سے پہلے تیرا قصہ پاک کر دوں۔'' وہ غصہ میں بپھرا پھر باہر کی طرف لپکا، راحیلہ نے زور کا جھٹکا دیا اور پھنکاری۔
''کچھ نہیں ہوا، صفدر نے مجھے کچھ نہیں کہا، جاوید نے قہرآلود نظروں سے اسے دیکھا۔ پھینک دے چھری اور جا کمرے میں چلا جا۔ راحیلہ کے کہنے پر اس نے چھری وہیں پھینکی اور بیٹھک میں چلا گیا۔
''کیا تو سچ کہہ رہی ہے بیٹی۔''
''ہاں ماں، ایسا کچھ نہیں جیسا آپ سوچ رہی ہیں، اس نے مجھے عزت بھی دی اور ایک پیشکش بھی کی ہے۔''
''کیا کہا اس نے''
''ماں وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، سب کچھ جانتے ہوئے بھی''
''ایک نشئی کی بہن کو کون اپنے گھر لے جائے گا۔'' ماں بولی۔
''لیکن ماں وہ تیار ہے، اس نے کہا کہ دو چار دن میں سوچ کر فیصلہ سے آگاہ کر دوں۔''
''تو ٹھیک ہے، اگر اس کی نیت صاف ہے تو میری چند باتیں دھیان سے سن۔'' ماں نے کہا پھر ماں بیٹی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ماں اسے کچھ سمجھانے لگی، وہ اقرار میں سر ہلاتی رہی، بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی، ماں بیٹی میں سمجھوتہ ہو گیا تو دونوں مطمئن ہو گئیں۔

......❁......❁......

راحیلہ نے تیسرے دن صفدر کو فون کیا۔
''زہے نصیب...... کیسی ہیں آپ۔'' وہ محبت سے بولا۔
''ٹھیک ہوں اور مجھے تمہاری پیشکش قبول ہے لیکن......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''لیکن کیا......'' صفدر کا دل دھڑکا۔
''میری کچھ شرائط ہیں، یا تم اسے میری خواہشات سمجھ لو۔''
''ہاں ہاں بتاؤ۔''
''پہلی بات تو یہ کہ تم میرے بھائی کا علاج کراؤ گے۔''
''اوکے، ٹھیک ہے۔''
''دوسری بات یہ کہ ٹھیک ہونے پر اسے کاروبار بھی کرا کے دو گے۔''
''مجھے یہ بھی منظور ہے۔''
''اور تیسری بات یہ کہ 10 مرلے کا ایک پلاٹ خرید کر میرے نام کرا دو، یا جس گھر میں دلہن بن کر جاؤں گی وہ میرے نام کرا دو۔''
صفدر نے اس کی یہ شرط بھی تسلیم کر لی'' ''اور کچھ؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں یہی تمہارے احسانات کافی ہوں گے۔'' راحیلہ نے جواباً کہا۔ پھر بولی۔
''ہاں ہم شادی تب کریں گے جب جاوید اس گندگی سے نکل کر صاف ستھری زندگی کی طرف لوٹ آئے گا''۔
''بے فکر رہو اور ماں جی کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ نکاح سادگی سے ہو گا۔ جہیز وغیرہ یا کسی سج دھج کی ضرورت نہیں، کچھ لوگ آپ کی طرف سے ہوں گے اور کچھ میری طرف سے، لیکن اس سے قبل آپ کی تمام خواہشات کی تکمیل ہو گی۔ صفدر نے اس کا من خوش کر

دیا۔ سلام دعا کے بعد بات ختم ہوگئی، راحیلہ سوچنے لگی، ماں کتنا گھنا سایہ ہے۔ اس نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے جو سمجھایا تھا وہ ان کے گھر کے لئے بے حد ضروری اور صفدر کے کسی بھی ممکنہ اقدام سے تحفظ کیلئے انتہائی اہم تھا۔



سمجھا کر، ڈرا کر، حیلوں، بہانوں اور چوں چالاکیوں کے بعد جاوید کو انسداد منشیات سنٹر میں داخل کرانے کا معرکہ سر کیا گیا۔ سنٹر انچارج کو کہہ دیا گیا تھا کہ باندھ کر رکھو یا کھلا چھوڑو، یہ آپ کی صوابدید پر ہے، سختی سے یا نرمی سے، جیسے چاہے پیش آئیں لیکن جاوید کا علاج ہر صورت ہونا چاہیے۔ انچارج کو سفارش کے ساتھ خاصی رقم بھی دی گئی۔ انچارج مسٹر خالد کی ہر طرح کے خیال اور علاج کی مکمل یقین دہانی کے بعد ہی جاوید کی والدہ، بہن، رشتہ دار اور صفدر مطمئن ہوئے، پہلے پہل تو جاوید نے سنٹر میں خوب اودھم مچایا، مگر عملے کا تو کام ہی ایسے مریضوں کو تیر کی طرح سیدھا کرنا تھا، علاج شروع ہوگیا، دن بیتتے گئے، جاوید کی دھیرے دھیرے ہیروئن کی طلب کم ہوتی گئی، ڈیڑھ ماہ گزرا تو اس کے جسم سے ہیروئن کی طلب کو صفر کر دیا گیا، ڈاکٹرز نے انگلینڈ سے ایک جدید سٹرپ منگوائی تھی، پاکستانی روپوں میں وہ 50 ہزار میں پڑی، ادائیگی صفدر نے کی، بازو پر چسپاں کر دینے والی اس سٹرپ کی خوبی یہ تھی کہ جسم سے نشے کی ہر طرح کے اجزاء جذب کر لیتی تھی اور اس طلب کو سرے سے ختم کر دیتی تھی جو مریض کو ہوتی تھی۔ گوروں کی یہ ایجاد کمال کی تھی، انجکشن اور دیگر میڈیسن کے استعمال اور سٹرپ کا کمال تھا کہ دو ماہ کے اندر جاوید اچھا بھلا ہوگیا لیکن ڈاکٹرز نے اسے ڈسچارج کرنے کے بجائے مزید ایک ماہ انڈر آبزرویشن رکھنے کا فیصلہ کیا، تین ماہ بعد جب وہ گھر میں اپنوں کے درمیان سر جھکائے بیٹھا تھا تو کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ وہی جاوید ہے جو ہیروئن کی طلب میں اپنا جسم بھنبھوڑا کرتا تھا، راحیلہ کی محبت میں جاوید نے پانی کی طرح پیسہ بہایا، جس بازار میں اس کی دکان تھی وہیں کرائے پر ایک بڑی دکان لیکر وہاں ڈیپارٹمنٹل سٹور بنا دیا، دو ملازم بھی رکھوا دیئے۔ اب صرف جاوید نے وہاں کا انتظام سنبھالنا تھا۔



گھر میں خوشی کا سماں تھا، جاوید کے صحت یاب ہونے پر سبھی کے چہرے گلنار ہو رہے تھے۔ ایک دیگ میٹھے چاولوں کی پکا کر خیرات کی گئی، چند روز بعد جاوید نے ڈیپارٹمنٹل اسٹور جانا شروع کر دیا، ماں نے شکرانے کے نوافل ادا کیئے۔ راحیلہ سوتے جاگتے صفدر کے سپنے دیکھنے لگی، زندگی معمول پر آ گئی تھی۔



اجڑا گھر شاد آباد ہوگیا تو صفدر نے شہر سے بہن اور بہنوئی کو بلا کر دل کی مراد بتائی اور جاوید کے گھر بھیج دیا، صفدر ان کی امیدوں پر پورا اترا تھا، بلکہ ان کا اجڑا گھر بسانے میں سب سے اہم کردار اسی نے ادا کیا تھا۔

''ست بسم اللہ، جی آیاں نوں۔'' ماں نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ چائے پانی کا دور چلا، خاطر تواضع کے بعد صفدر کی بہن رخشندہ نے کہا۔

''ماں جی ہم آپ کے پاس سے کچھ مانگنے آئے ہیں، دل چاہے تو جھولی میں ڈال دیں نہ چاہیں خالی موڑ دیں۔'' راحیلہ دروازے کی اوٹ سے اپنے دلدار کی باتیں سن رہی تھی، خود رفتگی کا عالم تھا۔

''بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔'' جاوید کی ماں بولی۔ صفدر کا چال چلن، برتاؤ، رنگ ڈھنگ سب کو ہی پسند ہے، محلے میں سبھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں''۔

''اگر ایسا ہی ہے ماں جی تو راحیلہ کو ہمارے گلشن کا پھول بنا دیں' صفدر اکیلا ہے' کاروبار بھی خوب ہے' دونوں بہت خوش رہیں گے''

راحیلہ سنتی جا رہی تھی اور اس کے محبوب کا رنگ اس کے چہرے پر دھیرے دھیرے رچ رہا تھا۔

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے بیٹا'' ماں بولی۔

''رخشندہ نے مٹھائی کا ڈبا کھولا اس کی ماں کا منہ میٹھا کرایا، راحیلہ کو بلایا گیا، سر پر ڈوپٹہ سیدھا کرتی، شرماتی لجاتی آ گئی، رخشندہ نے اس کا منہ چوما اور میٹھا بھی کرایا، 5 ہزار اس کی مٹھی میں زبردستی تھماتے ہوئے بولی۔

''آج سے تو میری بھابھی بھی اور بہو بھی' فریقین نے من کی مراد پالی تھی، کچھ ضروری امور طے کرنے کے بعد رخشندہ اور اس کے شوہر نے اجازت لی اور گھر پہنچ گئے، وہاں صفدر پہلے سے موجود تھا اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے بہن اور بہنوئی کو دیکھا، ان کے پہنچنے تک وہ راحیلہ سے بات بھی کر چکا تھا۔



صفدر اور راحیلہ کی شادی انتہائی سادگی سے ہوئی، راحیلہ کے آنے سے صفدر کی زندگی میں جیسے بہار آ گئی، ندی میں جاؤ اور پیاسے آ جاؤ یہ تو صفدر کی لغت میں ہی نہ تھا، بڑی سمجھداری سے مہرے چلنے کے باعث وہ شطرنج کی یہ طویل بازی جیت چکا تھا، اکثر اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رہتی جسے راحیلہ کبھی سمجھ نہ پائی تھی، شادی کے تین ماہ بعد راحیلہ کو ماں بننے کی خوشخبری ملی تو وہ رب کا شکر بجا لائی، صفدر بھی اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا۔



رات کے 7 بجے بیرونی دروازہ کھٹکا، صفدر باہر دیکھنے گیا، راحیلہ بیٹھک میں تھی، اس نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا، موالی سے دولڑکے کھڑے تھے۔

''کیوں آئے ہو؟'' جاوید ان سے مخاطب تھا۔

''باؤ صفدر آپ نے تو من کی ساری مرادیں پالیں، کچھ ہمارا بھی خیال کرلو۔'' یہ عمران اور وقاص تھے۔

''تمہیں تمہارے کام کے معاوضے سے کہیں بڑھ کر رقم دی، پھر کیوں میری عزت کا جنازہ نکالنے نازل ہو جاتے ہو۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

ناراض کیوں ہوتے ہو صفدر بابو، اگر ہم آپ کے کہنے پر جاوید کو ہیروئن کا عادی نہ بناتے تو آج اس کی بہن آپ کے گھر نہ ہوتی۔'' وقاص نے کہا۔

''بکواس بند کرو، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' صفدر نے اسے جھاڑا۔

''یہ پکڑو دو ہزار اور پھوٹ لو یہاں سے، آئندہ دکھائی دیئے یا کبھی میرے گھر یا راستے میں آڑے آئے یا کہیں زبان کھولی تو یہ جان لو کہ روزانہ اخبارات میں خبریں شائع ہوتی ہیں کہ ''نشئی سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا'' ''ویران جگہ سے نشئی کی لاش برآمد'' وہ انہیں بری طرح دھمکا رہا تھا۔



ایک رات راحیلہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ صفدر نے کار خرید لی تھی، اس نے فوری راحیلہ کو اسپتال منتقل کیا، فون کر کے راحیلہ کی ماں کو بھی بلا لیا، جاوید بھی آ گیا، دو یا تین گھنٹے گزرے ہوں گے لیبر روم سے ایک ماسی ٹائپ خاتون باہر آئی، صفدر کون ہے؟ اس نے وارڈ کی گیلری میں آواز لگائی۔

''جی میں ہوں۔'' صفدر آگے بڑھا۔

''مبارک ہو! اللہ نے چاند سی بیٹی دی ہے''

صفدر نے 500 نکال کر ماسی کو دیئے، چند لمحوں بعد ایک نرس بھی آ گئی۔ صفدر نے اسے بھی 5 سو روپے دیئے، اسی طرح تین ملازمین اور مبارکباد دینے آ گئے، صفدر سب کو خوش کرتا رہا، وہ خود بھی خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا، وارڈ کلرک کو بھی اس نے ایک ہزار روپے دیئے، اسے بتایا گیا کہ چند گھنٹوں بعد زچہ بچہ کو وارڈ میں شفٹ کر دیا جائے گا۔ صفدر کا دل مچل رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو ایک نظر ہی دیکھ لے، لیکن اجازت نہ تھی۔ دو گھنٹوں بعد راحیلہ اور بچی کو خواتین کے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ صرف اس کی ماں ساتھ تھی، صفدر اور جاوید وارڈ کی گیلری میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''اللہ اکبر، اللہ اکبر۔'' فجر کی اذان ہونے لگی تو دونوں شکرانے کے نوافل کی ادائیگی کیلئے اسپتال کی مسجد میں چلے گئے، نماز اور نوافل کی ادائیگی کے بعد کنٹین پر ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور پھر وارڈ کی گیلری میں چلے آئے۔ بیرونی دروازے پر ایک سخت گیر خاتون تالہ لگائے، دروازے کے جھروکے سے جھانک رہی تھی، صفدر ہمت کر کے آگے بڑھا۔

''آپا اندر جانے کا کوئی طریقہ؟'' اس نے پوچھا۔

''تھوک سے پکوڑیاں تلو گے'' خاتون نے ترنت جواب دیا۔

صفدر فوری سمجھ گیا اس نے چپکے سے 500 کا نوٹ

جھروکے سے آپا کو پکڑا دیا۔
"جلدی آ جانا، ڈاکٹر صاحب چکر لگانے آئیں گے، ان کی آمد سے قبل آ جانا"۔
"جی بہتر"
آپا نے دروازہ کھول دیا، صفدر چپکے سے وارڈ میں داخل ہو گیا، سائیڈ کی گیلری میں چلتا ہوا وارڈ کے دروازے تک پہنچا، جھکتے جھکتے اندر داخل ہوا، دروازے کے ساتھ ہی چوتھے بیڈ پر راحیلہ نومولود کو سینے سے چمٹائے لیٹی تھی، چہرے پر زردی تھی، آنکھیں بند تھیں۔
"اماں سب ٹھیک ہے۔" صفدر نے ساس سے پوچھا۔
"ہاں بیٹا، اللہ کا بڑا کرم ہے۔" راحیلہ، راحیلہ" ماں نے اسے آہستہ سے پکارا، راحیلہ نے آنکھیں کھولیں، سامنے صفدر تھا، وہ آگے بڑھا، راحیلہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا، پھر اپنے چاند کے ٹکڑے کی پیشانی پر کئی بوسے دیئے، بیٹی کے نین نقش بالکل ماں پر تھے، وہی گلابی گال، پتلے پتلے ہونٹ، ستواں ناک، سحرزدہ سی کر دینے والی آنکھیں، صفدر اسے تکے جا رہا تھا۔
"بس کرو، نظر لگ جائے گی۔" راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔
"ایں...... صفدر چونکا، اس نے اردگرد دیکھا، وارڈ میں متعدد بیڈ تھے جن پر خواتین نوزائیدہ بچوں کے ہمراہ لیٹی تھیں۔
"میں چلتا ہوں، جاوید میرے ساتھ ہی ہے، کوئی مسئلہ ہو تو فون کر لینا۔"
صفدر یہ کہہ کر وارڈ سے دوبارہ گیلری میں آ گیا۔



راحیلہ چاند سی گڑیا کے ہمراہ اسپتال سے گھر آ گئی تو جیسے میلہ لگ گیا ہو، کبھی ایک ہمسائی مبارک باد دینے آ رہی تھی تو کبھی دوسری، صفدر نے مٹھائی کا ٹوکرا ہی منگوا لیا تھا، خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، اس نے مٹھائی کے کئی ڈبے بازار بھی بھجوائے تاکہ اس کے ہمسائے دکاندار بھی منہ میٹھا کر لیں، دو چار دن خوب ہلا گلا رہا، صفدر کی بہن بھی آ گئی تھی، رخشندہ اور راحیلہ کی ماں تب تک وہاں رہیں جب تک راحیلہ خود اٹھنے بیٹھنے اور ہلکا پھلکا کام کرنے کے قابل نہ ہو گئی۔ اس کے بعد صفدر نے ماسی ہی کے ذریعے ایک ایسی خاتون کا انتظام کر لیا تھا جو راحیلہ کی دیکھ بھال کر سکے اور دائی کے فرائض بھی انجام دے سکے، رفتہ رفتہ خوشیوں سے بھرے دن گزرنے گئے، صفدر بیوی اور بیٹی کا ہر طرح سے خیال رکھتا، راحیلہ کی والدہ بھی دو چار دن بعد چکر لگا لیتی تھی، بچی کا نام انہوں نے جمیلہ رکھا، وہ تھی بھی حسین و جمیل، نام اس پر خوب جچتا تھا۔



جمیلہ 6 ماہ کی ہو گئی تھی، ایک شام جب گھر میں صرف وہی تینوں افراد تھے تو راحیلہ نے صفدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے"۔
"ہاں کہو۔" صفدر جو جمیلہ کو گود میں لئے بیٹھا تھا متوجہ ہو گیا۔
"محبت کی جو کھوکھلی یادگار تم نے تعمیر کی ہے میں اسے مسمار کرنا چاہتی ہوں۔" راحیلہ کا لہجہ انتہائی سنجیدہ تھا۔
"میں سمجھا نہیں؟" صفدر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔
"تمہاری ساری منہ دیکھے کی محبت، چاہ، الفت، پریت، سب دھوکا تھا" راحیلہ نے دوسرا تیر چلایا۔
"کیا کہہ رہی ہو تم۔" صفدر دیدے پھاڑے ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔
"مجھے طلاق چاہیے۔" راحیلہ نے اچانک دھماکا کیا۔
"کک کیا؟" صفدر کے اوسان خطا ہو گئے، اس کے قدموں تلے زمین نکل گئی، سخت گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں بولا۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"
"جو تم سن رہے ہو" راحیلہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔
"صفدر کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ "غضب خدا کا" اتنی بڑی بات تم نے اتنی آسانی سے یوں کہہ دی جیسے طلاق نہیں کھلونا مانگ رہی ہو"۔
"تم نے میرے گھر، میرے بھائی، مجھے کھلونا ہی تو سمجھا، ہم سے یوں کھیلے کہ کوئی کمینہ بھی ایسا کھیل نہ کھیلتا ہو جس کی رگ رگ میں کمینگی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔"

راحیلہ کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں، ''تم تو آدمیت سے بھی گزر گئے ہو''
''بس طلاق یا پھر خلع'' یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''
راحیلہ نے آنسو پونچھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔
''مجھے کچھ بتاؤ گی بھی یا باتوں سے میرا سینہ چھلنی کرتی رہوگی''۔
''گزری سردیوں کی اس شام موالی قسم کے وہ نوجوان کون تھے جو تم سے ملنے آئے تھے۔'' راحیلہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''کون نوجوان۔'' صفدر بوکھلا گیا۔
''وہی جن کو پیسے دیئے تھے؟''
''کیسے پیسے؟''
''ہمارا گھر تباہ کرنے، ہمارے آشیانے کو تنکا تنکا بکھیرنے کے پیسے، ہمارے گھر کو عذاب کی بھٹی میں جھونکنے کے پیسے؟ سنو صفدر! میں نے اس روز وہ تمام گفتگو سن لی تھی جو ان دو نشئیوں اور تمہارے درمیان ہوئی تھی' تم نے ان نشئیوں کے ذریعے جاوید کو ہیروئن کا عادی بنایا، ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور خود تماشہ اہل کرم دیکھتے رہے''۔
''صفدر کی حالت یوں تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، ہوش وحواس اڑ گئے تھے''۔
راحیلہ شعلہ بار آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں بولی ''جب سے مجھے تمہاری سازش کا پتہ چلا میں نے کروٹیں بدلتے راتیں گزاریں، دن بے چینی میں گزرے، لیکن مجھے مناسب وقت کا انتظار تھا، میرا جی تو اسی دن ہی تم سے کھٹا ہو گیا تھا، تمہارا نشانہ تو خطا نہیں گیا، اب وار کی باری میری ہے اور ہدف تم ہو، جو نشتر میرے دل میں پیوست ہوتے رہے اب وہ گھاؤ تمہارے سینے میں لگیں گے تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ جب بازی پلٹتی ہے تو شکست کا سواد کیا ہوتا ہے۔'' وہ چند لمحے سانس لینے کے لئے رکی۔
صفدر جمیلہ کو زور سے سینے سے چمٹائے پتھر کا بنا ہوا تھا، اس کی عقل ٹھکانے پر نہ رہی تھی، بیچ چوراہے ہنڈیا پھوٹی تھی، اس سے کوئی جواب نہ بن پا رہا تھا، اس نے راحیلہ کے گھر میں جو گھات لگائی تھی وہ سب آشکارا ہو چکا تھا، سچ کو کیسے جھٹلاتا؟
''راحیلہ خدا کیلئے، ایسا نہ کہو، میرا دل ڈوب رہا ہے''
وہ التجائیہ لہجے میں بولا۔
''بس صفدر، بس، موقع اور مطلب پرستی کی کوئی حد ہوتی ہے لیکن تم نے تو بدلے کی آگ میں ہر حد پار کر دی''، اس کا لہجہ تھا یا پھنکار صفدر تھرتھرا کر رہ گیا، راحیلہ کا یہ روپ وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی، وقت پلٹ کر اس پر جو تازیانے برسا رہا تھا یہ تو اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا، اس نے پھر ایک کوشش کی۔
''راحیلہ خدا کیلئے اب بھول جاؤ، میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگتا ہوں'' وہ گڑگڑایا۔
''تم ہوس پرست، حریص، لالچی، معافی کی بات کرتے ہو، میرے پاس تمہیں دینے کیلئے کچھ نہیں''
''لوگ کیا کہیں گے، رشتہ دار سو سو باتیں بنائیں گے کہ بچی ابھی سال کی بھی نہیں ہوئی اور نوبت طلاق تک پہنچ گئی''
''ان باتوں کا جواب تم نے دینا ہے، تمہارے پاس جواب بھی ہے اور گزرے وقت کا حساب کتاب بھی''۔
''بس کرو راحیلہ!''
''تم نے بس کی تھی، نہیں نا، بلکہ بے بس کر دیا تھا ہمیں۔''
''مجھ سے اگر بہت ظلم ہوا ہے تو میں نے مداوا کرنے کی بھی کوشش تو کی ہے۔''
''نہیں تم نے یہ بازی جیتنے کیلئے میری شرائط مانی تھیں۔''
''کیا مفاہمت کا کوئی راستہ نہیں۔''
''سارے راستوں پر بندھ تم نے باندھے۔''
''تم مجھے امتحان میں ڈال رہی ہو۔''
''امتحان تو ہو چکا، میں تو رزلٹ بتا رہی ہوں''
بچی رونے لگ گئی، راحیلہ نے چھاتی سے لگایا، دودھ پلایا، بچی کو سکون ملا اور پھر سوگئی۔
''دیکھو تمہیں اس بچی کی قسم''......راحیلہ نے اسے فوراً ٹوکا ''خبردار جو بچی کا نام لیا۔
''اپنے بوئے ہوئے کانٹوں سے زخمی ہو رہے ہو تو

اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں"
"راحیلہ کے جملے اسے تلخ کافی کے گھونٹ محسوس ہو رہے تھے، دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا، ہر طرف اندھیرا محسوس ہو رہا تھا، اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ اپنی بیوی کو کیسے منائے، اس کے تخیل کا پردہ پاش پاش ہو رہا تھا، حقیقت بہت تلخ تھی، زہر کے جیسی...... جس کا ذائقہ بے انتہا کڑوا ہو اور وہ ہر رگ جاں سے دھیرے دھیرے زندگی نچوڑ رہا ہو"۔

وہ راحیلہ کے پاؤں پڑ گیا۔
"ایسا نہ کرو، میری زندگی برباد ہو جائے گی" راحلہ نے پاؤں جھٹکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
"سنو صفدر! میں نے ساری کشتیاں جلا دیں، واپسی کا کوئی راستہ نہیں، طلاق یا خلع اور بس...... ہاں یہ مکان بھی میرے نام ہے، اپنے رہنے کا بھی بندوبست سوچو!
"صفدر ساکت سا ہو کر اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ شاید وہ اپنے حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ پتہ اس وقت چلا، جب وہ دھڑام سے فرش پر گرا اور بے ہوش ہو گیا، راحیلہ ایک لمحے کے لئے بوکھلا گئی، فوراً ہی خود کو سنبھالا، ہمسائے کو بلایا۔ حاجی انور نے فوراً اسے گاڑی میں ڈالا، ڈاکٹر کے پاس لے گئے، دو گھنٹے بعد واپسی ہوئی، رات کے تقریباً بارہ بج رہے تھے، حاجی انور اسے سہارا دیئے لائے اور کمرے میں لٹا دیا، اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔
"فکر کی بات نہیں بیٹا' حاجی انور بولے "اعصابی کھچاؤ کے باعث بے ہوش ہو گیا تھا، اب قدرے بہتر ہے، یہ کچھ ادویات ہیں، نسخے کے مطابق اسے کھلاتی رہنا کل شام تک طبیعت مکمل سنبھل جائے گی، ابھی یہ دوائیوں کے اثر میں ہے اس لئے سو جائے گا پھر بھی میری ضرورت ہو تو آواز دے لینا" حاجی انور اسے ادویات کا شاپر پکڑا کر چلے گئے......
صبح جب صفدر کی آنکھ کھلی تو گھر سے کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ اس کا دل بھر آیا۔ کتنا کچا رشتہ ہوتا ہے۔ صرف اعتماد کی ڈور سے بندھا، جتنا اعتماد ہے اسی قدر مضبوط، ورنہ ایک کچی تند سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا یہ میاں بیوی کا رشتہ

۔جب دلوں میں دراڑ آ جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔
"ہوش آ گیا تمہیں؟" راحیلہ کی آواز پر وہ چونک گیا۔
"ہاں......" اس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔
"بولو، کیا کرنا ہے، مجھے طلاق دو گے یا خلع لینا پڑے گا مجھے۔" وہ انتہائی تلخ لہجے میں بولی تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
"بس کرو، معاف کر دو مجھے، میں اب اتنی سکت نہیں رکھتا کہ مزید کوئی دکھ سہہ سکوں، میں شرمندہ ہوں۔"
"ابھی تو تمہیں مزید شرمندہ ہونا ہے، میں بھی کسی کی بیٹی تھی، کیا حق تھا تمہارا مجھ پر جو تم نے ہمیں برباد کیا ایک ضد کے لئے، اب دیکھو میں تمہاری بیٹی کے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ سوچو، جب کوئی غیر مرد تمہاری بیٹی کو اپنی بانہوں میں لے گا۔ تم دیکھو گے۔ تم کسی کی بیٹی پر آوازے کستے تھے، غیر مرد تمہاری بیٹی پر آوازیں......"
"بس......" وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخا۔
"تم تصور میں بھی یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے، اور تم نے......" راحیلہ نے کہنا چاہا مگر اس نے پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"بس کرو، مجھے تم معاف نہ کرو۔ لیکن ایک وعدہ کرو، میری نہ سہی اپنی بیٹی سمجھ کر اس کی حفاظت کرنا، میں تمہارا مجرم ہوں، میں تمہارے سامنے اپنی جان دے دیتا ہوں۔ پلیز۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ تیزی سے الماری کی جانب بڑھا اور وہاں دھرا پسٹل اٹھا لیا۔ اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔ راحیلہ وحشت بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہی۔ صفدر نے اس کی جانب التجائیہ انداز میں دیکھا اور بولا، "پلیز اپنی بیٹی کی حفاظت کرنا۔"
یہ کہتے ہی اس نے اپنی انگلی کو حرکت دی۔ راحیلہ برق رفتاری سے بڑھی۔ ایک دھماکا ہوا، گولی چھت میں جا لگی۔ صفدر بچ گیا تھا۔ راحیلہ اس کے سینے سے لگی مسلسل روئے چلی جا رہی تھی۔ صفدر نے اسے خود سے الگ کیا اور اس کے آنسو پونچھ دیئے۔



لیکھ

روشانے سبعین

کیچڑ میں کھلنے والے ایک کنول کی روداد، اس کے لیکھ میں کیچڑ ہی لکھا تھا۔

اک دوشیزہ کا احوال، وہ اپنے آپ سے مطمئن نہ تھی

اسے اپنا بدصورت شوہر ایک آنکھ نہ بھاتا تھا

''نگوڑ ماری...... اٹھ جا...... کب تک کھاٹ پر پڑی یونہی اینٹھتی رہے گی......؟'' فقیر محمد کو آتا دیکھ کر بڑھیا چلاتی ہوئی رانی کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی اٹھ کھڑی ہوئی' نگاہیں ٹوٹے بوسیدہ دروازے کی اوٹ سے اندر آتے فقیرے پر پڑیں' تو لگا جیسے کونین کی گولی نگل لی ہو۔

''اے اماں! اپنے لاٹ صاحب کو آتا دیکھ آپے سے باہر کیوں ہو جاتی ہو تم......؟'' وہ بھی تنک کر دوبدو ہوئی۔

''ارے ناس پٹی...... نوج' خصم ہے تیرا...... ساری رات کی ڈیوٹی کر کے تھکا ہارا گھر آیا ہے...... ست بسم اللہ کہہ...... یوں بک بک کا ہے کو کرت ہے سویرے سویرے......؟'' بوڑھی ساس رانی کی صبح صبح کی بکواس سے سخت کبیدہ خاطر تھی۔

''کیا اماں...... تو بھی ناں...... کیوں اتنا کوستی ہے رانی کو ہر وقت......؟ اس گھر میں قل قل ہی ختم نہیں ہوتی......''

بیزاریت اور تھکاوٹ فقیرے چوکیدار کے سیاہی مائل چہرے پر یوں چسپاں تھی' گویا موروثی بیماری میں ملی ہو۔

''ہونہہ۔'' وہ ناک سکیڑتی ایک گاڈر کی چھت والے باورچی خانے کی اور چلی گئی...... اپنی حمایت میں کہا گیا جملہ اسے خوشی کا رتی بھر احساس نہ دلا سکا۔ اس ادھیڑ عمر آدمی سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی' جس کی گہری سانولی رنگت اور دیو قامت جثہ اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ظاہر کرتا تھا چپٹی سی قدرے پھیلی ہوئی ناک سیاہ چہرے کو اور بھی بھدا بناتی...... اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سانپ سی گول آنکھیں رانی کو اتنی بری لگتیں کہ خواہ مخواہ جی متلانے لگتا اور اس کا دل چاہتا کہ اس کے دیدے نوچ کے چیل کوؤں کو کھلا دے' جب وہ محبت بھری نظروں سے 19 سالہ چھریرے بدن کی رانی کو دیکھتا تو وہ اسے اور بھی برا لگتا...... قریب جانے کے خیال سے بھی ابکائی آنے لگتی۔

''منحوس بڈھا...... جان کا عذاب......'' وہ باورچی خانے میں برتن پٹخ پٹخ کر اپنا غصہ نکال رہی تھی۔

''ارے اس چھٹانک بھر کی چھوکری کے پیچھے ماں کو ٹکے ٹکے کی سناتا ہے۔ پچھتائے گا اک دن فقیر محمد...... پچھتائے گا تو...... جوان چھوکری ہے' یوں سر پر مت چڑھا...... اس کے لچھن ٹھیک نہیں لگتے مجھے۔''

فقیر محمد نے گھبرا کر کچن کی طرف دیکھا...... جانے کیوں آج اماں کی للکار سن کر بھی وہ چپ تھی۔ ورنہ تو سیر کو سوا سیر تھا...... وہ گھمسان کا رن پڑتا کہ اللہ کی پناہ......!

''بس کر اماں...... اس نے جیسے منت کی' صبح صبح طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا ٹین کی چھت والے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

پوری رات کا رت جگہ...... اور ہر صبح یہی بک بک...... اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہونے لگا...... اماں بھی خاموشی سے فضلو دہی والے کی دکان کی طرف چل دی۔

''ہونہہ...... یہاں تو روز کا یہی تماشا ہے......'' باورچی خانے میں لچھے دار پراٹھے بیلتی رانی کڑاہی میں پڑے تیل کی طرح کڑھنے لگی۔

''اے سن تو...... اتنی دور کیوں بیٹھی ہے؟'' دوپہر کے



بعد فقیر محمد کی آنکھ کھلی تو دیکھا' وہ سلائی مشین پر کھٹ کھٹ کررہی تھی۔ اماں ہمسائے میں گئی ہوئی تھی' موقع سے فائدہ اٹھایا۔

''دیکھتا نہیں کفن سی رہی ہوں اپنا۔'' وہ کڑکی۔

''اتنی خفا کیوں رہتی ہے ہر وقت؟ اتنے تو ناز اٹھاتا ہوں تیرے۔'' وہ افسردہ ہوا۔

رانی کے ماتھے کے بل اور گہرے ہوگئے۔

''تو مت اٹھایا کر میرے ناز...... ہروقت سر پر سوار رہتا ہے میرے......'' دنیا جہاں کی نفرت اور حقارت اس کے لہجے میں پنہاں تھی۔

اتنی تحقیر پر فقیرے کا رنگ چند ساعتوں میں اور بھی سیاہ پڑ گیا۔

''رانو! اتنی نفرت کاہے کو کرتی ہے مجھ سے......؟'' اس کی آواز میں اتنی لجاجت اور بے بسی تھی کہ اک لمحے کے لیے رانو کا دل بھی ملال سے بھر گیا لیکن یہ احساس صرف پل بھر کے لیے تھا۔

ایک سال پہلے وہ اسے چالیس ہزار میں خرید کرلایا تھا' لیکن کبھی ایک بار بھی اس کو احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ اس کی زرخرید ہے' پھر بھی رانو زہریلی ناگن کی طرح ہروقت پھنکارتی رہتی۔

''رانو! یہ بدصورتی بھی اس رب کی دین ہے' میں اس پر بھی سوہنے کا شاکر ہوں۔ جانتی ہے ب چپن میں میری کالی رنگت کو جب سارے دوست مذاق کا نشانہ بناتے' میرا تمسخر اڑاتے' مجھے الٹے ناموں سے پکارتے' تو میں چڑ کر رونے لگتا' میرا ننھا سا دل بری طرح ٹوٹ جاتا' تب اللہ بہشت نصیب کرے' ابا مجھے پیار سے کہتا ''پتر فقیر محمد' کالے کرماں والے......اور تو میرا کرماں والا بچہ ہے۔'' تو میرے دل سے ہر رنج وغصہ جاتا رہتا۔''

چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے شفاف قطرے گرے، وہ تن کا کالا من کا اجلا تھا۔

"چل چھوڑ ان باتوں کو...... کھانا لاؤں تیرے لیے ......؟" وہ جیسے دامن بچا رہی تھی۔

کچی بستی کے پاس سے گزرتی ریل گاڑی کی چھک چھک، دفعتاً فقیر محمد کے دل کو تیز آری سے چیرنے لگی۔

"ابا...... ابا بھی تو ریل کار کے ایک حادثے میں......!"

"کسی کا کیا گیا......؟ بس اخبار کے فرنٹ پیج پر ایک بڑی سی خبر......"

ٹرین میں بم دھماکے سے درجنوں افراد زخمی اور تیرہ ہلاک۔"

ان تیرہ میں ایک ابا بھی تو تھا۔

دہشت گردی کی بھینٹ چڑھنے والا ایک بے ضرر مزدور۔

"اے بیٹھے بیٹھے سو گیا ہے تو......؟" رانو کی تیز پاٹ دار آواز نے اسے یادوں کے جم غفیر سے باہر لا پٹخا۔

"یہ منحوس ٹرین ہر روز چار بجے یہاں سے کیوں گزرتی ہے ......؟ میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لیے ......؟" وہ دبے دبے غصے سے چلایا۔

رانو کو ایک لمحہ کے لیے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

"پاگل ہو گیا ہے تو ...... ابھی اپنے ابے کی باتیں کر رہا تھا، یہ ٹرین کہاں سے آ گئی بیچ میں......؟" رانو کے انگ انگ سے بیزاریت ٹپک رہی تھی۔

یہ بے سروپا گفتگو اسے سخت کوفت زدہ کر رہی تھی۔

"رانو! یہ دہشت گرد کیا ماں کے پیٹ سے ہی ایسے جنم لیتے ہیں، یا دنیا انہیں ایسا جانور بنا دیتی ہے؟ وہ کھویا کھویا سا کسی اور ہی جہان میں تھا، انہی خیالوں میں گم یوں معصومیت سے رانو سے استفسار کر رہا تھا، گویا وہ ہر سوال کا جواب رکھتی ہے۔

"دیکھ فقیرے تیری یہ فضول کی بکواس سننے کے لیے ٹیم نہیں ہے میرے پاس، تیرا تو سچ میں دماغ چل گیا ہے۔"

وہ تن فن کرتی یہ جا وہ جا۔

"ربا! میرے لیکھ محبتوں سے خالی کیوں......؟" فقیر محمد کے لبوں سے ایک بے بس آہ نکلی۔

وہ چپلیں گھسیٹتی پھر سے بوسیدہ در و دیوار والے اسی کمرے میں آئی، جہاں چند ساعتوں پہلے فقیر محمد کے ساتھ منہ ماری کر کے گئی تھی۔

"لے روٹی کھا...... تیری ماں واپس آ کے جینا حرام کر دے گی میرا۔ کہ ٹیم سے روٹی ٹکر بھی نہیں دیتی تجھے......" اس نے ٹرے فقیر محمد کے پاس جیسے پٹخی، اور خود پاس پڑی جھلنگا سی چارپائی پر لیٹ گئی۔

تھیلے سے رومال میں دو روٹیاں اور کچی پکی چنے کی دال...... وہ بے دلی سے کھانا زہر مار کرنے لگا، رانی آنکھوں پر بازو رکھے بلو حجام کو سوچ رہی تھی، جس کی دکان گلی کی نکڑ پر تھی۔

"خدایا! کیسا بانکا سجیلا اور سوہنا جوان ہے۔" رانی کا دل اس کے تصور سے دھڑک اٹھا۔

"کہاں وہ ...... اور کہاں یہ مکروہ صورت ڈھلتی عمر کا مرد......" نفرت و بیزاریت سوچ کی لہروں سے ہوتی ہوئی بدن کے ہر عضو میں سرایت کرنے لگی۔

گناہ میں بھی کیسی لذت ہوتی ہے۔

برائی ثواب و گناہ کے تصور سے ماورائی ہوتی ہے۔

گناہ کبھی مجبوری و بے بسی کی اوٹ سے چھپ کر حملہ آور ہوتا ہے تو کبھی انسان کی فطرت اسے دعوت گناہ دیتی ہے۔

غربت کے سائے میں پلی رانی خانہ بدوشوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھی جہاں بھوک رگ رگ میں گناہ کا زہر اتار دیتی ہے، قبیلے کے ہر مرد کی طرح رانو کا ابا بھی نشے کا عادی تھا...... بیٹی بھی اس لت کی نذر ہو گئی۔ خانہ بدوشوں کا یہ قبیلہ ریلوے لائن کے پار کچی بستی کے قریب پچھلے 10 سال سے آباد تھا۔ یہاں مرد عورتوں کی کمائی پر پلتے تھے...... جو سارا دن کچرا چنتیں اور بھیک مانگتیں...... بستی کے مرد جوا کھیلتے اور چوری چکاری میں بھی ملوث رہتے، اکثر بستی پر پولیس کے ریڈ ہوتے رہتے، یہ وہاں کے لوگوں کے لیے معمول کی بات تھی۔

رانو اپنی ماں کے ساتھ دن بھر کوڑا چنتی، اور ابا نشے میں دھت کھولی میں پڑا رہتا۔ مائی رجاں گھنٹوں اسے کوسنے دیتی، کام چور، نکھٹو اسلم کبھی کان دبائے چپ چاپ چارپائی توڑتا رہتا، اور کبھی اسے روئی کی طرح دھنک کے

رکھ دیتا' جواباً مائی رجاں کے منہ سے مغلظات کا نہ تھمنے والا طوفان شروع ہو جاتا۔ رانو دنوں مائی رجاں کے نیل نیل بدن کو تکور کرتی بچپن سے ہی اسے ابا سے شدید نفرت تھی۔

''اللہ کرے یہ منحوس جلد مرجائے۔'' وہ دل سے باپ کو بددعا دیتی۔ پوری حیاتی اسے باپ کی طرف سے کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا تھا۔ ماں کو اس نے ہمیشہ باپ سے پٹتے اور روتے دیکھا۔ وہ رانو کی شادی کے لیے مائی رجاں کے پائی پائی جوڑ کے رکھے ہوئے پیسے بھی چھین کے لے جاتا' اور جب بھی وہ مزاحمت کرتی تو اس کے ساتھ ساتھ رانو کو بھی دھنک کے رکھ دیتا...... رجاں اس دکھ میں سوکھ کے کانٹا ہوگئی تھی۔ رانو میں اس کی سانسیں اٹکی رہتی تھیں' سات بار اس کی کوکھ اجڑی تھی...... اٹھرا کا مرض کسی آکاس بیل کی طرح اس کے وجود سے چمٹ گیا تھا۔ ہر بار زندگی اس کے اندر سانس لینے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی' جادو' ٹونے' تعویذ' بہترے پاپڑ بیلے' حکیموں اور ڈاکٹروں سے ہر طرح کا دوادارو کیا' تب کہیں جاکر رب نے اس کی جھولی بھری اور بڑی منتوں مرادوں کے بعد رانو پیدا ہوئی۔

باپ اس قدر سنگدل تھا کہ اس نے ایک نظر بچی کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

''لڑکی پیدا کرکے تو نے کونسا تیر مار لیا' کوکھ لی عورت۔'' مائی جلی کو جلے کٹے انداز میں ابا نے کئی طعنے کسے

-

''تو چھوکرا پیدا کرکے کون سا تیر مار لیتی......؟؟ وہ بھی تیری طرح نکھٹو ہی ہوتا' بستی کے سارے مرد ایسے ہی تو ہوویں......'' وہ بھی تنفر سے کہتی دوبدو ہوئی' بیٹی اسے جان سے بھی پیاری تھی' اللہ نے اس کی سنی تو سہی...... اس کے لیے یہی بہت تھا۔ رانو کو کبھی یاد نہیں پڑتا تھا کہ ابا نے ایک پل کے لیے سہی' کبھی اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھا ہو' ابا اس کے لیے ایک ناسور سے بڑھ کر کچھ نہ تھا۔

اور اب تو دھیرے دھیرے وہ اس سے بھی بیزار ہورہی تھی' جوانی اس کے انگ انگ میں شرارے کی طرح ناچتی' بدقسمتی سے وہ باپ کی فطرت چرا لائی تھی۔ اسی کی طرح نیت کی کھوٹی' بدفطرت اور نظر باز...... مائی کی کڑی نگاہوں کا پہرہ اسے زہر سے بھی برا لگتا...... سولہ کا سن تھا...... اور وہ سرتاپا آتش تھی' جو خاک ہوجانا چاہتی تھی۔ مائی جھگی کے پاس کسی چھوکرے کو پھٹکنے بھی نہ دیتی' اور رانو جلتی کڑھتی رہتی۔

قبیلے کی بہت سی عورتیں شام کے سائے گہرے ہوتے ہی' چوراہوں پر بھیک مانگنے کے علاوہ صاحب لوگوں کی لمبی لمبی گاڑیوں میں بیٹھ کر ان کے ساتھ چلی جاتیں' کمائی کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا۔ قبیلے کے مردان باتوں سے لاعلم نہیں تھے' لیکن مائی کیچڑ میں کنول کا پھول تھی...... اس غریب کی روح پاکیزہ تھی...... اسلم نے کئی بار اس سے دھندہ کروانے کی کوشش کی' لیکن مائی اس کے منہ پر تھوک دیتی۔

''تجھ سا بے غیرت میں نے اپنی جندگی (زندگی) میں نہیں دیکھا' اس کے اصرار پر وہ شعلے برساتی نظروں سے اسے دیکھ کر کہتی۔

''تو اب دیکھ لے......'' وہ بے شرمی اور ڈھٹائی سے اپنے ٹیڑھے میڑھے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا' مائی کو گندی نالی کے کیڑے سے بھی بدتر لگتا......

موئے! اللہ کرے مرجائے تو......'' وہ بے بسی اور شرم سے پیلی پڑجاتی۔

حالات کی کڑک دھوپ میں خود کو جھلسائے اس نے پل پل زندگی کا زہر پیا تھا' لیکن عزت کا سودا اسے منظور نہ تھا۔

''ربا سوہنا! کیا عزت صرف امیروں کی میراث ہے؟ جھگی میں رہنے والوں کو عزت سے جینے کا کوئی حق نہیں؟'' آنسو اس کے دل پر قطرہ قطرہ گرتے' لیکن چھید جگر میں ہو رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی ناں۔

اور اب تو وہ خون تھوکنے لگی تھی۔

رانو زندگی میں پہلی بار خوفزدہ ہوئی......''مائی! تو کسی وید سے دوادارو کر...... اویں مرکھپ گئی تو میں کیا کروں گی......'' وہ اس سے لپٹ گئی۔

''پتر! مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا......خوف تو اس بات کا ہے کہ وہ تیرا بدخصلت باپ نشے کی خاطر تجھے بیچ کھائے گا' یہ دنیا بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے رانو...... جھلیے' تو بہت کم عقل اور معصوم ہے الہڑپن میں کوئی وڈا نقصان کر بیٹھے گی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کے رودی۔

رانو نظریں چرا گئی' اس کے نین مٹکلے مائی کے جہاندیدہ نگاہوں سے چھپے نہ تھے۔

''مائی تو وی ناں......رب جانے کیا کیا بولتی رہتی ہے......چھوڑ ان ساری باتوں کو......'' رانو نے جیسے اسے بہلانا چاہا۔

''رانو......! تو مجھ جیسی کیوں نہیں......؟'' مائی کے زرد مٹیالے چہرے کی ہر جھری میں بے بسی کی انمٹ داستانیں رقم تھیں۔

''او نیلی چھتری والے...... کیا میں سکون سے مر بھی نہیں سکتی......'' غم کی برچھیاں اسے لہولہو کر رہی تھیں۔

''مائی! مجھے چھوڑ کے کہیں نہ جائیں......'' رانی کی کالی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھرنے لگیں۔

مائی کی دوائیوں نے اسے نچوڑ کے چٹا سپید کر دیا۔

''رانو......میری اکو اک دھی......'' مائی نے تڑپ کے اس کا چہرہ ابھری رگوں والے نحیف ہاتھوں کے پیالے میں لیا اور پیاسی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

مائی کی آنکھوں کی پتلیوں میں موت کی وحشت دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ رانو کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

''کیا میری مائی مجھ سے بچھڑنے والی ہے؟'' محض جدائی کی سوچ نے ہی اس کی رگ رگ میں درد کا زہر اتار دیا تھا۔

اس نے مائی کو اس زور سے بھینچا کہ اس کی کراہ نکل گئی۔ وہ اس کی پناہوں میں چھپ کر ہر خوف سے بے نیاز ہو جانا چاہتی تھی۔

مائی کے لبوں پر اک زخمی مسکراہٹ پھیل گئی......پچھلے کئی مہینوں سے اس سے دور رہنے والی رانو' چھوڑے کے خوف سے اب اس کے بوڑھے سینے میں چھپی ہولے ہولے سسکیاں بھر رہی تھی۔

''ربا! میری دھی کو اپنی امان میں رکھنا۔''

زرد چہرے والی عورت کے سیاہی مائل پھیکے لبوں نے رب کی بارگاہ میں عرضی دی۔

لیکن شاید وہ وقت قبولیت نہیں تھا......تقدیر نے دہائی دی۔

اور...... وہ سیاہ رات ماتمی لباس پہنے رانو کے گھر کی چوکھٹ پر اپنے اندر جہانوں کی تاریکیاں سموئے یوں اتری کہ مائی کو ہر فکر و غم سے بے نیاز کر گئی۔

رانو نے بے جان وجود کی ٹھنڈک کو محسوس کیا' تو اس کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

زندگی کی قید سے چھٹکارا پانے کے بعد مائی کے چہرے پر آسودگی تھی۔

''مائی......میری مائی......میری ماں۔'' رانو کی چیخیں اس کے اندر ہی گھٹ گئیں۔ وہ کئی دن تک سکتے کے عالم میں جھگی کے اک کونے میں سہمی سی بیٹھی رہی۔

مائی کے بنا زندگی جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔ مائی کے جانے کے بعد رانو کو اندازہ ہوا' کہ وہ کتنی تنہا ہے' اسے سب کچھ ادھورہ اور بے جان لگتا۔

ابا کے روز و شب میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ حسب عادت نشہ کر کے پڑا رہتا' مائی کا وجود گویا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

''کتنا گھٹیا شخص ہے یہ...... جانور کے ساتھ بھی رہیں تو اس سے بھی انسیت ہو جاتی ہے' مائی تو پھر بھی انسان تھی۔'' وہ تنفر اور یاسیت سے سوچتی۔

باپ سے اس کی نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ مائی کو گزرے تین ماہ ہو گئے تھے۔ رانو کی تیز طراری' شوخی سب ختم ہو کے رہ گئی تھی۔ بس اکلاپا ہی اکلاپا تھا۔ باپ کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا' یہ بات ساری بستی جانتی تھی۔

کل شام مودے کو اس نے جھگی کے آس پاس منڈلاتے دیکھا' وہ اسے گندے گندے اشارے کر رہا تھا۔

''کمینے دفع ہو جا یہاں سے......'' رانو تنتناتی ہوئی جھگی سے باہر نکلی' اور اسے دیکھ کر تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

''میری رانی! اب تو میدان صاف ہے' کاہے کو نخرے کرتی ہے؟'' استہزائیہ لہجے میں ایک آنکھ دبا کر اس نے انتہائی کمینگی سے کہا۔

اس کی بات نے رانو کو پتنگے لگا دیے۔

''بے غیرت تیری یہ جرات' میری مائی کے بارے میں۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح وہ چارپائی پر پڑی کلہاڑی اٹھا کر اس کی طرف لپکی۔

''ایں...... فیوز تو نہیں اڑ گیا تیری کھوپڑی کا......؟

کمینی پہلے تو بڑا ہنس ہنس کر دیکھتی تھی......'' مودا (محمود) تحیر آمیز بے یقینی سے اسے دیکھتا ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔ اور وہ وہیں کھولی کے سامنے دھم سے پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔

مودا' ندیم' رحیمو' بستی کے سب چھوکرے اس کی راہ میں گھنٹوں کھڑے رہتے' اس کی منہ زور چڑھتی جوانی ایک مسکراہٹ اچھال کر اپنے حسن کا خراج وصول کرنا جانتی تھی' بدلے میں اس کے حسن کو خراج تحسین دینے کے لیے وہ پراندے' ہار' بندے اور کئی تحفے دیتے' جو مائی سے چھپ کر وہ خوشی خوشی قبول کرتی' لیکن مائی کے جانے کے بعد اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ اسے یاد آیا' مائی کیسے اس کی رکھوالی کرتی تھی' اور اب...... اس کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

''کیا مائی کے بعد اب میرا کوئی سائبان نہیں......'' اس کا دل درد کی اوس میں بھیگنے لگا۔

''مائی! تیری رانو تجھ جیسی بننے کی کوشش کررہی ہے۔'' اس نے مٹیالے آسمان کو خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے مائی کو پکارا۔

شام کے سائے کرب کا چولا پہنے بستی کو اپنی آغوش میں لینے لگے' رانو چولہے چوکے میں مصروف تھی جب ابا جھگی میں داخل ہوا' اور شہد آگیں لہجے میں اسے پکارا۔

''رانو بیٹی!'' رانو کو لگا جیسے اس کی سماعتوں کو دھوکا ہوا ہو' چند ثانیے وہ پتھر کی بت بنی جہاں کی تہاں رہ گئی...... مائی کے بعد اس کے دل کے نہاں خانوں میں یہ خواہش کب سے پنپ رہی تھی کہ کبھی دو گھڑی کو ہی سہی' ابا اس کو اپنے ہونے کا احساس دلائے' لیکن اس کی چھٹی حس جیسے اسے باور کروا رہی تھی کہ اس میٹھی پکار میں چالاک لومڑی کی سی عیاری پنہاں ہے۔

''جانے اب کیا قیامت برپا ہونے والی ہے۔'' اس کا دل یکبارگی ڈوب کے ابھرا۔

ابا اسے دانت نکوستا بھیڑیا لگا۔

''رانو بیٹی......'' ابا نے پھر سے پکارا...... مٹھاس کے خول میں لپٹی آواز نے اس کے اعصاب مترشح کردیئے' وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''ارے پگلی...... ادھر آ...... اپنے ابا سے کیوں ڈر رہی ہے تو؟'' ابا نے اسے پکارا۔ ''دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں......'' اس نے ایک پیکٹ رانو کی طرف بڑھایا۔

رانو سراسیمہ سی اس زرق برق لباس کو دیکھنے لگی۔

''ابا یہ کیوں......؟'' کسی انہونی کا احساس اسے ہولائے دے رہا تھا' اس کی آواز جیسے کسی اندھے کنوئیں سے آرہی تھی۔

'یہ سوہا جوڑا تیرے لیے لایا ہوں۔ آج شامیں (شام) تیرا نکاح ہے پیجے (پرویز) کے ساتھ۔'' رانو کی سماعتوں میں جیسے بم پھٹا۔

''میری لاڈو دہی اس میں شہزادی لگے گی۔'' ابے کی کھردری پاٹ ڈار آواز جو ہمیشہ مغلظات بکتی تھی۔ اس وقت مکھن جیسی ملائم ہورہی تھی۔

رانو شاک کی کیفیت میں اک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

''دیکھ پتر رانو...... تیری ماں کے بعد میں کلا (اکیلا) اس قابل نہیں کہ تیری ذمہ داری اٹھاسکوں...... اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ میری جندگی (زندگی) میں ہی تو اپنے گھربار کی ہوجائے۔''

مصنوعی شیریں لہجہ جیسے بوند بوند زہر ٹپکا رہا تھا۔

رانو کی سماعتیں چیخ اٹھیں۔

رانو نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا' تو وہ نظریں چرا گیا۔ اتنا سگا تو وہ کسی کا نہ تھا۔

''مائی! میں نے تجھ جیسا بننے کی دعا مانگی تھی...... تجھ جیسی قسمت نہیں مانگی تھی۔'' شکوے اس کے اندر سر اٹھانے لگے۔

40 سالہ پیجا بستی کا سب سے بڑا غنڈہ تھا...... شرابی' جواری' مار دھاڑ کرنے والا کئی جرائم میں ملوث......!

بستی پر اکثر اس کی وجہ سے پولیس کے ریڈ پڑتے۔

کلے میں پان دبائے وہ مکروہ صورت پیجا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ کمینہ ایک نمبر کا نظرباز تھا۔

''عشق تو آدمی اپنی عمر کے حساب سے ہی کرتا اچھا لگتا ہے۔'' رانی کو ادھیڑ عمر کے آدمی سخت برے لگتے تھے۔

پیجے سے نکاح کا سن کر ناگواریت کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

''ابا! وہ ایک نمبر کا لفنگا ہے' اور مجھ سے دوگنی عمر کا ہے' پھر بھی تو مجھے جلتی آگ میں جھونک رہا ہے۔'' وہ روہانسی

ہوئی۔
''تو اور کیا تیرے لیے آسمان سے کوئی شہزادہ آئے گا؟'' وہ بے صبرا اور عجلت پسند تھا۔ نرماہٹوں کا خول لمحوں میں چٹخ گیا' تو اہانت آمیز لہجے میں چمک کر بولا۔
رانو بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔
''میں کسی صورت اس غنڈے سے شادی نہیں کروں گی.....'' رانو نے قطعی لہجے میں انکار کیا۔
''زیادہ ڈرامہ بازی نہ کر.....تو کون سا محلوں میں پیدا ہوئی ہے کہ تیرے لیے کوئی لاٹ صاحب آئے گا...... خانہ بدوشوں کی بستی میں جنی ہے تو کوڑ اچننے والی فقیرنی...... بھول گئی اپنی اوقات؟ اپنے جیسے لوگوں کے رشتے ناتے ایسے ہی لوگوں کے ساتھ جڑتے ہیں۔ بستی کے سارے چھوکرے ایسے ہی تو ہوویں۔'' اس نے پھر سے مصالحانہ انداز اپنانے کی کوشش کی۔
حقیقت کے آئینے میں وہ اوندھے منہ گری تھی۔ کرچیاں اس کے وجود میں گھپ کر اسے لہولہان کر گئیں...... مائی نے رانو رانو کہ کر اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ سچ میں رانی سمجھ بیٹھی تھی خود کو..... ٹھیک کہتا ہے ابا۔ ''فقیرنی کے لیے سفید گھوڑے پر کوئی شہزادہ تھوڑی آئے گا.....'' وہ ساکت سی سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھوگئی۔
''چل تیار ہو جا تیرا نکاح بچے سے ہی ہوگا۔'' ابا نے تنک کر کہا۔ اور پھر وہی ہوا جو ابا چاہتا تھا..... شام میں ہی اس کا نکاح بچے کے ساتھ ہو گیا۔ وہ اتنی گم صم اور رنجیدہ خاطر تھی کہ اسے اردگرد کی مطلق پروانہ تھی' اور نا ہی کسی کو اس کی پروا تھی' اس کا دل جیسے پتھر ہو گیا' مائی بھی ایک لحہ کو یاد نہ آئی۔
وہ جیسے محبت و نفرت کے ہر جذبے سے ماورا ہو گئی تھی۔
بستی میں بچے کا پکا مکان تھا' اپنی جھگی سے اس مکان تک کا سفر اس نے صدیوں میں طے کیا۔
آدھی رات کو پرویز شراب کے نشے میں دھت اندر داخل ہوا تو اس کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ پلنگ پر اس کے قریب بیٹھا' تو اس کے پان زدہ منہ سے بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ رانی کو اس سے حد درجہ کراہیت محسوس ہوئی۔
''کتنی تمنا تھی تجھے پانے کی' آخر تجھے حاصل کر ہی لیا ناں...... بڑا نخرہ تھا' تجھ میں اور تیری مائی میں......'' اس کا ہاتھ تھامے وہ لڑکھڑاتے لہجے میں حقارت سے بولا۔
رانو کے اندر نفرت کے بگولے اٹھنے لگے۔ اس کی دست درازی بڑھنے لگی' تو رانی نے تنفر سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ رانو کو اس سے وہ اک گدھ لگا' جو اسے نوچ لینا چاہتا ہو...... وہ شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھنے لگی' تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔
''کمینی! تیرا وہ کمینہ باپ پیسے لے کر چلتا بنا' اور تو اب بھی اکڑ دکھاتی ہے' 40 ہزار میں خرید کر لایا ہوں تجھے' تیرے نخرے نہ دیکھوں گا...... جوتی کے نیچے رکھوں گا تجھے۔''
''40 ہزار......؟'' رانو کے اردگرد دھماکے ہونے لگے' اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔
''نہیں......میرا ابا اتنا بھی نہیں کر سکتا...... بکواس کرتا ہے تو......وہ پاگلوں کی طرح ہذیانی انداز میں چلائی۔
اس کے لاشعور میں اب بھی کہیں خوش فہمی تھی کہ شاید ابا.....ورنہ وہ جانتی تھی کہ وہ چرسی' جواری کیسا گھٹیا آدمی ہے...... مائی ٹھیک کہتی تھی۔ ''یہ بے غیرت تجھے بیچ کھائے گا۔''
''اور...... اور...... وہ نکاح ...... وہ کیا تھا؟ میں بکاؤ نہیں ہوں' میرا نکاح ہوا ہے تجھ سے۔'' وہ تڑپی' اس کی حالت انتہائی دگرگوں تھی۔
''نکاح......'' وہ مکروہ ہنسی ہنسا۔ ''جعلی تھا نکاح بھی......جعلی مولوی......جعلی گواہ......تیرے نشئی باپ نے منتیں کی تھیں کہ رانو کو رام کرنے کے لیے ضروری ہے ورنہ ......''
''اتنا بڑا دھوکا......؟'' اس سے آگے وہ سن نہیں پائی ...... مائی کہتی تھی۔ ''تیرا باپ بے غیرت آدمی ہے......'' آج ثابت بھی ہو گیا تھا۔
وہ غصے سے پاگل ہوگئی۔
مائی کی بیٹی تھی......اسی کی طرح اتھری اور ہٹیلی۔
''میں بکاؤ نہیں......اب اگر ایک قدم بھی تو نے میری طرف بڑھایا تو کاٹ ڈالوں گی تجھے......'' دھکم پیل میں ٹوٹی بوتل اٹھا کر وہ بھری شیرنی بنی کھڑی تھی۔
''تو چھٹانک بھر کی چھوکری مجھے کاٹے گی......'' وہ

تمسخرانہ ہنسا۔

رانو نے ایک نظر اس کے چوڑے جثے کو دیکھا اور لمحوں میں ایک ہولناک خیال اس کے دماغ میں آیا۔

''خود کو تو کاٹ سکتی ہوں ناں۔'' وہ عجیب دیوانگی سے ہنسی۔

''اے...... پاگل ہوگئی ہے۔'' اس غیر متوقع صورت حال پر وہ بھونچکا رہ گیا۔

اور لمحوں میں وہ ہوگیا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

وہ خون میں لت پت اس کے سامنے تھی۔

''ارے یہ چھوری تو چلتا پرزہ نکلی۔'' وہ بڑبڑایا۔

''اوئے فقیرے...... ادھر آ......'' اس نے گھبرا کر صحن میں بیٹھے اپنے دوست فقیر محمد کو بلایا' جو ریلوے اسٹیشن کے پار آبادی میں چوکیدار تھا۔

اندر کا منظر اسے بھی تحیر زدہ کرگیا۔

''اوئے اے کی ہویا......؟ کڑی ماردتی......''

''او نئیں نئیں یار...... کم بخت نے اپنی بانہیں خود ہی کاٹ ڈالیں...... چل جلدی اٹھا' اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں...... تیری تفتیش میں مجھ پر 302 لگ جائے گی۔'' وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔ اس ناگہانی افتاد کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

وہ ہر طرح کے جرائم میں ملوث رہتا تھا' لیکن قتل و غارت گری اس کی طبیعت کا خاصہ نہ تھی۔

ڈاکٹر نے رانو کو ایسی دل گرفتہ حالت میں دیکھ کر خاصی پس و پیش سے کام لیا...... لیکن...... جب فقیر محمد نے اس کی جیب گرم کی تو اس نے معاملہ سنبھال لیا' لیکن ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ ہسٹریائی انداز میں خود کو مارنے کی کوشش کرتی۔

''کرلو گل...... پیسے بھی گئے...... اور چھوکری بھی ہاتھ نہیں آرہی......'' پرویز سخت تلملا رہا تھا۔ اب اس مصیبت کا ایک ہی حل تھا' اس نے فقیرے کو سارا ماجرا بتا کر اس آفت کو اس کے حوالے کردیا۔

فقیر محمد اس کا جگری دوست تھا۔ فطرتاً بھلا آدمی تھا۔ پرویز کو ہمیشہ غلط کاموں سے روکتا' لیکن وہ سنی ان سنی کردیتا...... پیجا یاروں کا یار تھا' سو دونوں کی دوستی قائم تھی۔

رانو کی کہانی سن کر بھی اس نے حسبِ عادت پرویز کو خوب لعن طعن کی' جواباً وہ سر کھجاتا رہ گیا۔

فقیر محمد کی اماں نے جوان چھوکری گھر لانے پر خوب واویلا کیا...... اس حادثے کے بعد رانو بہت اکیلی ہوگئی تھی۔ باپ کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ اس نے اماں کے پاؤں پکڑ لیے۔

''اماں! خدا کے لیے مجھے اپنے گھر سر چھپانے کی جگہ دے دے۔ اس دنیا میں کوئی اپنا نہیں ہے میرا...... ایک باپ تھا' اس نے بھی بیچ ڈالا...... میں تمہارے گھر نوکرانی بن کر رہوں گی' خدا کے لیے مجھے اس پیچے سے بچالو......'' رو رو کے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

اماں کا دل ایک لمحے کے لیے پسیج گیا' لیکن اس نے ایک شرط رکھی۔

''ٹھیک ہے لیکن میں جوان لڑکی کو گھر رکھ کر دنیا کو انگلی اٹھانے کا موقع دینا نہیں چاہتی' اس لیے تجھے میرے بیٹے سے نکاح کرنا ہوگا۔'' بڑھیا نے اٹل لہجے میں کہا۔

رانو کو اس مطلبی اور خود غرض دنیا سے جی بھر کر نفرت محسوس ہوئی' جو اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ فقیر محمد نے بھی چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ بیٹے کا گھر بسانے کا خواب وہ برسوں سے دیکھ رہی تھی اس کی بدصورتی' اس میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ برادری میں سے کوئی بھی لڑکی دینے کو تیار نہ تھا' سو بڑھیا نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

''فقیر محمد اور پرویز میں کیا فرق ہے......؟'' رانی زخم زخم ہوئی۔

دونوں ہی اس سے عمر میں دگنے تھے اور بدصورتی میں تو وہ پرویز سے چار ہاتھ آگے ہی تھا۔

رانو نے بے بسی سے بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ نظر چرا گئی۔

پیچے کے پاس واپس جانے سے بہتر تھا کہ وہ زہر پھانک لیتی' اور فقیر محمد کے ساتھ نکاح......؟ آگے کنواں پیچھے کھائی کے مصداق وہ خوب پھنسی تھی۔

پھر ایک فیصلہ ہوا۔

''مائی! رانو آج سے تیری نہیں' اسلم نشئی کی بیٹی بن کر جئے گی......'' بغاوت کے ناگ اس کے روم روم میں پھن اٹھانے لگے۔

""ٹھیک ہے' مجھے منظور ہے......'' رانو کے اقرار میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ وہ اتنا ٹوٹ کر روئی کہ فقیر محمد کے اعصاب بھی جھنجلا اٹھے۔ اس نے اماں کو سمجھانے کی لاحاصل سعی کی لیکن وہ پتھر بنی رہی۔

اس کا اتنا تڑپ تڑپ کر رونا بڑھیا کو زہر لگا' لیکن بیٹے کی زندگی کا سوال تھا' اس نے خود کو مکمل طور پر لاچار محسوس کیا۔

شاید کاتب تقدیر نے اس کی قسمت کے پھیر الٹے لکھ دیئے تھے اس کی وہی جانے۔

رانو کے صحت مند ہونے کے بعد پچا اس کی واپسی کا تقاضا کر رہا تھا' وہ رانو سے دستبردار ہونے کو قطعی تیار نہ تھا۔ فقیر محمد نے اسے چالیس ہزار دے کر جانے کیسے رام کیا...... اور...... اب پچھلے ایک سال سے وہ اس کی بیوی بن کر اسی کے گھر رہ رہی تھی۔ لیکن ہر وقت زہریلی ناگن بنی اپنا زہر انڈیلتی رہتی۔

فقیر محمد اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا' لیکن وہ ہمیشہ اینٹھی رہتی' اور یہ بات اماں کو تاؤ دلانے کو کافی تھی...... اسی لیے رانو اکثر و بیشتر بڑھیا کے عتاب کا نشانہ بنتی رہتی' جواباً وہ بھی کم نہ تھی...... اماں کو تگنی کا ناچ نچائے رکھتی' گھر میدان جنگ کا سا نقشہ پیش کرتا...... لیکن رانو کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہتا' فقیر محمد ہمیشہ اسی کا ساتھ دیتا۔

اپنے سے آدھی عمر کی بیوی پا کر وہ بے حد مسرور رہتا' چاہے وہ اسے کتنا ہی دھتکارتی...... جاتی جوانی فقیر محمد کو پاگل کرتی' تو وہ اس کے تلوے چاٹنے سے بھی گریز نہ کرتا...... لیکن وہ کم بخت اسے کم ہی منہ لگاتی۔

آج کل وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ سر شام ہی چھت پر آجاتی۔ موسم بدل رہا تھا' سردیوں کی آمد آمد تھی۔ گلابی شامیں اپنے اندر عجیب سی خوشبو سموئے ہوئے تھیں۔

بڑھیا کو اس کی ذات کا یہ بدلاؤ کچھ عجیب سا لگا...... لیکن وہ تو جیسے خود میں گم تھی' فقیر محمد کو بھی رانو بدلی بدلی سی لگی...... اماں کی کسی بات کو در خور اعتنا تو وہ پہلے بھی نہ جانتی تھی...... اب بھی اگر وہ کچھ کہہ دیتی' تو رانی سر جھٹک کر آگے گزر جاتی۔

""شاید وہ اس رشتے کو دل سے تسلیم کرنے لگی ہے......'' فقیر محمد کو خوش فہمی اپنے گھیرے میں لینے لگتی' لیکن اماں کو اس کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ اس کی ایکسرے کرتی نگاہیں ہمیشہ رانو کے اردگرد گھمن گھیریاں ڈالے رہتیں' لیکن رانو تو جیسے ہر شے سے بے نیاز ہوگئی تھی۔

ہلکا گلابی جوڑا پہنے وہ بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی' پہلے تو وہ ہفتوں کپڑے نہ بدلتی' نہ ہی کنگھی پٹی کرتی' بڑھیا کے اندر جیسے کوئی پھانس اٹک گئی تھی۔

""اے چھوکری' تو یہ ہر وقت چھت پر جانے کو کاہے تیار رہتی ہے......؟'' سیڑھیاں چڑھتی رانو کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے اماں تڑخ کر بولی۔

""کپڑے لینے جا رہی ہوں......'' بے نیازی سے کہتی وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اماں بلند آواز میں بڑبڑاتی اسے کوسنے دیتی رہی' رانو کو مطلق پروا نہیں تھی۔

بلو حجام سے معاملہ اشاروں کنایوں سے بات ملاقاتوں تک پہنچ چکی تھی' بلوری آنکھوں والا بلو محلے کا سب سے بانکا جوان تھا۔ رانو بری طرح اس پر مرمٹی تھی۔ اس کے ہمسایہ میں بلو کی بہن کا مکان تھا...... جس کے چوبارے پر اب اس کی رانو سے ملاقاتیں بھی ہونے لگی تھیں۔

""رانو...... اللہ قسم' تو میرے دل کی رانی بن گئی ہے...... کسی طرح اس کالے دیو سے چھٹکارا حاصل کر...... اب تیرے بغیر رہا نہیں جاتا......'' وہ مخمور لہجے میں کہتا تو رانو کے دل و دماغ پر اس کی محبت کا نشہ چھانے لگتا۔

""یہ ممکن نہیں ہے بلو...... وہ منحوس کبھی بھی مجھے طلاق نہیں دے گا۔'' وہ یکایک اداس ہوئی۔

""وجہ......؟'' وہ چمک کر کہتا۔ ""اسے بتا کہ تو اس کالے کوے کو مزید نہیں برداشت کر سکتی۔'' وہ اسے صرف خود تک ہی محدود کرنا چاہ رہا تھا۔

""بس اس کی زرخرید جو ہوئی۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ""اور اب تو اس بڑھیا کو بھی مجھ پر شک ہو گیا ہے' وہ تو گٹھیا کی مریض ہے چھت پر آنا اس کے لیے ممکن نہیں' ورنہ میری رکھوالی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی...... اب میرا بار بار چھت پر آنا ممکن نہیں رہا۔'' رانو نے بے بسی سے کہا۔

""لے! ایسے کیسے نہیں آئے گی تو...... مر جاؤں گا تیرے بغیر۔'' اس نے دلار سے کہا۔

''چل، جھوٹا کہیں کا۔'' دوپٹے کا پلو دانتوں میں دبائے وہ بھی نخرے دکھا رہی تھی۔ اس کی خودسری دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ بڑھیا کو اس کی حرکتیں بے حد کھٹکنے لگی تھیں۔ آخر ایک دن اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا تو اس نے فقیر محمد کو جالیا۔

'اے فقیرے! بالکل ہی بے غیرت ہوگیا ہے تو۔'' اماں نے اسے پھٹکارا۔

''ہن کی ہوگیا اماں۔'' وہ اس عزت افزائی پر بھونچکا رہ گیا۔

''ارے...... میں کہتی ہوں، ہوش کے ناخن لے...... پچھتائے گا...... اپنی زال (بیوی) پر نظر رکھ، موئی ہر وقت چھت پر جانے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ آخر ماجرا کیا ہے؟'' بڑھیا نے دیدے مٹکائے...... ''اور وہ بلو حجام ہے ناں، اسے بھی میں نے اپنے دروازے کے پاس اکثر منڈلاتے دیکھا ہے......'' اماں اس کی طرف قدرے جھک کر رازدارانہ انداز میں بولی۔

''اماں کیسا خناس بھرا ہے تیرے دماغ میں...... رانو لاکھ بدزبان سہی، لیکن بدکردار نہیں ہے۔'' فقیر محمد نے اماں کو بری طرح جھڑک دیا۔

''فقیرے! میں سچ کہہ رہی ہوں، میرا یقین کر......'' اماں نے منمناتے ہوئے کہا۔

''بس اماں...... بہت ہوگیا...... ایک لفظ اور نہیں...... بیوی ہے وہ میری...... اس پر اتنا بڑا بہتان لگانے سے پہلے تو نے ایک بار بھی نہیں سوچا۔'' اس کے تیور بری طرح سے بگڑ گئے تھے۔ لہجے سے غم وغصہ چھلک رہا تھا۔

''تیری عقل پر پردہ پڑ گیا ہے فقیرے۔'' اماں کا بھی مزاج بگڑ گیا تو وہ کڑک لہجے میں بولی۔

''اچھا...... تو میرے خلاف پٹیاں پڑھائی جا رہی ہیں، میرے شوہر کو۔'' وہ جانے کہاں سے کسی آفت کی طرح نازل ہوئی......

''اے اماں، لگائی بجھائی کی عادت نہیں جاتی تیری......؟ ہر وقت میرے خلاف کوئی نہ کوئی سازش رچائے رہتی ہے یہ بڑھیا۔'' اس کا واویلا بلند پاٹ دار آواز میں جاری تھا۔

''میرا شوہر......'' فقیر محمد کا دماغ تو جیسے اسی ایک بات میں اٹک گیا تھا۔ شادی کے بعد پہلی بار اس نے اس رشتے کو تسلیم کیا تھا۔

''رانو تو فکر کاہے کو کرتی ہے؟ میں ہوں نا تیرے ساتھ......'' سینہ پھلا کر کہتا فقیر محمد رانو کو خاصا احمق لگا۔

''لے فکر کیوں نہ کروں؟ مجھ پر بہتان بازی سے پہلے تیری ماں کی زبان کٹ کیوں نہ گئی؟ زرخرید ہوں، تو تم لوگ جو چاہے سلوک کرو میرے ساتھ، اللہ میرے، میں مر کیوں نہیں جاتی۔'' اس کی اداکاری عروج پر تھی۔

مکاری سے ٹپ ٹپ آنسو گراتی وہ حد درجہ مظلوم بن رہی تھی۔

''بند کر اپنا یہ ناٹک بے شرم...... میں خوب جانتی ہوں، کہ تو کتنی مکار ہے۔'' اماں نے تنفر سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اب تو گویا جنگ کا بگل بج اٹھا، وہ گھمسان کا رن پڑا کہ اللہ کی پناہ، سیر کو سوا سیر تھا۔ فقیر محمد سر پکڑ کر بیٹھ گیا معاملہ اب اس کے بس سے باہر تھا۔

وہ پیر پٹختی تن فن کرتی یہ جا وہ جا...... اور اماں بھی بکتی جھکتی اپنا بھاری تن و توش سنبھالتی، باورچی خانے کی جانب بڑھ گئی۔ فقیر محمد کو لگا فضاؤں میں کثافت بڑھ گئی ہے۔

اس واقعے کے بعد اب رانو خاصی محتاط ہوگئی تھی۔ اماں سے بات چیت مکمل طور پر بند تھی۔ وہ بھی رانی کو دیکھ کر منہ پھیر لیتی...... فقیر محمد اس صورت حال پر سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

آج کتنے ہی دن بعد بلو سے ملاقات کا موقع ہاتھ لگا تھا۔ فقیر محمد حسب معمول ڈیوٹی پر تھا۔ اور اماں گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھی۔ ورنہ تو بڑھیا ہلکے سے کھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوتی اور رانو دل ہی دل میں اسے کوستی چپکی پڑی رہتی، بلو چوبارے پر اس کا منتظر تھا۔ جب وہ انتہائی محتاط انداز میں اپنی چارپائی سے اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی...... سبک خرامی سے چلتی ہوا اس کے تن سے ٹکرائی تو اس پر ایک کپکپی طاری ہوگئی۔

بلو کو دیکھتے ہی رانو نے آنسوؤں کی برسات کردی۔

''جھلیے کیوں روتی ہے...... پتہ ہے روز تیرا انتظار کرتا تھا...... اتنے دن کہاں رہی؟'' وہ پیار سے پچکارتے ہوئے بولا، تو رانی کا ضبط چھلک گیا...... اور نمک مرچ لگا کر

گزشتہ دنوں ہوا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔
''ہوں...... تو بات اتنی بڑھ گئی ہے......'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے پر مکاری اور آنکھوں میں کسی انہونے خیال نے چمک بھر دی تھی۔
''بس' اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی...... مجھے یہاں سے کہیں دور لے جا۔'' احمق لڑکی کیسا خسارے کا سودا کرنے چلی تھی۔
دور کہیں بجلی گرجی تھی۔
اس کی بات سن کر بلو کا دل بلیوں اچھلنے لگا' چند ساعتوں پہلے ہی تو اس کے دماغ نے یہ ابلیسی کھیل رچانے کا سوچا تھا۔
''مجھ پر اعتبار کرتی ہے ناں......؟'' وہ جیسے اسے جانچ رہا تھا۔
''خود سے بھی زیادہ۔'' رانی نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔
''ٹھیک ہے......'' اس نے چٹکیوں میں فیصلہ کیا۔ ''کل رات ٹھیک بارہ بجے تیار رہنا' ہم گھر سے بھاگ چلیں گے۔ یہاں سے بہت دور' جہاں صرف ہم دونوں ہوں گے۔'' وہ اسے سبز باغ دکھا رہا تھا۔ شیطان کے لہجے سے ہی عیاری و مکاری ٹپک رہی تھی۔
ماہر شکاری تھا۔ خوب جال بنا تا کہ پنچھی خود آن پھنسا تھا۔
ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے کا تصور ہی رانو کو مدہوش کیے دے رہا تھا۔ اس نے سر ہلا کر آمادگی ظاہر کی۔
''لیکن وہ بڑھیا......؟'' رانو بات ادھوری چھوڑ کر بے چارگی سے اسے تکنے لگی۔ اور وہ سمجھ گیا تھا کہ رانو کس مسئلے کی طرف توجہ دلا رہی ہے۔
''ارے میری جان! تم فکر کا ہے کو کرتی ہو...... کل صبح سویرے ہی میں موقع دیکھ کر تمہیں نیند کی گولیاں پکڑا دوں گا۔ بس! دودھ میں گھول کر دے دینا بڑھیا کو...... اور ہم دونوں اڑن چھو......'' اس کے پاس تو جیسے ہر مسئلے کا حل تھا...... رانو تو اس کی خوبیوں کی معترف پہلے ہی تھی۔
دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔
''بلو! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے......'' گھر سے قدم نکالتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا...... وہ سیاہ چادر میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی تھی۔
''پاگل سب کچھ پلان کے مطابق ہو رہا ہے' پھر ڈر کیسا......؟ میں ہوں ناں تیرے ساتھ۔'' وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا' لیکن فی الفور لہجہ پر قابو پا کر مٹھاس بھرے انداز میں بولا۔
رانو کے قدم من من کے ہو رہے تھے۔ جیسے کوئی انجانی طاقت اسے روک رہی ہو' آج کتنے ہی دنوں بعد مائی بھی ٹوٹ کے یاد آ رہی تھی۔
''اور...... یہ بے موسم کی بارش کیوں......؟'' چوکھٹ سے قدم نکالتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کو آسمان کو تکتے ہوئے سوچا...... سیاہ اندھیرے کی دبیز چادر چہار سو تنی ہوئی تھی۔ تاحد نگاہ اندھیرے کا راج تھا۔ اس کے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی' سب کچھ حسب خواہش ہو رہا تھا' پھر کیوں اس گھر کو چھوڑتے ہوئے اس کی سانسیں تھم رہی تھیں......؟؟
''فقیر محمد......؟ وہ تو ہر بات سے انجان ہے...... رب جانے اس کے دل پر کیا بیتے گی......'' سوچیں اس کے دماغ میں چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگیں۔ اسے خود پر حیرت ہوئی' وہ فقیر محمد کے لیے فکر مند ہو رہی تھی...... اس نے گھبرا کر فوراً سر جھٹکا اور آگے کے لیے قدم بڑھائے۔
دفعتاً برستی بارش کی چند بوندیں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں...... اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی...... اسے لگا جیسے آسمان سے بارش نہیں' مائی کے آنسو ٹپک رہے ہوں۔
''مائی...... میری مائی......'' دل سے ہوک سی اٹھی۔
اس نے ایک بار بھی آسمان کی طرف دیکھنے کی جرات نہیں کی......!
گویا وہ آسمان سے نظریں چرا رہی تھی۔
دل کی بدلتی کیفیت پر وہ سخت ہراساں ہو رہی تھی۔
''بلو! اس نے خوفزدہ ہو کر بلو کا بازو تھام لیا...... وہ لوگ اڈے پر پہنچ گئے تھے۔ میں تیرے لیے سب داؤ پر لگا کر آئی ہوں' میرا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا۔'' انداز التجائیہ تھا۔
''پھر سالی کے ناٹک شروع ہو گئے۔'' بلو حجام نے دانت کچکچائے' لیکن فی الحال خود پر قابو پانا ضروری تھا۔ سو نرمی سے اسے تسلی دینے لگا۔

''پگلی! تو جان ہے بلو کی ......'' پرفریب لہجے میں شیطان کا وار کاری تھا اور پگلی اس بات سے انجان تھی' بے خبر تھی۔

''بس اڈے پر بلو نے جانے کہاں کی ٹکٹیں خریدی تھیں...... واللہ عالم...... وہ تو نڈھال سی بس کی سیٹ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

بس انجان منزلوں کی طرف گامزن تھی۔

لوگوں کے گھروں کی رکھوالی کرنے والا چوکیدار اس بات سے بے خبر تھا' کہ وہ اپنے گھر کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا ہے۔

''فقیر محمد......'' تقدیر نے اس سینہ بخت کی قسمت پر جیسے آہ بھری۔

اسی پل کڑاکے کی بجلی چمکی' گویا فقیر محمد کی سیہ بختی پر سینہ کوبی کررہی ہو۔

اور...... دو دن بعد نہر میں سے لوگوں کو ایک نوجوان لڑکی کی لاش ملی تھی' جس کی دگرگوں حالت اس بات کی گواہی دے رہی تھی' کہ اس کو پامال کرنے والا ایک نہیں کئی شیطان تھے۔

آہ......!!

لوگ توبہ تائب کررہے تھے' لاوارث لاش پولیس کے حوالے کردی گئی اور پولیس والے حسب معمول خود کو ورثا کی تلاش میں سرگرداں ظاہر کررہے تھے۔

''بھلا اس کیس کی پیروی کون کرے گا......؟'' ہجوم میں سے ایک اجنبی ناک پر رومال رکھے با آواز بلند تاسف سے بولا تھا۔

محلے میں جب رانو کے گھر سے بھاگنے کی خبر پھیلی' تو لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں' لیکن فقیر محمد تو جیسے اس صدمے سے سکتے میں ہی چلا گیا تھا۔ چپ اس کے ہونٹوں سے لپٹ گئی تھی۔

''ربا! تو گواہ رہنا' اس سنگ دل کی ستم ظریفی پر......'' آسمان کی طرف شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے فقیر محمد نے خاموشی سے ہولے سے رب کو پکارا۔ چھوٹی چھوٹی سانپ سی گول آنکھوں سے ایک آنسو نکلا اور جانے کہاں کھو گیا۔

بس! وہ پہلا اور آخری ایک آنسو تھا' جو اس نے رانو کے جانے کے بعد اس کی یاد میں بہایا تھا۔

''تیری وقعت صرف ایک آنسو کی تھی ......تو میرے ایک آنسو جوگی تھی؟'' بے دردی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اس نے جیسے ہولے سے رانو کو پکارتے ہوئے خود سے استفسار کیا۔

کتنی عجیب بات تھی ناں کہ ہمیشہ واویلا کرنے والی ماں اس وقت بالکل خاموش تھی......فقیر محمد پر اس نے ایک طعنہ بھی تو نہیں کسا تھا۔

''اللہ سوہنا! سیاہ چہرے والے کا دل تو سیاہ نہ تھا۔'' اماں یاسیت سے فقیر محمد کو دیکھتے ہوئے اپنے رب سے شکوہ کناں تھی۔

اور فقیر محمد سوچ رہا تھا' کاش اماں مجھے اتنے طعنے کسے' اتنے کون سے دے' کہ میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔

اگلے دن کے اخبار میں آخری صفحہ پر ایک گمنام سی خبر تھی۔

''نوجوان لڑکی اجتماعی زیادتی کا شکار......''

پڑھنے والے نے اخبار کا صفحہ یوں پلٹا' جیسے یہ کوئی عام سی بات ہو......نظر اب سامنے رکھے ٹی وی پر تھی...... سائیڈ ٹیبل پر بھاپ اڑاتا چائے کا کپ اس کا منتظر تھا' جبکہ سماعتوں میں بیاہتا بیوی کی دلکش آواز گونجی' جو بڑی اپنائیت سے مستفسر تھی۔

''سنیے! آج کھانے میں کیا بناؤں......؟''

''بھنڈی گوشت......'' مصروف سے انداز میں مختصر جواب آیا۔



ٹوٹا جو کبھی تارا

ثناء ناز

کبھی الفاظ چابک کا کام کرتے ہیں اور زخم بھی گہرا چھوڑ جاتے ہیں جو مدتوں نہیں بھرا کرتے، اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا کہ ذرا سے طنز نے اسے نامور بنا کر زمین سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچادیا تھا، لیکن اسے محبت کی ہوا نے چھولیا۔

ایک انگریز صحافی کی کہانی جو کشمیر میں بھارتی مظالم دکھا رہا ہے

چھن چھن گردونواح یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے بے گانگی برتنے پر مجبور کردینے والی پائل کی مخمور کن دبی دبی آواز اور اس آواز کی آڑ میں چھپی ہوئی مست کردینے والی سرگوشیاں۔

کسی پریم امرت کی مانند سماعتوں کو چھو کر دل کی گہراؤں میں رس گھول دینے والی میٹھی میٹھی چوڑیوں کی سحر انگیز کھنک آب حیات کی مانند حیات جاویداں بخش کر امر ہونے کی نوید سناتی مخموری جاندار مسکان۔

مغرب کے سینے پر پروان چڑھا مشرقی روایات کی ترجمانی کرتا دل نشین سا سرایہ اور روس کی برفیلی ریاست پر بنا تاج وتخت کے راج کرتی برفیلی ملکہ کا ہر احساس سے عاری بے پروا منجمد سفید وسپاٹ چہرا جسے ایک اجنبی کی سچے موتیوں جیسی خالص دیوانہ وار محبت کی من موہنی تپش نے پگھلا کر گلاب کردیا تھا

زمانے سے ناطہ توڑتی سہمی ہرنی کی مانند سبز گہری دہشت میں ڈوبی خوفزدہ نگاہوں میں ایرک کی قربت اور اعتبار نے دھنک رنگ ایسی نزاکت سے بکھیرے کہ افق پر نمودار ہوتی قوسِ قزاح کا حسن بھی ان بکھرتے رنگوں کے سامنے ماند پڑھتا چلا گیا

گنتی کے تین مہینے فقط تین مہینے ہی تو ہوئے تھے۔ ایرک کو ہانا سے دور ہوئے پھر یہ تین مہنے تین برسوں پر محیط کیسے ہوگئے اس نے بیتے دنوں کو انگلی کے پوروں پر ایک بار پھر سے گنتے ہوئے سوچا اور یہ دوری بھی عجیب تھی۔ کہ روم روم وصالِ یار کی خوشی میں نڈھال ہوا بیٹھا تھا محبت میں دوریاں ہوکر نہیں ہوتی بمشکل ہی تو شہر میں اس کے نام کا ڈنکا بجنا شروع ہوا تھا پر نہ جانے نہ جانے وہ کون سے طلسمی انجان لمحات تھے جن کے سحر میں گرفتار ہو کر مکمل بے خودی کے عالم میں وہ نتائج کی پروا کیے بنا اپنا پورا کیرئر داؤ پر لگا کے مشینی زندگی سے کوسوں دور برف ریز سبزے کی سنگت کی حسین آڑ میں چھپے اس چھوٹے مگر طلسمی علاقے شہرِ یاراں کی جانب چلا آیا

چھن چھن پہاڑوں کی دامن سے ہانا کی پائل کی شوخ چھنکار ایک بار پھر ایرک کی سماعتوں سے ٹکرائی یہ چھنکار یہ کھنک ہوا میں ابھرتی سرگوشیاں اپنی گلابی کلائی پر ثبت کسی کی نرم گداز انگلیوں کا لمس جدائی کے پرزور اندیشوں کی زد میں آئی الوداعی مسکان ہزاران کہی باتوں کے حصار میں الجھا ہوا بے چین چہرا روک لینے کی کوشش میں ہلکان ہوتے کانپتے لرزتے خاموش لب جلد لوٹ آنے کی التجا کرتی سوجھی سوجھی شربتی سی سبز مترنم نگائیں اور ان قیامت خیز نگاؤں کی بہتی آبشار میں ابھرنے والا ایک عکس۔ مسٹر ایرک پاول مہرا کا عکس

کیا اس سے پہلے سنگ دل بے حس بے پروا اور آوارہ



تصور کیے جانے والے۔لیکن حقیقت میں کامنی سے دل کے مالک ایرک مہرا کی ذات کسی کیلئے اتنی اہم ہوئی تھی

نہیں نہیں دل ودماغ سے اس قدر شدت سے نفی میں گردن ہلائی جیسے ایسا احمقانہ خیال بھی دل میں لانا پریزڈینٹ روس کی جانب سے جرم قرار دیا ہو

وہ الوداع کہہ کر پلٹنے ہی والا تھا جب گلابی کلائی پر جمی نرم وگداز انگلیوں کی شدت اختیار کرتی ہوئی والہانہ گرفت نے اس کے اٹھتے قدم منجمد کر ڈالے تڑپتی نگاہوں نے بے قابو ہو کر چہرہ یار کا طواف کیا تو ایرک کو محسوس ہوا جیسے برف کی آنکھ مچولی میں سرکتے سرد دور کے ان مختصر مہربان لمحات نے اس کا پورا وجود منجمد کر دیا ہو

سبز نگاہوں سے چھلکتے شفاف چشمے سنہری گالوں سے ہوتے ہوئے گلابی ہونٹوں تک آن پہنچے تھے سمعے کی بے قراریوں اور سوگواریوں نے ملکر سرخ اونی چھال میں لپٹے اس کے دلفریب گلابی چہرے کو نظر لگ جانے کی حد تک حسین بنا رکھا تھا ایرک اپنی متاع حیات کو بہلانا چاہتا تھا مگر کیسے بہلاتا اس سوگواری نے اس کا حسن اس قدر نکھار جو دیا تھا کہ لاکھ بار چاہنے کے باوجود بھی اس نے لفظوں کے داو پیچ استعمال کرنے میں گریز ہی مناسب سمجھا کہ کہیں اس کے منہ سے نکلے گئے ان چند الفاظ کی سرسراہٹ قدرت کے بنے گئے اس حسین طلسم میں خلل پیدا نہ کر دیں

اک دوجے کی نگاہوں میں الجھے پہلے ننھے لمحوں نے برف کی افشاں ان پر لہراتے ہوئے گزرنا شروع کر دیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وقت کی طویل لمحوں کو ماضی میں سرکا دینے والی ننھی سوئی نے بھی جوش پکڑا اور جلد ملن کی آس میں گنگناتے الوداعی شادیانے بجوا ڈالے

ایرک ان حسین لمحوں کو اپنی یادوں کی ڈائری میں

پروتے ہوئے گھٹنوں کے بل برفانی چادر کے دامن میں بیٹھتا چلا گیا کلائی پر جمی نرم گداز انگلیوں کے لمس کو نگائیں موند کر دل کے اندر دور کہیں بہت گہرائی میں اتارا آہستگی سے برفانی حسینہ کے لرزتے کانپتے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور سر جھکا کر دائمی محبت کی اک یادگار رسم ادا کر دی برف افشاں بن برسنے لگی۔ ہوائیں ساز بن بکھرنے لگیں نیلگوں فلک کھلکھلا سا اٹھا، مسافتوں کے ادھورے پل قربت کی چادر اوڑھے ہولے ہولے تکمیل پانے لگے سماں محبت کا تھا۔ جشن محبت بھی منایا جانے لگا تقریب محبت ادا کی جانے لگی۔ قدرت کی اس حسین مہربانی پر دو دل اک دوجے کی سنگت میں نہال ہوتے چلے گئے

مغرب کی شہزادی ہانا گالوں کا گلال اوئی چادر کی آڑ میں چھپائے مشرق کی راج کماریوں کی مانند شرماتی رہی اور روس کا سرد شہزادہ ایرک پوری سلطنت بھلائے تخت یاراں پر گھٹنوں کے بل بیٹھا محبتوں کی ایک نئی داستان رقم کرتا رہا

"صاحب چلیں ورنہ آپ کی ٹرین مس ہو جائے گی۔" گاؤں کا اکلوتا ڈرائیور جانے کہاں سے اپنی کھٹارا موٹر جو رنگ و روغن اور بے حال حلیے کی مناسبت سے دی گریٹ ہٹلر کی زمانے سے تعلق رکھتی دکھائی دے رہی تھی لیے نمودار ہوا

"جا رہا ہوں مگر اس امید کے ساتھ زندگی نے وفا کی تو جلد لوٹ آؤں گا اپنا خیال رکھنا۔"

وہ آہستگی سے ہانا کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں سے جدا کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دل بے قرار پر ہزاروں ٹن وزنی ضبط کے پتھروں کی تہیں جما کر کھٹ کھٹ کرتی کھٹارا موٹر کے سامنے آ رکا شاہی خاندان کی دھتکاری ہوئی بیچاری علاقے کی تن تنہا موٹر

"یہ ہمیں پہنچا تو دے گی؟" دل میں سوچتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو مخاطب کیا

"جناب ٹینشن کیا آپ جائیں تو یہ آپ کو ہمالیہ بھی پہنچا سکتی ہے ڈرائیور نے یورپین اسٹائل میں کیپ اٹھا کر خالص ایشین لہجے میں جواب دیا

اور وہ الوداعی نظر ہانا کے خاموش چہرے کی جانب ڈالتا ہوا جیپ میں جا بیٹھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ضبط پر قابو پاتی خاموش آنسوؤں سے۔ ہولے ہولے ہاتھ ہلا کر الوداع کہتے ہوئے اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو صاف کیا تھا۔ اور اس کی سرخ ہوتی منجمد ناک وہ اک اک منظر بڑے خیال کے ساتھ دل و دماغ کے کینوس پر قید کر رہا تھا۔

......☆☆......

آئینہ جھوٹ نہیں بولتا عین ممکن ہے آئینہ جھوٹ نہ بولتا ہو مگر یہ بھی تو عین حتمی ہے کہ آئینہ رنگ بدلتا ہے اور ایک بار نہیں ہر بار بدلتا ہے زندگی کے ساتھ ساتھ بالکل ویسے جیسے قسمت رنگ بدلتی ہے وقت کا سکہ رخ پلٹتا ہے۔ من چاہے خوابوں کو تعبیر ملتی ہے آئینہ کا رنگ بھی بدلنے لگ جاتا ہے

وہ ہرگز یقین نہ کرتا اگر یہ باتیں اسے فلسفے کی کتابوں کے پرانے صحفوں میں لکھی ملتی یا محض اسے یہ سب لوگوں سے سننے کو ملتا مگر یہ معجزہ تو رونما ہوا تھا عین اس کی آنکھوں کے سامنے عین اس کی اپنی خود کی ذات کے ساتھ اب بھلا وہ کیسے بیگانگی برت سکتا تھا یا اس حقیقت کو جھٹلا سکتا تھا

ایک طرف پوری زندگی کی انتھک محنت لگن۔ اور جنون تھا مگر زندگی بے نام تھی۔ اور ایک طرف چند سیکنڈ گنتی کے محض چند سیکنڈ کے لیے زندگی داؤ پر لگا کر فاتح عالم کہلوانے کا گر

سالہ سال کی بے بہا کوششوں کے بعد اس کی زندگی کی سب سے بڑی مراد پوری ہوئی تھی اور وہ مراد کیا تھی آیئے دیکھتے ہیں۔

خود پر آخری نظر ڈالنے کے غرض سے وہ فائیو اسٹار لگژری روم میں نصب بیش قیمت آئینہ کے سامنے آ رکا جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی سیاہ جینز کے اوپر سالوں پرانی ڈھیلی ڈھالی سفید ٹی شرٹ جو سفید کم مختلف رنگوں کا پوسٹر زیادہ لگ رہی تھی میں ملبوس ایک عکس آئینے کی چمکدار شفاف سطح پر نمودار ہوا۔ آہ غربت کا مارا بیچارا ایرک کسی نے سرگوشی کی تو اس کی نگائیں بلا ساختہ اپنے رنگ دار خشک ہاتھوں پر سے ہوتی ہوئیں پیروں کو چھپانے کی کوشش میں ہلکان

پھٹی پرانی چپل پر جا ٹھہری ایک ایک پائی بچا کر اس نے کتنی کوشش کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح کرسمس تک اپنے پیروں کیلئے ایک آرام دہ جوتوں کا جوڑا خرید سکے۔ مگر عین وقت پر اسے لگا جیسے اس کے جوتوں سے کہیں زیادہ بھوک سے بلکتے ان نوعمر بچوں کا راشن ضروری ہے جنہیں اپنی ماں کے ہمراہ روز وہ پارک کی جھاڑیوں میں چھپے دیکھا کرتا تھا اس ایک پل میں آنسوؤں کا پیمانہ یوں لبریز ہوا جیسے ساری دنیا کو تہس نہس کرنے کا ارادہ رکھتا ہو

اگلی بار نگاہیں اٹھیں تو بے رنگ چہرے اور گردن تک پھیلے ہوئے گھنگھریالے بالوں پر سے ہوتی ہوئی سنہری آنکھوں پر جا الجھی۔ آنکھیں سوگوار تھیں۔ ازلی محرومیوں پر آنکھیں اشک بار تھیں حسرتوں کا ملبا دفنانے پر آنکھیں زار زار تھیں بن مانگی رسوائی پر۔

''سارا دن ہاتھ رنگ کے بیٹھے رہتے ہو کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں سیکھ لیتے۔'' مالکن ہر مہینے کی طرح اس بار بھی بروقت کرایہ نہ ملنے پر بھڑک اٹھتی۔

''ہنر ہے تو سہی میرے پاس۔'' دیواروں پر لٹکے رنگارنگ کینوس پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر وہ بھیگے لہجے میں جواب دیتا۔

''تمہارا یہ ہنر تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے پیارے دنیا جس ٹریک پر دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے نہ اس ریس میں یہ فن پارے یہ تھرڈ کلاس پینٹنگز بہت پیچھے رہ چکی ہیں پھر اب تم چاہے جتنی مرضی محنت کر لو جتنا مرضی سر کھپا لو رہو گے تو ایک سڑک چھاپ آرٹسٹ ہی نا اور ویسے بھی ایک سڑک چھاپ آرٹسٹ کے حسین بے حد حسین خواب اس کی بھدی حثیت تو بدلنے سے رہے۔''

لینڈ لیڈی میتیرا پورے مہینے کا جمع شدہ غصہ پورے جوش وولولے کے ساتھ ایک ہی بار اس پر نکالتی جاتی

''ایک سڑک چھاپ کا جنون اس کی دنیا بدل سکتا ہے دیکھ لیجئے گا ایک دن یہی پرانی گلیوں کا آرٹسٹ دنیا بھر میں جانا جائے گا وہ پورے یقین کے ساتھ کہتا۔

''پوری دنیا میں جانا جائے گا ہونہہ دنیا نہ ہوئی کوئی معجزہ ہو گیا خیر خوب جی بھر کے دیکھو خواب اب تمہارے خوابوں پر تو پابندی لگنے سے رہی لیکن ایک بات کان کھول کے سن لو اس مہینے کے آخر تک باقی تمام مہینوں کا کرایہ جمع نہ کروایا تو میں تمہارا دو ٹکے کا سامان پھینک باہر کر رہوں گی سمجھے۔''

لیڈی میتیرا انگلی اٹھا کر کرخت لہجے میں اسے تنبیہ دیتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور وہ اپنا سا منہ لیکر ایک بار پھر پرامید نظروں سے کینوس پر نگاہیں جما لیتا ہر مہینے کے آخری ایام میں میتیرا ہاؤس میں یہ ہنگامہ تقریبا کئی بار دہرایا جاتا۔

سڑک چھاپ مصور ماضی کی تنگ دست اور مفلسی کی ماری بے بس گلیوں میں جھانکتے ہوئے وہ بڑبڑایا اور سامنے بیش قیمت آئینہ میں عیاں بے قیمت منہ چڑاتے غربت کے مارے نوجوان کا عکس دیکھ کر بری طرح بدک کر پیچھے ہٹا۔

تم چاہے جتنے مرضی خواب دیکھ لو رہو گے تو وہی ایک تھرڈ کلاس آرٹسٹ ہی لیڈی میتیرا کے سخت جملوں کی بازگشت ایک بار پھر سے کانوں میں سیسہ بن کر اترنے لگی۔

''تمہاری پینٹنگز میں بہت ساری خامیاں ہیں میں انہیں اپنی آرٹ گیلری میں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا۔'' دوسری تذلیل آمیز بازگشت۔

''تم مارکیٹ میں ان ہو نہ تمہارا کوئی شوشل بیک گراونڈ ہے۔ چلو تمہارے لیے میں ایک احسان کرتا ہوں اپنی پینٹنگز مجھے سیل کر دو۔ میرا نام انہیں دنیا کے ہر کونے میں مقبول کروا دے گا۔'' ایک خود غرض بازگشت۔

''دیکھو لڑکے ہم صرف اپنے پروفیشنل آرٹسٹ ھائیر کرتے ہیں ہر ایرے غیرے سڑک چھاپ آرٹسٹ کو چانس دینے سے مارکیٹ میں ہماری ویلیوز کس قدر گر سکتی ہیں کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔ دل کرچی کرچی کر دینے والی ایک نئی بازگشت۔

''ہم جو کچھ تمہارے لئے کر سکتے ہیں وہ اتنا ہے کہ تم ہماری کمپنی کے ساتھ 70 : 30 کا شئیر کر لو تمیں تمھارا

اور چونکہ سپونسر شپ، شوشل میٹنگز اور مارکیٹنگ وغیرہ ہم ارینج کریں گے اس لیے ستر پرنسٹ ہمارا۔'' جھانسے میں چھپی بازگشت۔

your value is not more than a street worm آخری بازگشت نے تو اس کی روح تک جھنجھوڑ کے رکھ دی۔

وہ ماضی کی اذیت ناک گلیوں میں بھٹکتا بھٹکتا تھک گیا تو آنکھیں کھول کر ڈرتے ہوئے ایک بار پھر خود کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

گہرے نیلے رنگ کے پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک دوسرا عکس آئینے کی شفاف سطح پر نمودار ہوا جو اس نوجوان سڑک چھاپ آرٹسٹ کے بوسیدہ عکس سے قطع مختلف بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ قدرے منفرد تھا۔ گھنگھریالے بالوں کی کٹنگ اور ایک نئے ہیر اسٹائل نے اسے ایک سوبر لک بخشا تھا۔ شرٹ کے دو سامنے والے ٹوٹے بٹنوں کی جگہ سرخ رنگ کی ڈھیلی ٹائی دھیرے دھیرے لہرا رہی تھی جسے وہ ہزار کوششوں کے باوجود بھی ٹھیک سے سیٹ نہیں کر پایا تھا اس سے نگاہیں ایک بار پھر بے اختیاری ہو کر ہاتھ میں بندھی رولیکس واچ پر سے ہوتی ہوئی پاؤں میں پہنے بیش قیمت چمک دمق کرتے گہرے نیلے جوتوں پر جا ٹھہری

سڑک چھاپ مصور ہونہہ دی موسٹ وانٹڈ مصور وہ ٹیبل پر پڑے کلونز کو باری باری خود پر سپرے کرتا ہوا گنگنایا۔

ٹک ٹک دروازے پر مدھم انداز سے دی جانے والی دستک بھی اسے اپنے آپ سے بیگانگی برتنے پر مجبور نہ کر سکی

''یس کم ان۔'' وہ اب اپنی کلائیوں پر بیش قیمت کلون کا سپرے کرنے میں سرمست تھا۔ دروازہ کھلا اور ہوٹل کی میٹنگ ڈائریکٹر مسز دانہ جان ونگ ہاتھ میں رنگا رنگ پھولوں کا دلفریب گلدستہ تھامے اک من موہنی سی مسکان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی

''گڈ ایوننگ مسٹر ایرک۔'' پھولوں کا بکے سائیڈ ٹیبل پر سیٹ کرنے کے بعد وہ اس کے پہلو میں آن کھڑی ہوئی۔

''شکریہ۔'' نوجوان ایرک نے محض ایک لفظ کہنے پر اکتفا کیا۔

بمشکل گھٹنوں تک پہنچتی اغوانی اسکرٹ اور ڈیپ گلے کی حامل سیاہ شرٹ میں ملبوس لیڈی جان ونگ بلاشبہ دھڑکنیں منتشر کر دینے کی پرزور صلاحیت رکھتی تھیں۔ اسکرٹ سے میچ کرتی ڈراک ارغوانی لپ اسٹک اور نیچرل میک اپ نے انہیں ان کی عمر سے زیادہ جاذب اور دلکش بنا دیا تھا سنہری پیروں میں اڑسی سیاہ ہیل، لمبے بالوں کے کلرز اور باقی کی تیاری اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ آج کی حسین اور یادگار شب میں شمولیت اختیار کرنے کیلئے لیڈی پاولز نے خود کو کس قدر نفاست اور فرصت سے تیار کیا ہے لیڈی جان ونگ کا طویل تر جائزہ لینے کے بعد ایرک نے اپنی نگاوں کا زاویہ ایک بار پھر آئینے کی جانب کیا۔

وہ ہر لحاظ سے مکمل اور جاذب تھا مگر ٹائی کی ڈھیلی ناب اب تک بے ترتیب تھی اس نے قدرے بے بسی سے لب بھینچے۔

لیڈی جان ونگ مسٹر ایرک کی نگاوں میں چھپی الجھن کو محسوس کرتے ہوئے زیرلب مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور ذرا سے محنت کے بعد ٹائی سیٹ کر دی۔

''یو آر پرفیکٹ۔'' نگاہوں میں جھانکتے ہوئے مسز پاولز نے ایرک کے قدرے قریب ہو کر کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کچھ کچھ بے باکانہ انداز میں کہا۔

سرد علاقوں کا باشاندہ ہونے کے باوجود ایرک ان نازک لمحات میں کچھ پل کیلئے بوکھلا سا گیا اور اسی بوکھلائی ہوئی کیفیت میں اس کا ہاتھ ڈریسنگ ٹیبل پر جمی پرفیوم کی شیشی سے ٹکرایا جو اک لمحے کی تاخیر کیے بنا فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔

''اوہ مجھے معاف کیجئے گا۔'' مسز جان ونگ ہڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہٹی۔

''اٹس اوکے۔'' خاصی قیمتی کلون تھے جواب کمرے کا فرش مہکا رہے تھے پر اسے پروا کہاں تھی وہ ایک ساتھ ایسے کئی مہنگے پرفیومز افورڈ کر سکتا تھا۔

چلیں چیف گیسٹ آچکے ہیں۔ ہال میں خاصی بے تابی سے آپکا انتظار ہو رہا ہے پیشہ وارانہ مسکراہٹ فراخ دلی سے ایرک کی جانب اچھالتے ہوئے وہ اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

"ہاں کیوں نہیں۔" کسی نوجوان سوہاگن کی مانند اپنے آپ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے وہ مسز جان ونگ کے ہمراہ ہولیا۔

......☆☆......

آڈیٹوریم کا بیرونی حصہ ملک کے دو عظیم نامور مصور وں اور اب تک کے گمنام تھرڈ کلاس مصور ایرک مہرا کے شاہکار فن پاروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ پینٹ کی جیپ میں ہاتھ ڈالے کسی بزنس مین کی مانند ٹہلتا ہوا ایک ایک پینٹنگ کے سامنے رک کر ایگزیبیشن کا جائزہ لیتا رہا۔

بکھرے زرد پتوں والی پینٹنگ۔ ہونہہ خزاں ہی خزاں۔ مایوسی ہی مایوسی۔ کوئی امید بہار نہیں۔ کوئی جشن کی منادی نہیں۔ اس نے اچنبھے سے نگاہ ہٹائی اور آگے بڑھ گیا۔ ملک کے نامور مصور کے نامور شہکار نے اسے قدرے مایوس کیا تھا۔

رنگ برنگے پھولوں پر پہرا جمائے رنگ برنگی تتلیوں اور ننھی چڑیوں والی پینٹنگ۔ یہ شاہکار بھی کچھ خاص اس کی توجہ اپنی جانب مرکوز نہیں کروا پائے۔ وہ آگے بڑھا سائیڈ پاکٹ سے منی چیونگم نکال کر منہ میں ڈالی۔ لیڈی الزبتھ کا پوٹریٹ فن پارہ۔ اب کی بار وہ متاثر نظر آیا۔

اور ان تمام پینٹنگز سے قدرے دور الگ تھلگ اسٹیج کے دونوں اطراف جگمگاتے اس کے فن پارے سامنے بیٹھے شائقین کی ستائش آمیز نگاہوں کا بھرپور مرکز بنے ہوئے تھے۔

ایرک مہرا ایک سڑک چھاپ آرٹسٹ آرٹ کی دنیا میں ایک نیا نام بلاشبہ ہزاروں شائقین کیلئے ایک ابھرتا ہوا ستارا تھا باقی دو آرٹسٹ کے برعکس اس مصور کے فن پارے دنیا بھر کے سماجی سیاسی معاشی اور اخلاقی روایات کی مکمل ترجمانی کرر ہے تھے

آج کی تقریب کا پہلا اور سب سے شاندار ایواڈ ایرک مہرا کے نام تالیوں کے گونج نوجوان دوشیزاؤں کی مسکرا اٹھیں۔ ایرک دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے ایوارڈ وصول کرنے کے لیے سٹیج تک آیا اور پروگرام کا پہلا مرحلہ حسین جام کے نام ٹھہرا۔ اگر آپ ایرک پاولز جیسے ایک سڑک چھاپ آرٹسٹ ہیں تو بلاشبہ آپکو خود پر فخر ہونا چاہئے لیڈی ہوٹس کی آواز پر پورا ہال ایرک مہرا کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔

بے ساختہ اس نے اپنی پینٹنگ کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔

افلاس سے لڑ کر بھوک سے نڈھال ہوتے معصوم بچوں والی پینٹنگ جن کے اردگرد بے جا دولت سمیٹنے کی غرض میں محو کچھ خود غرض انسان نما بھیڑیے ہر احساس سے لاتعلق بے حس نگاؤں کا جال پھیلائے گھوم رہے تھے اس پینٹنگ پر نگاہ ٹھہرتے ہی اس کا ذہن آپ ہی آپ الجھی ہوئی ماضی کی ڈائری پر کندہ بے درد داستان کے صفحے پلٹنے لگا۔

سر سے لیکر پاوں تک سیاہ چادر کی آڑ میں چھپی چھبیس ستائیس سالہ وہ نوجوان خاتون جس کے چہرے پر پھیلے زرد رنگ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وقت کے چند بے رحم لمحوں نے مل کر اس کی زندگی کے سبھی رنگ نچوڑ لیے ہوں وہ گارڈن کے ایک کونے میں لگے قوی ہیکل درختوں کے سائے میں بیٹھے اپنے دو نوعمر بچوں کی بھوک کا سامان کرنے کیلئے ادھر سے ادھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے نہایت اضطرابی کے عالم میں پھر رہی تھی ننھے فرشتوں کی نگاؤں سے بہتے آنسو کی رفتار لحہ بہ لحہ شدت اختیار کرتی جارہی تھی جنوری کی سرد برف باری کے باعث پارک میں اکا دکا لوگ موجود تھے جبھی وہ خاتون بمشکل سے چند ڈالر ہی اکٹھے کر پائی تھیں۔

ایرک گارڈن کے تیسرے کونے میں بیٹھا پرانی ردی جلا کر خود کو گرم رکھنے کی ناکام کوشش کرنے میں معروف تھا۔ کل کی شام ایک بار پھر کرائے کے تنازعے کے نام ہوئی تھی جبھی وہ رات بھر برف کے بیچ بیٹھا برف کے آنسو بہاتا رہا

ننھے ناتواں بچوں کا حال بے حال ہوتا دیکھ کر اس کے منجمد ہوتے سرد وجود دن میں لرزش پیدا ہوئی۔ تو اس نے وہیں بیٹھے کاغذ پر قلم کی مدد سے اسکیچ تیار کرنا شروع کر دیا اور اگلے کچھ لمحوں میں وہ ایک نایاب شاہکار تیار کر چکا تھا

ماں اب بچوں کو گود میں لیے انہیں بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مگر بچے نہ کسی بہلاوے میں آنے والے تھے اور نہ وہ آئے یہاں تک کہ ممتا کی سرد آنکھیں گرم پانیوں سے لبریز ہو گئیں

ایرک اپنی جگہ سے اٹھا پرانے بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹ جانے والے اور کوٹ کی پھٹی پرانی جیبوں کو ٹٹولنے کے بعد چند ڈالرز اور کچھ کھانے کے پیکٹس برآمد کیے اور بے اختیار سا چلتا ہوا بے بس ماں کے پہلو میں آن کھڑا ہوا

''شاید اس سے آپ کی کچھ مدد ہو پائے۔'' ہاتھ میں موجود چیزیں ان کی جانب بڑھاتے ہوئے ایرک نے اپنائیت سے کہا تھا۔

نوجوان خاتون سے حیران و پریشان کی سی کیفیت میں اپنے سامنے کھڑے اپنے سے بھی بدتر حلیے میں موجود فقیر نما مسیحا کو دیکھا اور دل ہی دل میں اسے ڈھیروں دعاؤں سے نواز کر چیزیں تھامتی ہوئی بچوں کو لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''شکریہ۔'' اچانک یاد آنے پر خاتون نے شرمندہ لہجے میں مڑ کر کہا۔

اپنے منتخب کردہ کونے پر جانے سے پہلے ایرک نے ایک گمنام سی نگاہ زرد رنگ والی خاتون کے چہرے پر ڈالی۔ جہاں اب امید کے کچھ دیے جگمگانے کو بے قرار تھے اور مطمئن سا ہو کر واپس ہو لیا۔

......☆☆......

وہ اب اپنی دوسری مقبول پینٹنگ کے سامنے آ کھڑا ہوا جہاں یونیفارم میں ملبوس کئی نوعمر بچے خون میں لت پت کتابوں کے ساکن اوراق تلے دفن پڑے تھے بے اختیار سنہری نگائیں پل بھر میں مترنم ہو گئیں۔ یہ تصویر ایرک نے ردی میں موجود کسی پھٹے ہوئے پرانے اخبار سے حاصل کی تھی اور بعد میں بڑی مہارت سے اس نے پاکستان میں ڈھائے جانے والے ستم کو اپنے بے رنگ سیاہ کنویس پر منتقل کیا تھا۔

کیسا ظلم تھا کیسی سفاکی تھی جو ان ننھی معصوم جانوں پر ڈھائی جا چکی تھی وہ ننھی ادھ کھلی معصوم نگائیں بے جان ہو کر بھی امید سے کیسے جگمگا رہی تھیں۔ جیسے ابھی کوئی نجات دہندہ آسمان سے اترے گا اور انہیں اس جبر سے بچا کر اپنے پروں میں چھپائے دور کہیں بہت دور نکل جائے گا جیسے ابھی ابھی سفاکی کا یہ ڈروانا خواب ٹوٹے گا۔ اور سب ایک بار پھر ڈر کے مارے ممتا کی ٹھنڈی آغوش میں جا سمٹیں گے

وقت کی ٹک ٹک ایک بار پھر وہیں سے چلنا شروع ہوئی جہاں کچھ ساعتیں پہلے موجود تھی وہ جانتا تھا کہ یہ اب تک اس کی بنائی گئی پینٹنگز میں سے سب سے کٹھور پینٹنگ ہے مگر شاید وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس ایک پینٹنگ کے بعد بنائی جانے والی اگلی ہر پینٹنگ اس کیلئے کہیں زیادہ خطرناک اور دردآمیز ہو گی

اسے یاد آیا کیسے آرمی پبلک اسکول کے شہدا کی یاد میں اس کی بنائی گئی مصوری کو سراہا گیا تھا کیسے اس کے نمونے ہاتھوں ہاتھ بکے تھے کیسے اس کی جیب پاؤنڈز سے بھر گئی تھی اور سب سے بڑھ کر کیسے لینڈ لیڈی اس پر مہربان ہوئی تھی۔ سب ایک اسی پینٹنگ کی بدولت ہی تو تھا

دنیا میں کیے جانے والے ظلم کو لوگ اس طرح سے بھی سرائیں گے ایرک سوچ نہیں سکا تھا

دو قدم مذید بڑھا کر وہ اپنے تیسرے بڑے شاہکار کے سامنے آ موجود ہوا

جسے اس سے بیشتر تین بین القوامی ایوارڈ سے نوازا جا چکا تھا۔ وہ حال سے کٹ کر ایک بار پھر دور کہیں دہشت ناک ماضی میں کھو گیا جس ماضی کا حصہ خود اس کی اپنی ذات رہی تھی۔

یہ تصویر اسرائیل کی غزوہ پر ستم کی ایک المناک داستان پیش کر رہی تھی۔ وہ اپنے روم میٹ جیکب جو کہ کسی مقامی چینل پر رپوٹر بھی تھا کے ساتھ غزوہ کے سنگین حالات پر ڈاکومینٹری بنانے آیا تھا اس تصویر پر نگاہ پڑتے

ہی ایرک کے پلکوں کے نم گوشے ایک بار پھر سے گرم ہونے لگتے۔ کرب کی شدت محسوس کرتے ہی وہ مٹھیاں اور لب بھینچ کر رہ گیا ایسا پہلے بھی تو کیا تھا اس نے اور جیکپ نے جب وہ دونوں مسلمانوں کے مقدس مقام کی آڑ میں چھپے بیٹھے بربریت کی رقم کی جانے والی ایک نئی تاریخ دیکھ رہے تھے اس نازک صورتِ حال میں ان کے بے حس جوان نڈر دل اس قدر شدت سے دھڑک رہے تھے کہ دھڑ ادھڑ گولیوں کی بوچھاڑ اور بے انتہا چیخوں و پکار کے عالم میں بھی انہیں اپنی دھڑکنیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ظلم و ستم کے طوفان جاری تھے اور وہ اپنے احساس پر سیاہ پردہ گرائے بے حس بنے اپنی کھوکھلی شہرت کی تکمیل کا سامان اکٹھا کرنے میں محو تھے وہ بیچارے آخر کر بھی کیا سکتے تھے۔ان کی ڈیوٹی جو ٹھہری۔اب وہ فوجی تو تھے نہیں کہ ظلم کے خلاف ٹکر لینے کیلئے سر بازار خالی ہاتھ میدان میں کود کھڑے ہوتے جیکپ کی نگائیں اپنے کیمرے میں قید کرتی بستی میں برپا خون و فساد پر جمی ہوئی تھیں

کلک کلک جیسے ہی اسے کوئی اسرائیلی درندہ درندگی کی حدود کو پار کرتا نظر آتا اس کے کانپتے ہاتھوں کی انگلیاں فوراً حرکت میں آجاتیں اور یہ دردناک منظر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کیمرے کے دماغ میں محفوظ ہو جاتا

ایرک بھی دوربین نگاہوں پر چڑھائے یہی کر رہا تھا وہ اب تک کوڑے کاغذ پر ظلم کی داستانیں بیان کرتی کئی آڑھی ترچھی تصاویر کھینچ چکا تھا۔ کہ وہیں انسانی تاریخ میں بربریت، ظلم و ستم اور سفاکی کی انتہا رقم ہوئی جیکپ کا رخ دوسری جانب تھا جبھی وہ یہ ہولناک روح دہلا دینے والا منظر اپنے کیمرے میں نظر بند نہیں کر پایا تھا۔اور ایرک خود بھی تو کئی ساعتیں سن بیٹھا رہا تھا کیسی بے دردی سے سفید چادر میں لپٹی روشن چہرے والی خاتون کی شفاف پیشانی کو گولیوں کی بوچھاڑ سے داغدار کیا گیا تھا بات اگر یہی تک رہتی تو وہ چپکے سے باقی ظلم و ستم کی طرح یہ ستم بھی برداشت کر لیتا لیکن اس معصوم کی کیا خطا تھی جو اپنی بے جان ماں کے بطن میں قید آہ و فغاں کر رہا تھا ایرک ہزار بار دماغ پر زور دینے کے باوجود بھی یہ سمجھ نہیں پایا کہ مری ہوئی عورت کا پیٹ چاک کر کے اسے ایک بار پھر سے کیوں مارا گیا جانے یہ کیسی دشمنی تھی کیسا بدلا تھا جس کی آگ دنیا میں آنے کو بے قرار اس نومولود وجود کو بھی نگل چکی تھی

زمانہ خون سے بھر گیا تھا یا اس کی اپنی نگائیں سرخ اشک برسا رہی تھیں وہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا

کافی لمحے بیت جانے کے بعد جب توپوں کے شعلے ذرا مدھم پڑھے جب بھاری بوٹوں بھرکم والے درندے دیو قامت ٹرکوں میں بیٹھ کر دور چلے گئے جب زخمیوں کی چیخیں آہ و فغاں میں بدلی جب بستی کی فضا سوگواری میں ڈوب چکی تو ایرک نے سن ہوتے دماغ کے ساتھ اپنی انگلیوں کو لرزش دی وہ سرخ آنکھوں کو بار بار صاف کرنے کے باوجود بمشکل ہی یہ دردناک منظر کاغذ کے سینے میں محفوظ کر پایا تھا اگلی دو پینٹنگز بھی غزوہ کی درد بھری داستان کی مکمل ترجمانی کر رہیں تھیں وہ ٹشو پیپر سے آنکھیں رگڑتا ہوا اپنے آخری لاجواب کر دینے والے شاہکار کی جانب بڑھا۔

......☆☆......

میں ایشیا جا رہا ہوں کچھ عرصے کیلئے کمرہ چھوڑنے سے پہلے ایرک اپنی لینڈ لیڈی کو آگاہ کرنے کی غرض سے اس کے پاس چلا آیا۔

’’کس سلسلے میں۔‘‘ لیڈی میترا نے سرسری اس کا جائزہ لیا پھر ناک تک پھسلتے چشمے کو واپس اپنی گول مٹول نگاہوں پر جمایا

’’کس سلسلے میں جا سکتا ہوں؟‘‘ وہ الٹا سراپہ سوال بنا جیکپ کسی پراجیکٹ کے سلسلے میں ایک ڈاکومینٹری بنانے کشمیر جا رہا ہے۔اس کے ساتھ میں بھی جا رہا ہوں اپنے لیے کچھ نئے منظر ڈھونڈنے۔‘‘

’’ایشیا ہی جانا تھا تو کسی ڈھنگ کی جگہ چلے جاتے جاپان یا چائینہ کشمیر جانا لازمی تھا کیا میرا مطلب ہے تم وہاں کے حالات میں کیسے ایڈجسٹ کر پاؤ گے خود کو؟‘‘

''ہم مستقل سیٹیل ہونے یا سیر و تفریح کرنے تھوڑی جا رہے ہیں مادم۔ وہاں کے جو حالات چل رہے ہیں اس کی کوریج کیلئے جا رہے ہیں ڈیٹس اٹ۔''

''ہم سنا ہے پاک و ہند بھی تم جیسے سڑک چھاپوں سے بھرا پڑا ہے۔''لیڈی متیرا عادت سے باز آنے والوں میں سے کہاں تھیں جبھی تو جاتے جاتے طنز میں ڈوبے لفظوں کے نشتر قدرے لاپرواہی سے اس کے خوابوں پر چلا کر گئی تھیں۔

......☆☆......

آخری شاہکار۔

ظلم کے سبھی دردناک روپ اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا دماغ پھر سے بھٹکا اور ماضی کی انجان بھیانک گلیوں میں جا پہنچا وہ ایک ادھ جلی کار کے کھوکھلے ڈھانچے میں چھپا بیٹھا نگائیں ایک خاص مقام پر جمائے خون کی ہولی کو کیمرے کی نگاہوں میں نظر بند کرنے کی انتھک کوشش کر رہا تھا، جیکپ پچھلے کئی دنوں سے پولیس کسٹڈی میں تھا جیکپ کے کیس کے سلسلے میں برٹش حکومت کے بھارتی حکومت سے مزاکرات جاری تھے۔ لیکن تب تک اسے تنہا ہی ڈاکومنٹری مکمل کرنا تھی۔

اور اسی منصوبے کے پیشِ نظر وہ بھارتی فوج کی عقابی نگاہوں کی زد سے بچتے بچاتے چوراہے میں موجود ایک ادھ جلی کار میں گھٹنوں کے بل تقریباً چھپا بیٹھا تھا۔ یہاں سے وہ مقبوضہ کشمیر پر ڈھائے جانے والے مظالم کی مکمل ریکارڈنگ کر سکتا تھا۔

بھارتی افواج کی گولیوں اور توپوں کے چھلے دھڑ ادھڑ نہتے مسلمان نوجوان کشمیریوں کے جسم جگہ جگہ سے چھلنی کر رہے تھے کلک کلک اس نے بے اختیار سینکڑوں فوٹوز کھینچ ڈالی بے گناہ شہریوں کے دکانیں نزرِ آتش کی جا رہی تھیں کلک کلک آنکھوں میں چبھن پیدا کرتے ہوئے دھوئیں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنا پورا فوکس ان مظالم پر کئے ہوئے تھا اگلا منظر جو وہ قید کر پایا تھا وہ منظر غزہ کے ہولنا کی سے بھرپور تھا۔ معصوم بچوں اور کئی بوڑھوں کو یرغمال بنا کر ان پر اندھا دھند لاٹھیوں اور ربڑ کی گولیوں کی بوچھاڑ کی جا رہی تھی۔

پوری وادی لحہ لحہ دردناک آوازوں سے گونج رہی تھی اس نے ریکارڈنگ آن کی کیمرہ ایک خاص پوائینٹ پر فوکس کیا اور دوسرے کیمرے کی مدد سے اپنے لئے تصاویر کھینچنے لگا۔

خواتین کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جا رہا تھا کلک کلک اس نے ہر قصے کو محفوظ کیا۔

ایک سوگوار خاموشی۔

ایک بوجھل سی تاریکی۔

بھاری بھرکم اسلحے سے لبریز فوجی نما درندے اپنی اپنی جیپوں اور ٹرکوں میں بیٹھ کر فتح کے نعرے لگاتے نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

مسلمز آر ٹیرریسٹ۔

وہ اب تک یہی سنتا پڑھتا اور مانتا چلا آیا تھا لیکن اس کے سامنے جو اٹل حقیقت موجود تھی وہ اس سے بھی تو نگائیں چرا نہیں سکتا تھا اگر مسلمان ہی اصل دہشت گرد ہوتے تو شاید یہ سب نہ ہوتا جو وہ کئی دنوں سے مسلسل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا یا اب تک دیکھ چکا تھا اور ویسے بھی کسی ایک پھول کے داغدار ہونے کا قصور وار پورے پودے کو تو نہیں ٹھہرایا جا سکتا یا کسی ایک پودے کے مرجھا جانے کی وجہ سے پورے چمن کو تو نیست و نابود نہیں کر دیا جاتا صرف اس مرجھائے ہوئے پودے کو باغ کی ازلی خوبصورتی قائم رکھنے کی خاطر الگ کیا جاتا ہے

باہر کی خاموشی سے وہ اندازہ لگا سکتا تھا مشکل ہی تھا کہ کوئی انسان بچا ہو

......☆☆......

''سنو'' ایرک کیمرہ سنبھالتے ہوئے اس ڈربے نما کار سے اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں سے ایک آواز سنائی دی۔

دہشت اس قدر تھی کہ وہ بجائے پیچھے مڑ کر دیکھنے کے پھولی ہوئی سانسوں کو ساکن کئے اسی میں دب رہا۔

دیکھو مجھے لگتا ہے۔ کہ وہ تم ہی ہو جو ہماری مدد کر سکتے ہو۔ اور میں تمھیں یہاں یہ کہنے آئی ہوں خدا کیلئے تم کم

سے کم تم اپنا فرض   فرض سمجھ کے نبھانا۔
ایرک کی نگائیں غیر ارادی طور پر ریشمی سیاہ برقعے میں ملبوس وجود کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ اس نازک وجود کی بس آنکھیں ہی دیکھ پایا تھا۔ گہری سبز شکوہ کرتی پر اثر نگائیں۔
اس نے ان سرخی مائل نم آنکھوں کی جانب ایک بار پھر سے دیکھنا چاہا پر اپنی ہزار چاہ کے باوجود وہ دوبارہ نظریں اٹھانے سے قاصر رہا
نہیں وہ یہ نہیں کر سکتا تھا وہ ایک مقدس شے کا دیدار اپنی گناہ گار آنکھوں سے نہیں کر سکتا تھا اسے یاد آیا کچھ برس پہلے بھی وہ ایسے ہی کسی سیاہ چادر میں لپٹے سبز آنکھوں والے وجود کے سامنے بے بس ہوا تھا جانے کون سی لڑیاں تھیں جو وقت کی ڈور تھامے ایک بار پھر ماضی کی جانب چل نکلی تھیں۔
لڑکی وہاں کھڑی اسے اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں کچھ التجائیں کچھ داستانیں وہ اپنے منجمد ہوتے دماغ کے ساتھ کچھ باتیں سن پایا کچھ نہیں سن پایا۔
ایسا کیا تھا اس میں کہ وہ مدد کیلئے ایک سڑک چھاپ مسٹر ایرک مہرا کے پاس آئی لڑکی کے چلے جانے کے بعد اس نے خود کو ٹٹو لتے ہوئے حیرانگی سے سوچا۔
......☆☆......
جیکب ابھی تک پولیس کسٹڈی میں تھا یا نہیں اس کے علم میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا تو محض اتنا کہ وہ اپنا اور جیکب کے حصے کا کام کافی حد تک مکمل کر چکا ہے کشمیر میں مزید ستم دیکھنا اب اس کے بس میں نہیں تھا۔ سو اس نے جلد از جلد واپس روس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔
جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر کیمرہ ہاتھ میں تھامے کشمیر کے سرسبز مناظر نظر بند کرنے اوپر وادی میں چلا آیا۔ جب اسے جھاڑیوں کے بیچ و بیچ سیاہ برقعے میں ملبوس ساکن وجود لئے وہ ایک بار پھر سے نظر آئی۔
سیکنڈ کے اٹھارویں حصے میں وہ اسے آسانی سے پہچان چکا تھا۔
سبز نگاہوں میں تیرتی دہشت اب دم توڑ چکی تھی۔
مجھ سے جس قدر ممکن ہو سکا میں اپنا فرض ضرور نبھاوں گا ان آنکھوں کو آخری بار بند کرتے ہوئے اس نے ایک عہد خود سے کیا ایرک کو ایک بار پھر وہ یاد آئی تھی۔
......☆☆......
اسے یاد آیا جنوری کی ایک بے درد شام کیسے اس کے سوتیلے باپ نے بے رحمی سے اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ وہ اپنے سوتیلے باپ اور زندگی کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر دو بار خود کشی کرنے کی کوشش کر چکا تھا اور برفانی دھرتی کی گود میں دھنسا وہ اب بھی یہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
وہ سڑک سے ملنے والے پرانے بلیڈ سے اپنے کلائی کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا جب سیاہ چادر میں لپٹی پاکیزہ وجود لئے وہ اس کے پہلو میں آن بیٹھی تھی
ساری دنیا سے ماروا۔
ساری دنیا سے بے پروا اس کی زندگی کی محافظ اس کے درد کا مسیحا
''سنو یہ تم کیا کر رہے ہو تم خود کو ختم کرنے جا رہے ہو۔'' اس کے ہاتھ سے بلیڈ لیتے ہوئے وہ تقریباً پورے جوش سے چلائی تھی
وہ خاموش رہا۔ آنکھوں میں آئے آنسو ظلم کی داستان سنا رہے تھے وہ آنسوؤں کی زبان سمجھ سکتی تھی شاید جبھی اس نے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے پہلو میں بیٹھی چپ چاپ ایرک کے آنسوؤں کے تھمنے کا انتظار کرنے لگی
''میں خود کو ختم نہیں کر رہا زندگی مجھے اپنا آپ ختم کر لینے پر مجبور کر رہی ہے اور بار بار کر رہی ہے میں پہلے دو بار خود کشی کرنے کی ناکام کوشش کر چکا ہوں پر شاید زندگی بنا آزمائے میری جان نہیں چھوڑنے والی نہ ہی میرے سوتیلے باپ کو پسند ہوں نہ زندگی مجھ پہ مہربان ہوتی ہے مجھ جیسے ناکارہ انسان کو مر ہی جانا چاہئے ایرک پھٹی ہوئی میلی آستین سے آنسو صاف کرتے ہوئے تقریباً پھٹ پڑا۔
''یہ لو برف آ تمھاری زندگی کی محرمیوں کے کچھ پتلے

بناتے ہیں۔'' وہ کافی سوچ بچار کے بعد بولی تھی۔
''تمہارا مطلب ہے سنومین۔'' وہ ٹھٹک کر بولا۔
''ہاں سنومین۔'' جتنی محرومیاں اتنے سنومین۔
اگلے کچھ گھنٹے میں وہ آٹھ بڑے سنومین تیار کر چکا تھا۔ باپ کی شفقت سے محروم ہونے کا سنومین۔ زندگی کی کوئی خواہش پوری نہ ہونے کا سنومین۔ ماں کی مسلسل خاموشی کا سنومین خود کو نکما بنائے جانے کا سنومین اور ایسے ہی کچھ دوسرے سنومینز۔
''یہ لو بن گئے اب؟؟'' وہ ہاتھ جھاڑ کے اسکے سامنے آن بیٹھا تھا
''اب کچھ نہیں چپ چاپ بنا کوئی سوال کیے انتظار کرو وہ اپنے سامنے بیٹھے چودہ سالہ لڑکے کے معصوم چہرے کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے بولی۔
ایرک اب اسے اپنے بچپن کی کچھ حسین واقعات سنا رہا تھا ساتھ ساتھ وہ اسے پرانے بیگ میں پڑے کچھ پوٹریٹ ڈایز این بھی نکال کر دکھا رہا تھا۔
''محرمیوں کو اہمیت ہمیشہ برف کے پتلوں کی مانند دینی چاہے اس نے پگھلتے ہوئی برف کی جانب اشارا کرتے ہوئے کہا،، جو تقریبا تمام ہونے والی تھی۔ جن کا وجود تو ہوتا ہے مگر صرف وقتی طور پر ان محرومیوں کے پیچھے خود کو خوار مت کرو جنہیں تم نہیں بدل سکتے یا جو تمہارے بس میں نہیں ہیں ہاں جو چیزیں تمہارے بس میں ہیں انہیں بدلنے کی چاہ میں تم زمین آسمان ایک بھی کر دو تو مضائقہ نہیں ہے
جانتے ہو زندگی کی چھوٹی چھوٹی محرومیاں مل کر انسان کو زندگی میں سب سے کامیاب انسان بنا دیتی ہیں اپنی محرومیوں پر شکوہ کرنے کے بجائے انہیں اپنی طاقت بناو تمھیں اللہ نے پیدا کیا ہے تو ضرور ناکارہ نہیں پیدا کیا ہوگا تم دو بار خودکشی کرنے کے باوجود بھی زندہ ہو مطلب تم نکمے یا فضول نہیں ہو اس نے تمہارے لئے ضرور کچھ نہ کچھ بہتر بلکہ کچھ بہت بہتر پلان کر رکھا ہو گا سو اپنی محرمیوں پر ناشکری کرنے کے بجائے اس کی عطا کی گئی رحمتوں کو گننے میں لگ جاو اس کی شکر گزاری میں لگ جاو زندگی آسان ہو جائے گی یقین جانو میں نے اپنی بتیس سالہ زندگی میں کسی شکر گزار کو پریشان اور کسی پریشان کو شکر گزار نہیں دیکھا ان فضولیات کو ذہن سے جھٹکو خود کو پہچانو زندگی کا کوئی مقصد بناو۔ جسے صرف تمھارے لئے بنایا گیا ہے جس کی تکمیل صرف تم کر سکتے ہو اس دنیا میں رہنے والے باقی سینکڑوں افراد نہیں اور اس مقصد تک پہنچنے کی کوئی راہ تلاش کرو ہو سکتا ہے تمھیں اس وقت کوئی راستہ نظر نہ آ رہا ہو لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ راستہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ میں اللہ سے دعا کروں گی کہ وہ تمھیں اپنے راستے پہ لے آئے۔

......☆☆......

اور وہ اپنی زندگی کا مقصد بنا چکا تھا جیکپ روس واپس آ چکا تھا اس کا لوکل چینل مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان بار بار ہائی لائیٹ کر رہا تھا باقی چینلو میڈیا کچھ سیاسی لوگ اپنی جانب سے اس ڈاکومینٹری پر بھرپور تنقید کر رہے تھے ایرک کے فن پارے بھی جگہ جگہ نمائش کے لئے پیش کئے جا رہے تھے مخالفت کا نشانہ اسے بھی بنایا جا رہا تھا مگر اب پروا کسے تھی،، وہ مطمن تھا وہ اپنا فرض فرض جان کر پورا کر رہا تھا وہ مسلم کیمونٹی کو بے گناہ ثابت کرنے کیلئے جو کچھ کر سکتا تھا کر رہا تھا وہ خوش تھا اور سب سے بڑھ کر اس کا دل مطمئن تھا۔ وہ کئی سالوں بعد سکون کی نیند سو پایا تھا۔

......☆☆......

چھن چھن۔ سوچوں کا محور ماضی سے نکل کر ایک بار پھر چاندنی میں رقص کرتے وجود پر جا اٹکی تھیں سفید موروں کا جوڑا بھی سرمست ہو کر پر پھیلائے ناچنے میں مگن تھا برف کی افشان بھی کبھار اڑتی اور منظر ایک بار پھر سے آسمانی ہو جاتا۔
ایرک بنا آگے بڑھے اس پر حسین من چاہے منظر کو بے خود سا ہو کر کینوس پر منتقل کرتا چلا گیا کہ جبھی فلک کی نیلگوں چادر پر اک ہلچل ہوئی تھی اک تارہ ٹوٹا تھا۔ ٹوٹے تارے کو دیکھ کر سبز و سفید دھرتی پر رقص کرتے وجود میں بھی یکدم ہلچل ہوئی تھی اپنے ریشمی اغوانی لباس کو سمیٹے

ہوئے وہ محو دعا ہوئی تھی

"کیا مانگا۔" ایرک نے اس برفانی حسینہ کے قریب آ کر اس کی لمبی سیاہ پلکوں کی جھالر پر لشکارے مارتی برف کی جانب دیکھتے ہوئے مخمور سے لہجے میں پوچھا۔

"تمہاری اک جھلک۔ وہ آنکھیں بند کیے ہی مخاطب ہوئی۔

"دعا قبول ہوئی۔ فرمانِ ملن جاری ہوا۔ اک جھلک کیا جی بھر کے دیکھ لو۔" بند آنکھیں کھل چکی تھیں ایرک اب بھی پلکوں کی جھالر میں اٹکی برف دیکھ رہا تھا۔

"تم تم کب آئے۔" وہ بلش ہوتی ذرا پیچھے ہوئی۔

"جب ستارہ ٹوٹا تھا اور کسی نے میری اک جھلک کی دعا کی تھی۔" ایرک نے مزید قریب ہو کر کہا۔ وہ پلکوں کی باڑ میں چھپی برف صاف کر چکی تھی۔

"جانتی ہو۔ اب کی بار جب کوئی تارہ ٹوٹے گا تو میں بھی ایک دعا مانگوں گا۔"

"کیسی دعا۔ ہانا نے پلکیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سب دعاؤں سے ماورا ایک دعا۔" ایرک نے تقریباً سرگوشی کی تھی جواباً وہ مسکرا کر رہ گئی۔ اور پھر صرف اسے ہی نہیں ایرک نے سفید موروں کے جوڑوں رات کی تاریکی تاریکی پر غلبہ پاتی چاندنی یہاں تک کہ چاند کو بھی بادلوں کے پیچھے سرکتا، چھپتا اور مسکراتے پایا۔

"مان لو ہم تم فلک کے دو ستارے ہوتے۔" وہ مدہوش ہوا تھا۔

"یہ بھی مان لو یہ ستارے اک دوجے سے دور بے حد دور ہمیشہ بستے۔" ہانا نے گلابی ناک کو رگڑتے ہوئے سوال کیا۔

"مان لو ہم کئی برس کئی ساعتیں سنہرے آکاش کی سیاہ چادر پر ایک ساتھ چمکتے۔"

یہ بھی مان لو یہ کئی برس کئی ساعتیں ملکر بھی ہمیں کبھی ایک نہ کر پاتیں۔

مان لو فاصلے ہمیں لحہ بہ لحہ مذید قریب سرکاتے رہتے

تم بھی مان لو ستاروں کے فاصلے ازل ہوتے ہیں (یہ کبھی سمٹا نہیں کرتے)

مان لو ہماری روشنی پر حق صرف ہمارا ہوتا۔

یہ بھی مان لو پورا زمانہ فقط انہیں روشنیوں کی آمد کا منتظر ہوتا

مان لو ہم اک دوجے کو ٹوٹ کر چاہتے۔

یہ بھی مان لو یہی چاہت ہمیں توڑ کر رکھ دیتی۔

مان لو جدائی بھی ہمیں راحت ہی بخشتی۔

یہ بھی مان لو ہم عرصہ دراز کی جدائی سہہ نہ پاتے۔

مان لو اک زمانہ ہمارے ملن کی آس میں ہوتا۔

یہ بھی مان لو ایسا تب ہوتا جب ہم تم فلک کے دو ستارے ہوتے

مان لو ہم فلک کی چادر سے کبھی نہ ٹوٹ کے گرتے۔

یقین مانو ہم گرتے تو کئی لب ملتے کئی ہاتھ اٹھتے۔

نیلگوں تاریک آکاش کی دھرتی سے ایک اور تارا ٹوٹ کر گرا تھا بلا ارادی طور پر ایرک کے ہاتھ اٹھے تھے لب ہلے تھے۔

وہ کئی دنوں سے اسلام کا مطالعہ کر رہا تھا وہ ایک سبز آنکھوں والی کی رہنمائی میں اپنی منزل پہچان کر سیدھے راستے کی جانب نکل پڑا تھا

وہ دوسری سبز آنکھوں والی کی ہدایت پر اپنا فرض فرض جان کر پورا کر چکا تھا

اور اسے یقین تھا کہ اب وہ جلد اپنی زندگی کا حقیقی مقصد پالے گا اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ تیسری سبز آنکھوں والی ہانا ہمیشہ اس کا ساتھ دے گی۔



اقتدار

بلال شیخ

سیاست عبادت سے کم نہیں، سیاست کا مطلب ملک وقوم کی بھلائی ہوتا ہے مگر آج سیاست ایک کاروبار بن چکی ہے جس میں خدمت خلق کا دور دور تک سبق نہیں ملتا۔

ایک سیاست دان کا احوال، وہ اقتدار کے لیے سب کچھ جائز سمجھتا تھا

گھر کے باہر گاڑی کھڑی ہوئی عاطف اور افضل دونوں گاڑی سے باہر نکلے اور بھاگتے ہوئے اپنی ماں کے پاس گئے۔

" امی امی۔۔۔۔۔" عاطف اور افضل زور زور سے بول رہے تھے۔

" کیا ہوا خیریت تو ہے؟" مریم بولی۔

" آج ہمارا رزلٹ آیا ہے " افضل بولا اور رزلٹ کارڈ دکھانے لگ گیا۔ دونوں اپنا اپنا رزلٹ کارد دکھانے لگ گے " ٹھہروں ٹھہروں ایک ایک کر کے دیکھوں گی نہ " مریم نے دونوں کا رزلٹ کارڈ پکڑلیا۔

" ارے واہ دونوں کے نمبر اچھے آئے ہے پر اس دفعہ افضل نے زیادہ اچھے نمبر لئے ہیں عاطف کے مقابلے۔" مریم نے عاطف کی طرف نظر کرتے ہوئے کہا۔

" ہاں جی اس دفعہ دانش بھائی کی شادی کی وجہ سے تیاری نہیں ہوسکی پر اگلی دفعہ زیادہ نمبر لے کر کسر پوری کر دوں گا آپ کو پتہ تو ہے میں کسی سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوں۔" عاطف نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

" چلو چھوڑو اس رزلٹ کارڈ کو اور جا کر منہ ہاتھ دھولو اور کھانا کھاؤ" مریم نے کہا۔

دونوں اپنے کمرے کی طرف چل دیے اور مریم نے باورچن کو کھانا لگانے کا حکم دے دیا۔ مریم طلال کے پاس سب کچھ تھا اگر کچھ نہ تھا تو اپنے بچوں کے لئے وقت نہ تھا۔ مختلف قسم کی پارٹیز میں جانے کا شوق اور اپنی بوتیک اور اگر کچھ وقت بچ جائے تو شاپنگ بہت مصروف زندگی تھی مریم طلال کی۔ مزاج کی بہت سخت تھی اپنے سامنے اونچی آواز اور اٹھتی ہوئی نگاہ اسے بالکل نہیں پسند تھی۔

مریم، رخسانہ کو جو کہ اس کی باورچن ہے نصیحت کر رہی تھی " سنو رخسانہ بچوں کو کھانا کھلا دینا اور ان کو زیادہ شرارتیں نہ کرنے دینا کچھ دیر کے لئے سونے دینا اور شام کو ان کے ٹیچر آئے تو ان کو وقت پر تیار کرا کر اسٹڈی روم میں بھیج دینا اوکے " مریم نے بیگ سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

" جی بیگم صاحبہ۔" رخسانہ نے کہا۔

مریم چلی گئی اور اب رات تک اس کی مصروفیت تھی کام کی دوڑ نے کبھی باہر مریم کو گھر کی یاد نہیں دلائی۔

کمرے میں بہت خاموشی تھی کمرے میں ملک طلال اور ان کے علاوہ چار افراد بیٹھے تھے جو کہ ملک طلال کے بہت خاص بندے تھے اور ملک طلال سگریٹ سلگا رہا تھا اور باقی چار بھی خاموش بیٹھے تھے کافی دیر کی خاموشی کے بعد ولید نے خاموشی توڑی۔

" ملک صاحب آگے الیکشن ہے اور چوہدری امجد کافی اچھا جا رہا ہے اس دفعہ لوگ اس کی حمایت بھی کر رہے ہے ہمیں اپنے روزمرہ کے معاملات بدلنے ہوں گے " ولید نے کہا۔

سلیم نے ولید کی بات سنی تو بولا۔ " صرف جلسوں سے کام نہیں چلے گا ولید صاحب ہماری پوزیشن کوئی اچھی نہیں رہی ہم نے اس دفعہ اس علاقے میں کیا ہی کیا ہے؟ لوگ اس دفعہ چوہدری کو بہت سپورٹ کر رہے ہے "



ولید نے جب سلیم کی بات سنی تو خاموش ہو گیا اور ملک طلال سگریٹ سلگا رہا تھا اور باتیں سن رہا تھا پھر ولید بولا "ملک صاحب آپ ہی کوئی مشورہ دیں کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ اس دفعہ آپ ہار نہ جائیں"

ملک طلال نے جب ہار کا لفظ سنا تو ایک دم سیدھا ہو گیا اور اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں دبا کر بجھا دیا اور بولا۔

"ولید تم بھول رہے ہو ملک طلال نے کبھی ہار نہیں دیکھی ہے اور ملک طلال ہار کے لفظ کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے اور جہاں ہار ہوتی ہے وہاں ملک طلال نہیں ہوتا ہم الیکشن لڑیں گے اور چوہدری امجد کو ہرائیں گے چاہے ہمیں لاشوں کا قالین ہی کیوں نہ بچھانا پڑے ہفتے کے دن گراؤنڈ میں جلسہ رکھو ہم جلسہ کریں گے اور جلسے میں گولی بھی چلنی چاہئے" ملک طلال نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ٹیک لگالی۔

گولی کا لفظ سن کر چاروں ایک دم حیران ہو گے۔ "گولی" احمد بولا۔

"ہاں جلسے میں ایک کارکن اُڑا دیا جائے گا اور اس طرح لوگوں کی محبت سمیٹنے کو بھی مل جائے گی اور چوہدری بھی ڈر جائے گا آخر اس کو بھی پتہ چلے کے وہ کس کے ساتھ مقابلہ کر رہا ہے" طلال نے بات مکمل کی اور اٹھ گیا اور باہر چلا گیا اس کے جانے کے بعد چاروں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگ گئے۔

دولت اور سیاست ملک طلال کو وراثت میں ملی تھی۔ ملک طلال ایک دفعہ ارادہ کر لیتا تو پھر دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے طلال کا فیصلہ نہیں بدلتا تھا۔ ملک طلال کو اپنے بیٹے بہت عزیز تھے جو کہ اس کی ہر چیز کے وارث تھے اور بچوں کے معاملے میں وہ کسی کا سگا نہیں تھا۔ رات کو جب طلال گھر پہنچا تو اندر بچے بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے اور جب ان دونوں نے طلال کو آتے دیکھا تو وہ دونوں بھاگے بھاگے آئے۔

"ڈیڈی ڈیڈی۔۔۔۔۔" بچوں نے آواز لگائی دونوں اپنے والد کے ساتھ لپٹ گے۔

"میری جان کیسے ہو میرے بچو؟" طلال نے افضل کو گود میں اُٹھالیا اور عاطف کے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ "تمھاری امی کہاں ہے؟" طلال نے بچوں سے پوچھا۔

"پتہ نہیں ہوگی اپنے کام میں مصروف آپ کو تو پتہ ہے ان کو کتنے کام ہوتے ہے" عاطف نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے کھانا کھالیا؟" طلال نے پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں" عاطف نے کہا۔

"چلو کھانا کھاتے ہے۔" طلال کہتا ہوا کمرے میں فریش ہونے چلا گیا۔

طلال نے کمرے میں آتے ہی اپنا موبائل نکالا اور مریم کو فون کیا۔ مریم اس وقت ایک ہوٹل میں کچھ دوستوں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھی جن میں خواتین کے ساتھ مرد بھی موجود تھے اور مریم خوش گپیوں میں مصروف تھی کہ اس کے موبائل پر رنگ ہوئی مریم نے فون کان کو لگایا۔

"ہیلو۔" مریم بولی۔

"کہاں ہو؟" طلال نے پوچھا۔
"میں ادھر کچھ فرینڈز کے ساتھ ہوں خیریت ہے؟" مریم نے کہا۔
"تمہیں بچوں کی کچھ پروا ہے کے نہیں گھر سے باہر جاتی ہو تو گھر کو ہی بھول جاتی ہو تمھارے بچوں نے کھانا کھایا نہیں کھایا تمہیں کسی چیز کی پروا ہی نہیں۔" طلال کو غصہ آیا ہوا تھا اور اس نے فر فر بول دیا۔
مریم نے جب طلال کی غصے بھری آواز سنی تو وہ دوستوں میں سے اُٹھ کر تھوڑا سائڈ پر ہو کر بات کرنے لگ گئی۔
"کچھ ہی دیر میں آ رہی ہوں بابا اور میں گھر میں رخسانہ کو سب سمجھا آئی تھی وہ کھلا دے گی کھانا بچوں کو۔" مریم نے صفائی پیش کی۔
"وہ تمہارے بچے رخسانہ کے نہیں جو تم سب اس کو سمجھا دیتی ہو۔" طلال نے کہا اور فون بند کر دیا۔
مریم کو طلال کی بات ناگوار گزری مگر وہ کسی کی باتوں میں آ کر ماحول خراب کرنے والوں میں سے نہیں تھی اور اس کو سب چیزوں سے زیادہ اپنی لائف بہت عزیز تھی اس نے سب باتوں کو نظر انداز کر دیا اور دوبارہ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئی۔
طلال نے کھانا بچوں کے ساتھ کھایا اور پھر دونوں کے ساتھ ان کے کمرے میں چلا گیا۔ طلال ایک بارعب شخص تھا اس کے پاس کسی کے لئے وقت نہیں تھا مگر عاطف اور افضل کے لئے وہ غلام بن جاتا تھا۔ طلال نے دونوں کو لیٹ جانے کے لئے کہا۔
"چلو بچو اب آپ دونوں لیٹ جاؤ اور آنکھیں بند کر لو شاباش"
"ابو آپ بھی ہمارے ساتھ لیٹ جاوں نہ پلیز۔۔۔۔" افضل نے معصومانہ انداز میں کہا اور طلال کو اس پر پیار آ گیا اور وہ کچھ دیر کے لئے ان کے ساتھ لیٹ گیا ایک طرف عاطف لیٹ گیا اور دوسری طرف افضل۔
"ڈیڈی کل میں نے آپ کا انٹرویو دیکھا تھا وہ نیوز چینل پر آپ اچھے لگ رہے تھے۔" عاطف نے کہا۔
"اچھا۔" طلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ڈیڈی میں بھی آپ کی طرح سیاست دان بنوں گا اور ٹی وی پر انٹرویو دیا کروں گا" عاطف نے کہا۔
"اور آپ کیا بننا چاہو گے افضل بیٹا۔" طلال نے افضل سے پوچھا۔
"میں ڈاکٹر بنوں گا۔" افضل نے کہا۔
"کیوں آپ سیاست دان نہیں بننا چاہو گے" طلال نے پوچھا۔
"نہیں مجھے سیاست دان بننا نہیں پسند مگر میں سیاست دانوں کو فائدہ پہنچاؤں گا۔" افضل نے کہا۔
"وہ کیسے۔" طلال نے افضل کے سر کو ہاتھ لگاتے ہوئے پوچھا۔
"روز ٹی وی میں دیکھتا ہوں جلسوں میں خون خرابا ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی مر جاتا ہے میں ان لوگوں کو بچانے کی کوشش کیا کروں گا۔" افضل نے بڑی معصومیت سے ساری بات کر ڈالی۔
افضل کی بات سن کر طلال خاموش ہو گیا اور کسی سوچ میں گم ہو گیا کچھ دیر بعد دونوں سو گئے اور طلال اُٹھ کر باہر چلا گیا اور باہر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا اس نے ملازمہ سے بوتل منگوائی اور گلاس میں تھوڑی سی ڈالی اور پینا شروع کر دی اور کسی سوچ میں گم ہو گیا۔
آج جمعہ کا دن تھا اور آج جلسہ بھی تھا اور تیاریاں اپنے عروج پر تھیں میڈیا والے ملک طلال کو پورا دن ٹی وی پر دکھا رہے تھے ملک طلال سیاست میں ایک نمایاں نام تھا اور اس دفعہ جو مقابلے میں کھڑا تھا وہ بھی ملک طلال کی ٹکر کا آدمی تھا۔
ملک طلال نے بہت مضبوط تقریر تیار کی ہوئی تھی اور اس کا ماننا تھا کہ وہ عوام میں جوش بھر دے گا اور آج کا دن اس کے لئے اہم تھا۔ ملک طلال کے چار آدمی بھی پورے ایکٹیو تھے ملک طلال نے آدھے گھنٹے کی ہنگامی میٹنگ بلائی اور اس میٹنگ میں ولید، اسلم، احمد اور اجمل موجود تھے۔ طلال نے ولید سے مخاطب ہو کر کہا۔
"ولید کام مکمل ہے نا کام بہت صفائی کے ساتھ ہونا چاہیے کسی قسم کی بات بھی لیک آؤٹ نہیں ہونی چاہیے"
"آپ بے فکر ملک صاحب کام اتنی صفائی سے ہو گا کہ کسی کے باپ کو بھی نہیں پتہ چلے گا۔" ولید نے کہا۔

"چلو پھر سب اپنے اپنے کاموں میں لگ جاؤ اور جس کو جو کہا گیا ہے وہ کرے۔" طلال نے کہا۔
میٹنگ ختم ہوئی اور سب کمرے سے باہر چلے گئے اور تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ رات کے آٹھ بج گئے تھے اور تیاریاں مکمل تھیں سارا علاقہ روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور ہر طرف ملک طلال کے پوسٹر لگے ہوئے تھے، ملک طلال ایک بارعب شخصیت کا مالک تھا اس کے چہرہ اس کے چلنے کا طریقہ بہت خوب تھا۔ طلال نے جلسے کے لئے خاص اور خوبصورت شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور اوپر کالا ویسٹ کوٹ تھا۔
طلال سٹیج پر بیٹھا ہوا تھا اور مقرر نے پر جوش انداز میں طلال کو تقریر کرنے کے لئے بلایا۔ طلال بڑے پر جوش انداز میں اُٹھا اور مائک کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔
میرے پیارے ہم وطنو السلام علیکم،
میرے پیارے بھائیوں اور بہنوں آپ کا آج اس جلسے میں تشریف لانا اور اس لمحے کو خوشگوار بنانے کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کو بھی اتنی خوشی ہوگی جتنی آج مجھے ہے ادھر میں فضول باتیں کر کے آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا کیونکہ وقت باتوں کا نہیں کام کرنے کا ہے اور آپ جانتے ہے پچھلے سال ہم نے اس علاقے پر کتنی محنت کی ہے اور ہم نے جو وعدے کیے وہ ہم نے بخوبی پورے کر کے دکھائے عوام کا اعتماد حاصل کرنے اور اس علاقے کو شہر کا بہترین علاقہ بنانے میں میں نے دن رات محنت کی ہے تو میں بالکل نہیں چاہوں گا کہ میرے علاقے کو کل کا بندہ جس نے ابھی سیاست کی الف ب نہیں آتی وہ میرے علاقے کو بیوقوف بنائے یہ چوہدری امجد جو اپنے آپ کو لیڈر کہتا ہے یہ دیہاڑی باز سیاست دان۔
ابھی ملک طلال تقریر کر رہا تھا کہ ایک زوردار گولی چلنے کی آواز آئی اور ہر طرف افراتفری مچ گئی سیکیورٹی گارڈ آئے اور طلال کو سٹیج کی بیک سائڈ سے لے گئے اور گاڑی میں بٹھا دیا کچھ ہی لمحوں میں جلسہ میں لوگوں کا شور وغل ہو گیا اور ہر شخص ایک دوسرے کو دھکے دے کر بھاگ رہا تھا ہر چینل پر اس جلسے کی ویڈیو بن رہی تھی۔
مریم نے جب ٹی وی پر دیکھا تو اس نے فوراً طلال کو فون کیا طلال نے فون اُٹھایا۔
"ہیلو۔" طلال نے کہا۔
"آپ ٹھیک ہے نا میں نے ٹی وی پر دیکھا تو میں ڈر گئی تھی آپ خیریت سے تو ہے نا" مریم نے کہا۔
"ہاں میں ٹھیک ہوں تم فکر نہ کروں میں گھر ہی آرہا ہوں" طلال بولا۔ طلال نے فون بند کر دیا اور سکون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور مسکرانے لگا۔
اگلے دن کی صبح نیوز چینلو پر جلسے میں چلنے والی گولی اور اس سے جاں بحق ہونے والے شخص کی تصویر بار بار دکھائی جا رہی تھی اور ملک طلال کے حامیوں نے سارا مدعا چوہدری امجد پر ڈال دیا اور سب کو یہ ظاہر کر دیا کہ یہ سازش اپوزیشن نے کی ہے۔
صبح اُٹھتے ہی طلال نے پریس کانفرنس کرائی اور تمام میڈیا چینلو والے اس کے گھر میں تھے اس نے میڈیا والوں کو بتایا" دیکھیے یہ سب سازش ہے ہمیں ڈرایا گیا ہے میں اس حلقے میں پچھلے دو الیکشن لگا تار جیت رہا ہوں اپوزیشن سیاست میں بے گناہ لوگوں کی خون کی سیاست کھیل رہی ہے جو کہ ہم نہیں ہونے دے گے ہم بے چارے اور معصوم عوام کا خون نہیں بہنے دیں گے" کچھ باتیں کر کے ملک طلال نے کانفرنس ختم کر دی۔
جو شخص رات کو جلسے میں گولی سے مارا گیا تھا اس کا نام علی تھا اور علی کے گھر میں قیامت کا منظر تھا ملک طلال اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس گھر میں پہنچا ملک طلال کو دیکھ کر اس کے گھر والے سب الرٹ ہو گے اور سب طلال کے اردگرد جمع ہو گئے۔ علی کے ابو بھی وہاں موجود تھے جو کہ شروع سے طلال کی پارٹی کے سپورٹر رہے تھے۔
علی کے ابو نے ملک طلال کو بٹھایا ان کی آنکھیں رو رو کر لال ہو چکی تھیں اور ملک طلال ان آنکھوں میں درد صاف دیکھ سکتا تھا۔ "دیکھیے ہم آپ کے دکھ کو جان سکتے ہے اور ہمیں بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا آپ کو اور آپ کا بیٹا ہماری پارٹی کا بہت اچھا کارکن رہا اس بات کا بھی ہمیں بہت فخر ہے اس نے اس ملک اور اس پارٹی کی خاطر جان دی وہ شہید ہے۔" ملک طلال نے علی کے ابو کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
"جی بس اللہ کو جو منظور جی ہمارا اکلوتا بیٹا تھا اس کے

علاوہ ہمارا تھا کون علی کی امی نے رو رو کر اپنا حال ہی برا کر لیا ہے۔'' علی کا باپ احمد بول رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جہاں طلال بیٹھا تھا وہاں ایک دم عورت چیختی چلاتی باہر آئی '' میرا بیٹا میرا بیٹا اے اللہ اس کو دردناک موت دے جس نے میرے جوان بیٹے کو مار دیا وہ بھی نہیں بچے گا وہ کتے کی موت مرے گا وہ'' جمیلہ چیخ رہی تھی۔

طلال نے جب جمیلہ کو چیختے ہوئے دیکھا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگ گیا اس نے اپنے سیکرٹری سے چیک بک نکالنے کو کہا اس نے چیک بک پر دس لاکھ روپے کا چیک کاٹ دیا اور احمد کو پکڑا دیا۔

'' نہیں جی اس کو رہنے دے ان پیسوں سے کون سا علی واپس آ جائے گا۔'' احمد بولا۔

'' یہ میری طرف سے ہے مہربانی کر کے منع مت کیجیے گا اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور بتایئے گا۔'' طلال کہتا ہوا اٹھا اس نے مصافحہ کیا اور باہر جانے لگا تو جمیلہ طلال کو غصے سے دیکھ رہی تھی اس کی آنکھیں لال تھیں اور طلال کو جمیلہ کی آنکھوں سے خوف آ رہا تھا۔ طلال تیز قدموں کے ساتھ باہر آ گیا۔

کچھ دیر بعد نیوز چینل پر ایک ہیڈ لائن چلی '' علی کے لواحقین کو دس لاکھ کا چیک دے دیا گیا''

کچھ ہی ہفتے بعد الیکشن ہوئے اور طلال کا اپنے حلقے میں بہت چرچا ہو رہا تھا جلسے میں حادثے کے بعد طلال کی پوزیشن بہت بہتر ہو گئی تھی بینرز، سٹیکرز اور نعروں کی گونج سے ماحول بنا ہوا تھا۔ '' اب کی بار ملک طلال، ملک طلال زندہ باد'' ملک طلال کی ٹیم ووٹرز کو مل رہے تھے۔ چوہدری امجد کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور طلال کافی بھاری ووٹوں سے جیتا میڈیا والے طلال کے پیچھے پیچھے تھے پورے علاقے کو روشنیوں سے سجا دیا گیا تھا۔

چوہدری امجد ایک بھاری جسم کا مالک تھا اور کافی بارعب تھا اس میں ایک اچھے سیاست دان کی کافی خوبیاں موجود تھیں اس کا بہت نام تھا وہ ملک طلال کی طرح بے پروا نہیں تھا وہ اس کے مقابلے میں کافی ہمدرد تھا غریبوں کی مدد کرنا اور محب وطن بھی تھا۔ امجد اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا باتوں میں مصروف تھا۔

'' دیکھو چوہدری صاحب اس دفعہ اس کی یہ تکنیک کامیاب ہو گئی'' زبیر بولا۔

'' ہاں زبیر تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' چوہدری نے مایوس ہو کر کہا۔

'' ملک کو کافی داؤ پیچ آتے ہیں الیکشن جیتنے کے لئے اس نے اس علاقے کو دیا کیا ہے جب بھی آتا ہے کرپشن ہی کرتا ہے اور الیکشن جیتنے کے لئے بھی اتنا ظالم داؤ کھیلے گا امید نہیں تھی'' محمود علی بولا۔

'' کوئی بات نہیں یار ملک کتنی دیر تک اس دھوکے کے ساتھ عوام کو بیوقوف بناتا پھرے گا ایک دن یہی دھوکا اس کو ڈھونڈ نکالے گا اور کوئی داؤ نہیں کھیل سکے گا۔'' امجد نے مونچھوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ سب خاموش ہو گے اور امجد کی آنکھیں لال ہو رہی تھی۔

اس دفعہ بھی الیکشن جیت کر بھی حالت ویسے کی ویسی ہی رہی اور کوئی خاص کام عمل میں نہ آیا سڑکیں ٹوٹی، سیوریج کا نظام خراب ہو چکا تھا۔ ملک طلال سب کام سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی میں مصروف تھا۔ پانچ سال ہونے کو تھے اور اس دفعہ ملک طلال کو سیاسی نقصان پہنچا اور اس کو کم پسند کیا جانے لگا۔

طلال اور اس کے کچھ ساتھیوں کی میٹنگ جاری تھی۔ '' ملک صاحب اس دفعہ تو بہت مشکل لگتا ہے کہ خدا ہی ہے کہ ہمیں الیکشن جیتا دے ورنہ کچھ نظر نہیں آتا میڈیا والوں نے تو ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے۔'' ولید بڑے ادب کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

ولید، ملک طلال کا فرمانبردار ساتھی تھا مگر آج ولید کو دیکھ کر طلال کی آنکھوں میں چمک آ رہی تھی۔ '' ایسا کرو ولید علاقے میں کچھ کام کراؤ اس دفعہ تم لوگوں میں کچھ نمایاں ہو جاؤ میں چاہتا ہوں لوگوں کو ایک نیا چہرہ دکھایا جائے اس دفعہ میں تمہیں الیکشن میں کھڑا کراوں گا۔'' طلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ولید نے جب یہ بات سنی تو اس کا خوشی سے دل جھومنے لگا۔''

ملک صاحب میں آپ میرے لئے یہ سوچ رہے ہے میں تو آپ کے غلاموں جیسا ہوں۔'' ولید نے کہا۔

'' تم الیکشن جیتوں یا میں جیتو بات تو ایک ہی ہے اس

میں کیا فرق پڑتا ہے آخر ہم نے بازی جیتنی ہے اور عوام کے سامنے ایک نیا لیڈر ہوگا تو شاید وہ خوش ہو جائیں۔" طلال نے ولید کی حوصلہ افزائی کی۔

"جی میں آج سے ذمہ داریاں سنبھال لوں گا اور علاقے میں کام کروانا شروع کرتا ہوں اور آپ کے نام پر کام کرواتا ہوں۔" ولید خوشی سے بات کر رہا تھا۔

"سیوریج کا نظام بہت خراب ہے علاقے میں تم پہلے وہ کراؤں اور پیسوں کی فکر مت کرنا۔" طلال کہتا ہوا اُٹھا اور ولید کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

"جی بہت شکریہ ملک صاحب ہم آپ کے غلاموں میں سے ہیں" ولید نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور کچھ دیر بعد دونوں کمرے سے باہر نکل گے۔

عاطف اب بڑا ہو چکا تھا او لیولز کے بعد اب وہ اے لیولز میں تھا اور افضل او لیولز میں گیا تھا اب ان کی ایکٹوٹیز بدل چکی تھیں۔ عاطف زیادہ پولیٹیکل سبجیکٹ میں دلچسپی لے رہا تھا اس کی شکل اور عادات اپنے باپ سے بہت ملتی تھی اور اس کے برعکس افضل ذرا درویش صفت ہی رہا اس کو جانوروں کا شوق تھا اس نے پرندے اور دو کتے پالے ہوئے تھے اور ان کی دیکھ بھال کرتا رہتا۔

آج رات کھانے کی ٹیبل پر طلال اور سب گھر والے موجود تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ طلال کھانا کھاتے ہوئے عاطف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"عاطف بیٹا کیسی پڑھائی جا رہی ہے؟"

عاطف نے کہا۔

"بہت اچھی۔"

"اور افضل بیٹا تم بتاؤ میں نے سنا ہے آج تم نے پھر ایک طوطا خریدا ہے یہ تم کیسے شوق پالتے ہو۔" طلال نے ذرا ناک چڑا کر بولا۔

پرندے معصوم ہوتے ہے" افضل نے کہا۔ Cute ڈیڈی وہ اچھے لگتے ہیں ان کی دیکھ بھال کرنا اچھا لگتا ہے۔

"بیگم تمہارا یہ بیٹا آگے پڑھائی کم اور چڑیا گھر کھولنے کے موڈ میں لگتا ہے" طلال نے مریم سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی آپ کا بیٹا ہے آپ ہی جانیں میری تو ایک نہیں سنتے عاطف اس دفعہ آپ کے ساتھ پولیٹیکل کیمپین کرنے کی سوچ رہا ہے۔" مریم نے عاطف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

طلال نے سنا تو اس کو تعجب ہوا اس نے عاطف سے پوچھا" کیوں بھئی تمہیں سیاست میں انٹرسٹ ہوگیا کیا۔"

"جی ابو میں سوچ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ تھوڑی سی ہیلپ کروں۔" عاطف نے کہا۔

"تم ابھی پڑھائی کی طرف توجہ دو ان کاموں میں ابھی نہ پڑو تعلیم مکمل کرو پھر سوچیں گے اس بارے میں۔" طلال کا لہجہ ذرا سخت محسوس ہوا عاطف کو۔

کھانا کھا کر سب فارغ ہو گئے اور طلال کی بات سن کر خاموش بھی پر عاطف کو اپنے باپ کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا طلال نے کبھی عاطف کو کسی بات سے منع نہیں کیا تھا۔

الیکشن کے دن چل رہے تھے اور الیکشن کو ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ ولید کے پہلی بار اتنے بڑے پوسٹر چھپے تھے اور پہلی بار ہی وہ ایم این اے کی کرسی کے لئے الیکشن لڑ رہا تھا۔ ایک طرح سے وہ علاقے میں طلال کا جانشین بنا ہوا تھا اور دوسری طرف طلال کے گیت بھی گا رہا تھا۔ ان پانچ سالوں میں بھی کارکردگی بالکل خراب جا رہی تھی اور اس وجہ سے ولید کے سپورٹر بھی اتنے زیادہ نہیں تھے۔

آج جلسہ تھا اور کافی لائٹوں سے علاقہ روشن کیا ہوا تھا۔ ولید نے تقریر کی بھرپور تیاری کی ہوئی تھی اور ملک طلال مہمان خصوصی کے طور پر آیا تھا میڈیا والے صبح سے ملک طلال اور ولید کے جلسے کی ٹرانسمیشن دکھا رہے تھے۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے جلسہ میں بہت رونق لگی ہوئی تھی پہلے کی نسبت عوام کافی کم تھی مگر تھی کچھ لوگ پیسے دے کر منگوائے گے تھے۔ جلسہ شروع ہوا اسٹیج پر ملک طلال اور ولید کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ملک طلال نے فون نکالا ایک نمبر ڈائل کیا اور کان کو لگایا اُدھر کوئی بول رہا تھا طلال نے فون پر کہا۔" کام بہترین طریقے سے ہونا چاہئے" کہہ کر فون بند کر دیا۔

ولید نے دیکھا تو پوچھا۔" ملک صاحب خیریت ہے نہ"

"ہاں سب خیریت ہے تم فکر نہ کرو۔" طلال نے کہا۔

ولید کو عجیب سا لگا پر وہ خاموش ہوگیا" کیا محسوس کر رہے ہو آج اپنے آپ کو اس جگہ دیکھ کر۔" طلال نے ولید

سے پوچھا۔
"جی آپ کا ہی ہے ملک صاحب آپ کی دعائیں ہیں کہ آپ نے اپنے ملازم کو اس لائق سمجھا۔" ولید نے کہا۔
"تم ہمارا سرمایہ ہو ولید اور ہمیشہ یاد رکھنا ہمیں" طلال نے ولید کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔
اتنے میں ولید کو اسٹیج پر تقریر کرنے کو بلایا گیا اور ولید اپنی کرسی پر سے اٹھ کر ڈیسک پر چلا گیا یہ اس الیکشن کا سب سے بڑا جلسہ تھا اور کافی رونق تھی ولید کے سپورٹر کبھی ولید کے لئے نعرہ لگاتے اور کبھی طلال کے لئے ولید ڈیسک پر گیا اور اس نے مائک سیدھا کیا اور ڈیسک پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی تقریر شروع کی۔
ولید اپنی تقریر کر رہا تھا اور اس کی تقریر کرنے کے دوران کبھی نعروں کی آواز گونجتی اور تو کبھی خاموشی چھا جاتی ولید تقریر کر رہا تھا کہ ایک زوردار گولی چلنے کی آواز آئی اور سارا جلسہ عجیب و غریب شکل اختیار کر گیا سب ادھر اُدھر بھاگنے لگ گے بالکل پچھلی بار کی طرح جیسے طلال کی دفعہ ہوا تھا اسٹیج سے طلال اُٹھا اور اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا کہ اس کے قدم رکے اور ڈیسک کے پاس پڑی ولید کی لاش کو دیکھا اور آگے نکل گیا۔ ولید کو دل پر گولی لگی تھی اور موقع پر ہی دم نکل گیا۔
ولید کو اسپتال کے لئے لے جایا جا رہا تھا اور میڈیا والوں کا گروپ ولید کی لاش کی کوریج کر رہا تھا گولی کیسے چلی اور کہاں سے چلی میڈیا والے اور پولیس والے دونوں ہی جاننے میں ناکام جا رہے تھے۔
پچھلی بار کی طرح اس بار بھی الیکشن طلال جیت گیا اور ولید کا سوگ بھی منایا گیا۔ عاطف تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن چلا گیا افضل ابھی ادھر ہی پڑھ رہا تھا اور دو سال تک اس نے بھی باہر جانا تھا۔ مریم اپنے ہی کاموں میں مصروف رہتی تھی اس کو کسی کام کا پتہ نہیں تھا سیاست سے وہ ویسے ہی سخت نفرت کرتی تھی اس کو بس فیشن اور اپنی بوتیک کی فکر رہتی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ طلال سیاست میں زیادہ مضبوط ہو گیا تھا اپنی کرپشن کے باوجود کامیاب جا رہا تھا اور امجد عوام کا خیر خواہ ہونے کے باوجود ہار رہا تھا۔
چوہدری امجد اپنی جھولتی کرسی پر بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا کہ اس کا دوست زبیر اس کے پاس موجود تھا۔
"چوہدری صاحب ملک کو ہرانا مشکل کام ہے دیکھتے نہیں کس طرح وہ الیکشن جیتتے جا رہا ہے اور اس نے اپنی سیاست کی خاطر انسان کی جان کو جان ہی نہیں سمجھا۔" زبیر نے کہا۔
"وہ کسی کی جان کا نہیں اپنی جان کا نقصان کر رہا ہے وہ اپنی سلطنت کو بچانے کے لئے اپنے ہی پیادے مار رہا ہے ایک دن سلطنت ہوگی اور وہ ہوگا اور خود ہی شکار بن جائے گا" چوہدری امجد نے اپنی مونچھوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
عاطف نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اور اب وہ اپنے والد کا کاروبار سنبھال رہا تھا۔ کاروبار میں بھی عاطف طلال کی طرح کام کر رہا تھا۔ وقت آگے کی طرف دوڑ رہا تھا افضل بھی تعلیم مکمل کرنے کے قریب تھا اور مریم پہلے سے اب تھوڑا سادہ ہو چکی تھی پر ان کا بولنا آج بھی ویسا ہی تھا۔
گھر میں عاطف کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھی شادی بھی عاطف کی پسند کی ہو رہی تھی اور عاطف بھی خوش تھا گھر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ طلال کے سر کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو چکے تھے شلوار قمیص پر ویسٹ کوٹ پہنے کافی با رعب لگ رہا تھا اور اس کے مزاج میں کافی تبدیلی آ چکی تھی اب پہلے کے مقابلے اس کے مزاج میں شائستگی تھی۔
سیاست میں اس کی پوزیشن کافی اچھی ہو چکی تھی اب وہ ملک کا وفاقی وزیر تھا۔
شادی میں کافی بڑے لوگوں کی آمد تھی میڈیا والے بھی آئے ہوئے تھے اور ادھر چوہدری امجد بھی موجود تھا۔ چوہدری امجد اور طلال کافی اچھے دوست تھے کئی معاملات میں طلال اور امجد ساتھ ہوتے تھے۔
"میں نے سنا ہے عاطف میاں بھی سیاست میں دلچسپی رکھتا ہے مگر طلال جیسا کہاں جی۔
طلال نے تو اپنی جان پر کھیل کر یہ پوزیشن حاصل کی ہے" بیرسٹر نجم بولا۔
"جب خون بھوکا ہو تو بازیاں کھیلنی آجاتی ہے بیرسٹر صاحب" امجد نے آواز میں گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔
"جی چوہدری صاحب مگر آج کل بچے کہاں اس قابل ہیں اور ویسے بھی ملک طلال عاطف کو سیاست سے دور رکھتا ہے اور اس کو سیاست میں لانے کے خلاف بھی ہے"

بیرسٹر نجم نے کہا۔
چوہدری امجد کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھر آئی "اچھا بیرسٹر صاحب ایسا کیوں؟"
"جی آپ کو تو پتہ ہے آج کل کی سیاست میں خون خرابا عام ہو چکا ہے اور اس شعبہ میں راہ چلتے دشمن بن جاتے ہیں" نجم نے کہا۔
"جی نجم صاحب۔" امجد نے کہا اور امجد سٹیج پر بیٹھے دولہا بنے عاطف کو دیکھ رہا تھا اور گہری سوچ میں گم تھا۔
عاطف کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو چکا تھا اور عاطف کے گھر ایک چھوٹا عاطف ہو چکا تھا۔ گھر میں خوشیاں بھری ہوئی تھیں۔ مریم بھی اب گھر میں وقت دیتی تھی اور گھر کے ہر کام میں دلچسپی لیتی تھی۔ الیکشن قریب تھے اور ملک طلال کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ اقتدار کے نشے میں طلال ڈوبا ہوا تھا اور اس نشے میں اکیلے جھومنے کا اس کو لطف آ رہا تھا وہ اس میں کسی کو شریک کرنا شاید اپنی توہین سمجھتا تھا۔ جیسے ہی الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو گھر میں عاطف نے بھی ریسرچ شروع کر دی وہ سیاست میں نہیں آیا تھا کیونکہ اس کے والد طلال کی مرضی نہیں تھی پر وہ اپنے باپ کی طرح ضدی تھا حکمرانی کرنے کا شوق وراثت میں لے کر آیا تھا۔
رات کے گیارہ بج رہے تھے اور طلال لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا آج وہ جلدی گھر آ گیا تھا اور عاطف اس ٹائم اکثر گھر ہوتا تھا اس نے آج موقع پا کر اپنے باپ سے بات کرنا چاہی اتنے میں مصروف شیڈول میں اس گھر میں کسی کو کسی کے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں تھا مگر عاطف کے دل میں جو بات تھی وہ اسے تنگ کر رہی تھی۔ عاطف لاؤنج میں پہنچا تو اس وقت طلال موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا اور اس نے عاطف کو دیکھ موبائل بند کر دیا۔
" آؤ عاطف بیٹا بیٹھو" طلال نے پیار سے مسکراتے ہوئے کہا۔
"جی ڈیڈی" عاطف بیٹھ گیا۔
"اور سناؤ کاروبار میں کوئی تنگی تو نہیں آ رہی نا؟" طلال نے عاطف سے پوچھا۔
"جی ڈیڈی آپ سے کوئی بات کرنی تھی" عاطف نے کہا۔
"ہاں بولو۔" طلال نے موبائل ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔
ڈیڈی میں سیاست میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں" عاطف نے کہا۔ طلال نے سنا تو اس کے ماتھے سے بل غائب ہو گئے وہ ذرا سیدھا ہو گیا۔
"دیکھیے ڈیڈی آپ کے زیر سائے مجھے تنگی بھی نہیں ہو گی اور مجھے شوق بھی ہے آپ جانتے ہیں۔" عاطف نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
" دیکھو بیٹا ابھی تم کاروبار کی طرف توجہ دو، یہ کوئی آسان نہیں میں تمہاری جان کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا اور تمہیں پتہ تو ہے میرے پیچھے ہر وقت دشمن لگے ہوئے ہیں" طلال نے کہا۔
" پر ڈیڈی میں آپ کے ساتھ رہوں گا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں اور جہاں تک کاروبار کی بات ہے اس کی فکر مت کریں وہ میں مینج کر لوں گا" عاطف احتجاج کر رہا تھا کہ طلال کسی طرح مان جائے۔
" دیکھو بیٹا تم ابھی سیاست کی طرف توجہ نہ دو تو بہتر رہے گا یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں اور میڈیا والے ہر وقت گلے کا پھندہ بنے رہتے ہے تمہاری ابھی عمر نہیں کہ تم ابھی سیاست کرو جب وقت آئے گا میں تمہیں خود کہہ دوں گا" طلال اُٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔
مگر عاطف وہیں بیٹھا رہا اس کے اندر غصہ بن رہا تھا اور اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی وہ سوچ میں پڑ گیا پتہ نہیں شروع سے ہی ابو مجھے سیاست سے پیچھے رکھتے ہیں شاید وہ مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتے مگر کیوں کافی دیر وہ اسی سوچ میں گم رہا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔
پورا گراؤنڈ سجا ہوا تھا ہر بار کی طرح اس بار بھی ملک طلال کے پوسٹر ہر جگہ لگے ہوئے تھے طلال سیاسی طور پر بہت مضبوط ہو چکا تھا۔ نعروں کی گونج تھی اور لوگوں کا سمندر اکٹھا تھا اس دفعہ پیسہ پانی کی طرح بہایا ہوا تھا۔ طلال کی گاڑی پورے پروٹوکول کے ساتھ علاقے مین داخل ہوئی سیکیورٹی بہت تھی سخت کہ پرندہ بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ طلال گاڑی سے باہر نکلا تو لوگوں کا طوفان طلال کی طرف بڑھا طلال اس دفعہ کے جلسے کو دیکھ کر بہت خوش

تھا اُس کی آنکھوں میں چمک تھی کیونکہ اس دفعہ کا جلسہ پہلے کے مقابلے بہت اعلیٰ تھا یہ جلسہ شاید طلال کی زندگی کی محنت کا نچوڑ بھی تھا۔

افضل آج بہت خوش تھا اس کا اسپتال میں پہلا دن تھا اور اس کا بچپن کا خواب آج پورا ہوگیا تھا اس کی آج پہلے دن ہونے کی وجہ سے صرف ٹریننگ تھی اور وہ سینئرز ڈاکٹرز کے اردگرد گھوم رہا تھا کبھی کسی مریض کبھی کسی مریض کو دیکھتا کبھی تیمارداروں سے بات کرتا اس کو لوگوں کی خدمت کرنے میں بہت سکون ملتا تھا۔

طلال اسٹیج کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک جلسے میں کچھ نا معلوم افراد کی فائرنگ شروع ہوگئی لوگ بھاگنا شروع ہو گئے کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کچھ دیر بعد فائرنگ رکی تو کہیں بھی میں کسی کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا دو سیکیورٹی گارڈز موقع پر ہلاک ہو گئے اور باقی سیکیورٹی گارڈز طلال کو اُٹھائے ایمبولینس میں رکھ رہے تھے۔

افضل ایک مریض کی فائل دیکھنے میں مصروف تھا کہ اچانک اسپتال میں کھلبلی مچ گئی میڈیا والوں نے ہاسپٹل کے باہر رش لگا دیا تھا۔ افضل کو جلدی ایمرجنسی روم میں بلایا گیا۔ افضل بھاگتا ہوا ایمرجنسی روم میں پہنچا تو وہ دیکھ کر حیران رہ گیا اس کو چکر آنا شروع ہو گے وہ آنکھیں پھاڑ کر طلال کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد مریم اور عاطف اسپتال پہنچ گے افضل باہر ہی بیٹھا تھا مریم بے چینی میں تھی۔

" بیٹا کیسے ہیں تمہارے ڈیڈی ؟" مریم کی سانس پھول رہی تھی۔

افضل کی آنکھیں لال ہوگئی تھیں اور آواز ختم ہو چکی تھی

" بولتے کیوں نہیں کیسے ہیں طلال؟" مریم نے دوبارہ پوچھا۔

" وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے امی وہ انتقال کر گئے ہیں" افضل نے بھیگی آنکھوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مریم ایک دم زمین پر گر گئی عاطف اور افضل اپنی ماں کو سنبھالتے ہوئے نیچے بیٹھ گے عاطف کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ کتنی ہی دیر وہ اس حالت میں وہاں بیٹھے رہے۔

طلال کے حادثے کو سات دن گزر چکے تھے۔ ریسٹورنٹ میں اے سی کی ٹھنڈک اور ہلکا ہلکا گانا چل رہا تھا۔

ویٹر ٹیبل پر دو کپ چائے رکھ کر چلا گیا۔ عاطف چوہدری امجد سے۔" کتنے چمچ شوگر لیں گے چوہدری صاحب"

ایک چمچ بیٹا۔" امجد نے کہا۔

عاطف نے ایک کپ امجد کے آگے کیا اور ایک کپ اپنے سامنے رکھتے ہوئے اس میں شوگر مکس کرنے لگ گیا۔

" دیکھیے چوہدری صاحب آگے جلسہ ہے آپ اور ہم مل کر کام کریں گے آپ کو بھی فائدہ ہوگا اور ہمیں بھی میں لڑائیوں سے سخت نفرت کرتا ہوں اور آپ کے ساتھ پارٹی کو چلانے میں خوشی ہوگی" عاطف نے چائے کی سپ لی۔

" بیٹا جی ہم کہاں جا رہے ہے اب شطرنج کے دونوں طرف ہم ہی ہیں اب چال اپنی مرضی سے ہی چلیں گے چاہے اُس طرف سے چلیں یا اِس طرف سے۔ امجد نے کہا۔

" جو غلطیاں ڈیڈی جی نے کی تھیں میں چاہتا ہوں وہ غلطیاں اور بیوقوفیاں ہم نہ کریں" عاطف نے کہا۔

" جی بیٹا جی۔" امجد نے چائے کی سپ لی اور عاطف کو سیاست کے قصے سنانے لگ گیا اور خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے۔ ریسٹورنٹ میں ایک ٹی وی تھا اور اس پر ملک عاطف کی تصویر اور اگلے جلسے کی تیاریوں کی خبر شائع ہو رہی تھی۔



فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گے

پہلی چوری	عالیہ توصیف
میں ٹوٹ کر رو یا ہوں	نورین مسکان سرور
پاداش	حمیرا افضا
میری جنت	سحرش علی نقوی
پھر حوصلہ ٹوٹا پھر میدان سجا	فرحین ناز طارق
کوکھ	عابدہ احمد عابی
خوش نما	عمارہ جے ملک

پہلی چوری

عالیہ توصیف

''آ گئے آج پھرنا کام ونامراد خاک چھان چھان کے۔''

ہمیشہ کی طرح آج پھر دروازے سے داخل ہوتے ہی اس کی ماں کی کسیلی آواز اس کے کانوں میں زہر بن کر اتری جسے وہ بھی ہمیشہ کی طرح نظرانداز کرتا صحن کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''کیا پکا ہے آج؟''

''میرا کلیجہ...آ کھا لے۔''

اس سے پہلے کہ اس کی بہن اسے کچھ بتاتی اس کی ماں نے جھاڑو لگاتے ہوئے تلخی سے جواب دیا۔

''ایک تو سمجھ نہیں آتی میں گھر کیوں آجاتا ہوں کیا کروں چوری کروں ڈاکہ ڈالوں کیا کروں۔

''کیا کروں میں جا کر اپنا پیٹ دکھاؤں کہ میں بھوکا ہوں نہیں ملتی نوکری تو میں کیا کروں صبح سے شام ہو جاتی ہے مجھے، سارا دن پیدل ہی سفر طے کرتے، تھکا ہارا گھر لوٹوں تو یہ سب بھی سنوں۔''

اب کی بار اس نے بھی اپنے دل کی تمام بھڑاس نکال دی۔

''تو کرتا ہے سفر؟ تو بھی اپنے باپ کی طرح۔''

'بس کر بس کر جو میرا باپ ہے وہ تیرا بھی کچھ لگتا ہے سارا دن تو تھکتی نہیں ہے اسے کوسنے دے دے کہ ویسے بھی کون سا اس نے میرا کمایا گھر پہ لگنے دینا ہے؟''

اپنی ماں کے منہ سے وہ روز ہی دن میں ایک دفعہ ایسی باتیں سنتا تھا، جب غربت، محرومی اور بے بسی اپنے پَر پھیلائے کھڑی ہو تو لہجوں میں تلخی اور رشتوں میں دوری اپنے آپ ہی پیدا ہو جاتی ہے۔

''جسے تو گھر کہتا ہے یہاں تو بھی اپنے باپ کی طرح صرف روٹیاں ہی۔''

''جہنم میں جاؤتم سب میں ہی کودمرتا ہوں۔''

کلیم اپنی ماں کی جلی کٹی سننے سے پہلے ہی بولتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

''اسے کچھ کھا تو لینے دیتی تو بھی اماں! پھر اسے ہی طعنے دیتی ہے اس میں اس بے چارے کا کیا قصور آج پھر بھوکا ہی چلا گیا ہے۔''

نیلم نے اپنی ماں کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے اس کے سخت رویہ کا احساس دلایا۔

''اب رو کیوں رہی ہے کھانا کھالے۔''

نیلم نے بے بسی سے اپنی ماں کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے ویسے بھی میں نے کھالیا تھا تو ایسا کر یہ اس کیلئے رکھ دے جب آئے تو اسے دے دینا وہ اپنی ممتا سے مجبور بیٹے کے درد کو محسوس کر کے بولی وہ بھی کیا کرے۔''

جہاں قطرہ قطرہ زندگی سسکتی ہو وہاں یہ چڑ چڑا پن عام سی بات ہے۔

''کیا کروں میں کہاں جاؤں کس سے فریاد کروں؟ پڑھا لکھا ہوں نہیں کہ کوئی اچھی نوکری ملے چھوٹی موٹی ملنے کا نام نہیں دے رہی اوپر سے گھر کا کرایہ اور پھر قرضہ! کیسے ادا ہو گا سب؟''

چلتے چلتے تھکن سے چور ہو کے سڑک کے کنارے بیٹھے وہ اپنے مسائل کو ایسے سوچ رہا تھا کہ جیسے یہ مسائل اسکے یہاں بیٹھے سوچنے سے ایک لمحے ہی میں حل ہو جائیں گے۔

''چوری کروں ڈاکہ ڈالوں۔''

اس کے دماغ میں اپنے کہے ہوئے جملے ہی گردش کرنے لگے۔

''چوری......ہاں چوری......''

اس کے دماغ نے بار بار یہ بات دہرائی۔

جب کوئی راہ نہیں دکھائی دے رہی ہو اور مسائل کا عفریب منہ کھولے کھڑا ہو محرومیوں کا گھپ اندھیرا ہو، کوئی ہاتھ مددگار ثابت نہ ہو تو پھر برائی جنم لیتی ہے، مفلسی برائیوں اور گناہ کو پیدا کرتی ہے کہ غربت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے جو معاشرے میں بے اطمینانی اور نفسا نفسی کا باعث بنتی ہے۔

''چوری ہاں چوری ہاں ہاں چوری میں بھی اب ایسا ہی کروں گا جب کسی کو میرا احساس نہیں تو پھر میں کیوں؟ کسی کا کروں؟ کیوں''

اس نے اپنے دل میں سوچا اور اٹھ کر چل پڑا۔

وہ عورت تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے برقع میں جیسے کچھ چھپاتی تقریباً بھاگتی ہوئی چل رہی تھی جب کلیم اس کا پرس کمال مہارت سے چھین کر بھاگ کھڑا ہوا بالکل ایسے جیسے وہ بچپن سے چوریاں ہی کرتا آرہا ہو۔

''ہائے میرے مولا ہائے میں کیا کروں مجھ غریب ہی پر تیرے سارے ظلم کیوں ہیں؟ اللہ غارت کرے اس کمینے انسان کا جس نے میرا بٹوہ چھینا اب میں کہاں جاؤں کیا کروں رشیدہ کے پیسے کیسے واپس کرونگی جو میں اس سے لاکھ التجا کرنے کے بعد دس ہزار ادھار مانگ لائی تھی، اور تجھے ۔۔۔ تجھے کہاں چھپاوں؟ تیرا حساب کیسے کروں؟ (مرن جوگی) تو پیدا ہی کیوں ہوئی یہاں؟ ہائے۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی اسے اپنی ماں کی بلند آواز میں آہ بقا سنائی دی جو اپنے نصیبوں اور اپنی بیٹی کو کوس رہی تھی جسے اس کا باپ جوئے میں ہارا تھا اور وہ اپنا نیم مردہ جسم لئے دیوار سے ٹیک لگائے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور مرکزی دروازے پر کھڑا کلیم دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی پہلی چوری تھی!

......☆☆......

میں ٹوٹ کے رویا ہوں

نورین مسکان سرور

''اماں میں کیوں روؤں، کیسی باتیں کرتی ہیں آپ، مرد روتے اچھے نہیں لگتے'' وہ اماں کے گلے میں بانہیں ڈالے محبت پاش لہجے میں بولا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے پتر پر کبھی کبھی رو لینا چاہیئے، خصوصاً دعا مانگتے ہوئے، اپنے گناہوں پہ توبہ کرتے ہوئے ضرور رونا چاہئے۔'' اماں جان اکثر اسے کہتیں تھیں۔ کہ اتنا نہ ہنسا کر، رو لیا کر، بیٹا سجدے کیا کر، اپنی جوانی برباد نہ کر، وہ بھلا کب سنتا تھا۔

ہاں ہم کب سنتے ہیں بوقت سحر، نماز قضا ہو رہی ہوتی ہے۔ روتی ہوئی، سسکتی ہوئی، آہیں بھرتی ہوئی اور چیختی ہوئی کہ میں اب کبھی نہیں آؤنگی... میں تیری زادراہ ہوں مجھے ضائع نہ کر، میں برباد ہوگئی تو تیرے پاس کچھ نہیں بچے گا۔

مگر ہم کہاں سنتے ہیں۔

ہم تو ساعتوں سے محروم، بے خبر، غفلت کی نیند سو رہے ہوتے ہیں۔

سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور نماز فجر چلی جاتی ہے۔ ہماری بربادی پہ ماتم کناں سی اور اور پتہ ہے۔ گردوں وقت ہر گھڑی وقت گھٹاتے ہی چلے جاتے ہیں۔

انہیں کیا کہ ہم آگے نکل گئے یا پیچھے رہ گئے، انہیں کیا کہ ہم نے اپنی نمازیں پوری کرلیں یا غاصب بن گئے۔ اپنے اللہ کا حق کھا گئے۔ انکا کام تو وقت کی رفتار بڑھانا ہے۔ اور وہ پوری رفتار سے بڑھتا ہے۔ بہت تیزی سے، انسان ابھی جوان ہے اور اس کی عمر کی ساٹھویں بہار شروع ہو جاتی ہے۔ یہ وقت کی تیز رفتاری ہے ورنہ انسان تو ابھی اپنی عمر کی پہلی سیڑھی کراس کر کے دوسری تک پہنچا ہے کہ وقت اجل سر پہ کھڑا ہوتا ہے۔ آہ..........

عبادت گزار اماں جان تہجد کی نماز میں سجدے میں پڑی بہت دیر تک روتی تھیں۔ جانے کیوں روتی تھیں، کیا مانگتی تھیں، پتہ نہیں انکا ایسا کیا گم ہو گیا تھا۔ جو وہ سجدوں میں گریہ التجائیں کرتی تھیں

"ٹھیک ہے، اماں جان کل جگا دینا میں نماز پڑھنے جاؤں گا۔" وہ چادر تان کر لیٹ گیا۔ اماں کھڑی رہیں، نہ پلٹیں، نہ بیٹھیں، چادر میں لپٹا وجود ساکت رہا۔

"کل کی کسے خبر بیٹا...... اور کل کے ارادے کرنے والے کبھی کچھ نہیں کر سکتے، ہمیشہ آج فائدہ دیتا ہے، ابھی، اسی وقت، کیونکہ ہمارے پاس تو بس آج ہے، کل کی کسے خبر آئے یا نہ آئے، کل کا سورج طلوع ہو کہ نہ ہو......"۔ اماں ٹھہرے لہجے میں بول رہی تھیں۔ ان کا اکلوتا بیٹا، ان کی جاگیر، سرمایۂ حیات اور کل کائنات، وہی تو تھا سب کچھ، وہی غافل ہو جاتا تو کیا جواب رہتا ان کے پاس بھلا وقت حساب، وہ ساکت رہا اماں واپس پلٹ آئیں۔ وہ کہہ سکتی تھیں، سمجھا سکتیں تھیں، زور زبردستی نہیں، اسلام میں جبر نہیں، یہ تو سمجھنے کا دین ہے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، مگر محنت، جستجو تو ہم پر فرض ہے ناں۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں اماں جان" انہیں پلٹتے دیکھ کر وہ نماز میں سستی کرنے والا فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

اماں کی باتیں سنتا تو دل چاہتا اماں بولتی رہیں اور وہ سنتا رہے

"میرا اللہ بلائے اور میں نہ جاؤں وہ کہے آؤ بھلائی کی طرف اور میں اندھیروں میں ڈولتی رہوں۔

وہ کہے آؤ کامیابی کی طرف اور میں پستیوں میں بھٹکتی رہوں"

وہ کہہ کر پلٹ گئیں، اور پھر رک کر اسے دیکھا۔

"جب تو چھوٹا تھا تو بہت شوق سے قرآن پڑھنے جاتا تھا۔ مکمل کر لیا تو پڑھنا چھوڑ دیا۔ پہلے تو میرے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ پھر مسجد جانے لگا اور اب......"۔۔ وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

وہ کہہ سکتا تھا اسے ایک ایک دن یاد تھا۔ سب کچھ مکمل طور پہ، بارش ہوتی تو اماں اس کی فرمائش پر نت نئی ڈشز بناتی تھیں۔ اسکی ہر خواہش پوری کرتیں۔

اسے تو وہ دن بھی یاد تھا جب ابا کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ تب وہ چھ سال کا تھا۔ سب رو رہے تھے، وہ نا سمجھ تھا۔ سب اسے گلے لگاتے تھے، پیار کرتے، اس دن جیسے وہ ساری دنیا کے لیئے اہم ہو گیا۔ سب کی نظروں سے وہ خائف نہیں ہوا تھا بلکہ اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ اسے کیا خبر بھلا کہ وہ نظریں ترحم کی پوشاک میں لپٹیں ہوئیں تھیں۔ وہ یتیم ہو گیا تھا۔ رشتوں ناتوں اور جدائی کے درد سے بے خبر وہ بے پناہ خوش تھا۔ مگر لوگ کیوں رو رہے تھے اسکی اماں جان کی آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ رہے تھے۔

آج بھی اس کی اماں جان واویلا نہیں کر رہیں تھیں اور سب سے انوکھا کام جو اس نے اپنی ماں کو کرتے دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ لوگوں کو روتا چھوڑ کر وہ باوضو ہو کے ایک طرف مصلّٰی بچھائے نماز میں مشغول تھیں۔

پھر بھی اسے ابا نظر نہیں آئے وقت کی چالاکیوں نے اسے سمجھا دیا کہ ابا دنیا سے چلے گئے ہیں۔

وہ سارے دن انگلیوں پہ گن کے بتا سکتا تھا۔ اسکی اماں شفیق، ملنسار، باعمل نیک اور خدا ترس خاتون تھیں۔

جب اس کا ایکسیڈینٹ ہوا تو اماں اس کو زخمی حالت میں بے بس پا کر اس کے منہ میں لقمے دیتے ہوئے۔ خاموشی سے رو رہی تھیں، کوئی واویلا نہیں تھا۔ کسی انجان کے لیئے کوسنے نہیں تھے۔

"آپ پریشان مت ہوں اماں جان، جس لڑکے کی بائیک سے ایکسیڈینٹ ہوا تھا اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

وہ انگشت بدنداں سی اسے دیکھے گئیں۔ اچانک آنسوؤں تھم گیے۔

"تو اسے گرفتار کروا آیا......؟؟" تحیر تھا، شکوہ تھا۔

"کسی بے کس ماں کے بیٹے کو تو نے تھانے بھیج دیا...... میرا بیٹا ایسا کیسے کر سکتا ہے" وہ بے یقین تھیں۔

ہاتھ میں پکڑا لقمہ وہیں چھوڑ دیا اور چپ چاپ بنا کچھ بتائے چادر سر پہ لیئے گھر سے نکل گئیں۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد واپس آئیں۔

"ہم انسان بہت خود غرض ہوتے ہیں۔

بھلا کیسے عفو کر سکتے ہیں ہم......؟ بھلا کیسے......؟" لہجہ تاسف سا تاسف تھا۔

ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا وہ اس لڑکے کو رہا کروا کے آ رہی تھیں۔

"ہم انسان ایک معمولی سی غلطی کو بمشکل معاف کرتے ہیں۔ جرم یا گناہ کو معاف کرنا تو بڑی دور کی بات ہے۔ اور میرا بیٹا ایک غلطی پر کسی معصوم کو جیل بھیجنے چل دیا۔" وہ حیرت زدہ سی بولیں۔

"کوئی شخص قتل کر کے کہے میں نادم ہوں، شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دیں، ہم انسان معاف نہیں کرتے مگر میرا اللہ صرف

ایک سچی توبہ پر معاف کر دیتا ہے۔ بھلا میرے اللہ سے رحیم کون ہو سکتا ہے۔اس کی صفات اپنایا کرو بیٹا"
اس کی اماں کو کوئی وکیل ہونا چاہیئے تھا، یا عالمہ...... وہ نہ انجینئر، نہ ڈاکٹر اور نہ کوئی آفیسر بننا چاہتا تھا بلکہ وہ صرف اپنی ماں کے جیسا بننا چاہتا تھا۔
اس دن وہ رویا تھا۔اور ٹوٹ کر رو دیا تھا۔
"مرد نہیں روتے اماں جان سمجھا کریں ناں" وہ ہمیشہ کہتا۔
"مرد اللہ کے آگے روتے ہیں۔ اچھے بھی لگتے ہیں......اور پیارے بھی لگتے ہیں۔ بہادر اور نڈر بھی کیونکہ وہ سب سے بڑی طاقت کے آگے آنسو بہا رہے ہوتے ہیں۔ بیکار کی مردانگی ہے اس مرد کی جو اپنی مردانگی کے زعم میں اپنی مردانگی کے نشے میں اپنے اللہ کے سامنے بھی ناں جھکے۔" اماں رسان سے سمجھاتیں۔وہ رونے کی کوشش کرتا مگر رونا بھی نہیں آتا تھا۔
مگر آج...... جسے کبھی رونا نہیں آتا تھا۔وہ ٹوٹ کے رو دیا تھا۔
وہ آج بے بس ہو گیا تھا۔ کھوکھلا۔ بنجر اور ویران ہو گیا تھا۔ خاردار سے پر راہوں میں ننگے پاؤں، تپتے سورج تلے، بے سائبان ......اور کہاں سے لاتا بھلا سائبان......
اب اماں جان نہیں رہی تھیں۔ اسے بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ گئیں۔
"آج آپ دیکھیں میں ٹوٹ کے رویا ہوں۔ بس ایک بار دیکھیں تو سہی۔
آج آپ کا بیٹا کس قدر رو رہا ہے اماں جان"
آج بھی لوگوں کا مجمع تھا۔ آج بھی سب رو رہے تھے۔ اسے سنبھال رہے تھے۔ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر آج وہ ان نظروں کے مفہوم سے آگاہ ہو گیا تھا۔ جو نظریں کبھی اسے خوش کر رہی تھیں آج وہی اس کا کلیجہ کاٹ رہی تھیں۔
اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا جب صحن میں اسے کوئی سجدہ ریز نظر ناں آیا، جب کوئی مصلیٰ بچھا ہوا نظر نہ آیا۔
کیا اماں جان کے لیئے اللہ سے رو کر مانگنے والا کوئی نہیں رہا۔" ہاں اتنے لوگوں میں کوئی کیوں ہوتا، بیٹا تو وہ تھا۔ لوگ تو نہیں تھے ناں۔
جب وہ نہیں تو کوئی کیوں......
وہ مسجد چلا آیا با وضو ہو کر سجدے میں گر گیا۔ اس کا دل چاہا وہ گھر بھاگ جائے، اس کی دنیا ویران ہو گئی۔
وہ اس پرنور چہرے کو اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتا تھا۔
"دیکھ اللہ میں ٹوٹ کے رویا ہوں۔ میری ماں تیری امانت تھی تو نے لے لیا۔ مجھے گلہ نہیں۔ بس میری دعا ہے اللہ کہ میری اماں جان مجھ سے راضی ہو جا، مجھے میری ماں کو معاف کر دے آمین!" وہ بلک بلک کر رو دیا۔ اسے سکون آنے لگا۔
"میرا اللہ بلائے اور میں نہ جاؤں۔" کتنا پیارا جملہ، کتنا شیریں لہجہ، کتنی شدتیں، کتنا پیار تھا اماں کو اپنے اللہ سے۔۔
برسوں پہلے اماں یہ جملہ بولا کرتی تھیں۔ اور آج وہ ہر نماز سے پہلے کہتا تھا۔ آج وہ تہجد میں اٹھ کے روتا تھا۔ اس کے آنسو سنبھلتے ہی ناں تھے۔ عظیم ماں کا بیٹا تھا۔

......☆☆......

پاداش

حمیرا فضا

وہ جس کمرے میں بڑے وقار اور چاؤ سے دلہن بن کر آئی تھی اُس کی عزت کا جنازہ بھی اُسی کمرے سے اُٹھا تھا۔ وہ اُس دھان پان سی عورت کو اُس کے لمبے گھنے بالوں سے پکڑ کر کمرے سے گھسیٹتا ہوا سیڑھیوں تک لایا۔ وہ اُسے جانوروں کی طرح گھسیٹتا گیا مگر وہ کچھ نہ بولی۔
نہ روئی......نہ چلائی...... نہ رحم کی اپیل کی۔ اُس کا جسم جتنا کمزور تھا اُس کا حوصلہ اتنا ہی مضبوط۔ رسوائی کی اس گھڑی نے اُسے موت کے سکوت سے پہلے ہی گونگا کر دیا تھا۔ بیس سیڑھیوں کی مار کٹائی نے اس کے فقط کپڑوں کو ہی

نہیں بدن کی بوٹیوں کو بھی جگہ جگہ سے اُدھیڑ ڈالا تھا۔
اُس گھر کے لوگوں سمیت اُس گھر کا نقشہ بھی اِستعجاب کا مارا تھا۔لوگ یوں تھے کہ دماغوں کے بھیتر چھپے ہوئے کئی شاطر دماغ، کمرے ایسے کہ کمروں کے اندر منہ پھاڑتے ہوئے کئی ہولناک کمرے۔سیڑھیوں کے بائیں جانب اُس کی اماں کا کمرہ تھا، بیچوں بیچ سانس لیتا ہوا منجھلے بھائی کا کمرہ پھر چھوٹے بھائی کا کمرہ پھر بڑی آپا اور پھر چھوٹی بہن کا کمرہ، ایک دوجے سے بغل گیر ہوتے کمرے، مگر ایک دوجے سے قطعی انجان لوگ۔وہ اُسے باری باری سب کمروں سے گھسیٹتا جارہا تھا تاکہ تذلیل کی ڈولی دھوم دھام سے اُٹھے۔سب محاصرین تھے......تماش بین تھے......مگر کسی میں مزاحمت کرنے کی ہمت نہ تھی۔شہباز خان کی دھاک کے آگے وہ سب اندھی گونگی کٹھ پتلیاں ہی تو تھے۔
''اماں کچھ کر......خدا کا واسطہ کچھ کر......ماں کہتی ہے وہ تجھے......اِتنی کٹھور نہ بن۔'' رضیہ نے بوڑھے کانوں میں منت سماجت سے لرزتی ہوئی سرگوشی کی۔
''اُسے روکنا اور تباہی کو دعوت دینا ہے۔تیرے بھائی کے دل کو بے رحمی کے پتھروں نے ڈھانپ لیا ہے اور اُس کے احساس کو امارت کا زعم کھا چکا ہے۔اِس سنگدل سے اَب رحم کی کوئی اُمید نہیں رضیہ اور نہ اِس خونخوار چٹان سے ٹکرانے کی سکت اِن بوڑھی ہڈیوں میں ہے۔'' اماں کے جھریوں سے بھرے چہرے پر رنج اور بے بسی کی سیکڑوں لکیریں اُبھریں۔
وسیع صحن کے چاروں اُور گھر کے مکینوں کے علاوہ گھر کے نوکر اور چند قریبی رشتے دار بے زبان پوشاکیں اوڑھے کھڑے تھے۔اُن کے چہروں پر کوئی اچھا بُرا تاثر نہ تھا۔کچھ لمحوں بعد والا منظر اُن کے لیے ایک دردناک فلم تھی جس کو دیکھنے کے لیے وہ مشتاق نہیں......مجبور تھے۔
اُس گھر کا سفاک اصول تھا کہ وہاں محبتیں لپیٹ کے کی جاتیں اور سزائیں برہنہ دی جاتی تھیں۔''مرد شرم کے بار سے سر جھکائے اور عورتیں برداشت کی چادروں سے سر ڈھانپے ہوئے تھیں مگر اُس گھر کی بڑی بہو سرخ اینٹوں کے صحن کے وسط میں بے آبرو کھڑی تھی۔چھلنی جگر کے نیر صبر نے سنبھال لیے تھے اور پھٹی لیروں سے رِستے لہو کو سرخ اینٹوں نے چوس لیا تھا۔
اُس نے سپاٹ آنکھوں سے شہباز خان کو اِک نظر دیکھا۔بھوری آنکھوں کے ساگر میں ندامت یا خوف کا کوئی بھنور نہ تھا۔اِس سرکشی، اِس دلیری پر شہباز نفرت اور غضب سے تلملا اٹھا۔اُس نے پوری طاقت سے لات اُس کے پیٹ پہ دے ماری۔وہ بل کھاتی ہوئی اوندھے منہ سرخ اینٹوں پر جا گری۔پر زباں پہ نہ اُف مچلی......نہ فریاد نے سر اٹھایا......نہ شکووں نے شور ڈالا......نہ پکار نے گلا پھاڑا۔اُس نازک اندام کی شجاعت پر سفید پڑتیں زندہ شکلیں اور بے جان سرخ اینٹیں ہکابکا رہ گئیں۔اِنسانیت کے قتل خانے میں اِنسانیت چپ تھی۔مگر چار کتوں کی متواتر بھوں بھوں نے دہشت زدہ ماحول کی تختی کو مزید بڑھا دیا تھا۔
''اماں روک لے بھائی جان کو رضیہ نے تڑپ کر سینے پہ ہاتھ رکھا۔''
''نہ بول بدبخت۔'' اماں نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔شہباز نے دائیں ہاتھ سے اُس کے گھنیرے بالوں کو دبوچا اور کچھ دیر مٹھی میں مسل کر یوں زور سے کھینچا جیسے کسی پودے کو جڑوں سمیت زمین سے اُکھاڑا جارہا ہو۔اُسے چند قدموں تک اتنی بے رحمی سے گھسیٹا گیا کہ زخمی وجود نے سرخ اینٹوں کو شدت سے گلے لگا کر آخری الوداع کہا۔
''اِس عورت کو پھولوں کی سیج پر رکھا گیا مگر اِس بدکار عورت نے اپنے لیے ذلت کا اِنتخاب کیا، میرا وعدہ ہے تم سب سے اگر اِس گھر اور اِس خاندان کے کسی فرد نے ہمارے اُصولوں سے انحراف کیا اور اِس عورت جیسے گناہ کا مرتکب ہوا تو اُس کی بدکرداری کی داستان اِنہی سُرخ اینٹوں پر لکھی جائے گی۔'' شہباز نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر یوں پاؤں زمین پر مارا کہ پتھر بنے سارے جسم خوف سے کانپنے لگے۔اُس نے پوری قوت سے زمین سے لپٹی ریشماں کو بالوں کے سہارے سے پکڑ کر کھڑا کیا۔کچھ فاصلے پر چار سیاہ جنگلی کتے زبانیں لٹکائے اچھل اچھل کر بھونک رہے تھے۔ان کی زبانوں پر ٹپکتی ہوئی رال اُن کی وحشیانہ بھوک کا اعلان کررہی تھی۔شہباز نے آخری بار ناگواری سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔جو بے تاثر، بے خوف تھیں مگر خاموش زبان میں زور زور سے یہ کہہ رہیں تھیں۔
''شہباز خان مجھے ان کتوں کا نوالہ بننے کا کوئی غم نہیں۔میں خوش ہوں کہ تمہارے ناپاک ہاتھوں سے نہیں

مر رہی۔" وہ جیسے اُن کہے لفظ سمجھ گیا۔نفرت کے شعلے پورے بدن سے پھوٹنے لگے۔

اُس کا وفادار خادم نہ چاہتے ہوئے اس کے حکم کا پابند کھڑا تھا۔اُس نے ہاتھ کی گرفت مظبوط کر کے ڈھیلی کی اور ریشماں کو رعونت سے زمین پر پٹخ کر بلند آواز میں چلایا۔

"کھول دو ان کتوں کے پٹے۔"

"لماں میں یہ ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتی مجھے اندر جانے دے۔" رضیہ نے پھولی ہوئی سانسوں سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گیلی آواز میں التجا کی۔

"منہ بند کر نامرادے......دیکھ......سُن......پر آج محسوس نہ کر......ورنہ تو بھی اِس بدقسمت کی طرح کتوں کی غذا بن جائے گی۔" لماں نے سسکیاں دباتے ہوئے اُسے اچھا تماش بین بننے کا حکم دیا۔

"ایک بے حس گنہگار کو سب سے زیادہ خطرہ اُس شخص سے ہوتا ہے جو اُس کے گناہ کا چشم دید گواہ ہو۔میں جانتی تھی وہ معصوم ہے......پاک ہے......!"

"تو پھر اتنی سفاکی سے انہیں کیوں مارا گیا؟" کہانی کے اس موڑ پر اُس نے آب دیدہ ہو کر پوچھا۔

"کیوں کہ وہ چشم دید گواہ تھی، شہباز بھائی کے گناہ کی گواہ۔"

"کیسا گناہ؟" اُس کی بے چینی اور بڑھی۔

"کبھی کبھی جیون کی ناؤ میں دو بلکل ہی مختلف لوگ سوار ہو جاتے ہیں۔منجھلے بھائی فراز بھولپن نگر کے باسی تھے تو منجھلی بھابھی فرزانہ شاطر کھیلوں کی چسکے باز، بڑے بھائی شہباز کھوٹ ملاوٹ کے رسیا تو بڑی بھابھی ریشماں وفاداری کی پجارن۔ریشماں بھابھی شہباز بھائی پر جان چھڑکتی تھیں۔وہ عشق کی سب عبادتوں میں پوری تھیں تو شہباز بھائی کی محبت میں شراکت کیسے سہن کرتیں۔بس بغاوت پہ اتر آئیں۔مجھے یاد ہے وہ بھاری پل میں پردے کی اوٹ سے سب سن اور دیکھ رہی تھی۔

"بھائی جان فرزانہ اور شہباز ہمیں دھوکہ دے رہے ہیں۔اُن کے کالے کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں میں نے ہمارے اعتماد اور محبت کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے اوپر سے معتبر دکھنے والے اندر سے میلے اِن رشتوں کو ہمیں بے نقاب کرنا چاہیے۔" وہ پلو سے آدھا منہ چھپائے سسک سسک کے بول رہی تھیں اُن کی آواز اور لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ درد اور بدلے کی آگ میں کس قدر جل رہی ہیں۔

یہ کڑوی حقیقت تو مجھ سے بھی نہ نگلی گئی مارے گھن کے مجھے اُبکائی آنے لگی۔ذہن کے ہلکے فراز بھائی بچوں کیطرح بلکنے لگے۔کوئی دماغ سے پاگل ہو یا جسم سے مفلوج، معذور محبت کا درد کہاں جھیل پاتا ہے۔ریشماں بھابھی نے مارے ہمدردی کے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔بس یہی منظر شہباز بھائی نے دیکھ لیا اُپنے جرم کا پردہ رکھنے کے لیے وہ تو کسی بہانے کی تاک میں ہی تھے شاید۔بے گناہ فراز بھائی کو تو موقع پر ہی گولی مار دی اور ریشماں بھابھی کو بدچلن کا لقب دے کر وہ موت دی کہ اُس گھر کی سب روحیں موت کے ڈر سے تڑپ اُٹھیں۔

"آپ نے اُس گھر سے تعلق کیوں توڑ لیا؟ کیا آپ کو کوئی منانے نہیں آیا؟" اُس کے دماغ اور چہرے پہ کئی سوال الجھ رہے تھے۔

"ریشماں بھابھی کے ساتھ ہی بڑے بھائی کے دل میں رشتوں کی محبت اور فرزانہ کے دل میں رشتوں کا احترام پوری طرح سے دم توڑ گئے۔دن رات ریشماں بھابھی کے بیٹے کی فکر مجھے کھانے لگی ہر وقت یہ دھڑکا بےقرار رکھتا کہ کہیں اُس کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہو جائے۔میں پانچ برس سے اپنے شوہر سے ناراض بیٹھی تھی اس ظلم کے بعد جی چاہا کہ خود سے ہی خفا ہو جاؤں۔بس ایک اندھیری رات میں اس کالک زدہ گھر کو چھوڑ آئی اور تجھ جیسے روشن ستارے کو ساتھ لے آئی۔تیری میری ضرورت کسی کو نہ تھی تو نہ کوئی ڈھونڈنے آیا، نہ منانے۔"

"میں......میں......میں کون ہوں؟" وہ اس انکشاف پر بری طرح سے چونکا تھا۔

"ریشماں کا بیٹا شاہ جہاں۔" راز کا بوجھ اُتارتے ہوئے رضیہ کی زبان ایک پل کے لیے لڑکھڑائی۔اُس لمحے شاہ جہاں کے چہرے پر غم، غصے، نفرت اور انتقام کے کئی رنگ لڑ جھگڑ رہے تھے۔

''میں شاید تجھے کبھی نہ بتاتی مگر کچھ دنوں سے جسم کی سرگوشی ہے کہ خاموش ہونے کا وقت قریب ہے تو ضمیر چیخ چیخ کہ کہتا ہے رضیہ اب بول پڑ۔'' وہ سر جھکا کے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

اُس کے ذہن میں بد سے بدترین موت دینے کے منصوبے ناچ رہے تھے۔ وہ سرخ اینٹوں پر اِنصاف کی ہولی کھیلنے آیا تھا۔ مگر جونہی اُس نے اُس گھر کی دہلیز پار کی تو اِینٹوں، دیواروں اور مکینوں کے رونے کی آوازیں اُس کے قدموں سے لپٹ گئیں۔

کوئی مر گیا تھا آج...... جسے آج مرنا تھا...... وہ دیوانہ وار کئی لوگوں سے پوچھتا چلا گیا۔ کئی بلند، کئی مدھم آوازوں نے اُس سے اُس کا اِختیار چھین لیا تھا، اَپنی ماں کا بدلہ لینے کا اِختیار۔ چاروں طرف کہرام کا سماں تھا مگر سُرخ اینٹوں پر فتح کی مسکان تھی، وہ سرخ اینٹیں جن کے سینے میں ایک پرانا وعدہ دفن تھا جو آج پورا ہو چکا تھا، وہ سرخ اینٹیں جو خود پہ اِنصاف کی داستان لکھنا چاہتیں تھیں وہ داستان رقم ہو چکی تھی۔

کہیں ریشماں کے آخری لفظ ہنس رہے تھے۔

''شہباز خان مجھے ان کتوں کا نوالہ بننے کا کوئی غم نہیں، میں خوش ہوں کہ تمہارے ناپاک ہاتھوں سے نہیں مر رہی۔'' تو کہیں رضیہ کے آخری لفظ رو رہے تھے۔

''شاہ جہاں اَپنے ہاتھوں کو اُس سیاہ کار کے لہو سے گندہ مت کرنا، اُس درندے کو کسی کے ناپاک ہاتھوں سے مرنے دے۔''

وہ اَپنی شکست پر دکھ سے بت بنا کھڑا تھا۔ سرخ اینٹوں پر شہباز خان کی میت شان سے رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے خباثت ٹپکاتے مردہ چہرے پر ایک اور بے وفائی چیخ رہی تھی جس کے گلے میں فرزانہ نے زہر اُنڈیلا تھا۔

......☆☆......

میری جنت

سحرش علی نقوی

شدید گرمی کا موسم تھا اور سورج بھی اپنے بھرپور جلوے دکھانے پر تلا ہوا تھا۔ اس تپتی، سلگاتی دھوپ میں وہ تیس سال کا نوجوان اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا بجلی تو حسب معمول تھی نہیں کہ ڈور بیل کو استعمال کیا جا سکتا۔

لوہے کا دروازہ اس قدر تپا ہوا تھا کہ اسے کھٹکھٹانے میں جانے کتنی بار اس کے ہاتھ بری طرح سے جلے تھے۔

''کون ہے؟'' بالآخر کوئی دروازے پر آ کر چلایا تھا۔

''میں ہوں...... کب سے کھڑا ہوں۔'' اس نے اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کا سارا جسم دھوپ کی تپش سے سلگ چکا تھا۔

سندس نے آواز پہچان لی تھی۔ اس نے نجانے کیا کیا بڑبڑاتے ہوئے بے دلی سے گیٹ کھولا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ نوجوان اپنی پرانی موٹر سائیکل کو دروازے سے اندر دھکیلنے لگا تھا۔

''کتنی بار کہا ہے یوں مجھے دھوپ میں نہ تڑپایا کرو آدھا تو راستے میں اس موٹر سائیکل پر جل جاتا ہوں، باقی کا تم دروازہ کھولنے میں تاخیر کر کے بھون دیتی ہو۔'' اس نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے بھی کتنی بار کہا ہے اتنی تپتی دھوپ میں گھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں وہیں دکان پر ہی بیٹھے رہا کرو۔'' وہ بے پروائی سے کہتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

''انسان ہوں میں، بھوک لگتی ہے مجھے بھی، اب کیا دوپہر کا کھانا ہی چھوڑ دوں۔'' وہ بھی اس کی تقلید میں مدھم آواز میں کہتا کمرے میں آیا تھا۔

''ہنہ، میں نے کب منع کیا ہے تمہیں صرف اتنا ہی کہتی ہوں تا کہ دکان کو چھوڑ کر مت آیا کرو، کیا پتہ تمہارے پیچھے دو، چار گاہک آتے ہوں۔'' اسے ہمیشہ کی طرح گاہک کی فکر کھائے جا رہی تھی اسے ہمیشہ اس بات پر اعتراض ہوتا تھا کہ بشیر دکان کو ایک

گھنٹے کے لیے بھی کیوں بند کرتا ہے اس میں بھی کمایا کرے اور اس کو لا کر دیا کرے۔
''اب کم از کم ٹھنڈا پانی تو پلا دو تم تو یہاں چھاؤں میں بیٹھی ہو مگر میں تو سلگتا آیا ہوں۔'' اس نے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے کہا تھا مگر سندس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
''ہاں، ہاں، تم نے تو مجھے یہاں اے سی لگوا کے دیا ہوا ہے نا جس کی ٹھنڈک میں بیٹھی ہوں۔'' وہ پھنکارتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی تھی۔ ان کا گھر بس دو کمروں، ایک کچن اور ایک واش روم پر مشتمل تھا اور اتنا چھوٹا تھا کہ کچن میں جا کر ذرا سا اونچا بولو تو سارے گھر کو سنائی دیتا تھا۔
بشیر اپنا ماتھا مسلنے لگا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی اپنی چھوٹی سی کریانے کی دکان پر جا بیٹھتا تھا جو اس نے ادھار پر لے رکھی تھی۔ سارا دن ایک ہی جگہ بیٹھ، بیٹھ کر اس کی کمر اکڑ جاتی تھی۔ ایک پنکھا جو مر، مرا کر چلتا تھا وہ بھی بجلی نہ ہونے کے باعث دن کا زیادہ تر حصہ بند ہی رہتا تھا۔ سارا دن پسینے سے شرابور ہوتا وہ جو چار پیسے کما کر اپنی بیوی کے ہاتھ میں رکھتا تھا تو بدلے میں محبت یا ستائش کے بجائے طعنے ملا کرتے تھے۔
''یہ لو، پی لو پانی۔'' وہ اس کے آگے پانی کا گلاس بڑھا کر طنزیہ سا بول کر وہیں اس کے سر پر کھڑی تھی۔
''مجھے کھانا دینے کا کوئی موڈ نہیں ہے؟'' اسے یوں ہی اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر بشیر نے پانی کے گھونٹ بھرتے کہا۔
''دے دیتی ہوں کھانا بھاگا نہیں جا رہا کتنی کمائی ہوئی ہے آج؟'' تو غالباً وہ سر پر پیسے لینے کے لیے کھڑی تھی۔
''پہلے مجھے کھانا دے دو کمائی بھی بھاگی نہیں جا رہی۔'' بشیر نے بھی ذرا تپ کر کہا تھا۔
اس نے برا سا منہ بنایا اور پیر پٹختی کچن میں چلی گئی۔ وہاں کھانا گرم کرتے مسلسل کچھ نا کچھ بڑبڑاتی رہی، کوستی رہی (زندگی عذاب ہوگئی ہے میری، اچھے بھلے کھاتے پیتے گھر سے آئی تھی پتہ نہیں کس فقیر کے پلے بندھ گئی، فقیر بھی مانگ مانگ کر اچھا کما لیتے ہوں گے ایک یہ موصوف ہیں جو دکان چھوڑ کر بھاگے چلے آتے ہیں یہ نہیں کہ صبح ٹفن لے جائیں، ہنہ.... باسی کھانا تو گلے میں اٹکتا ہے نا)۔
بشیر اتنی دیر میں ہاتھ منہ دھو آیا تھا وہ شادی کے پانچ سالوں میں اس کی اس بک بک کا کافی حد تک عادی ہوگیا تھا۔ ان دونوں کا ایک چار سال کا بیٹا تھا جو اسکول سے آنے کے بعد سو رہا تھا۔ دوسرا بچہ سندس نہیں چاہتی تھی بقول اس کے پہلے بشیر اسے اور ببلو کو تو پال لے۔
''یہ لو کھاؤ۔'' اس نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ کر بشیر کو اسی بدتمیزی سے مخاطب کیا تھا۔
بشیر نے اسے گھورا تھا مگر کہا کچھ نہیں۔ اس وقت اسے جھگڑا نہیں کرنا تھا اسے جلدی کھا کر واپس دکان پر بھی جانا تھا۔ جھگڑے کے لیے تو شام بھی تھی اور پوری رات سے لے کر اگلی صبح بھی تو تھی ہی۔
''کس دوزخ میں آگئی ہوں۔'' اس کا بڑبڑانا ابھی بھی جاری تھا۔ وہ اچھی خاصی کھاتی پیتی فیملی سے تعلق رکھتی تھی بشیر اس کا ماموں زاد تھا سندس کی ماں نے اپنے بھائی کے پیار میں اپنی ناز نخروں والی بیٹی کی شادی اپنے غریب بھانجے سے کر دی تھی۔ اس وقت تو سندس نے سوچا تھا کہ اپنے اس ایماندار کزن کے کریانے کو چار دن میں ہی چار چاند لگوا دے گی مگر اس کی امیدوں کے برعکس شادی کے بعد بھی بشیر نے ایک بھی چیز میں ملاوٹ نہیں کی تھی۔ نہ وہ سرخ مرچوں میں پسی ہوئی اینٹیں ڈالتا تھا نہ چائے کی پتی میں کالے چنوں کے پسے چھلکے۔
''اس گھر کو دوزخ تم نے بنایا ہے سندس۔ گھر کو جنت بنانا عورت کا کام ہے۔'' بشیر نے روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے سکون سے کہا تھا۔ وہ اس کی ہمیشہ سے یہی عادت تھی وہ کھانا بہت سکون سے کھاتا تھا چاہے اس کا موڈ کتنا ہی کیوں نا خراب ہو۔ اللہ نے جو دیا تھا جتنا دیا تھا اسے وہ خوشگوار طریقے سے شکر ادا کرتا ہوا کھایا کرتا تھا۔
جنت سے اسے اپنی خالہ زاد یاد آئی تھی جو بشیر کی بھی خالہ زاد تھی جنت تو اس کا گھر تھا۔ اسے آج بھی یاد تھا جب وہ تین سال پہلے اس کے گھر گئی تھی تو اس کا عالیشان گھر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں۔ نوکروں کی ریل پیل تھی۔ ہر کمرے میں اے سی تھا اور ساتھ ہی اٹیچ واش روم بھی کیا خوب قسمت چمکی تھی اس کی خالہ زاد کی کہ اس کی شادی ایک کامیاب بزنس مین سے کسی بڑے شہر میں ہوئی تھی۔ وہ تو بس دل مسوس کر رہ گئی تھی۔
''میں سوچ رہی ہوں دو چار دن کے لیے نگین کے ہاں ہو آؤں بڑا عرصہ ہوگیا ہے اس کے گھر گئے ہوئے۔'' شہر دور ہونے کی

وجہ سے وہ اپنی خالہ زاد کے گھر تین سال سے نہیں گئی تھی اب جب جنت کا ذکر آیا تو اس نے سوچا ایک آدھ ہفتہ اس کے گھر میں اے سی کی ٹھنڈک میں گزار آئے، جی بھر کر نت نئے کھانے کھالے اور نوکرانیوں سے اپنے ناز نخرے بھی اٹھوالے نوکرانی تو سندس کی بھی تھی مگر وہ صرف صفائی، ستھرائی کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ مزید کاموں کے لیے مزید پیسے بھی تو درکار تھے جوان کے بجٹ میں نہیں تھے۔ اس نوکرانی کی تنخواہ کے لیے بھی بشیر کو اپنے ذاتی اخراجات میں کمی لانی پڑی تھی تب جا کر وہ سندس کی نوکرانی کی فرمائش پوری کر سکا تھا۔

''ٹھیک ہے اس سے رابطہ کرلو جب جانا ہو مجھے بتانا میں ٹکٹ کٹا دوں گا۔'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے انکار پر جو تماشا ہونا تھا وہ برداشت کرنے کی اس میں فی الحال ہمت نہ تھی۔ گرمی اور تھکاوٹ نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔

اس کی اجازت پا کر اب جا کر سندس کے تنے ہوئے چہرے پر ہلکی مسکان آئی تھی۔

اسٹیشن پر اسے اور ببلو کو لینے کے لیے اس کی خالہ زاد نگین کا خاوند آیا تھا وہ جو کسی بڑی سی گاڑی کی منتظر تھی ٹیکسی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ شاید گاڑی خراب ہوگئی ہوگی اس نے سوچ کر خود کو تسلی دی تھی۔

ٹیکسی تو کسی چھوٹے سے محلے میں جا پہنچی تھی اسے تو یاد تھا کہ تین سال پہلے وہ کسی ایلیٹ کلاس ایریا میں گئی تھی اور آج یہ چھوٹا سا محلہ؟

اس کی آنکھیں حیرت سے مزید پھیلیں جب ٹیکسی کو ایک چھوٹے سے خستہ حال گھر کے سامنے روکا گیا۔

گھر کے اندر داخل ہونے پر وہ اس کی خالہ زاد عام سے لباس میں ملبوس سے اس سے بہت خوش دلی سے ملی تھی۔ مگر ملنے کے فوراً بعد وہ کچن سے ٹھنڈے پانی کا جگ بھر لائی تھی۔ سندس کی تو پیاس ہی بجھ گئی تھی مگر نگین چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنے شوہر کو پانی دے رہی تھی۔

رسمی حال احوال کے بعد اس نے بالآخر نگین سے پوچھ ہی لیا تھا کہ وہ اس عالیشان کوٹھی سے اس گھر میں کیسے آ گئی جس پر نگین نے اسے بتایا کہ کس طرح کاروبار میں انہیں نقصان ہوا اور وہ قرضوں میں ڈوب گئے۔ قرض اتارنے کے لیے گھر، زیورات سب بیچنا پڑا تھا۔

وہ ایک دن سندس کے لیے کس قدر دشوار تھا یہ تو وہی جانتی تھی۔ بجلی تو ہوتی نہ تھی اور یہاں پر یو۔ پی۔ ایس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اس کو یاد تھا کہ بشیر نے ایک، ایک پیسہ جوڑ کر اپنی دوکان پر یو۔ پی۔ ایس نہیں لگوایا تھا مگر گھر میں سندس کے لیے لگوایا تھا۔

وہ نگین کو برتن دھوتے، کھانا پکاتے، بچے سنبھالتے، جھاڑو دیتے دیکھ رہی تھی۔ وہ نگین جس نے کبھی اتنی عیاشیاں دیکھی تھیں کہ پانی بھی ملازمہ ہاتھ میں دے کر جاتی تھی مگر پھر بھی اس کے چہرے پر ایک شکن نہیں آئی تھی۔ شام میں اس کا شوہر اپنی سبزی کی معمولی سی دکان سے چند سو کما کر لایا تھا جسے نگین نے فراخ دلی سے قبول کیا تھا۔

''تم اس گھر میں خوش تو ہو نگین۔'' سارا دن کے بعد رات میں آخر اس نے اپنی خالہ زاد سے پوچھ ہی لیا تھا۔

''اپنی جنت میں کون خوش نہیں ہوتا یہ گھر میری جنت ہے۔'' لہجے اور چہرے پر اطمینان لیے نگین نے جواب دیا۔

وہ اس کے جواب پر ششدر رہ گئی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ واقعی یہ گھر اس کی جنت ہے بھلے ہی اس گھر میں آسائشات نہیں تھیں مگر سکون تھا، نہ میاں بیوی کا جھگڑا، نہ نوک جھوک، نہ کوئی طعنے بازی کچھ تھا تو وہ تھی سادہ سی پرسکون زندگی۔

اگلے ہی روز اس نے واپسی کے لیے سامان باندھ لیا تھا جس پر نگین نے حیرت سے سوال کیا تھا اس کے علم میں تو یہی تھا کہ سندس ہفتہ تو رہے گی ہی کال پر یہی بتایا تھا سندس نے پھر اچانک......

''تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہے تو میں......!'' وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر سندس نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے چہرے پر شفیق مسکراہٹ سے کہا۔

''نہیں نگین، اس گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے میں جا اس لیے رہی ہوں کیونکہ میری جنت میرا انتظار کر رہی ہے۔''

......☆☆......

پھر حوصلہ ٹوٹا پھر میدان سجا

فرحین ناز طارق

''آٹو گراف پلیز''

وہ جس نے زندگی میں سب سے پہلی بار اس سے آٹو گراف مانگا تھا وہ سیٹھ عماد کا دس سالہ بیٹا تھا۔ سیٹھ عماد اس کا ساتھی کھلاڑی ہی نہیں اس کا محسن بھی تھا۔ بچے نے جونہی چھوٹی سی خوبصورت آٹو گراف بک اس کی طرف بڑھائی اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ یہ لمحہ اس کی زندگی بھر کی کمائی تھا۔ جس کی خواہش ہر کھلاڑی کو ہوتی ہے۔ اس نے آٹو گراف بک پہ اپنے سائن کرنے سے پہلے ایک لائن کا اضافہ کیا تھا۔

''خواب ضرور خوب صورت ہوتے ہیں مگر ان کی تعبیر زیادہ خوبصورت ہوتی ہے اور خواب کی تعبیر صرف انہی کا مقدر بنتی ہے جو اپنے خواب کو اپنا جنون بنا کر محنت کرتے ہیں۔''

بچہ آٹو گراف لے کر جا چکا تھا مگر اس کے پیچھے اک بڑا ہجوم غنی کا منتظر تھا۔

☆......☆......☆

''آپ کو کہیں دیکھا ہے۔'' سیٹھ عماد نے بنگلے پر مزدوری کرنے والے غنی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اسے آج تیسرا دن تھا اور تین ہی دن اس نے سیٹھ کو اپنی طرف گھورتے کسی کشمکش کا شکار دیکھا تھا اس کشمکش کی وجہ وہ بھی جانتا تھا۔

''کسی بنگلے پر کام کرتے دیکھا ہوگا صاحب۔ مالی ہوں سب کی کوٹھیوں پہ جاتا ہوں، اب کیا معلوم کدھر دیکھا آپ نے۔'' غنی نے کندھے نہایت ادب سے کہا۔

''ہو سکتا ہے...... مگر نہیں۔'' فرمان تم فرمان ہو فرمان غنی......اس نام کی گونج سیٹھ کو سالہا سال پیچھے سنائی دی۔ فرمان غنی ہاکی کا وہ کھلاڑی جس کے میدان میں اترتے ہی شور مچ جاتا تھا جو جونیئر لیول نیشنل ٹیم کی سلیکشن سے چند قدم کے فاصلے پر سے اچانک غائب ہو گیا تھا، جس کے سینئر ٹیم میں کھیلنے کے امکانات بہت واضح تھے جس کے ساتھ کنٹریکٹ کرنے کے لیے کئی بڑے ادارے تیار تھے۔ وہی فرمان غنی ہاتھ میں کھدال پکڑے بلا جھجک وجحت مٹی برابر کر رہا تھا پودے لگا رہا تھا۔

''تم۔ یہ سب کیا ہے تم تو اس میچ کے بعد کبھی نظر ہی نہیں آئے حالانکہ تمہاری ٹیم کی ہار کے باوجود تمہیں بہت سراہا گیا تھا۔'' سیٹھ عماد نے حیرت سے گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں گویا کسی نے مرچی سی بھر دی تھی وہ اپنے ماضی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ماضی کو فراموش کیے بیٹھا تھا مگر سیٹھ عماد نے اسے بہت پیچھے دھکیل دیا۔ جہاں سٹیڈیم لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ پاکستان نیشنل جونیئر ہاکی ٹیم کی سلیکشن ہونا تھی فرمان غنی بھی اپنے ابا کو میچ دکھانے لایا تھا۔ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ لوگ ان کے بیٹے کی کتنی پذیرائی کرتے تھے۔ اسے اپنی ٹیم کی جیت کا قوی یقین تھا اور اپنی نیشنل ٹیم میں سلیکشن کا بھی۔

مگر دوسری ٹیم زیادہ بہتر نکلی تھی اس کی ٹیم ہاری تھی۔ اس کے باوجود اس کی بہت تعریفیں ہوئی تھیں۔ وہ بہت عمدہ کھیل کھیلا تھا۔ سامنے والوں کا گول کیپر بہت بہترین تھا جو ان کی ہار کا باعث بنا تھا اور وہی گول کیپر سیٹھ عباد تھے۔ ابا گھر آ کر گھنٹوں اس پر چیختے رہے وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے اپنا ہاکی کھیلنے کا سب سامان جلا دیا اور دوبارہ کبھی ہاکی اسٹک نہیں پکڑی۔

ایسا ہوتا ہے ناں کہ ہم دنیا کے طنز کا سامنا تو کر جاتے ہیں مگر اپنوں کے چند الفاظ بھی ہمیں اندر سے توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

''تم نے کس قدر بے وقوفی کا مظاہرہ کیا، اک ہار سے اس قدر دلبرداشتہ ہو گئے کہ اک شاندار کیریئر چھوڑ دیا۔'' سیٹھ عباد نے اس کی باتیں سن کر آہ بھرتے ہوئے اسے سے کہا۔

''چھوڑیں صاحب بیتی باتوں میں کیا رکھا ہے۔'' فرمان غنی نے بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ دل میں درد بھری ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

''ماضی اگر شاندار ہو تو کچھ لوگ اسی میں جینے لگتے ہیں لیکن حال اگر اتنا ہی بھیانک ہو تو شاندار ماضی کی یادیں روح کا ناسور بن جاتے ہیں۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

سیٹھ عباد نے اسے مزید کام سے روک کر کھیل کی جانب جانے کا کہا تاہم وہ ایک بھی نہیں مان رہا تھا۔ سیٹھ عباد چاہتے تھے کہ

فرمان غنی پھر سے کھیلنے لگے مگر وہ جھجک گیا ہاکی اسٹک سے کدال پکڑنا آسان لگتا تھا اب، کدال سے دوبارہ ہاکی اسٹک تک کا سفر انتہائی مشکل لگنے لگا تھا۔

مگر سیٹھ نے اس کے اندر بجھی چنگاریوں میں پھر سے آگ بھڑکا دی تھی۔ وہ جانتے تھے اب ہاکی اسٹیڈیم کا سفر بانسبت سابق انتہائی کٹھن تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ پہلے کی بانسبت آج بھی کوئی اس کا معاون نہ تھا مگر اب کھونے کے لیے بھی کچھ نہ بچا تھا۔

سیٹھ عباد بھی اس کی ہمت بندھانے میں نہیں تھکے تھے۔

''شہرت اک دن میں نہیں ملا کرتی، ایک بار کوشش کر کے دیکھ لیں، ممکن ہے کچھ ہو جائے۔'' سیٹھ عباد نے ایک دن فرمان غنی کو گم سم پایا تو اسے پیار سے کہا۔ فرمان غنی کی آنکھیں جھلک پڑی تھیں۔ وہ شاید ایک بار پھر سے حوصلہ بحال ہوتے دیکھ کر کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل مچل اٹھا تھا۔ اس نے اب دل ہی دل میں تہیہ کیا تھا کہ وہ دوبارہ سے سینئرز کی لسٹ میں مقام حاصل کرے گا۔

سیٹھ عباد نے اس کے ارادے دیکھے تو اسے تھپکی دی اور مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہاتھ سے کدال پکڑ کر ہاکی تھما دی۔

وہ دن فرمان غنی کے لیے کافی عجیب سا گزرا تھا۔ وہ اس مخمصے میں تھا کہ کیا کرے مگر پھر اچانک دل میں ایک پختہ ارادہ کر کے انجام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرنے نکال پڑا۔ دس بارہ سال کی گمنامی کے بعد اسے کئی سال سیلیکشن بورڈ کے چکر لگانے بلکہ دھکے کھانے پڑے تھے۔ تب کہیں 35 برس کی عمر میں جب لوگ ریٹائرمنٹ کے نزدیک ہوتے ہیں لوگوں نے ایک خبطی کو ہاکی اسٹک پکڑے پاکستانی جھنڈے کے ہم رنگ نیکر شرٹ پہنے سینئر ہاکی ٹیم کے کھلاڑی کے طور میدان میں اترتے اور پھر اپنے کھیل سے لوگوں کو پاگل کرتے دیکھا۔ فرمان غنی نے کدال چھوڑ کر ہاکی اسٹک پکڑی تو ایک بار پھر لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔

آج اس کا الوداعی میچ تھا۔ جسے وہ خوب جی بھر کر کھیلنا چاہتا تھا کہ اسے سیٹھ عباد نظر آئے۔ سیٹھ عباد نے مسکراتے ہوئے اسے داد تحسین پیش کی۔ جو اس کے انگ انگ میں اترتی چلی گئی۔ فرمان غنی نے وہ الوداعی میچ ایسے کھیلا کہ اس دن عزم، حوصلے اور ہمت نے پوری دنیا کو بتا دیا تھا کہ اگر یہ سب جواں ہوں تو پھر کوئی طاقت انسان کو اس کے مقصد سے دور نہیں رکھ سکتی۔

......☆☆......

کوکھ

عابدہ احمد عابی

برانکس (نیویارک) کی ویران سڑکیں رات کے اس پہر ازابیل کے مدھوش قدموں کی ٹک ٹک سے گونج رہی تھیں۔ بلیو منی اسکرٹ کے اوپر وائٹ بیک لیس ٹاپ پہنے میک اپ سے بجی گہری رنگت اور ٹاپ سے جھانکتا قدرے ابھرا ہوا سا پیٹ نمایاں ہو رہا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی بیس اکیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد اور بھرا بھرا جسم، موٹے ہونٹ، کالی بے داغ چمکتی جلد۔

''یہ فرینکلن کہاں مر گیا؟'' نیم وا آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا جیسے کہ وہ یہیں کہیں سے برآمد ہو جائے گا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں لڑکھڑاتا اس کا وجود ایک پل کو ٹھہرا تھا۔ وہ کسی بھی چیز پر فوکس نہیں کر پا رہی تھی۔

''واٹ دا ہیل۔'' بہت سوچنے پہ بھی اسے اپنے رکنے کا جواز سمجھ میں نہیں آیا۔ آج بار سے وہ کچھ زیادہ ہی چڑھا آئی تھی حالانکہ اپنے پچھلے وزٹ میں اسے ڈاکٹر ٹینسی نے واضح الفاظ میں وارن کیا تھا کہ وہ بے تحاشا ڈرنگ کرنے سے اپنے ساتھ ساتھ اپنی کوکھ میں پلتی جان پر بھی ظلم کر رہی ہے۔

''یو شوڈ گیو اپ آن الکوحل (تمہیں شراب چھوڑنی پڑے گی)'' اس کے کانوں میں ڈاکٹر کا کہا جملہ گونجا۔ اسے جیسے بڑی پروا تھی۔ اس کے دھیان کا پنچھی تو برانکس کی برانڈڈ دکانوں میں سجے لوازمات کے گرد پھڑ پھڑاتا رہتا تھا۔ بچہ چاہیے بھی کسے تھا؟ پر جانے کیوں وہ فرینکلن کی بار بار دھائیوں کہ اسے ''اباررٹ'' کروا دے کے باوجود پانچ ماہ کا حمل اٹھائے پھر رہی تھی۔

''ہے! یو وانا رائیڈ ودمی (میرے ساتھ آنا پسند کرو گی)'' اس علاقے کی طوائفوں کے لئے مخصوص اشارہ۔ سوچوں کا پہیہ کھلی قریب سے ابھرنے والی آواز سے ساکت ہوا تھا۔

''ہوڈا ھیل یو آر نگا (تم ہو کون کالے)'' مدہوشی میں بھی اس کا ہوش قائم تھا اپنے ابھرے پیٹ پہ ہاتھ مار کر وہ چیخی تھی۔
مطلب اندھا ہے تو کیا؟ نظر نہیں آتا؟
اپنی شیوی (شیور لیٹ) سے گردن باہر نکالے اس آدمی کی نظر شاید اس کے باہر کو نکلے پیٹ پر نہیں پڑی تھی کہ وہ کھڑی اس زاویے سے ہوئی تھی۔
اس کے دھاڑنے پر وہ سیاہ فام اسے گالی بکتا اپنی شیوی آگے بڑھا لے گیا۔
''سن آف بچ'' اس نے اس کی دھول اڑاتی کار کے پیچھے تھوک پھینکا۔
گہرے گہرے سانس لے کر اپنے حواس بحال کئے ادھر ادھر دیکھ کر سر جھٹکا اور کندھے سے لٹکتے بیگ میں ہاتھ ڈال کر اپنا فلپ موبائل برآمد کیا۔
کال ملانے کو اس کی نمبر ٹائپ کرتی انگلیاں یکدم رکی تھیں۔
''ہیل (گالی)۔'' یاد آیا نمبر تو صبح سے بل نہ جمع کروانے کی وجہ سے بند ہو چکا تھا کوئی کال آتی جاتی کیسے؟
خیال آیا کہ فون اٹھا کر سڑک پر دے مارے لیکن اس بیوقوفی سے ہونے والے نقصان کا سوچ کر عقل جذبات پر غالب آ گئی۔
بس منہ سے تواتر سے نکلتی گالیاں ہی اس کی فرسٹریشن کا غبار اندر سے نکال رہی تھیں۔
''صبح میں بل جمع کرواتی ہوں۔'' ارادہ باندھا اپنے شولڈر بیگ کو تھپتھپاتے ہوئے آج ایوننگ جاب سے ملنے والی تنخواہ کی موجودگی کا یقین کیا۔
''کمینہ فرینکلن گھر بیٹھ کر موجیں اڑاتا رہتا ہے اور میں دو دو جابز کی خواری اور اوپر سے یہ بچہ؟'' سر جھٹک کر اب وہ ذرا مضبوط قدموں سے چل رہی تھی۔ کوڑے کا ڈھیر بنی گلیاں پھلانگتی وہ اپنے اندھیرے میں ڈوبے اپارٹمنٹس کی بلڈنگ کے اوپر جانے والے زینہ کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ گردن اٹھا کر یونہی تیسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ کی کھلی کھڑکی سے چھن چھن کر آتی روشنی کو دیکھا۔
''سالا! بجلی تو یوں استعمال کرتا ہے جیسے اس کے باپ کی رکھیل ہو۔ ابھی پوچھتی ہوں۔'' دماغ میں ہی ساری کھچڑی پکاتی وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
اپنے پاس موجود ایکسٹرا چابی کی مدد سے اپارٹمنٹ کا دروازہ دھاڑ سے کھول وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ ایک کمرے کے اس تنگ سے اپارٹمنٹ کے وسط میں رکھے صوفہ سیٹ پہ بیٹھا سب وے سینڈوچ اڑاتا بائیس سالہ، کالی رنگت اور لمبوترے چہرے اور مضبوط جسامت والا فرینکلن اسے زہر سے بھی زیادہ برا لگا تھا۔
''ہے ہنی!'' اسے یوں دندناتے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک سیکنڈ کو اپنی مصروفیت روک کر اس کا استقبال کیا۔
''یو باسٹرڈ (تم کمینے)۔'' اپنا شولڈر بیگ اتار کر اس کے منہ پہ پھینکا۔
''واٹس رونگ لو (کیا ہو گیا جان)'' کھی کھی کرتے اس نے اس کا بیگ کیچ کیا۔ وہ بھول چکی تھی کہ اسے فرینکلن کو بجلی کے زیادہ استعمال پہ ایک لمبا لیکچر دینا تھا۔
''واو! تمہیں پے مل گئی؟'' خوشی بھری حیرت والا استفسار بیگ کو ہاتھوں میں تولتے ہوئے کیا جا رہا تھا۔
''نن آف یور بزنس۔'' سرخ رنگ والی ہیل اتار کر ہوا میں اچھالی ایک سیدھی فرینکلن کے سینڈوچ کے عین درمیان جا کر جا گئی۔ اس نے ناپسندیدگی سے اپنے مقابل رکھے صوفے پہ ڈھیر ہوتی ازابیل کو دیکھا تھا جہاں وہ ٹانگیں پسار چکی تھی منی اسکرٹ اس کے یوں بیٹھنے سے مزید اوپر چڑھ ہی۔
''پھر تم ہار گئی تھیں؟'' وہ سوال جس کا جواب سو فیصد اثبات میں تھا۔ اپنی پے کا پہلا دن وہ یونہی بار میں گزار کر آتی تھی۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر آنکھوں پہ ہاتھ دھر کر لیٹ گئی۔
''کھاؤ گی۔'' کچھ لمحے اس کے ابھرے ہوئے پیٹ اور بے حس و حرکت وجود کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ اپنا سینڈوچ اٹھائے اس کے پیروں کے پاس کارپٹ پر آ بیٹھا۔
''نو تھینکس۔'' وجود کی طرح بے حس آواز۔
''تھک گئی ہو؟'' سینڈوچ کے بڑے بڑے بائٹس لیتا وہ اس خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا۔

''یپ (ہاں)۔'' مختصر ترین جواب۔
''کتنی بار سمجھاؤں تمہیں کہ اس بچے سے نجات حاصل کرلو۔ میرا کوئی پتہ نہیں میں کب ڈیڈ کے پاس اورنج کاؤنٹی موو آؤٹ کرجاؤں کیسے پالوگی اکیلے؟''
روز روز کا ٹنٹا وہ پھر کھڑا کر رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ مانتی کیوں نہیں تھی کچھ عرصہ سے وہ دن رات ایک ہی راگ الاپ رہا تھا لیکن کچھ تھا جو وہ بہت چاہنے کے باوجود ابھی تک کر نہ سکی تھی۔
''مجھے اکیلا چھوڑ دو پلیز۔'' وہی بے حس انداز تھا۔ مطلب مزید بات نہ کی جائے۔
''میں کب تمہارے ساتھ چپکا رہنا چاہتا ہوں؟ وہ بھی بھڑکا تھا۔ اس نے یکدم آنکھوں سے ہاتھ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ زرد رنگ، بجھی آنکھیں۔
''دیکھو جان۔'' خود کو ''ریلیکس ریلیکس'' کے اشارے دیتا وہ بولا تھا۔ اس کی زرد رنگت اسے شرمندہ کر گئی تھی۔
اس کے ساتھ تھوڑی سی جگہ بناتے ہوئے وہ بیٹھ گیا۔
''ہم کسی بھی طرح اس پوزیشن میں نہیں کہ اس بچے کو ابھی تو کیا اگلے پانچ سالوں میں بھی افورڈ کرسکیں۔'' اس کا ہاتھ تھام کر وہ سرگوشیاں کرنے لگا۔
وہ خاموشی سے بنا پلک جھپکائے اس کے ہلتے ہونٹ دیکھ رہی تھی۔
''ہم جیسے ادھورے لوگ کیسے ایک مکمل فیملی کی بنیاد رکھ سکتے ہیں؟''
اس کا ہاتھ تھپتھپاتا وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
اس کی بات سے اسے ایک ٹکے کا اختلاف نہیں تھا۔
''یو آر رائیٹ۔''
''لیکن مجھ سے نہیں ہو پاتا یہ۔'' اس کی ساری باتوں سے دل و جان سے متفق ازابیل یہیں آ کر مات کھا جاتی تھی۔
''دیکھو! تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ ہم اس بچے کو کچھ نہیں دے سکتے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اسے اپنے جیسی سسکتی زندگی گزارنے کے لیے اس دنیا میں لانے کی بجائے اسے یسوع مسیح کے گاڈ کے پاس ہی بھیج دیں۔ وہاں یہ خوش رہے گا۔ ٹرسٹ می۔''
اس کی آنکھیں شاید شدت ضبط یا پھر سفا کی کی وجہ سے سرخ پڑ چکی تھیں۔
ازابیل خلاف معمول بڑے تحمل سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ورنہ تو وہ یہ سب سنتے ہی خود کو کمرے میں بند اور اسے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکال دیتی تاوقت یہ کہ وہ اس سے ''سوری'' کر کے واپس نہ آ جاتا۔
''میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا اور اس کے ہاتھوں میں جکڑا اپنا ہاتھ باہر نکال کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید وہ بھی تھک چکی تھی اپنے اندر کی جنگ سے۔
فرینکلن کا چہرہ ایک دم سے ڈھیلا ہوا تھا۔ اس نے نامحسوس انداز میں شکر کا سانس لیا۔
''میں...... میں اپنے بچے کو کچھ نہیں دے سکتی۔'' اس کی آواز بھرا گئی لیکن آنکھیں پتھر کی معلوم پڑتی تھیں۔ کوئی آنسو نہیں۔ وہ روتی نہیں تھی اسے رونے سے نفرت تھی۔
''میں سمجھتا ہوں تمہاری کیفیت۔'' وہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔
''ہمیں یہ کڑوا گھونٹ بھرنا ہے ہنی۔'' اس کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ پھیلا کر اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
''میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ میں بھی ایک دن ماما ڈونا (اس کی ماں) کی طرح بن جاؤں گی۔'' وہ اندر جمع ہونے والے غبار کو راستہ دیتے ہوئے بولی۔ کتھارسس کا عمل بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔
وہ تسلی دینے والے انداز میں اس کا بازو مسلنے لگا۔
''مجھے تو لگتا ہے کہ میں ڈونا سے بھی زیادہ قابل نفرت ہوں وہ تو صرف مجھے پیدائش سے پہلے ابارٹ نہ کروانے کا ماتم کرتی رہی اور میں۔'' وہ اس سے الگ ہو کر ایک قدم آگے بڑھی۔ دونوں ہاتھ ابھرے ہوئے پیٹ کے اوپر لپیٹ لیے۔
''ہرگز نہیں ہمارے ماں باپ زیادہ سفاک تھے جنہوں نے ہمیں اس دنیا میں لا کر بڑا ظلم کمایا کروا دیتے ابارشن یوں ادھورے، سڑے وجود کا لاشہ ہر وقت اٹھائے پھرنا بڑی اذیت ناک زندگی ہے۔'' اس کی لہو رنگ آنکھ پانی کے روپ میں خون

ٹپکانے لگی۔
وہ دونوں اس معاشرے کی نوے فیصد بروکن فیملی کا شکار لوگوں میں سے ایک تھے۔والدین کی سفا کی اور سماجی نظام کی تفریق کا کالا ناگ انہیں ڈس ڈس کرادھ موا کر چکا تھا۔اپنی بقا کی اس جنگ کو وہ اپنے خون (بچوں) سے سینچنے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔
ازابیل نے مڑ کر اپنے پیچھے کھڑے فرینکلن کو دیکھا اور اس کے پاس چلی آئی۔
''میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس کے کان کی لو کو دھیرے سے چھوا تو وہ اداسی سے مسکرا اٹھا دونوں ادھورے لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر ایک مکمل انسان کی شبیہ میں ڈھل چکے تھے۔
رات کی تاریکی کا پردہ گہرا ہوتا جارہا تھا۔رات جو اگر بہت سے رازوں کی امین ہوتی ہے۔وہیں پرانے کھاتے بھی کھول لیتی ہے۔جس میں سے انسان ''کیا پایا کیا کھویا'' کے گوشوارے الگ الگ کرتا رہتا ہے ساتھ ساتھ لیٹے ازابیل اور فرینکلن مختلف سوچوں میں گم تھے۔نیند تو دونوں میں سے کسی کو نہیں آنی تھی کہ نصیب کے ساتھ ساتھ نیند سے بھی ان کی اکثر ٹھنی رہتی تھی۔
فرینکلن کا ایک ھاتھ ازابیل کے سر کو سہلا رہا تھا اور دوسرا اس کے پیٹ کی دبیز تہوں میں سانس لیتی اس زندگی کی حرکت کو محسوس کر رہا تھا جس کو وہ دونوں ختم کرنے کا سوچ چکے تھے۔
''تم ٹھیک ہو؟'' فرینکلن نے جانے کیا پوچھنا چاہا تھا۔
وہ بس ''ہوں'' کہہ کر کروٹ بدل گئی۔اب فرینکلن اس کی پشت کو اور وہ سامنے دیوار میں ٹنگے صلیب کے نشان کو گھور رہی تھی۔
ازابیل کی ماں (ڈونا) اور باپ (جسٹن) مختلف نظریات اور شخصیات رکھنے والے دو انسان تھے۔اس کا باپ طبعاً ''نرم خو اور ساتھ نبھانے والا انسان تھا'' پرپل برادرز گینگ کا ایک سرگرم رکن لیکن ایک انتہائی نفیس باپ جانے دونوں کب کیسے اور کیوں ملے؟ یہ سوال اس کے لیے بے معنی تھا۔اگر کوئی چیز اہم تھی تو اس کی اپنے باپ کے لیے بے تحاشا محبت۔
جبکہ ماما ڈونا میں لالچ اور آزادی کا پارہ ہمیشہ تھرتھراتا رہتا۔جسٹن کی ہمہ وقت ڈالرز سے بھری رہنے والی جیبیں اور اپنا ذاتی فلیٹ ماما ڈونا کے لیے کشش کا باعث تھا۔دونوں نے کچھ ٹائم اس معاشرے کے رواج کے مطابق ساتھ گزارنے کے بعد چرچ میں جا کر شادی کر لی۔جسٹن اب بچے چاہتا تھا اور ماما ڈونا آزادی لیکن اس کی روز بروز مستحکم ہوتی مالی حیثیت کا اندازہ کر کے ایک دو بچوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' کہہ کر خود کو ذہنی طور پر تیار کیا جلد ہی وہ ایک صحت مند سیاہ فام لڑکے کے والدین بن گئے۔جسٹن بہت خوش تھا۔شب و روز یونہی گزرتے رہے اور ماما ڈونا اک بار پھر امید سے ہوگئی۔
اب کی بار حالات مختلف تھے کیونکہ جسٹن سنجیدگی سے اپنے گینگ کو چھوڑ کر کسی دوسری ریاست میں جا کر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر چکا تھا اس فیصلے سے ڈونا سمیت گینگ بھی ناخوش تھا لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی سوائے اپنی فیملی کے۔
سو گینگ کو خیر باد کہہ کر ان کی مالی مشکلات آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں اور جھگڑے بھی جو کہ ہمیشہ ماما ڈونا کی پہل سے ہی شروع ہوتے تھے۔ان ہی جھگڑوں اور آنے والے بچے کو بے شمار بار گرانے کی کوششوں میں ناکام ہو کر ماما ڈونا اسے پیدا کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔اس کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد ہی ماما ڈونا اور جسٹن میں طلاق ہوگئی۔
شاید دونوں ہی تھک چکے تھے ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتہ کرتے کرتے۔ماما ڈونا جسٹن کے گھر میں ہی رہتی رہی تا کہ اس کے بچوں کو دربدر کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔وہ خود ایسٹ کی کسی ریاست میں منتقل ہوگیا۔آنا جانا اس کا لگا رہتا تھا پتہ نہیں اب کیا اور کس کے ساتھ کام کرتا تھا؟ لیکن ایک بار پھر سے ڈونا کو کھلا خرچ مل رہا تھا وہ خوش تھی۔اپنے مزاج کے مطابق اس کے بوائے فرینڈز آتے اس کے ساتھ کبھی کچھ ہفتے یا بہت ہوا تو سال گزار اپنی راہ لیتے۔وہ یونہی ماما ڈونا کی بے توجہی کا شکار جسٹن کے آنے کے دن گنتی وقت کے پہیے کا ساتھ دینے لگی۔
ان کو تنگی کسی شے کی نہیں تھی سوائے جسٹن سے دوری کے۔وہ ڈونا کا شوہر تو نہیں رہا تھا لیکن ان دو بچوں کا باپ ہونے کا فرض خوب نبھا رہا تھا۔اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک بار ڈیڈ رات کے وقت ان کے گھر آیا تھا۔ڈونا کو اپنی آمد کی اطلاع وہ ہمیشہ پیشگی دیا کرتا تھا۔اس دن بھی دی تھی لیکن اب کی بار اس نے اپنے نئے بوائے فرینڈ سے ایک رات کی دوری بھی برداشت کرنا گوارا نہ سمجھا اور اسے اپنے بیڈ روم میں ہی رکھے رکھا۔جسٹن آیا دروازہ ڈونا کے بوائے فرینڈ نے کھولا۔وہ اس کے مخنی وجود پہ لپٹے اپنے کپڑے دیکھ کر آگ بگولہ ہوگیا۔اس سے پہلے کہ وہ اسے مخنی شخص کو اٹھا کر دیوار سے دے مارتا ڈونا ہانپتی چلی آئی۔

جسٹن کو بمشکل ٹھنڈا کر کے بوائے فرینڈ کو چلتا کیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ جسٹن اپنے بچوں کے لیے بہت سی چیزیں لایا تھا اس رات وہ ان کے ساتھ ہی سویا۔ رات کے کسی پہر اس کی آنکھ اپنے باپ کی دہشت ناک چیخوں سے کھلی تھی۔ معلوم ہوا کسی نے سوئے ہوئے جسٹن کے منہ پر کھولتی ہوئی ویکس گرادی تھی۔ اس کا منہ بری طرح جل چکا تھا۔ پولیس اور پیرا میڈیکس آگے پیچھے ہی پہنچے تھے۔ اسے ہسپتال پہنچانے سے لے کر ٹریٹمنٹ کے بعد روم میں شفٹ کرنے تک وہ ساتھ رہی تھی اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر ڈونا کی اصلیت سب کو بتا دے لیکن ڈونا کی ایک ہی گھوری سے ڈرنے والی ازابیل کچھ بتا نہ سکی۔ جسٹن نے ہوش آنے کے بعد ڈونا کے خلاف کوئی بیان نہ دیا۔ جانے کیوں؟

اسے ماما ڈونا سے نفرت ہوگئی۔ وہ ہر چیز کا ذمہ دار اسے ٹھہراتی۔ جسٹن ڈونا کے قاتلانہ حملے سے تو بچ گیا لیکن اس کے گینگ کی اندھی گولی سے نہیں۔ باپ کی آنکھ بند اور مصیبتوں کا اک نیا باب کھل گیا۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی بدلحاظی سے اس کا یارانہ پکا ہو گیا۔ ماما ڈونا سے اس کی کبھی بنتی نہیں تھی۔ اس کے سولہویں چڑھتے ہی ماما ڈونا نے اس کا سامان اسی کے باپ کے گھر سے باہر پھینک دیا۔

''تم اب بڑی ہو چکی ہو اور اپنا خیال خود رکھ سکتی ہو تمہیں میرے گھر سے جانا ہوگا۔'' ماما ڈونا نے بے حد بیگانگی سے کہا تھا۔

وہ اپنا سامان اٹھائے یونہی سڑک پر ''کہاں جاؤں'' کے بھنور میں پھنسی کھڑی تھی جب اسی کے بلاک میں رہنے والا اسی کا ہم عمر فرینکلن اس سے آٹکرایا۔ شاید اس نے ماما ڈونا کو اسے نکالتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے آیا۔

اسے سر چھپانے کو ایک چھت اور فرینکلن کو تنہائی کا ساتھی درکار تھا۔ فرینکلن کی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی تھی وہ بھی محرومیوں کا شکار ادھورا انسان تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے۔ فرینکلن اس کا بہترین ساتھی ثابت ہوا تھا۔ اس کے باپ کی طرح دھیما، چاہنے والا۔ وہ بھی اسی کی طرح بروکن فیملی سے تھا۔ ماں اور باپ دونوں کی راہیں سالوں سے جدا ہو چکی تھیں۔ اس کی روح بھی بچپن کی محرومیوں کے کانچ پہ چلتے چلتے زخمی ہو چکی تھی۔ وہ تین سال سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

بچے ان کے پلان میں کبھی بھی شامل نہیں رہے تھے لیکن کسی ایک رات کی بے احتیاطی نے اس کے اندر اک گوشت کا لوتھڑا پیدا کر دیا تھا۔ اسے خبر ہی دیر سے ہوئی۔ فرینکلن یہ سن کر بے چین ہو گیا تھا اور فوراً ''ابارشن'' کی رٹ لگادی تھی۔ گو کہ بچپن کی نفرتوں اور محرومیوں سے اس کے جذبات پہ بھی ایک کثیف سا دھواں چھایا رہتا تھا لیکن وہ یہ سنتے ہی سرد پڑ جاتی۔ دن پہ دن گزرتے جا رہے تھے اور وہ ''ہاں یا نہ'' کی منزلیں چڑھتی اترتی رہتی لیکن آج تو فیصلہ ہو گیا تھا۔ اب سے کچھ ہی گھنٹوں بعد وہ اس ''بوجھ'' سے آزاد ہونے والی تھی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ صبح میں دونوں ہی بڑی کسلمندی سے اٹھے تھے۔ فرینکلن نے اسے چیز آملیٹ اور کپ کیکس بنا کر دیے۔ اگر وہ اداس تھی تو وہ بھی اپنے اس فیصلے سے خوش نہ تھا لیکن اپنی اولاد کو اپنے جیسا محروم دیکھنا بھی اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔

''بس ٹھیک ہے اب جو بھی ہے۔'' اپنے لرزتے دل کو دلیل دے کر سنبھالا۔

''میں تیار ہوں۔'' وہ کل رات والے ہی حلیے میں تھی۔ بس منہ ہاتھ دھو لیا تھا۔

''یو شیور۔'' اس نے پوچھا۔

''یس ایم ہنڈرڈ پرسنٹ پازیٹو۔'' وہ مسکرائی تو اس کے دانتوں میں لگے برو سز واضح ہو گئے۔

وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر اسے آہستہ سے گلے لگا لیا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اس کی پشت مسل رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں دونوں ٹیکسی کر کے پلین پیرنٹ ہڈ (ابارشن سینٹر) کے باہر آن کھڑے ہوئے۔ تیز بارش اب بھی جاری تھی۔ فرینکلن نے اسے بارش سے بچانے کے لیے ہاتھ میں پکڑا چھاتا اس کے سر پر تان لیا۔ وہ خود بارش میں بھیگ رہا تھا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے وہ اسے اپنے بازو کی لپٹ میں لیے سینٹر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وہ لڑکھڑائی تھی۔ اپنے اندر کی انسانیت کو روندنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے تو پھر اس کے قدم کیسے نہ لڑکھڑاتے؟

''آر یو او کے۔'' اسے سنبھالتے ہوئے اس کے لہجے میں تشویش در آئی۔

اس نے سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔ ابارشن سینٹر میں ایڈمیشن کی فارمیلیٹیز سے فارغ ہو کر باری کے انتظار میں وہ اسے ہال میں

پڑے بینچ پر لے آبیٹھا۔
وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی جیسے بڑا لمبا سفر طے کیا۔
''میں پانی لاتا ہوں۔'' فرینکلن نے کہا اب بھی وہ صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کے جاتے ہی اس نے اپنا سر بنچ کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔
ذہن بالکل تاریک تھا۔ کوئی سوچ کوئی خیال نہیں۔ بھید بھری خاموشی اور تاریکی۔
وہ تھوڑا سا بنچ سے بیٹھے بیٹھے نیچے سرکی۔ ٹانگیں سیدھی کر لیں شاید یہ اس کے لیے سب سے آرام دہ حالت تھی۔ ایک ہاتھ سے اپنی دوسری بازو مسلتے ہوئے اس کا ہاتھ انجانے میں ہی اپنے ابھرے پیٹ پہ آٹھہرا۔ زندگی اندر ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ اس کے لب یہاں سے وہاں پھیلے۔ اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے اپنا ہاتھ یونہی پیٹ پر دھرا رہنے دیا۔ آنکھیں بدستور بند تھیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا ذہن غنودگی میں جا رہا ہے لیکن جانے کیوں اسے اس پوزیشن میں سکون مل رہا تھا اس نے اپنا سارا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور ذہن آزاد۔
''مس جسٹن۔'' نرس نے آنکھیں موندے پڑی ازابیل کے قریب آکر آہستگی سے اسے پکارتے ہوئے ہلایا۔
وہ ایک دم سے آنکھیں کھول کر اپنے اوپر جھکی سفید فام نرس کا مسکراتا چہرہ دیکھنے لگی۔
''اٹس یور ٹرن ناؤ (اب آپ کی باری ہے)۔'' مسکراتے لب گویا ہوئے۔
وہ میکانکی انداز میں اٹھ کر اس کے پیچھے چل دی۔ فرینکلن ابھی تک نہیں آیا تھا۔
''کرنا تو ہے تو پھر کیا فرق پڑتا ہے اس کے ہونے یا نہ ہونے سے۔'' دل کی اس خواہش کو کہ فرینکلن کا انتظار کر لیا جائے اس نے رد کیا۔
اندر بیٹھے سیاہ فام ڈاکٹر نے مسکرا کر پیشہ ورانہ انداز میں اس سے چند سوالات کیے جس کے اس نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دے دیئے کیونکہ اب اسکا سر چکرانے لگا تھا آنے والے لمحوں کا سوچ کر۔
ڈاکٹر نے نرس کو کچھ ہدایات جاری کیں اور اسے سینٹر کے کپڑے پہننے کو دیے گئے وہ نرس کی ساری ہدایات پر کانپتے ہاتھوں سے عمل کرتی رہی۔ ڈاکٹر مسلسل اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پہ نظریں جمائے کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھا۔
نرس نے اسے سائیڈ پر پڑے بیڈ پہ لیٹنے میں مدد کی اور کوئی محلول سا انجکشن میں بھر کر اس کے بازو میں گھونپ دیا اس کا دماغ فوراً تاریک ہوا تھا اور پھر ایک جھماکے سے روشن۔ اس نے خود میں سے کسی کو اٹھتے دیکھا۔
''کون۔'' وہ چلائی۔ اس وجود نے گردن گھما کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ششدر رہ گئی اپنے سامنے خود کو کھڑے دیکھ کر اس نے خود کو ہاتھ ہلا کر اس کمرے کے ایک کونے میں کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے اندر سے نکلنے والا وجود اپنے ہونٹوں پر انگلی جمائے۔
''چپ۔'' رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس نے تھک کر سر گرا دیا۔ وہ ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوب رہی تھی۔
ڈاکٹر اب آپریشن کی تیاری کر رہا تھا۔
اس کی نظریں دائیں طرف رکھے مانیٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تیز دھار جلد ہی اس کی کوکھ میں اطمینان سے سوئے فیٹس (بچے) کے سر پہ آپہنچا۔ فیٹس کو شاید آنے والے وقت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اپنے بچاؤ کے لئے وہ ایکدم سے سکڑا تھا۔ لیکن اوزار کی بے رحم دھار نے اس کا بازو کاٹ کر کوکھ سے باہر پھینک دیا۔
فیٹس تکلیف سے بے آواز چیخا تھا اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے مانیٹر پر اس کی دھڑکن دو سو تک جا پہنچی تھی۔ اوزار ایک بار پھر کوکھ میں گھسا اس فیٹس کا جسم بیدردی سے کاٹ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی یہ سب ہوتا دیکھتی رہی۔
ڈاکٹر اپنے پیچھے اوزاروں کی ٹرے لیے کھڑی نرس سے ہنس ہنس کر جانے کیا باتیں کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اب لہولہو ہوتی کوکھ میں مختلف ٹکڑوں میں کٹے فیٹس کی کھوپڑی کو توڑا جا رہا تھا۔ ننھی زندگی کب کی سانسوں کے بوجھ سے آزاد ہو چکی تھی۔
وہ ایک دم پسینے پسینے ہوتے وجود کے ساتھ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ اس کے اردگرد کا ماحول، وہی ہال، وہی بنچ اور اس کا اپنے پیٹ کو سہلاتا ہاتھ سب کچھ وہیں تھا۔
''تو کیا یہ ایک خواب تھا؟'' ابھرے پیٹ کے اندر کھلکھلاتی زندگی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

''او گاڈ......او مائی گاڈ'' اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ آگے کو جھک آئی۔ پہلی بار اسے اپنے گال گیلے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ پہلی بار کئی احساس جاگے تھے۔ وہ یونہی آگے پیچھے جھولتی آنسو بہاتی رہی۔

''مس جسٹن۔'' وہی خواب میں دیکھی جانے والی نرس اس کی باری آگئی تھی جو اس نے ابھی خواب میں دیکھا ہونے والا تھا۔ نرس اسے پکارتی نزدیک چلی آرہی تھی۔ وہیں فریز ہونے والی ازابیل کے دماغ نے اسے ایک سگنل دیا تھا۔

''بھاگو۔'' اس نے عمل کرنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا تھا۔ وہ اٹھ کر بھاگی تھی۔

''نہیں......نہیں......نہیں۔'' اس کی ہذیانی چیخیں سارے ہال میں گونج رہی تھیں۔ لوگ مڑ مڑ کر اس حاملہ لڑکی کو اندھادھند بھاگتے دیکھ رہے تھے۔ سینٹر کی انٹرنس سے داخل ہوتا فرینکلن اسے یوں سامنے سے بھاگتے آتے دیکھ کر شدید حیرت سے دوچار ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟ ازابیل، رکو......میری بات سنو۔'' اس کے نزدیک پہنچ کر ازابیل نے اسے ایک دھکے سے اپنے سامنے سے ہٹایا تھا وہ لڑکھڑا کر گرا تھا۔

''مس جسٹن......مس جسٹن۔'' اس کے پیچھے آتی نرس نے سنٹر کے باہر سڑک کے بیچوں بیچ بھاگتی ازابیل کو پھر پکارا تھا۔ وہ برستی بارش اور اچانک اسے سامنے دیکھ کر بریک لگاتی گاڑیوں کے ہارنز سے بے پروا بھاگتی جارہی تھی اس کے اندر موجود زندگی کھلکھلا کر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

......☆☆......

خوشنما

عمارہ جی ملک

اتنی پیاری بچی تھی کہ نظر نہیں ہٹتی تھی۔ فوراً اس کے کان میں اذان دی گئی۔ اماں نے جھٹ پٹ نام بھی رکھ دیا ''خوشنما'' اور وہ معصوم ان سب باتوں سے بے نیاز آنکھیں موندیں اونگھ رہی تھی۔ ابا کو بیٹی کے پیدائش کی بہت خوشی تھی۔ بار بار آنکھیں صاف کرتے اور کہتے۔

''بیٹی کا باپ ہونا بھی سنت ہے۔'' گاؤں بھر میں مٹھائی بانٹی گئی۔

''خوش بخت تو پاگل ہوگئی ہے۔ بٹی ہی ہوئی ہے اس میں مٹھائی بانٹنے والی کیا بات ہے لیکن ہمیں کیا۔ اب دی ہے تو کھا لیتے ہیں۔'' یوں خوشنما ابا کی لاڈلی اماں کی آنکھ کا تارہ بن گئی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ خوشنما ان کی اکلوتی اولاد تھی چار بیٹے پہلے سے تھے لیکن ابا بار بار کہتے رحمتیں خوش نصیبی میں آتی ہے۔ وقت گزرتا گیا اماں کی خوشنما دو سال کی ہوگئی۔ لیکن بس مسکرا دیتی۔ اماں کو فکر تو تھی لیکن کبھی کسی سے اظہار نہ کیا۔ ایک دن ان کے دور کی بہن آگئی۔

''ہائے اللہ خوش بخت آپا یہ تو گونگی ہے۔'' اماں کے جواب سے پہلے ہی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

''خوشنما گونگی ہے۔'' چند ایک نے افسوس سے سر ہلایا۔

''گونگی ہے اچھا ہوا ان کے ساتھ بڑا اترا رہے تھے۔''

''نہیں تو بیٹی ذات ہے اب کون سنبھالے گا۔'' لوگوں کو ابھی سے فکر ہونے لگی۔

''جس نے پیدا کیا ہے وہی سنبھال لے گا۔'' اماں نے سنتے ہی کہا۔

''آپ کو کیا پتا خوش بخت بہن دنیا بہت مشکل ہے۔''

''مجھے پتا ہے اور اس کے خالق کو بھی پتا ہے اس کی تخلیق ہے وہ خیال رکھے گا۔'' اماں ازل سے اللہ لوک تھی۔ عورتیں آتی چند جملے اگلتی چلی جاتی۔ اماں کے ہونٹ مسکراتے ہی رہے۔ ابا مسجد سے نماز کی امامت کر کے نکل رہے تھے کہ گاؤں کا قصائی بھاگا بھاگا آیا۔

''مولوی صاب آپ کی بیٹی تو گونگی نکلی۔'' یوں خوشی سے اطلاع دی جیسے لاٹری نکلی ہو۔ ابا کے قدم ایک منٹ کے لئے تھمے اگلے پل پھر مسجد کی طرف مڑ گئے۔ زیادہ صدمہ لگا ہے مولوی صاب کو۔

اور مولوی صاحب سجدے میں گرے۔
"جیسی بھی ہے اللہ رحمت ہے اور رحمت کا ایک ذرہ بھی زندگی بھر کے لئے کافی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرے قدم رکے تھے اس کی مغفرت کر دے مالک۔" ابا سجدے میں گرے رہے اور لوگ مسجد کے باہر اور اندر پھیلے انتظار میں تھے کہ کب وہ سلام پھیرے اور کب خوشنما گونگی سے بات شروع کریں۔ چند ایک نے تو تعزیت کے جملے تک سوچ لئے۔ ابا کے سجدے لمبے ہوتے گئے اور ان سب سے بے نیاز خوشنما ہاتھ سے منہ کی طرف اشارہ کرتی اور اماں اس کے منہ میں نوالے ڈال دیتی۔
وقت گزرتا گیا خوشنما بارہ سال کی ہوگئی اتنی فرمانبردار بچی۔ بھائیوں کا ہر کام بنا کہے کر دیتی۔ اماں کا سارا کام ذمے لے چکی تھی۔ صبح ابا جب نماز کے لیے مسجد جانے اٹھتے وضو کے لیے گرم پانی کا لوٹا پہلے سے بھر کر رکھ دیا جاتا۔ ابا وضو کر کے نکلتے۔ اماں وضو کر کے آتی تو جائے نماز انگیٹھی کے ساتھ بچھی ہوتی۔ اماں کے ساتھ ساتھ خود بھی نماز پڑھ لیتی۔ آگ جلا کر ناشتہ بنا کے وہ سب کو ناشتہ دینے کے بعد صفائی میں لگ جاتی۔ پھر برتن دھونے کے بعد کبھی بھائیوں کے کپڑے دھو دیتی کبھی اماں کے سر میں جوئیں دیکھنے لگ جاتی۔ یوں ہر دن کی ابتدا اور اختتام کام سے ہوتا تھا۔ اب تو گاؤں والے بھی ان کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔
"بیٹی ہو تو خوشنما جیسی۔" وہ سنتی مسکرا دیتی۔ اس نے ایک ہی کام سیکھا تھا۔ مسکرانا اور وہ یہ کام کرتی رہتی ابا فخر سے کہتے۔
"مسکرانا سنت ہے۔"
وہ سولہ سال کی ہوگئی تو اس کی ڈولی اٹھی۔ یہاں پر بھی اللہ نے سنت کو ملحوظ خاطر رکھا۔ پہلا رشتہ تھا صبور احمد کا لیکن ابا نے خوشی خوشی رخصت کر دیا اور لوگ انگلیاں دانتوں میں دبا کر کہتے ہائے میرے رب جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں کیونکہ صبور احمد بھی گونگا تھا اور وقت نے دیکھا جتنی خوشنما سلجھی ہوئی تھی۔ صبور احمد اس سے دوگنا تھا۔ دونوں اشاروں کی زبان میں باتیں کرتیں اور مسکراتے رہتے اور بولنے والے ان کے گھر کی خوشحالی اور سکون دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔
وقت نے خوشنما کی جھولی میں چار بیٹے ڈال دیے۔ ہر بیٹے کی پیدائش پر ابا کی خوشنما آسمان کی طرف دیکھتی اور مسکرا دیتی۔ اماں ابا اب نہیں رہے تھے اور بھائی اپنی دنیا میں مصروف رہتے تھے۔ ویسے بھی ان کے سمجھ میں خوشنما کے اشارے نہیں آتے تھے۔ بیٹوں کو ان کے اشارے کم ہی سمجھ آتے اس لیے وہ اشاروں کی نوبت آنے ہی نہ دیتیں۔ بیٹے اٹھتے تو چارپائی کے ساتھ ان کے سلیپر لگے ہوئے ہوتے۔ منہ دھونے جاتے گرم پانی تیار کپڑے استری غسل خانے کی دیوار پر کیلیں لگی ہوئی اور ہر کیل پر ایک بیٹے کا تولیہ۔ کل گن کے تین کیلیں تھی۔ بڑا بیٹا صبح دودھ پیتا تھا۔ باقی دو دیسی گھی کے ساتھ چپاتی کھاتے تھے۔ لوہے کی الماری کے ایک کونے میں جرابوں کے جوڑوں کو باندھ کر رکھا گیا تھا۔ گونگی تھی لیکن بیٹوں کی ہر چیز کو ایک مخصوص جگہ پر رکھا تھا تاکہ انہیں ڈھونڈنے کی مشقت نہ ہو اور جنت جنت ہوتی ہے گونگی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔
پھر بیٹے بڑے ہوتے ہوتے اتنے بڑے ہوگئے کہ صبور احمد اور خوشنما ان کے سامنے بونے لگنے لگے۔ ایک بیٹا نوکری کر کے باہر چلا گیا اور اس نے وہیں شادی کر لی۔ ایک شہر میں رہنے لگا اور اس نے بھی وہیں شادی کر لی۔ چھوٹا بیٹا گاؤں میں رہتا تھا کیونکہ اس نے گاؤں میں شادی کی تھی۔
ایک شام جب صبور احمد بھی چلا گیا تو خوشنما کے مسکراتے لب خاموش ہوگئے۔ اب وہ چپ چاپ سب کے چہروں کی طرف دیکھتی رہتی۔ باپ کے چالیسویں کے بعد بیٹے ایک گھنٹہ کمرے میں بند ہو کر مذاکرات کرتے رہے اور جب باہر نکلے تو ان کی آوازیں تیز ہوتی جارہی تھی۔
"میں کیسے رکھ سکتا ہوں؟ انگلینڈ ہے وہ کوئی ہمارا گاؤں نہیں۔ کوئی پوچھے گا کہ یہ گونگی کون ہے؟ تو کیا کہوں گا میں۔" سوری میں نہیں رکھ سکتا۔
"تو میری کیا عزت نہیں ہے۔ میں بھی شہر میں رہتا ہوں میرے بھی سوشل سرکل میں مذاق بنے گا میں نہیں رکھ سکتا۔"
اور گونگی اس سب سے بے نیاز انگلی سے زمین پر دائرے بنا رہی تھی یہ ایک دائرہ...... یہ دو......
یوں پھر بیٹوں نے ایک ایک سال بانٹ لیا۔ پہلی باری بڑے بیٹے کی آتی تھی تو وہ اپنے ساتھ شہر لے آیا۔ وہ اشاروں کی زبان بولنے والی اب آنکھوں کی زبان سمجھنے لگی تھی تو چھوٹے بیٹے کی ناگواری کیسے نہ دیکھ پاتی۔ شہر میں آئے ہوئے دوسرا روز تھا۔ پہلے روز تو نوکرانی نے بہو کے کہنے پر کھانا لا کر کمرے میں دے دیا۔ کمرہ کیا تھا اسٹور تھا۔ جس کے ایک کونے میں صندوق رکھ کر سونے کے لئے جگہ بنائی گئی تھی۔ دوسرے روز جب خوشنما کو بھوک زیادہ لگی تو اسٹور سے نکلی۔ خوشبو سے سمت کا اندازہ کرتے ہوئے کچن

میں آ گئی۔ کچن میں تین چار کک لگے ہوئے تھے کیونکہ شام کو گھر میں پارٹی جو تھی۔ ایک کک نے آتے ہوئے دیکھ لیا۔

''یہ کون ہے؟ پہلے تو نہیں دیکھی۔''

''شاید صفائی والی ہے نئی ہوگی، اے اماں کیا ہوا۔''

اماں نے اشارہ کیا بھوک کا اور وہ خاک سمجھے۔ ایک نے لا کر وائپر اور ڈیٹول تھما دیا۔ خوشنما نے ہاتھ میں پکڑے پکڑے کچھ سوچا اور باہر آ گئی ایک کمرے میں ملازمہ ڈسٹنگ کر رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لوبی میں لے آئی اور وہاں چھوڑ کر چل دی۔ خوشنما نے پہلے ڈیٹول گرادیا اور پھر وائپر چلانے لگی۔ چلاتی رہی جب تک دن کے تین بجے ملازموں کو کھانا نہیں دیا گیا۔ اسے بھی صبح والی ملازمہ نے ایک پلیٹ میں کھانا دے دیا۔ وہ کھانا کھا کر پھر اسٹور میں آ گئی۔

پھر سارے ملازمین کو پتا چل گیا کہ وہ گونگی ہے۔ اب اس کو کھانا دینے کا بھی نیا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ صبح وہ باہر نکلتی کک ٹرے میں رکھی روٹی اور سالن اس کی طرف بڑھاتا اور وہ ہاتھ آگے کرتی وہ فوراً ٹرے پیچھے کر کے سنک میں پڑے برتنوں کی طرف اشارہ کرتا۔ وہ برتن دھونے میں جت جاتی۔ جب برتن دھو کر وہ پھر ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو جلدی جلدی ملازمہ کچن میں آ کر ایک ہاتھ سے ٹرے پیچھے کرتی دوسرے ہاتھ سے وائپر تھما دیتی۔ یوں باری باری ایک ٹرے کو پکڑ کر سب اپنا کام نکلوا لیتے تب تک شام کے چھ بج جاتے۔ خوشنما کھانا کھانے کے بعد پھر آسمان کی طرف دیکھتی اور دیکھتی رہتی۔

سردیاں آ گئی اب خوشنما کو زیادہ سردی لگنے لگی۔ وہ سردی سے کانپتی رہتی لیکن کون دیکھتا۔ بیٹا صبح جاتا آدھی رات کو واپس آتا۔ بہو کے پارٹیز ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے اور بچے اسکول سے آتے تو کوچنگ سینٹر چلے جاتے اور وہ کانپتی رہتی۔ دوسرے ملازمین کو تو کافی تنخواہ ملتی تھی اور ان کی یونیفارم سے میچنگ سویٹرز بھی تھے۔ مسئلہ تو سارا خوشنما کا تھا اسے تو کام کے بدلے ایک ٹرے کھانا ملتا۔ یونیفام اور میچنگ سویٹر کدھر سے لاتی لیکن پھر اس نے سردی کا حل ڈھونڈ لیا۔ دسمبر کی ایک صبح وہ کچن میں آ گئی تو سب ہنسنے لگے۔

کیوں...... کیونکہ اس نے قمیص کے اوپر قمیص اور شلوار کے اوپر شلوار چڑھائی ہوئی تھی۔ یہ کالے آستینوں کے نیچے ایک عدد اور بھورے آستین اور اوپر والی قمیص چھوٹی تھی نیچے والی لمبی تھی اور وہ جب پائنچوں کے نیچے ایک اور پائنچہ نکالے آگے بڑھی تو سب کھی کھی کرنے لگے۔ زبان والے بھی نا زبان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔

وہ ٹکر ٹکر سب کا منہ دیکھنے لگی اور سب اپنے اپنے منہ اور پیٹ پر ہاتھ رکھے بندروں کی طرح اچھل رہے تھے۔

دسمبر کے درمیان میں خوشنما کی آستینوں کی تعداد پانچ ہوگی۔ پانچ سے زیادہ اس کے پاس کپڑے بھی نہیں تھے۔ یوں دسمبر ختم ہو گیا اور سال بھی۔ اب منجھلے بیٹے کی باری تھی۔ ایک شام وہ آ گیا اور اسے لے کر انگلینڈ آ گیا۔ راستے بھر میں خوشنما طرح طرح کی آوازوں سے ڈرتی رہی اور بیٹا اس خوف سے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لیں چھوٹے سے اپارٹمنٹ کے ایک کونے میں اس کے لئے جگہ بنائی گئی۔ منجھلے کے بچے نہیں تھے۔ بیوی نے اسے کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہ دیا۔ ایک دن گزر گیا اگلے دن وہ اٹھی تو میڈ نے توس اور جوس اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ کچن میں آ گئی۔ برتن دھلے ہوئے تھے۔ باہر صفائی بھی کی گئی تھی۔ وہ حیران ہو کر توس کی طرف دیکھنے لگی جب ادھر ادھر سے کوئی ہاتھ ٹرے جھپٹنے نہ آیا تو کھا لیا۔ اتنے میں بہو آ گئی۔

''اماں جی آپ نے یہاں سے ہلنا نہیں ہے۔ میں نے گھر ابھی صاف کروایا ہے ورنہ پھر سمیل لگ جائے گی اور یہ اسٹیل کے برتن آپ کے لئے منگوائے ہیں ان کے علاوہ کسی برتن کو ہاتھ نہیں لگانا ورنہ جرم لگیں گے۔

وہ سمیل اور جرم کو خاک سمجھی البتہ اپنی جگہ پر ہی بیٹھی رہی۔

شام کو بہو کی فرینڈز دروازے پر آ گئیں۔ بہو نے میڈ کو دروازہ کھولنے سے روک دیا۔

''پہلے اماں جی کو چھپاؤ۔ میری فرینڈز دیکھیں گی تو کیا سوچیں گی۔''

اور میڈ اِدھر اُدھر بھاگنے لگی چھپانے کی جگہ ڈھونڈنے کے لئے۔ اب جیتی جاگتی اماں جی تھی کوئی سوئی نہیں کہ کسی ڈبے میں ڈال دیتی۔ ڈور بیل جب لگاتار بجتی رہی تو بہو نے شوہر کو کال ملائی میری فرینڈز آ ئیں ہیں تمہاری اماں کو کہاں چھپاؤں اب جھنجلا کے پوچھا گیا۔ دوسری طرف سے بیٹے نے پتا نہیں کیا کہا کہ بہو نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کال کاٹ دی۔ پھر بہو نے قد آور الماری کا پٹ کھول کر اماں جی کو بازو سے پکڑ کر اندر ڈال دیا اور کھڑاک سے پٹ بند کر کے لاک کر دیا۔ خوشنما الماری کے چوڑے کیبنٹ میں ڈری سہمی اونگھتے اونگھتے سو گئی۔ پھر یہی معمول بن گیا۔ روز فرینڈز آتی روز خوشنما کو الماری میں سونا پڑتا۔

بیٹا تین دن کے ٹور پر اپنے باس کے ساتھ دوسرے ملک چلا گیا۔شام کو پھر فرینڈز آ گئی اور بہو نے جلدی جلدی الماری کا پٹ کھول دیا۔خوشنما سمجھ گئی اور جلدی سے اندر آ کے بیٹھ گئی۔بہو نے الماری لاک کر دیا۔فرینڈز کے ساتھ پہلے کافی اور پھر مووی دیکھی۔پھر باتیں کرتے کرتے صبح ہو گئی تھی۔یار کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ایک دوست کا مشورہ باقی سب کا اصرار میڈ کو کال کر کے تین دن کی چھٹی دے دی۔جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر بیگ اٹھایا اور ہنستے ہنستے سب نکل گئیں اور اس افراتفری میں خوشنما کا کسے یاد رہا۔

......☆☆......

''میں ائر پورٹ سے گھر آ رہا ہوں ڈیئر تم کہاں ہو؟''

''اوہ سوری سوئٹ ہارٹ میں تمہیں لینے نہ آ سکی میں اینجیلا کے گھر پر ہوں تم آؤ میں بھی ابھی نکلتی ہوں۔''

یہ سمیل کیسی آ رہی ہے گھر سے۔وہ ناگواری سے بولا۔ڈونٹ تو کہیں کوئی چوہا نہ مرا ہو۔وہ بڑبڑائی۔

''اماں کہاں ہے؟''اوہ اماں اسے یاد آ گیا اماں تو الماری میں ہے جلدی سے الماری ان لاک کیا اندر کا منظر نا قابل برداشت تھا ان کے لئے جو بینائی رکھتے ہیں۔سکڑی ہوئی خوشنما کونے میں پڑی تھی لاش سے بدبو اٹھنے لگی تھی۔وہ ناک پر ہاتھ رکھتا پیچھے ہٹا۔

''یہ......یہ......کیسے؟''وہ ہکلایا۔

''میں نکالنا بھول گئی تھی۔''

''او مائی گاڈ اب کیا کریں۔''وہ دنگ رہ گیا آہستہ آہستہ ہوش و حواس کام کرنے لگے۔

''کفن دفن کا انتظام کر دیتا ہوں۔''

''پاگل ہو گئے ہو کتنا خرچہ آئے گا اندازہ ہے؟''

''اور کیا کروں؟ایک تو تمہاری سستی نہ ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا۔''وہ ٹھیک سے غصہ بھی نہیں ہو پایا۔

''دیکھو دفن پر بہت پیسے لگے گے ایک قبر کی قیمت بہت زیادہ ہے یہاں اور پھر کفن وغیرہ اور جس کو پتا چلے گا منہ اٹھا کے آ جائیں گے گنوار پاکستانی اور یہاں سب کے سامنے سبکی الگ ہوگی۔ایسا کرتے ہیں چپکے سے تابوت میں پاکستان بھیج دیتے ہیں وہاں تمہارے بھائی کر لیں گے۔''

اس کے مادیت پرست ذہن نے فوراً جمع تفریق کی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے میں ابھی تابوت کا انتظام کر دیتا ہوں۔''وہ باہر نکلا اور گونگی کی گونگی لاش اس طرح چیخ اٹھی کہ آسمان لرز اٹھا۔



ذوقِ آگہی

سباس گل

بکھرے موتی

قرآن مجید کی برکت

حضرت انس و جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانو!

اپنے گھروں میں اکثر قرآن مجید پڑھتے رہا کرو، کیوں کہ جس گھر میں قرآن مجید نہیں پڑھا جاتا اس میں خیر و برکت نہیں ہوتی۔

(دراقطنی جی السنن)

حسن اختر پریم......کراچی

خاتم النبیین سیدنا محمد ﷺ

سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت تمام زمانوں اور مکانوں کے انسانوں کے لیے ہے۔ ایسا کوئی زمانہ، نہ ایسی کوئی جگہ جہاں خاتم النبیین ﷺ کی نبوت و رسالت اور عصمت و امامت کا علم نہ لہرایا گیا ہو۔ اب کسی زمانہ و کسی جگہ میں کوئی نبی پیدا ہو تو کیوں؟ وہ آ کر کیا کرے گا، کیا سنائے اور کیا سکھائے گا؟ نہ کوئی آپ ﷺ سے بڑھ کر ہے، نہ مساوی اور جو آپ ﷺ سے مرتبہ میں چھوٹے تھے، وہ سب کے سب اللہ نے ماضی میں نبوت اور رسالت کے ابتدائی ارتقائی مراحل میں بھیج دیئے۔ جب پوری انسانیت کو ایک کے انتظار میں سنوارا، سجایا اور وہ آنے والے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ آ گئے۔ سب سے اعلیٰ اور نبوت رسالت کے ارتقا و کمال کی انتہا تھے۔ آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی آ سکتا نہیں اور کم تر درجہ کا پیدا ہو تو عروج سے زوال کی طرف آنے والی بات ہے۔ عظمت سے پستی کی طرف آنے کا تصور کونین کی ہلاکت کے مترادف ہے۔

حضور ختمی مرتبت ﷺ کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ تمام انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات تو حضور ﷺ کی امت میں شمولیت کو فخر سمجھیں اور اپنے امتیوں کو حضور ﷺ کی اتباع میں دیکھ کر فرحت و انبساط کا اظہار کریں جب کہ ایک ذلیل ترین شخص، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی امت گرامی کو اپنی اتباع کی طرف پکارے، یہ بغاوت ہے نبوت و رسالت محمد ﷺ کی۔ عباء ختم نبوت محمد ﷺ کی اور امتِ محمد ﷺ کی۔ مرزا قادیانی (لعنتہ اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واعوانہٖ وانصارہٖ) کی اطاعت کیوں؟

عبدالرحمان......پشاور

ابلیس

مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فرشتے نور (عرش) سے پیدا کیے گئے ہیں اور جنات خالص آگ سے اور آدم اس چیز سے جو تم سے بیان کی گئی (یعنی مٹی)

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ابلیس یعنی شیطان ایک لمحے کے لیے بھی فرشتوں میں سے نہ تھا حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جناب حضرت آدمؑ سے دو ہزار سال پہلے سے دنیا میں آباد تھے انہوں نے ایک دوسرے کا خون بہانا شروع کر رکھا تھا شہر بن جوشب فرماتے ہیں کہ ابلیس جنوں میں سے تھا جب جنوں نے زمین پر فساد مچایا تو اللہ نے ان کی سرکوبی کے لیے فرشتوں کی ایک جماعت بھیجی جنہوں نے جنوں کو قتل کیا اور بہت سوں کو سمندری جزیروں کی طرف دھکیل دیا ابلیس ان قیدیوں میں سے تھا جنہیں فرشتے پکڑ کر اپنے ساتھ آسمان کی طرف لے گئے تھے تو یہ وہیں آسمانوں میں رہتا تھا حضرت ابن مسعود، ابن عباس، صحابہ کی ایک جماعت سعید بن مسیب اور دیگر تابعین فرماتے ہیں کہ ابلیس آسمانوں میں فرشتوں کا سردار تھا حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا نام عزرائیل تھا اور انہی کی روایت ہے کہ اس کا نام حارث تھا نقاش فرماتے ہیں کہ اس کی کیبت ابوکردوس تھی حضر ابن عبار ماتے ہیں کہ یہ ملائکہ کی ایک جماعت میں سے تھا جس کو جن کہا جاتا ہے یہ جنوں کے نگراں تھے اس جماعت پر علم اور عبادت کے اعتبار سے شیطان اونچا مقام رکھتا تھا ابلیس کے چار پر تھے اللہ نے اس کو مسخ کر کے شیطان رجیم بنا دیا حضرت حسن بصری اور ابن سیرین

فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا شمس وقمر پرستش بھی محض قیاس کی وجہ سے کی جاتی ہے (ابن جریر) مطلب یہ ہے کہ اس نے قیاس کرتے ہوئے اپنا اور آدم کا موازنہ کیا اور اپنے آپ کو ان سے اعلیٰ واشرف سمجھتے ہوئے انہیں سجدہ کرنے سے انکار کیا حالانکہ فرشتوں کے ساتھ ساتھ اسے بھی سجدہ کرنے کا حکم ملا تھا حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے اپنے دست مبارک سے پیدا فرمایا تاکہ ابلیس ان کے آگے اپنی بڑائی کا اظہار نہ کر سکے چنانچہ انہیں بشر بنایا۔ حضرت آدم ایک مٹی کے بنے ہوئے ڈھانچے کی شکل میں چالیس سال پڑے رہے جو چالیس سال جمعہ کے دن کے برابر تھے فرشتے ان کے پاس سے گزرتے اور دیکھ کر گھبراتے تھے سب سے زیادہ گھبراہٹ ابلیس کو تھی وہ ان کے پاس سے انہیں مارتا ہوا گزرتا تو اس جسم سے ایسی آواز آتی تھی جیسے کھنکھناتی ہوئی مٹی کی ٹھیکری سے آواز نکلتی ہے پھر وہ اس جسم میں داخل ہوا اور پیچھے کے راستے سے باہر نکل آیا باہر آ کر فرشتوں سے کہنے لگا کہ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہارا رب بے نیاز ہے اور یہ اندر سے خالی ہے اور اگر میں اس پر مسلط ہوا تو اسے ہلاک کر دوں گا پھر جب وہ وقت آیا کہ اللہ نے حضرت آدم میں روح پھونکی تو فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں یہ حکم ابلیس کے لیے بھی تھا سب فرشتے سجدے میں گر گئے تھے۔ مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اللہ نے اس سے پوچھا کہ کس چیز نے تجھے سجدے سے روکا؟ وہ انتہائی غرور وتکبر سے بولا (شق ثانی واقع ہے) یعنی میں آدم سے بہتر ہوں، کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو خاک سے اپنے حکم کی نافرمانی کے سبب اللہ نے ابلیس کو حکم دیا کہ جنت سے نیچے اتر جا اور یہاں سے نکل جا تیرے جیسے مغرور ومتکبر کی یہاں گنجائش نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس آسمان میں تھا اس لیے اسے نیچے اترنے کا حکم دیا گیا جس مقام ومرتبے پر وہ اپنی عبادت کی وجہ سے فائز ہوا تھا یعنی وہ اپنی فرمانبرداری اور عبادت میں فرشتوں کے مشابہ تھا پس اس کی یہ ساری فضیلت اس کے غرور وتکبر، حسد اور اپنے پروردگار کی نافرمانی کے سبب سلب کر لی گئی اور اس کو راندہ درگاہ بنا کر زمین کی طرف اتار دیا گیا اللہ تعالیٰ نے اسے مردود قرار دے کر قیامت تک کے لیے لعنت زدہ قرار دے دیا پس جب اسے عزرائیل کے بجائے ابلیس، شیطان، مردود اور معلون جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے اور یہ سارے نام لعنت زدہ ہی تو ہیں۔

گل مہر......کراچی

عبرت انگیز

تاریخ اسلام کا کتنا عبرتناک منظر تھا جب معتصم باللہ آہنی زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا چنگیز کے پوتے ہلاکو کے سامنے کھڑا تھا کھانے کا وقت آیا ہلاکو نے خود سادہ برتن میں کھانا کھایا اور خلیفہ کے سامنے سونے کی طشتریوں میں ہیرے اور جواہرات رکھ دیے، پھر کہا۔ ''جو سونا چاندی تم جمع کرتے تھے اسے کھاؤ۔'' بغداد کا یہ تاجدار بے چارگی و بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا بولا۔ ''میں سونا کیسے کھاؤں۔''

ہلاکو بولا ''پر یہ سونا چاندی جمع کیوں کیا تھا۔''

وہ مسلمان جسے انکار دین قیمتی سے قیمتی ہتھیار بنانے اور اسباب حرب جمع کرنے کی ترغیب دیتا ہے لا جواب کھڑا رہا۔

ہلاکو نے عالیشان محل کی مزین ومنقش عمارت دیکھی تو پوچھا۔

''تم نے ان کو پگھلا کر تیر کیوں نہ بنائے یہ جواہر جمع کرنے کے بجائے اپنے سپاہیوں کو جانبازی سے میری فوج کا مقابلہ کرنے کیوں نہ دی۔

خلیفہ نے افسوس سے جواب دیا۔ ''یہی خدا کی مرضی تھی۔''

ہلاکو نے کڑکدار جواب دیا۔ ''پھر جو تیرے ساتھ ہونے والا ہے وہ بھی خدا کی مرضی ہے اور پھر خلیفہ کو کھال میں لپیٹ کر گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روند ڈالا اور بغداد کو قبرستان بنا ڈالا۔

ہلاکو خان نے کہا ''آج میں نے بغداد کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا اور اب دنیا کی کوئی طاقت پہلے والا بغداد نہیں بنا سکتی۔

تاریخ فتوحات گنتی ہے محل، جواہرات، لباس، لذیذ کھانے اور جائیداد نہیں۔ (بشکریہ، محاسن اسلام، اپریل 2017)

ایس حبیب خان......کراچی

حضرت لقمان نے فرمایا

کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ۔
جب لوگوں کے پاس آؤ تو زبان کی نگہداشت کرو۔
جو بات دشمن سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو دوست سے بھی پوشیدہ رکھو۔
جدوجہد نہ کرنا محتاجی کا باعث ہے اور محتاجی دین کو تنگ عقل کو خفیف اور مروت کو زائل کرتی ہے۔
مصائب سے مت گھبرایئے کیونکہ ستارے اندھیرے میں چمکتے ہیں۔
حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔
کوئی بھی چیز تیرے نزدیک نعمت آخرت سے محبوب تر نہ ہو۔
خاموشی کو اپنا شعار بناؤ تا کہ زبان شر سے محفوظ رہے۔

عبدالجبار رومی...... قصور سٹی

اچھی باتیں

مسلمانوں کا ہر فرقہ ایک دوسرے کو کافر کہتا ہے ایک کافر ہے جو ہم سب کو مسلمان کہتا ہے۔
زمین انسان کو رزق دیتی ہے لیکن جب انسان مرتا ہے تو وہ اسے اپنا رزق بنا لیتی ہے۔
پرندہ زندہ ہو تو چیونٹیاں کھاتا ہے مگر جب پرندہ مر جاتا ہے تو چیونٹیاں اسے کھاتی ہیں۔
انسانیت کا رشتہ بہت بڑا خزانہ ہے اسے لباس میں نہیں انسان میں تلاش کرو کبھی بھی دھوکہ نہیں کھاؤ گے۔
کل ایک انسان روٹی مانگ کر لے گیا اور بدلے میں کروڑوں کی دعائیں دے گیا پتا نہیں چلا کہ غریب وہ تھا یا میں۔
اچھی سوچ اور نیت والوں کو سکون ڈھونڈنا نہیں پڑتا ان کے دل میں ہمیشہ کسی نکھری صبح کی طرح اجلے اور پرسکون رہتے ہیں۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

انوکھا لاڈلا

صبح ہو چکی تھی بیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔
ماں نے سرہانے جا کر پیار سے کہا اٹھ جاؤ بہت دیر ہوگئی ہے تمہیں اسکول جانا ہے۔
''نہیں، میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔''
''تم دو دن سے غیر حاضر ہو، بہت بری بات ہے۔''
ماں نے قدرے خفگی سے کہا۔ ''تم اسکول جانے سے کیوں جی چراتے ہو؟''
''میں اسکول جاتا ہوں تو وہاں سب بچے اور استاد مجھ سے نفرت کرتے ہیں وہاں میرا دل نہیں لگتا آخر میں اسکول کیوں جاؤں۔''
''میرے پیارے بیٹے اسکول جاؤ۔ اس لیے کہ اب تم باون سال کے ہوگئے ہو اور تم اس اسکول کے پرنسپل ہو، آج کل گھوسٹ اسکولوں کے ساتھ ساتھ گھوسٹ اساتذہ کی بھی شامت آئی ہوئی ہے۔

مہرین خان...... ہری پور

حضور ﷺ کی نبوت

اب انسان، اس جھوٹے اور کھوٹے شخص کے پیغام نافرجام کے منتظر نہیں۔ جب حضور ﷺ کی نبوت و رسالت، امامت اور امت سب قیامت تک کے لیے ہے تو پھر مرزائی یہ بتائیں کہ مسٹر ''گاما'' قادیانی کس نسل اور زمانے کے لیے ہے؟ اب ''گاما قادیانی آ کر کیا کرے گا؟ اب جو بھی اس وادی میں قدم رکھے گا، ذلیل و رسوا ہوگا، منہ کے بل گھسیٹا جائے گا۔ اب نہ تو کوئی پیغام باقی ہے جو نازل کیے جانے کے قابل ہو اور نہ ہی کوئی ایسا شخص جو نبوت کا اہل ہو...... یہ دونوں اعلیٰ و ارفع مقامات، سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر مکمل ہو چکے ہیں۔ سچ فرمایا آپ ﷺ نے:
ترجمہ: ''میں نبیوں میں آخری نبی اور تم آخری امت ہو۔''

(ابن ماجہ)

ندیم عطاری...... نیو کراچی

ہمارے حکمران

تضاد حالات کہوں
یا تقاضہ وقت کہوں
اس انقلاب کو میں کیا کہوں
کل جس نبی ﷺ کا خلیفہ رہتا تھا
راتوں کو گلیوں میں گشت پر
غریب چولہوں کی فکر میں
آج اس نبی ﷺ کا امتی بندوق تھامے کھڑا ہے
حکمراں کے تحفظ کے لیے......!

عائشہ صدیقہ...... چکوال

دنیا

یہ دنیا ایک بس اسٹاپ، ایئر پورٹ اور ریلوے اسٹیشن کی طرح ہے جہاں مسافر آتے اور چلے جاتے ہیں لیکن یہاں کوئی بھی مستقل قیام نہیں کر سکتا۔

یہ ہواؤں کا چلنا، بادلوں کا جھومنا، دریاؤں کا بہنا، چڑیوں کا گانا، دن کا اجالا، رات کی تاریکی، بارش کی ٹھنڈک، سورج کی تپش، یہ اپنوں کی محبت، دشمنوں کی دشمنی، رشتوں پر اعتبار سب کچھ اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ اس دنیا میں رونما ہونے والی بہت سی تبدیلیاں ہیں یہ دنیا ایک خواب سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

گلشن شہزادی...... نیا لاہور

صبر کرنے کا وقت

صبر اپنے وقت پر ہوتا ہے مدت گزر جانے کے بعد تو ہر ایک کو صبر آ ہی جاتا ہے وہ صبر باعث اجر نہیں ہوتا صبر وہی باعث اجر ہوتا ہے جو ارادہ اور اختیار سے مصیبت کو دبانے کے لیے کیا جائے حدیث شریف میں ہے کہ ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا نبی کریم ﷺ ادھر سے گزرے بڑھیا واویلا کر رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا صبر کرو وہ آپ ﷺ کو پہچانتی نہ تھی جواب دیا کہ ہاں تمہارا جوان بیٹا مر گیا ہوتا تو پتا چلتا آپ ﷺ چل دیے کسی نے کہا اللہ کے رسول محمد ﷺ تھے۔ وہ بڑھیا دوڑی دوڑی آئی اور کہا اب میں صبر کروں گی آپ ﷺ نے فرمایا۔

ترجمہ: صدمہ اور رنج پہنچتے ہی آدمی صبر کرے تو مؤجب اجر ہوتا ہے۔

مدیحہ شبیر...... شاہ نکڈر

اللہ حافظ

پہلا ادیب: ''اس قوم کا اللہ حافظ ہے۔''

دوسرا ادیب: ''کیوں کیا ہوا؟''

پہلا ادیب: ''غضب خدا کا میں نے تحریریں چوری کرنے کی مذمت میں ایک مضمون لکھا اور چھپوایا کسی نے وہی مضبوط چوری کر کے اپنے نام سے دوسرے رسالے میں چھپوالیا۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

تاج محل

آگرہ تاج محل مشہور مغل بادشاہ شاہ جہان نے اپنی محبوبہ ممتاز محل کی یاد میں تعمیر کرایا ہے عمارت خوب صورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، اس کی تعمیر بیس سال میں مکمل ہوئی نقش و نگاری کے لیے فنکار چین سے منگوائے گئے انہوں نے بڑی خوب صورتی سے نقاشی کا کام سرانجام دیا، مرمر کے مختلف قسموں کے باسٹھ پتھروں کو ملا کر جو پھول بنایا گیا اس کے جوڑ بالکل نظر نہیں آئے اس قدر حسین و جمیل تاج محل کہیں بھی نہیں پایا جاتا اور اسے چاندنی رات میں قطعی طور پر دیکھنا منع قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کے نقش و نگار اور خوب صورتی ذہنی توازن پر اثر انداز ہونے کا خطرہ ہے، یہ تاج محل خاوند اور بیوی کی بے پناہ محبتوں کا امین ہے۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

اَنتَ وَمَالُکَ لِاَ بِیکَ

دنیا میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب بیٹے کو دنیا حاصل ہوتی ہے روزی کی بہتات ہوتی ہے اس کے خزانے مال و دولت سے پر ہو جاتے ہیں بہت زیادہ کشادگی حاصل ہو جاتی ہے اور خوب صورت بیوی اسے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے تو وہ اپنے والدین سے بے توجہی برتنے لگتا ہے اپنے باپ کو اور جو کچھ اس نے اس پر خرچ کیا اور جو احسانات کیے تھے وہ سب بھول جاتا ہے اس پر کچھ خرچ کرنے سے اپنا ہاتھ روک لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔

سعید خان...... کراچی

قابل رشک

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید لیکن قیامت کے دن اللہ کی طرف سے ان کو ملنے والے رتبے اور مقام پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو بغیر کسی رشتے داری اور لین دین کے صرف اللہ کی رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان کے چہرے روشن ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر جلوہ افروز ہوں گے۔

(سنن ابوداؤد)

تنویر جمال...... ڈیرہ اسماعیل خان

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

بنام زینب

تو، تو کہتی تھی تیری پری ہوں میں
ہوا کا جھونکا، پھولوں کی لڑی ہوں میں
لیکن پریوں کو کوئی یوں مسلتا ہے
زخم دیتا ہے اور جان لے لیتا ہے
لوری دیتے ہوئے تو نے جو سنائیں
مجھ کو انسانیت کی ساری وہ کہانیاں جھوٹی تھیں
ماں انکل نے مجھے بہت مارا ہے
نازک ہاتھ موڑے ہیں گلا دبایا ہے
چومتے نہ تھکتی تھی جنہیں تو کبھی
ان گالوں کو تھپڑوں سے سجایا ہے
پھولوں پر سلایا تھا جس کلی کو تو نے
انکل نے اس جسم کو کچرے پر ڈالا ہے
بابا کی باہوں میں جس نے جھولے جھولے
انکل نے اسی گڑیا کا گلا دبایا ہے
اب میں تو نہیں آؤں گی لیکن ماں اتنا کرنا
میری گڑیا کو کبھی گھر سے نہ نکلنے دینا

کامران مغل......

غزل

دوزخ کا وہ سامان ہے شیطان کہیں کا
ظالم ہے وہ حیوان ہے شیطان کہیں کا
جاہل کی جہالت کا جو اندازہ کرو گے
تم بولو گے شیطان ہے شیطان کہیں کا
ماں باپ کی تھی لاڈلی وہ پھول سی زینب
پر شخص وہ بے جان ہے شیطان کہیں کا
حاکم ہیں مرے شہر کے اپنے نشہ میں گم
مُنصف بھی بے ایمان ہے، شیطان کہیں کا
جانے کہاں ہیں سو گئے سب امن کے راہی
گھر کر گیا ویران ہے شیطان کہیں کا
آتے نہیں امداد کو عثمان و علی کیوں!
نمرود ہے، ہامان ہے، شیطان کہیں کا
گوہر کہاں سے لائیں گے معصوم سی زینب
دل باپ کا سُنسان ہے، شیطان کہیں کا

گوہر فرید...... بورے والا

غزل

کھا رہی ہے نوچ کر دل کی صدا میرا وجود
کیا اسی خاطر بنایا تھا خدا میرا وجود
دیکھ لے یہ ہجر ہے ہر سمت ہی پھیلا ہوا
اور اس کے درمیاں جلتا دیا میرا وجود
دل پہ یادیں ہیں تمہاری اک اذیت کی طرح
کاٹتا ہے اس لیے تنہا سزا میرا وجود
زندگی کی راہ پر ٹکراؤ چاہت سے ہوا
لے کہ زخمی پھر رہا ہے اب انا میرا وجود
بجلیاں بن کر تری یادیں گریں تنہائی پر
اور غم کی سہہ رہا ہے انتہا میرا وجود
سامنے کتنے ہی لشکر پیاس کے موجود ہیں
بن کے رویا نوحہ نوحہ کربلا میرا وجود
روح تک پھیلا ہوا ''تنہا'' عجب اک دشت ہے
ہو رہا ہے جس میں مجھ سے ہی جدا میرا وجود

عاصم تنہا......بھکر

غزل

کس کی کھوئی ہوئی ہنسی تھی میں
کس کے ہونٹوں پہ آ گئی تھی میں
کن زمانوں پہ منکشف ہوئی ہوں
کن زمانوں کی روشنی تھی میں

میں کسی شخص کی اداسی تھی
سرد لہجے میں بولتی تھی میں
دن ڈھلے لوٹتے پرندوں کو
گھر کی کھڑکی سے دیکھتی تھی میں
کاش اک بار دیکھ لیتے تم
راستے میں پڑی ہوئی تھی میں
اب جو افسردگی کی چادر ہوں
موسمِ گل کی اوڑھنی تھی میں
خود کو دریافت کرنے نکلی ہوں
یعنی خود سے کہیں خفی تھی میں
گنگناتا تھا شب کے پچھلے پہر
جانے کس دل کی راگنی تھی میں
پھر دسمبر تھا سرد راتیں تھیں
شہر سوتا تھا جاگتی تھی میں
اس نے جب ہاتھ ہاتھ پر رکھا
سرخ پھولوں سے بھر گئی تھی میں
آج دیکھا تھا آئینہ میں نے
اور پھر دیر تک ہنسی تھی میں
جانے کیا بات یاد آئی مجھے
ہنستے ہنستے جو رو پڑی تھی میں
میں نے اک شام پا لیا تھا اسے
اس سے اک رات کھو گئی تھی میں
جانتا کون مجھ کو میرے سوا
گھر کے اندر بھی اجنبی تھی میں
میری پرتیں نہیں کھلیں اب تک
دیوتاؤں کی شاعری تھی میں
خود سے ٹکرا گئی تھی جاناں کہیں
اپنے رستے میں آ گئی تھی میں

جاناں ملک......

غزل

تاپ کے ہاتھوں کو سردی میں اک بوڑھے انسان کے پاس
بچے قصہ کب سنتے ہیں بیٹھ کے آتشدان کے پاس
پھوٹی کوڑی بھی آنکھوں کی گلک سے نہیں نکلی ہے
سارے خواب میں دھر آئی ہوں شیلف پہ اک دیوان کے پاس
مائے گھر سے دور بھلا کیوں عمر گزارنی پڑتی ہے
گروی رکھنا پڑ جاتا ہے خود کو کسی انجان کے پاس
آج بہت سی باتیں دل سے تیرے بارے کرنی ہیں
آج انا کو پھینک دیا ہے ٹوٹے ہوئے گلدان کے پاس
کومل گھر کے سب لوگوں کے چہروں پر بیزاری ہے
صرف دعاؤں کا تحفہ تھا گھر آئے مہمان کے پاس

کومل جوئیہ......

غزل

غم کے موسم میں اذیت نے سند جاری کری
اشک نے آنکھ کی دنیا سے نمو داری کری
جیسے حالات ہیں ویسا ہی نظر آتا ہوں
خود پہ مانگی ہوئی وحشت تو نہیں طاری کری
شعر کہنا مجھے آساں تو نہیں تھا لیکن
موسمِ ہجر میں اشکوں نے اداکاری کری
میں نے حیرت کی نگاہوں میں بھی حیرت دیکھی
جب ہواؤں نے چراغوں کی طرف داری کری
غیر ممکن تھا مگر نام کمانے کے لیے
دل کے بازار سے زخموں کی خریداری کری
وہ جہاں پر ہے نہیں چین میسر اس کو
بس اسی بات نے دل میں بڑی بیزاری کری
عشق کے در پہ جبیں اس نے جھکائی تو سعید
پھر زمانے نے مبشر سے بھی دل داری کری

مبشر سعید......ملتان

نظم

آؤ ایسے شوق کو رسوا کریں
کچھ پرندے پر رکھتے ہوئے بھی

پروازنہیں کر سکتے
پرواز کی خواہش لیے
صرف اورصرف پرپھڑپھڑاتے ہیں
یہ پرندے اپنے اپنے ملکوں کے
شوق کے قیدی بنے
مالک کی خواہش کے سبب
پنجروں کے اسیری ہے
آزادلوگوں کی یہ کیسی بے ضمیری ہے
ظریف احسن جیسے لوگوں کے لیے دلگیری ہے
آؤ ایسے شوق کورسوا کریں
صیادکوپسپا کریں

ظریف احسن......

ساتسمندرپار

ساتسمندرپارا کیلی
میں ہوں کب سے یارا کیلی
کاندھے پرہے بوجھ غموں کا
دنیامیں غم خوارا کیلی
تیرے پیار کی خاطر میں تو
چڑھ جاؤں گی دارا کیلی
داتانگری آجاؤں گی
میں اک دن سرکارا کیلی
رستے میں تم پھول بچھانا
آؤں گی اس بارا کیلی
سچ پوچھوتو دل پرفری
سہہ لوں گی سب وارا کیلی

فریدہ فری......لاہور

غزل

بدل چکی ہے ہر اک یاد اپنی صورت بھی
وہ عہد رفتہ کا ہر خواب ہر حقیقت بھی
کچھ ان کے کام نکلتے ہیں دشمنی میں مری
میں دشمنوں کی ہمیشہ ہوں ضرورت بھی
یہ جس نے روک لیا مجھ کو آگے بڑھنے سے
وہ میری بے غرض تھی میری ضرورت بھی
میں اپنی بات کسی سے بھی کر نہ پاؤں گی
مجھے تباہ کرے گی یہ میری عادت بھی
یہ میرا عجب عجز کہ دل میں اسے اترنے دلا
یہ اس کا مان کہ مانگی نہیں اجازت بھی

شاعرہ:شبنم شکیل
انتخاب:پرنس افضل شاہین....بہاولنگر

غزل

لیڈران قوم ایسے بے ریا پیدا کریں
اس وطن میں پیار و الفت کی فضا پیدا کریں
اس جہاں میں بھی بھلا ہو اس جہاں بھی بھلا
دل میں رتی بھر جو ہم خوف خدا پیدا کریں
قتل و غارت میں کمی ہوگی یقیناً بالیقین
قوت برداشت دل میں حوصلہ پیدا کریں
آ مل کر مات دیں ہم غربت و افلاس کو
آؤ مل کر گنج ہائے بے بہا پیدا کریں
جو بچا لائے ہماری کشتیاں گرداب سے
ایسا کوئی باصفا ہم ناخدا پیدا کریں
ہم بھی ہوجائیں خدائے پاک کے نور نظر
اپنے اندر کوئی تو ایسی ادا پیدا کریں
روک سکتے ہیں گناہوں کے قمر طوفان کو
دوستو ہم اپنی آنکھوں میں حیا پیدا کریں

ریاض حسین قمر......منگلاڈیم

غزل

انجان بن رہا تھا مگر جانتا بھی تھا
دل کو محبتیں بھی اس سے گلہ بھی تھا
اب کچھ یاد نہیں رہا بچھڑے تھے کس جگہ
کچھ دور ساتھ ساتھ وہ میرے چلا بھی تھا

پچھلے برس ملا تھا بڑے اہتمام سے
آنکھوں میں رت جگے بھی رنگ حیا بھی تھا
برہم سا ہو بھی جاتا تھا وہ میرے ذکر پر
لیکن اکیلے پن میں مجھے سوچتا بھی تھا
یہ اور بات ہے کہ راس آئیں نہ رونقیں
اک شہر آرزوؤں کا دل میں بسا بھی تھا
اب اختلاف کرتا ہے میرے خیال سے
پچھلے برس تو ساتھ میرے آئینہ بھی تھا

رابعہ افضل......قصور

غزل

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں
بے فائدہ الم نہیں بے کار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں
میری زباں پر شکوہ اہل ستم نہیں
مجھ کو جگا دیا یہی احسان کم نہیں
یا رب ہجوم درد کو دے اور وسعتیں
دامن تو کیا ابھی میری آنکھیں بھی نم نہیں
زاہد کچھ اور ہو نہ ہوے خانے میں مگر
کیا کم یہ ہے کہ شکوہ دیر و جرم نہیں
مرگ جگہ یہ کیوں تیری آنکھیں ہیں اشکبار
اک سانحہ صحیح مگر اتنا بھی اہم نہیں

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

بابا سائیں

میں خالی ہوئی بابا سائیں
یہ دنیا حرص بھری بابل
ان تہمت کے صحراوں میں
میں ننگے پیر پھری بابل
مری چنری لیر و لیر ہوئی
میں کہت کبیر ہوئی بابل
وحشی سنسار کی آنکھوں میں
میں کالی ہوئی بابا سائیں
میں خالی ہوئی بابا سائیں
مری آشاؤں کا قتل ہوا
تری سبز دعائیں ہار گئیں
مری اُجڑی آنکھیں دیکھ ذرا
میں کالی ہوئی بابا سائیں
میں خالی ہوئی بابا سائیں
مری مہندی کو آسیب لگا
مری پور پور ہریالی تھی
مجھے غم کا کلر چاٹ گیا
اک منت اوڑھ کے بیٹھی ہوں
میں ٹالی ہوئی بابا سائیں
میں خالی ہوئی بابا سائیں
مجھے چیر گیا ترا جگ بابا
میں گئی دھرتی سے لگ بابا
مرے کورے سپنے لوٹ گئی
یہ دنیا نکلی ٹھگ بابا
تری راہیں بیٹھی دیکھتی ہے
تری پالی ہوئی بابا سائیں
میں خالی ہوئی بابا سائیں
میں خالی ہوئی بابا سائیں
میں خالی ہوئی......

علی زریون......



مرشد

ساحر جمیل سید

قسط نمبر8

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز
اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی
مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے
بدمعاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر......وہ کسی کا مرید ہو گیا......!!

شاہی محلے کا نمازی بدمعاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی





مرشد دیوانہ وار دوڑتا ہوا بغلی گلی میں پہنچا، عقبی طرف والی گلی کی نکڑ پر اسے ارشاد اور دلبر دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے دکھائی دیے دونوں کے ہاتھوں میں پسٹل دکھائی دے رہے تھے رشید گلی میں موجود گھبرائے اور بوکھلاہٹ کا شکار لوگوں پر دھیان دیے بغیر فوراً دلبر اور ارشاد تک جا پہنچا ارشاد کی بائیں ٹانگ میں غالباً گولی لگی تھی اس کی شلوار خون سے سرخ ہورہی تھی۔

''کیا ہوا، کون لوگ ہیں؟''

''معلوم نہیں تین بندے تھے لگتا ہے نکل گئے لڑکی کو بھی لے گئے۔'' مرشد کے سوال پر دلبر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا، مرشد ہونٹ بھینچتے ہوئے عقبی گلی میں داخل ہوا تو دلبر نے بھی اس کی تقلید کی۔

''ادھر مجیدن کے کوٹھے سے نکلے تھے لڑکی کو گھسیٹ کر اس سامنے والی گلی کی نکڑ پر کھڑی ایک لال رنگ کی کار کی طرف لے جارہے تھے ہم نے روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے فائر کھول دیا۔

دلبر نے مرشد کے ساتھ دوڑتے ہوئے مختصراً معاملہ بتایا مجیدن بائی کا کوٹھا اور نزہت بیگم کا کوٹھا آپس میں جڑے ہوئے تھے ایک کوٹھے سے دوسرے میں داخل ہونا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا اور یقیناً دشمن نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔

مرشد دلبر کی نشان دہی کے مطابق مذکورہ گلی تک پہنچا تو سامنے گلی کی نکڑ پر سرخ رنگ کی کار کی ایک جھلک دکھائی دی اگلے ہی لمحے وہ موڑ مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''یہی..... یہی کار ہے۔''

دلبر نے تیز لہجے میں کہا اور مرشد اندھا دھند گلی میں بھاگتا چلا گیا اس کے پاؤں ننگے تھے جسم پر شلوار اور بنیان ہاتھ میں پسٹل اور چہرے پر وحشت، اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسے کتنی گھبرائی سہمی نظروں نے دیکھا کہاں کون موجود تھا کون اس کے پیچھے بھاگا آرہا تھا اور کون نہیں، اس کے دل و دماغ میں صرف ایک صورت روشن تھی حجاب کی صورت وہ معصوم اور مظلوم چہرہ جو گزشتہ دو تین روز سے اس کی بینائی کا حصہ بنا ہوا تھا جس کا تصور دھڑکن بن کر اس کے دل میں اترا ہوا تھا وہ جس کے تحفظ اور سلامتی کی فکر میں اس کی اماں حسن آرا ہلکان تھی اور کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھی پورا محلہ بھی باخبر ہوچکا تھا کہ نزہت بیگم کے کوٹھے پر نندی پور کی ایک انتہائی معصوم اور خوب صورت لڑکی موجود ہے جسے نزہت بیگم جبراً پیشے پر لگانا چاہتی ہے اور حسن آرا اور مرشد نے اسے اپنی پناہ، اپنے تحفظ کا شکار لے لیا ہے اب اسی لڑکی کو دشمن اغوا کرکے لیے جارہے تھے یہ مرشد کے لیے بڑی ہی ذلت کی بات تھی، اگر اس وقت دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے تو مرشد کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوتا وہ آئندہ نہ تو محلے میں سر اٹھا کر جی پاتا اور نہ کسی سے آنکھ ملانے کے قابل رہتا۔

وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا گلی کی نکڑ تک پہنچا تھا کہ دوسری سمت سے اچانک اس گلی میں داخل ہوتی ہوئی ایک موٹر بائیک سے ٹکرا گیا، بائیک پر دو آدمی سوار تھے رفتار انتہائی کم تھی ڈرائیور نے فوراً بریک پر پاؤں رکھا اس کے باوجود وہ تینوں آپس میں ٹکرا کر بائیک سمیت گر پڑے مرشد کے دائیں گھٹنے پر چوٹ آئی مگر وہ اگلے ہی لمحے کھڑا ہوچکا تھا اس کا سارا دھیان ساری توجہ اس لال کار کی طرف تھی جو قلعہ روڈ پر مڑ چکی تھی وہ پھر سے دوڑنے لگا تھا کہ ٹھٹک گیا پلٹ کر دیکھا تو بائیک سوار اٹھ کر بائیک سنبھال رہے تھے مرشد ان کی طرف پلٹا تو اس کے ہاتھ میں پسٹل اور چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے وہ دونوں گھبرا گئے۔

''وہ، بھائی جی، ہماری تو کوئی غلطی نہیں۔''

''ہٹ جاؤ، بائیک صبح واپس مل جائے گی۔''

مرشد نے پسٹل ڈب میں لگاتے ہوئے بائیک کا ہینڈل تھام لیا۔

''وہ جی..... مگر.....!''

دلبر بھی قریب پہنچ گیا اس کے ہاتھ میں بھی پسٹل تھا وہ دونوں آدمی متذبذب سے ہوکر پیچھے ہٹ گئے اگلے چند لمحوں میں بائیک قلعہ روڈ کی طرف دوڑ رہی تھی مرشد ڈرائیو کررہا تھا اور دلبر اس کے پیچھے بیٹھا تھا جو ہوا تھا بہت برا ہوا تھا مرشد کو اماں کی بھی فکر تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلی تھی کہ اماں کی خبر گیری کے لیے اس کے ساتھی موجود تھے۔

بادشاہی مسجد کے قریب انہیں وہ سرخ کار دکھائی دے گئی آگے چل کر اس کا رخ منٹو پارک کی طرف ہوگیا تھا۔ مرشد کی نظریں کار پر جم کررہ گئیں اسے اندیشہ تھا کہ اگر اب

یہ کار اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو شاید دوبارہ دکھائی نہ دے کار پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی تو مرشد بھی بائیک کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا چکا تھا منٹو پارک کے قریب سے کار شیخو پورہ روڈ پر مڑ گئی، رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی سڑک پر ٹریفک کا اب وہ اژدھام نہیں تھا جو دن بھر رہا کرتا تھا پھر بھی بائیک کی جو رفتار تھی وہ ایک لمحے کی غفلت کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کسی بھی پل وہ کسی جان لیوا حادثے کا شکار ہو سکتے تھے مگر مرشد کو تو جیسے ذرا بھی پروا نہیں تھی اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ لحہ بہ لحہ دور ہوتی اس کار میں حجاب موجود ہے جسے ہر صورت، ہر قیمت پر دشمنوں کے چنگل سے نکال کر بحفاظت واپسی اماں کے پاس پہنچانا ہے اور بس اسی کی طرح دلبر کی بھی ساری توجہ اس کار پر مرکوز تھی شاید اسی لیے وہ دونوں اس بات پر توجہ نہ دے سکے کہ ایک جیپ طوفان کی طرح ان کے پیچھے آ رہی ہے، بائیک بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح اڑی جا رہی تھی اس کے باوجود ان کا اور کار کا فاصلہ کچھ مزید بڑھ گیا تھا جبکہ عقب میں آتی جیپ ان کے قریب ہوتی جا رہی تھی مگر انہیں اس کا احساس نہیں ہوا۔

وہ کوٹ عبدالمالک کے قریب تھے زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں بس اکا دکا کھلی ہوئی تھیں یہاں ٹریفک بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی ان کے کانوں میں ہوا کے شرلاٹوں یا پھر بائیک کے شور کی آواز پہنچ رہی تھی کہ اچانک عقب میں آتی ہوئی جیپ عین ان کے سر پر پہنچ گئی پہلے دلبر کو خطرے کا احساس ہوا پھر مرشد کو مگر انہیں دیر ہو چکی تھی آندھی اور طوفان کی رفتار سے آتی ہوئی جیپ نے موٹر بائیک کو ٹکر ماری تھی مرشد کے کانوں سے دلبر کی بوکھلائی ڈری ہوئی بے معنی آواز ٹکرائی، اس کے وجود کو اس زور کا دھچکا لگا کہ ایک لمحے کو تو اس کا دماغ بھی جیسے کھوپڑی کے اندر قلابازی کھا کر رہ گیا، ہزار کوشش کے باوجود بائیک کا ہینڈل اس کی گرفت سے نکل گیا اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ بائیک اور دلبر بھی سڑک سے اوپر کو ہوا میں بلند ہوئے تھے سامنے سے ایک ہائی ایس آ رہی تھی جس کے بریکوں کی بھیانک چرچراہٹ فضا میں بلند ہوئی اس میں سے کچھ دہشت زدہ گھٹی گھٹی چیخیں بھی بلند ہوئیں بائیک ایک دھماکے سے ہائی ایس کے بونٹ سے جا ٹکرائی جبکہ مرشد اڑتا ہوا اس کی چھت پر گرا اور چھت سے ٹکرا کر روڈ کے دوسرے کنارے پر کھڑے ایک ٹرالر سے جا ٹکرایا ٹرالر پر کسی ٹیکسٹائل مل کے بڑے بڑے بورے لدے ہوئے تھے جس پر ترپال ڈال کر رسے باندھے گئے تھے وہ کوئی سخت چیز تو نہ تھی پھر بھی مرشد جس رفتار سے ٹکرایا تھا اس نے کچھ دیر کو اس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا اس بوروں سے ٹکرا کر وہ ٹرک پر گرا تو اس کا سانس جیسے سینے میں اٹک کر رہ گیا۔ دماغ نے چیخ کر کہا۔

''بس مرشد استاد تم اپنے انجام کو پہنچے۔'' دماغ میں اترتے اندھیروں میں سرخ کار کی بیک لائٹس چمکیں جو برق رفتاری سے دور جا رہی تھیں ساتھ ہی حجاب کی روشن صورت اماں کا چہرہ اور محلے بھر کا ایک فضائی سا منظر لیکا یک سینے میں اٹکا ہوا سانس بحال ہوا تو اندھیروں میں ڈوبتا ہوا ذہن فوراً ہی بیدار ہوا تھا اس نے محسوس کرنے کی کوشش کی مگر کچھ اندازہ نہ ہوا کہ جسم کے کس کس حصہ پر چوٹ آئی ہے اور کس شدت یا نوعیت کی آئی ہے کہیں کسی خاص تکلیف کا احساس نہیں تھا وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک جیسے اس کی گردن پر کوئی پہاڑ آن گرا، ایک شدید جھٹکا تھا بے رحمی سے لگائی گئی ضرب تھی اس نے برق رفتاری سے حرکت کرنا چاہی تھی مگر وہ بس 'چاہ' کر رہ گیا جسم تو گویا مفلوج ہو چکا تھا گردن بھی پوری طرح جنبش نہیں کر پائی تھی البتہ اس نے اتنا دیکھ لیا کہ چند قدم کے فاصلے پر دو ڈھاٹا پوش رائفل بردار اس کی طرف دوڑے آ رہے تھے جبکہ ایک بالکل اس کے سر پر سوار تھا اور وہ رائفل کو لاٹھی کی طرح پکڑے اس پر وار کرنے والا تھا مرشد نے بچنا چاہا اپنی جگہ سے ہٹنا چاہا مگر پہلی ضرب اس کی گردن کو پتھرا گئی تھی وجود پوری طرح مفلوج ہو چکا تھا اگلے ہی لمحے رائفل کی دوسری بھرپور ضرب اس کے سر کے عقبی حصے پر پڑی اور ایک شدید جھنجناہٹ اس کے دماغ میں اترتی چلی گئی وہ سر جھٹکتے ہوئے منہ کے بل سڑک پر ڈھیر ہوا اور اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

......☆☆......

''یہ پاگل کا پتر اپنے غصے اور جنون کی وجہ سے خود بھی

پھنسے گا اور میری گردن وچ بھی پھندا ڈلوائے گا۔“
جاگیردار نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا وہ ابھی مردان خانے میں ڈی ایس پی اصغر علی اعوان کے ساتھ ملاقات کر کے اپنے کمرے میں آیا تھا اور بے چینی سے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا بڑی چوہدرانی ایک طرف رکھی اونچی پشت کی کرسی پر بیٹھی تھی۔
”آپ کچھ عرصے کے لیے اسے یہاں سے کہیں اور بھیج دو۔“
”کہاں......کدر بھیج دوں؟“
”کراچی بھیج دو، وہاں والے کارخانے کا کام دیکھے بھالے جا کر جب یہاں کے حالات ٹھیک ہو جائیں تب واپس بلالیں گے۔“
”اس نے مانی کس کنجر کی ہے ہمیشہ تو اپنی من مانی کرتا آیا ہے اب آج سویرے جو کام کیا ہے اس میں کتنے بندے پھڑکے ہوئے ہیں ایک اس مرشد کے ہاتھوں کتے کی موت مارا بھی گیا ہے۔“
”میری بات ہوئی ہے فرزند سے بتا رہا تھا کہ مرشد نے ہمارے دو بندوں کو مار پیٹ کے ننگا کر کے گاؤں میں لا پھینکا تھا اور......آپ نے الٹا اسے پولیس سے بچایا ہے قتل کا معاملہ تھا پھنسنے دیتے موئے کو پھانسی نہ بھی چڑھتا تو ساری حیاتی جیل میں مڑتا۔“
”اوئے، میں نے اسے نہیں بچایا خود کو اور تیرے اس سورے کو بچایا ہے۔“ جاگیردار آگے بڑھ کر چوہدرانی کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔
”اگر اس کے خلاف پولیس کارروائی ہوتی تو وہ ہمارا نام بھی لیتا شاہوں کی اس کڑی کا ذکر بھی بیچ میں آتا اگر تھانے میں یہ کہانی کھلتی تو کسی نہ کسی طرح اس اعوان کے کان تک بھی پہنچ جاتی اور یہ حرامی بڑا ہی کمڑ پیچ قسم کا افسر ہے ابھی بھی گھنٹہ بھر دماغ پکا کر گیا ہے اس کی باتوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اصل کہانی اس کو معلوم ہو چکی ہے بس کوئی ثبوت اور گواہ نہیں ہے اس کے پاس ورنہ تو۔“
جاگیردار ہونٹ چبا کر خاموش ہو رہا بڑی چوہدرانی کے چہرے پر بھی فکرمندی کے آثار پھیل گئے۔
”تو پھر سب سے پہلے تو آپ کو اس کا کوئی انتظام کرنا چاہیے۔“
”اس نظام کے پتر نے اوپر سے آرڈر کرائے ہیں اور یہ سور نہ دباؤ میں آنے والا ہے اور نہ کسی لالچ میں یہاں سے تو اسے کوئی گواہ شواہ ملتا نہیں لیکن اگر شاہوں کی کڑی کے متعلق اسے ہوا بھی مل گئی نا تو یہ مصیبت بن جائے گا اوپر سے صلاح الدین کی گھر والی اور اس کا وہ پلا اسرار پتا نہیں کدر گم ہو گئے ہیں یہاں سے لے کر بلوچستان تک بندے کھڑے کر رکھے ہیں مگر وہ دونوں تو یوں غائب ہیں جیسے کھوتے کے سر سے سینگ، اگر ان میں سے کوئی اک بھی اس اعوان کے ہتھے لگ گیا تو یہ ہتھکڑیاں لے کر آنے میں دیر نہیں کرے گا۔ تیرا گندا انڈا ہے تو اس کی سمجھ وچ کوئی بات آتی نہیں۔ وقت ویلے کی نزاکت نہیں سمجھتا یہ۔“ اسی وقت چھوٹی چوہدرانی چلم اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی بڑی چوہدرانی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور جاگیردار سے مخاطب ہوئی۔
”اتنا بڑا کھڑاک جوڑا لا تھا تو کسی کو چھوڑنا ہی نہیں تھا نا پورے ٹبر ہی کو مکا دیا ہوتا تو اب یہ پریشانی نہ بنتی۔“
حقے پر چلم دھرتے ہوئے ہاتھ ایک ذرا لرزے، پھر چلم درست کرنے کے بعد چھوٹی چوہدرانی نے حقہ اٹھا کر جاگیردار کے قریب رکھا پائپ کی ”نے“ جاگیردار کو تھمائی اور خاموشی سے واپس چلی گئی، جاگیردار نے دو بڑے بڑے کش کھینچے اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
”شاہوں کی کڑی کا تو کوئی رولا نہیں اسے تو جب مرضی ختم کر دیں مگر اس کی ماں اور حرامی پھرا کی سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ دونوں کدھر غائب ہو گئے ہیں کدھر جا چھپے ہیں۔“
”کہیں ایسا نہ ہو کہ گاؤں میں سے ہی کسی نے انہیں چھپا رکھا ہو۔“
چوہدرانی نے خیال ظاہر کیا مگر جاگیردار خاموش رہا حقے کی نے اس کے ہونٹوں میں دبی تھی اور آنکھوں میں سوچ بچار کے تاثرات چند لمحے بعد وہ چوہدرانی کی طرف متوجہ ہوا۔
”تیری اس کنجری دھی کا اب کیا حال ہے۔“
اس کی مراد نازو سے تھی اپنی سگی بیٹی سے۔
”اسی طرح ہے کچ دیر کو بخار ٹوٹتا ہے تو پھر دوبارہ چڑھ

جاتا ہے میں تو کم ہی جاتی ہوں اس کے کمرے میں الفت ہی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

چوہدرانی کے انداز میں ناگواری اور بے نیازی تھی جیسے وہ اپنی بیٹی کی نہیں بلکہ حویلی کی کسی ناپسندیدہ ملازمہ کی بات کررہی ہو۔

"دوا دارو اثر نہیں کررہا تو تھوڑا سا زہر دے کر دیکھ، ابھی جا اور کسی کو بھیج کر انورے کو بلا۔" جاگیردار کے چہرے پر بھی بدمزگی کے آثار تھے چوہدرانی خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور کمرے کی فضا میں حقے کی ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ باقی رہ گئی اس وقت جاگیردار کے نزدیک سب سے بڑی پریشانی ڈپٹی اصغر اعوان تھا اور اس کے بعد حجاب پھر اس کی ماں اور بھائی جو پراسرار طور پر غائب تھے۔

......☆☆......

اندھیرے میں مدھم سی سرخ روشنی کے دو نکتے نمودار ہوئے اور فوراً ہی ایک کار کی بیک لائٹس میں تبدیل ہوگئے کسی گاڑی کے ہارن کی آوز ابھری ساتھ ہی ایک بھاری اور کرخت مردانہ آواز سنائی دی۔

"اس وقت تو غٹ پڑا ہوگا خنزیر تو دیوار پھلانگ اور گیٹ کھول۔" دھیان میں فوراً حجاب کی صورت روشن ہوئی، مرشد تڑپ کر اٹھنا چاہتا تھا مگر کسی لاشعوری احساس کے تحت وہ بے حس وحرکت پڑا رہا اسے فوراً اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی گاڑی کے آہنی فرش پر اوندھا پڑا ہے اور گاڑی میں دو تین افراد بھی موجود ہیں دماغ پر پڑا بے ہوشی کا دبیز تاریک پردہ تیزی سے سرکتا چلا گیا لمحوں میں اس کے حواس پوری طرح بیدار ہوآئے اور بے ہوشی سے پہلے کی تمام صورت حال برقی رو کی طرح اس کے دماغ میں دوڑ گئی۔

موٹر بائیک کا بھیانک ایکسیڈنٹ اس کا اڑ کر ہائی ایس کی چھت سے ٹکرانا اور ٹرالر پر لدے کاٹن کے بوروں سے ٹکرا ڈھاٹا پوش افراد دلبر کی ڈری بوکھلائی سی چیخ کی بازگشت جیسے ابھی تک اس کے دماغ میں باقی تھی کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا کیا بنا۔

مرشد نے اپنے وجود کو محسوس کیا دائیں گھٹنے، بائیں

شکست

ہمارے نواب میاں کو کوئی ملازمت نہ ملی تو اپنے پرانے دوست کے کہنے پر مطب کھول لیا اور باہر بڑے سے تختے پر لکھوا دیا۔ "تین سو روپے میں اپنا مکمل علاج کرائیں اگر ہم علاج نہ کرسکے تو آپ کو ایک ہزار روپے دیں گے۔ ایک بار ضرور آزمائیے۔" کسی لالچی نے یہ تختہ پڑھا تو سوچا کہ چلو ہزار روپے ہی کماؤ۔ مطب میں آیا اور بولا "مجھے کسی بھی چیز کا ذائقہ محسوس نہیں ہوتا بہت علاج کرایا کہیں سے بھی آرام نہیں آیا آپ کا اشتہار پڑھ کر آیا ہوں۔" نواب میاں نے شاگرد کو آواز دی اور کہا دس نمبر ڈبے میں سے دوا نکالو اور موصوف کو تین قطرے پلا دو۔" جیسے ہی وہ قطرے لالچی کے منہ میں گئے وہ تھو تھو کرتا بولا یہ کیا یہ تو پیٹرول ہے نواب میاں، مبارک ہو آپ کے منہ کا ذائقہ ٹھیک ہوگیا ہے نکالو تین سو روپے۔" لالچی نے جی کڑا کر کے تین سو روپے دے دیے اور اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔

اب وہ اپنی رقم نکلوانے کی ترکیب سوچنے لگا اور کسی نئی بیماری کا سوچ کر کچھ دنوں بعد پھر مطب آ گیا نواب میاں سے کہنے لگا جناب کچھ دنوں سے میری یادداشت کام نہیں کررہی۔ نواب میاں نے پھر شاگرد کو آواز دی اور کہا وہ دس نمبر ڈبے سے دوا نکالو اور مریض کو تین قطرے پلا دو۔

"لیکن یہ دوا تو زبان کا ذائقہ ٹھیک کرنے کی ہے۔" لالچی جھٹ بول اٹھا۔ نواب میاں بولے میاں مبارک ہو آپ کی یادداشت واپس آ گئی لائیے ہماری فیس۔

لاریب نور...... کہروڑ پکا

بازو اور گردن کے عقبی حصے میں تکلیف کا احساس تھا سینے کے زخم میں بھی جلن ہو رہی تھی مگر یہ سب قابل برداشت حد میں تھا۔
گردن کے عقبی حصے میں لگنے والی دونوں ضربیں خاصی زوردار تھیں لیکن یہ اس کے مضبوط اعصاب تھے کہ اسے اتنی جلدی ہوش آ گیا تھا اسے اغوا کرنے والوں کو شاید اس کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ اس کی طرف سے بے فکر اور بے پروا دکھائی دے رہے تھے۔
گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی کوئی ایک نیچے اتر گیا تھا۔
''کھارلی اندر چل کے تو اور مرید ااس کن کٹے کو اٹھا کر گودام میں ڈال دو، ہاتھ پیر اچھے سے باندھ دینا۔'' وہی آواز دوبارہ سنائی دی بولنے والا ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔
''اس کا اچار ڈالنا ہے کیا؟''
''رانا صاحب اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے وہ اسے بڑی توپ چیز سمجھتے ہیں اپنی طرف سے یہ ان کے لیے تحفہ ہوگا۔''
''تجھے یقین ہے کہ یہ وہی بندہ ہے؟''
ایک تیسری آواز مرشد کی سماعت تک پہنچی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ جیپ کے عقبی حصے میں پڑا ہے ایک بندہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا جبکہ دو عقبی حصے میں اس کے قریب موجود تھے۔
''ہاں وہی ہے میں اچھے سے پہچانتا ہوں اسے رنڈیوں کے محلے میں ایک ہی دلا تو مرد بچا ہے۔'' باقی تو ہجڑوں کی ٹولیاں ہیں یا پھر رنڈیاں۔''
گیٹ غالباً کھل گیا تھا جیپ حرکت میں آئی اور آگے بڑھ گئی مرشد کا ذہن تیزی سے سوچ بچار میں مصروف تھا یہ رانا صاحب کون تھے اور ان کا حجاب سے یا خود اس سے کیا لینا دینا تھا اس کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ نامعلوم لوگ اسے کہاں لے کر آئے ہیں اسے تو بس اتنی فکر تھی کہ آئندہ کچھ ہی دیر میں اسے باندھ کر کسی گودام میں بند کیا جانے والا ہے اور اگر ایسا ہوا تو وہ فوری طور پر حجاب کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائے گا جیپ اندر جا کر رک گئی دروازے کھلے اور وہ لوگ نیچے اتر گئے دو بندوں نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹ کر باہر نکال لیا گردن اور بازو کے ساتھ ساتھ ٹانگ میں بھی تکلیف کی لہریں سی دوڑیں تو مرشد کو کچھ مزید اطمینان ہوگیا کہ اس کا وجود صحیح سلامت ہے کہیں کوئی ناقابل برداشت تکلیف نہ تھی۔
''بڑا وزن ہے یار اس کا تو۔''
''بس ایسے ہی گھسیٹ کر لے چل۔''
''چل کھینچ پھر۔''
وہ دونوں اسے بازوؤں سے کھینچتے ہوئے آگے بڑھ گئے مرشد نے نیم وا آنکھوں سے اردگرد کا جائزہ لیا یہ غالباً اس عمارت کا عقبی حصہ تھا یہاں ملگجی سا اندھیرا تھا کچی زمین پر اِدھر اُدھر خشک پتے بکھرے ہوئے تھے عمارت کے سامنے کے حصے کی طرف سے ہلکی ہلکی روشنی اس طرف آرہی تھی ان کے باقی ساتھی شاید سامنے ہی کی طرف رک گئے تھے ادھر سے آتی مدہم آوازوں سے مرشد کو اندازہ ہوا کہ اِدھر دو سے زیادہ افراد موجود ہیں۔
وہ دونوں اسے گھسیٹتے ہوئے ایک بڑے سے لکڑی کے دروازے کے سامنے آرکے ایک نے کھٹکا ہٹا کر دروازہ دھکیل کر کھولا اور دوبارہ مرشد کو گھسیٹ کر اندر لے گئے۔ مرشد کے نتھنوں سے گھل ڈیزل اور جلی ہوئی ربر جیسی ملی جلی بو ٹکرائی، اس ہال کے کسی کونے میں ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی ناکافی تھی لانے والوں نے مرشد کو لا کر ایک طرف پڑی پٹ سن کی خالی بوریوں کے ڈھیر پر ڈال دیا۔
''اب رسی دیکھ کوئی۔'' ایک دوسرے سے مخاطب ہوا۔
''ویسے اس بورے کو باندھنے کی ضرورت تو نہیں ہے۔''
''ضرورت کی چھوڑ جیسے فوجی نے کہا ہے ویسا ہی کرنا ہے۔''
''کیا ہے یار، اب رسی کدھر سے لاؤں۔''
''اِدھر اُدھر دیکھ یہیں سے مل جائے گی کوئی۔''
وہ دونوں رسی تلاش کرنے لگے اور مرشد نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں، یہ ایک بڑا ہال تھا لکڑی کا گیٹ اور چھت کی بلندی بتا رہی تھی کہ ٹرک سیدھا اندر آ کر لوڈ ان لوڈ ہوتا ہوگا۔ لکڑی کے گیٹ کے اوپر ایک بلب روشن تھا

جس کی بیمار روشنی بس تھوڑے سے حصے کو اجاگر کر رہی تھی ایک دیوار کے ساتھ بوریوں کی دھائیں تھیں ایک طرف کاٹھ کباڑ کا ڈھیر نائلون اور پٹ سن کی خالی بوریاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔

مرشد نے ٹانگ اور گردن کو ہلکے سے ہلا دیا، وہ دونوں ایک طرف رسی تلاش کر رہے تھے اور مرشد کی طرف سے بالکل غافل تھی یہی وقت تھا کچھ کر گزرنے کا بعد میں شاید ایسا موقع نہیں ملتا، مرشد نے دھیرے سے گردن گھما کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اس کے قریب ایسی کوئی چیز نہ تھی جسے وہ بطور ہتھیار استعمال کرسکتا، وہ دونوں اس سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر تھے اور دونوں کے کندھوں کے ساتھ رائفلیں جھول رہی تھیں۔

''یہاں نہیں ہے کوئی رسی شسی۔'' ایک نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''تو ایسا کر ادھر بھانے کی طرف دیکھ یا پھر نشئی کو پکڑ وہ کہیں سے نکال کر دے گا۔''

''لاش کی لاش ہے یہ لاش کو بھی باندھ کر رکھنا ہے حد ہوگئی۔'' وہ بکتا جھکتا گودام سے باہر نکل گیا اب وہاں صرف ایک شخص بچا تھا مرشد کے رگ و پے میں سنسناہٹ سی جاگ اٹھی، اب مزید تاخیر کرنا بالکل بھی مناسب نہیں تھا مرشد نے حساب لگایا پندرہ قدم کا فاصلہ رہا ہوگا مرشد کی طرف اس شخص کی پیٹھ تھی اور وہ پنجوں کے بل بیٹھا کباڑ میں سے غالباً کوئی رسی ہی ڈھونڈ رہا تھا، مرشد اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ وہ شخص پلٹ پڑا اس نے ایک نظر مرشد پر ڈالی اور پھر اٹھ کر اس کی طرف بڑھ آیا اس کے ہاتھ میں غالباً بجلی کے تار کا گچھا سا تھا مرشد نے فوراً آنکھیں موند لیں۔

قریب پہنچ کر وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں مرشد کے پہلو کی طرف بیٹھ گیا غالباً وہ اس تار کے ساتھ مرشد کے دونوں ہاتھ کسنا چاہتا تھا لیکن اگلے ہی پل جو ہوا اس کی خود اس بے چارے کو ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی۔

آنکھ جھپکنے سے بھی کم وقت میں اس کا ٹیٹوا مرشد کی انگلیوں کے شکنجے میں آیا اور ساتھ ہی مرشد کا بے حس و حرکت پڑا وجود اچھل کر اس کے اوپر آن رہا اس غریب

کے وہم وگمان میں بھی ایسا کچھ نہیں تھا شاید اسی لیے وہ سرے سے کوئی مزاحمت ہی نہ کر پایا اور مرشد کی وحشیانہ ٹکر اس کے منہ پر آ پڑی، وہ بری طرح پھڑکا مگر مرشد اس پر پوری طرح چھا چکا تھا اگلے ہی پل ایک اور ٹکر نے اس کی مزاج پرسی کی تو اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے، مرشد نے ایک ہاتھ سے اس کا گلا دبوچ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی گردن تھام لی جس میں شدید ٹیسیں کلبلا اٹھی تھیں، اسے اپنے ہاتھ میں چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی تھی گردن کے بال خون آلود تھے سینے کے زخم سے بھی غالباً خون رستا رہا تھا کیونکہ اس کی بنیان پر بھی خون کا بڑا سا دھبہ موجود تھا دوسرا شخص کسی بھی لمحے واپس آ سکتا تھا مرشد نے فوراً اس شخص کی رائفل الگ کی اور جس تار سے وہ مرشد کے ہاتھ باندھنے والا تھا اسی تار سے مرشد نے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے اور اسے گھسیٹ کر ایک طرف بوریوں کی اوٹ میں ڈال دیا، خود وہ رائفل سنبھالتا ہوا گودام کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

لکڑی کے اس پھاٹک کی اوٹ سے اس نے جھانک کر دیکھا سامنے چند قدم کے فاصلے پر شیشم کا ایک بلند و بالا درخت تھا اور اس سے آگے ایک اور عمارت دائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر ایک پیٹر انجن پڑا تھا اور کونے میں دو تین کوارٹر نما کمرے ان کے برابر سے ایک پانچ فٹ اونچی دیوار کے سامنے کے حصے کی طرف چلی گئی تھی جس کے ساتھ ساتھ لاچی کے بلند قامت درخت قطار در قطار موجود تھے اور انہی کے نیچے ایک جیپ کی کھٹارا سی باڈی اینٹوں پر دھری تھی۔

چند قدم فاصلے پر سامنے ایک گاڑی کی ہلکی سی جھلک دیکھتے ہی مرشد بری طرح چونک پڑا وہ ایک کار کا آدھا عقبی حصہ تھا سرخ رنگ کی کار کا اور یقینی طور پر یہ وہی سرخ کار تھی جس میں حجاب کو اغوا کر کے لایا گیا تھا مرشد کی دھڑکنیں اچھل پتھل ہو کر رہ گئیں۔

اگر یہ کار یہاں موجود تھی تو یقیناً حجاب بھی یہیں موجود تھی اسی عمارت اسی چار دیواری کے اندر یکایک ہی مرشد کے لہو میں ایک کیف آگیں بے قراری آ گھلی، بچپن سے لے کر آج تک اس نے بے شمار جھگڑے فساد بھگتائے تھے لیکن آج تک کسی کی جان نہیں لی تھی اب...... آج ان لمحوں میں اس کا شدت سے جی چاہا کہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھے اور لاشوں کے ڈھیر لگاتا ہوا حجاب تک جا پہنچے اس نے بمشکل اپنے اندر کی اس سرکشی کو قابو میں رکھا کہ یہی دانش مندی کا تقاضہ تھا۔

تبھی اسے دوسرے رائفل بردار کی جھلک دکھائی دی وہ اس سمت سے چلا آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط رسی بھی دکھائی دے رہی تھی مرشد پوری طرح اوٹ میں ہو کر کھڑا ہو گیا، اس کے اعصاب تن چکے تھے آنے والا اپنے دھیان میں اندر داخل ہوا۔

''لے آ گئی رسی، اب اسے باندھ۔''

وہ دو قدم آگے بڑھا تھا کہ ٹھٹک گیا اسے گڑ بڑ کا احساس ہوا تھا پھر اچانک وہ رائفل کندھے سے اتارتے ہوئے برق رفتاری سے پلٹا مگر اسے بہت دیر ہو چکی تھی ہاں اس کے اچانک پلٹنے کا نتیجہ یہ رہا کہ رائفل کی لاٹھی نما ضرب جو اس کی گدی میں پڑنی تھی وہ اس کے دائیں جبڑے پر پڑی اور وہ دھڑام سے فرش پر آ رہا اس کے منہ سے عجیب کرب ناک آوازیں خارج ہو رہی تھیں، مرشد نے آگے بڑھ کر اس کی گدی میں ایک اور بھرپور ضرب رسید کی اور اس کی آوازیں دم توڑ گئیں، ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے، مرشد نے ایک نظر دوبارہ باہر کا جائزہ لیا اور پھر پلٹ کر جلدی جلدی اس کے ہاتھ بھی پشت پر کسے اور اسے بھی گھسیٹ کر اس کے دوسرے ساتھی کے قریب جا لٹایا، اس کے بعد وہ گودام کے دروازے تک آیا لکڑی کا پھاٹک کھینچ کر بند کیا اور باہر سے کھٹکا لگا دیا۔

اس حصے میں مکمل سکون تھا البتہ سامنے کی طرف سے پنجابی گانوں کی ہلکی ہلکی آواز بلند ہو رہی تھی وہ لوگ شاید کسی اندرونی حصے میں اپنی کامیابی کے جشن کی تیاری کر رہے تھے۔

مرشد رائفل سنبھالتے ہوئے پہلے تو سیدھا آگے بڑھا پھر کچھ سوچتے ہوئے واپس پلٹا اور دائیں طرف سے آگے بڑھنے لگا کیوں کہ اس طرف تقریباً اندھیرا تھا۔

یہ قریب قریب چار کینال کا رقبہ تھا جس کے اطراف پانچ فٹ اونچی دیوار تھی عقبی طرف گودام، دائیں ہاتھ کے

ایک کونے میں چند کوارٹر نما مکان جبکہ اصل عمارت اس احاطے کے بالکل وسط میں تھی ساتھ ساتھ بنے کمروں کی کھڑکیاں اس طرف کھلتی تھیں جدھر اس وقت مرشد موجود تھا رائفل کاک کرنے کے بعد وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا، وہ پوری طرح چوکنا اور ہر حد تک جانے کے لیے تیار تھا اس نے ٹھان لی تھی کہ اگر آج اسے یہاں چار چھ لاشیں بھی گرانا پڑیں تو وہ دریغ نہیں کرے گا اسے تو بس حجاب کو صحیح سلامت اور عزت وآبرو کے ساتھ واپس اماں کے پاس لے کر جانا تھا زیادہ تر کمرے تاریک تھے صرف تین کمروں کی کھڑکیوں سے روشنی باہر آرہی تھی مرشد نے باری باری تینوں کمروں میں جھانکا ایک کمرہ تو مکمل طور پر خالی تھا، دوسرے کمرے میں دو دیہاتی صورت ملازم قسم کے بندے بے سدھ پڑے سو رہے تھے جبکہ کچھ فاصلے پر موجود تیسرے کمرے میں ایک شور بدتمیزی برپا تھا ٹیپ ریکارڈ پر میوزک بج رہا تھا اور پانچ افراد دیسی شراب کی بوتلیں کھولے بیٹھے تھے اب تک دکھائی دینے والی سبھی صورتیں اجنبی تھیں اس چار دیواری میں صرف ایک شناسا چہرہ تھا مگر معلوم نہیں وہ کدھر تھا اسے کس کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ مرشد کو خیال گزرا کہ ممکن ہے حجاب کو یہاں لایا ہی نہ گیا ہو، اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل ڈوبنے لگا وہ چند لمحے دیوار سے پشت ٹکائے کھڑا رہا پھر دبے قدموں سے سامنے کے حصے کی طرف بڑھ گیا، ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ بے اختیار ٹھٹک گیا اسے ایک آواز سنائی دی تھی مدہم سی گھٹی گھٹی آواز کسی کے رونے سسکنے کی آواز وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹا یہاں بھی ایک کھڑکی تھی جو یقیناً اندر سے بند تھی اور اندر اندھیرا بھی تھا مرشد نے کھڑکی کے ساتھ کان لگائے تو اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا سسکیوں کی آواز اس کھڑکی سے آرہی تھی اور آواز بھی نسوانی تھی یقینی بات تھی کہ اس طرف کمرے میں حجاب موجود تھی۔

مرشد نے بے قراری سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا سامنے سے اس کھڑکی تک کمروں کا اندازہ لگایا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر سامنے کے رخ پہنچ گیا پوری عمارت میں شاید صرف وہی لوگ موجود تھے جنہیں مرشد باری باری دیکھ چکا تھا اسے اندیشہ تھا کہ یہاں کتے بھی ہوسکتے ہیں مگر ایسا نہیں تھا کیونکہ اگر کتے اس چار دیواری میں موجود ہوتے تو اب تک اپنی موجودگی کا ثبوت دے چکے ہوتے۔

سامنے کے رخ عمارت کی پیشانی پر ایک بلب روشن تھا کوئی ذی روح موجود نہیں تھا مرشد چند قدم آگے بڑھا تو اسے ایک طرف کھڑی وہ سرخ کار بھی دکھائی دے گئی جس کے تعاقب کے نتیجے میں وہ یہاں تک پہنچا تھا یہاں دائیں بائیں ایک دوسرے کے مقابل دو کمرے تھے، درمیان میں قریباً دس فٹ کا برآمدہ، برآمدہ ہی میں سے ایک کوریڈور سیدھا چلا گیا تھا جس کے دونوں اطراف کمروں کے دروازے دکھائی دے رہے تھے کوریڈور کے درمیان میں ایک بلب روشن تھا البتہ اس کا آخری کونا تاریک دکھائی دے رہا تھا۔

مرشد نے رائفل پر گرفت مضبوط کی اور برآمدے سے کوریڈور میں داخل ہوگیا اندازے کے مطابق وہ پنجوں کے بل آگے بڑھتا ہوا پانچویں کمرے کے دروازے پر جا رکا دروازے پر ایل دراز تھا جو باہر سے بند کیا گیا تھا مرشد نے دروازے سے کان لگائے لیکن اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دی شاید اس لیے کہ کوریڈور میں گانے کی آواز گونج رہی تھی۔

"سن وے بلوری اکھ والیا...... اساں دل تیرے نال لا لیا۔" مرشد نے ایل دراز ہٹایا ٹھیک اس وقت چند قدم آگے سے ایک آواز ابھری۔

"تو بنا کے رکھ لوسی کہیں کے میں ابھی انہیں بھی بلاتا ہوں۔" ایک دروازہ چھوڑ کر اگلے دروازے سے اچانک ہی ایک شخص نمودار ہوا تھا لیکن اس کا دھیان کمرے کے اندر موجود اپنے ساتھیوں کی طرف تھا اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا اور اس کی نظر مرشد پر پڑتی مرشد بلا ارادہ دروازے کو دھکیلتے ہوئے کمرے کے اندر پہنچ گیا دروازہ اس نے فوراً ہی لپیٹ کر بند کردیا تھا کمرے میں گھپ اندھیرا تھا البتہ اندر داخل ہوتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے سسکی کی آواز اچانک ہی سہمے ہوئے انداز میں گھٹ گئی تھی۔

مرشد دروازے کے قریب ہی دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا فی الوقت اس کی تمام حسیات بیرونی جانب مرکوز

تھیں۔ محض چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ دروازے کی دوسری جانب سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز ابھری اور ساتھ ہی دروازہ کسی نے دھکیل کر کھول دیا ہلکی سی چچ کی آواز ابھری اور کمرے میں روشنی پھیل گئی یہ وہی شخص تھا جسے ابھی مرشد نے دیکھا تھا اس نے بھی مرشد کو دیکھ لیا غالباً وہ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو آواز دینے والا تھا کہ مرشد نے برق رفتاری سے رائفل کا کندا اس کے منہ پر رسید کیا اور اس کی پکار ایک کراہ میں تبدیل ہو کر رہ گئی مرشد نے جھپٹ کر اس کا کالر دبوچا اور ایک جھٹکے سے کھینچ کر چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر کمرے کے اندر آ گرا مرشد نے اسے اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے سر پر رائفل سے وار کیا اور وہ کراہتا ہوا وہیں لوٹ پوٹ ہو گیا تبھی مرشد کی نظر سامنے صوفے پر پڑی اور وہ سرتاپا پور پور نہال ہو گیا وہ حجاب ہی تھی صوفے پر بے حس و حرکت کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھی وہ یک ٹک اسے ہی تو تک رہی تھی، اس کی آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پیالا ہو کر رہ گئی تھیں حقیقت تو یہی تھی کہ ان لمحوں حجاب کو اپنی آنکھوں دیکھے منظر پر بھی یقین نہیں آ رہا تھا مرشد کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کر وہ مبہوت رہ گئی تھیں اسے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے اور اگر اس نے آنکھ جھپکی تو یہ خواب بکھر کر رہ جائے گا اور وہ پھر سے بے یار و مددگار ہو کر بے رحم دشمنوں کے نرغے میں جا پہنچے گی۔ پھر مرشد ہی آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچا تھا۔

''حجاب......تو......ٹھیک ہے نا؟''

اس کے لب و لہجے میں عجیب فکرمندی اور بے قراری تھی حجاب سے کچھ بھی نہیں بولا گیا اس نے بمشکل آہستہ سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں میں یہیں ہوں تیرے ساتھ۔''

''مم...... مجھے یہاں سے لے چلیں مرشد جی۔'' اس نے لرزیدہ آواز میں کہا تو مرشد کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک آسودہ سی مسکراہٹ اتر آئی۔

''میں تجھے ہی تو لینے آیا ہوں چل اٹھ، چل۔'' اس نے پلٹ کر مضروب کی طرف دیکھا وہ فرش پر پڑا کراہ رہا تھا مرشد نے اس کی گدی میں ایک جچی تلی ضرب لگائی تو وہ پرسکون ہو کر لیٹ گیا پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر جھانکا کوریڈور میں صرف ایک گانے کی آواز موجود تھی۔

''پیار نالوں پیارے سجناں......اسیں تیرے اگے دل ہارے سجناں۔''

''اس کے اور ساتھی بھی ہیں یہاں۔''

حجاب نے گھبرائے سہمے سے لہجے میں کہا تو مرشد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''اب تو پوری بٹالین بھی آ جائے تو پروا نہیں اماں تیرا انتظار کر رہی ہے۔'' مرشد نے اطمینان و یقین سے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تو حجاب نے قدرے جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تیری جوتی کدھر ہے؟''

اس کے ننگے پاؤں پر نظر پڑتے ہی مرشد نے پہلی بار توجہ سے اس کا جائزہ لیا چہرے کے گرد سفید پٹی اس طرح لپٹی ہوئی تھی دوپٹہ گلے میں جھول رہا تھا اور پاؤں مرشد ہی کی طرح ننگے تھے۔

''وہ......وہ تو وہیں رہ گئی تھی۔''

''خیر کوئی بات نہیں۔''

مرشد کے دل میں آئی کہ فرش پر بے ہوش پڑے آدمی کی قمیص اور جوتے اتار لے مگر اتنا وقت نہیں تھا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا انہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا لہٰذا اس نے حجاب کا نرم و گداز ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور کمرے سے باہر نکل آیا دروازے کو باہر سے بند کرنے کے بعد وہ دونوں تیزی سے بیرونی جانب بڑھ گئے۔

حجاب قدرت کے اس انتظام اور مرشد کی یوں آمد پر حیران تھی اسے یہ سب خواب لگ رہا تھا اندر کی حالت عجیب تھی اسے جب سے اپنے گھر آنے کی تباہی اور باپ بھائیوں کی موت کا علم ہوا تھا وہ اندر سے بجھ کر رہ گئی تھی دل و دماغ پر ایک دھند ایک جمود سا طاری تھا اور اس کا خیال تھا کہ اب یہ کیفیت ہمیشہ یونہی رہے گی لیکن اب سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے جب اچانک وہ تین بندے خالہ حسن آرا کے کمرے میں داخل ہو کر اس پر جھپٹے تو دل و دماغ کی حالت

یکدم ہی تبدیل ہوگئی تھی خالہ نے درمیان میں حائل ہونے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایک کمزور اور نڈھال عورت تھی خود اس نے بھی مزاحمت کی تھی لیکن ان تین میں سے ایک نے اس کے دوپٹے کو بل دے کر رسے کی صورت اس کے گلے میں پھندا بنالیا تھا پھر خالہ کو کمرے میں بند کر کے وہ لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے چھت کے رستے عقبی مکان میں اترے اور باہر نکل کر فائرنگ کرتے ہوئے اسے ایک کار میں ڈال کر یہاں تک لے آئے تھے۔

اسے باپ بھائیوں کے بعد اب اپنے بدترین انجام کا یقین ہوگیا تھا سب سے زیادہ خوف اسے اپنی عزت وآبرو کے حوالے سے تھا وہ ذلیل و پامال ہو کر مرنا نہیں چاہتی تھی کچھ دیر پہلے تک وہ اندھیرے کمرے میں بیٹھی روتے سسکتے ہوئے اسی حوالے سے شکوک وشکایتیں اور دعائیں فریادیں کر رہی تھی اسے کسی طرف سے بھی کسی مدد کی قطعی کوئی توقع نہیں تھی کسی کو بھلا کیا معلوم تھا کہ اسے کہاں لایا گیا ہے اور...... اور پھر کسی کو کیا پڑی تھی جو اس کی خاطر اتنے خطرناک لوگوں سے ٹکر لیتا ہر کسی کو امن سکون اور زندگی عزیز ہوتی ہے لیکن اب یہ مرشد یہ معجزانہ طور پر ہی تو اس کی مدد اور حفاظت کو آ پہنچا تھا اس نے بے دھڑک اس کی خاطر ان خطرناک لوگوں سے ٹکر لے لی تھی اسے شاید اپنی زندگی کی کوئی پروا کوئی فکر نہیں تھی اپنی دعاؤں اور فریادوں کی فوری قبولیت پر وہ ششدر رہی تھی۔

مرشد اس کا ہاتھ تھامے تیزی سے بیرونی جانب بڑھتا ہوا برآمدہ نما حصے تک پہنچ آیا ٹھیک اسی وقت سامنے موجود بیرونی گیٹ کے اس طرف کسی گاڑی کی آواز سنائی دی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی گیٹ کے نیچے سے اندر آئی اور ساتھ ہی ہارن کی آواز بلند ہوئی، شاید ان لوگوں کے کچھ مزید ساتھی آن پہنچے تھے۔

مرشد حجاب کا ہاتھ تھامے تھامے تیزی سے دائیں ہاتھ مڑ گیا صورت حال یکا یک کچھ مزید سنگین رخ اختیار کر گئی تھی وہ برق رفتاری سے اسے احاطے کی دیوار کی طرف بڑھا۔

”ہمیں دیوار پھلانگنا ہوگی۔“

”میں...... میں کیسے دیوار پر چڑھوں گی۔“

”اور کوئی راستہ نہیں ہمیں فوراً نکلنا ہے یہاں سے۔“

وہ دیوار کے قریب پہنچے تھے کہ ہارن کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی مرشد نے رائفل کندھے سے لٹکائی اور اچھل کر دیوار پر جا پہنچا۔

”ہاتھ دو۔“ مرشد نے دیوار پر بیٹھتے ہوئے ہاتھ حجاب کی طرف بڑھائے۔

”مم...... میں گر جاؤں گی۔“

حجاب جیسے بولی نہیں مسمسائی تھی وہ بری طرح گھبراہٹ کا شکار تھی۔

”اپنے ہاتھ پکڑاؤ حجاب۔“

مرشد کے لہجے میں اضطراب تھا بے چینی تھی حجاب نے ڈرتے ڈرتے دونوں ہاتھ بلند کیے تو مرشد نے مضبوطی سے اس کے ہاتھ تھامے اور اگلے ہی لمحے اسے یوں اوپر کھینچ لیا جیسے وہ کوئی گوشت پوست کا وجود نہ ہو بلکہ پلاسٹک کی گڑیا ہو دیوار پر پہنچتے ہی حجاب فوراً دوسری طرف ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی جبکہ مرشد نیچے کود چکا تھا۔

”کودو۔“

مرشد نے اسے پکارا مگر حجاب نیچے اندھیرے میں دیکھتی ہوئی اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔

”نیچے کودو۔“

”کک...... کیسے؟“

حجاب کے لبوں کو جنبش ہوئی اگلے ہی پل مرشد نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے کمر سے پکڑا اور دیوار سے نیچے کھینچ کر کھڑا کر دیا حجاب اس کی اس اچانک کارروائی پر گڑبڑا کر رہ گئی لیکن مرشد کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا وہ اندھیرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہیں کسی طرف کوئی روشنی نہیں تھی رات کا آخری پہر تھا اندھیرا تھا بس یہ اندازہ ہوتا تھا کہ دور دور تک صرف کھیت پھیلے ہوئے ہیں خدا جانے یہ کون سا علاقہ تھا۔ ہارن کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی اور تسلسل سنائی دینے لگی مرشد نے حجاب کا ہاتھ تھاما اور اس چاردیواری کی عقبی طرف کود پڑا ان کے پاس کوئی سواری نہیں تھی دوسر دور تک کسی آبادی یا چھپنے کی جگہ کے آثار بھی نہیں تھے اور وقت کم تھا مرشد کا اندازہ تھا کہ محض پانچ دس یا زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ تک دشمنوں کو

ان کے فرار کا علم ہونے والا تھا اس کے بعد وہ سب پاگل کتوں کی طرح ان کے پیچھے نکل کھڑے ہوتے ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اسلحہ کی بھی ان کے پاس کوئی کمی نہ تھی ایسے میں مقابلے اور ٹکراؤ کی صورت میں کیا نتیجہ رہتا اس حوالے سے مرشد کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا بچاؤ کی صرف ایک صورت تھی اور وہ یہ کہ وہ لوگ جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل جائیں۔

پھر دیوار کی اوٹ سے نکلتے ہی انہیں آبادی کے آثار بھی دکھائی دے گئے قدرے دائیں ہاتھ روشنیوں کے آثار تھے جو سیدھا دور تک چلے گئے تھے لیکن فاصلہ کافی تھا کم از کم بھی ڈیڑھ دو میل کی دوری تو رہی ہوگی۔

''ہمیں جلد از جلد اس آبادی تک پہنچنا ہے۔ چلو۔''

مرشد نے حجاب کو ایک پگڈنڈی پر جگہ دی اور خود اس کا ہاتھ تھامے کھیت میں دوڑنے لگا چاروں طرف غالباً سبزیاں اگائی گئی تھیں مٹی گیلی تھی جس میں مرشد کے پاؤں دھنس دھنس جا رہے تھے فضا میں نباتات کی مہک تھی اور ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی وہ لمحہ بہ لمحہ اس چار دیواری سے دور ہوتے جا رہے تھے مرشد پلٹ پلٹ کر عقب میں بھی دیکھ رہا تھا تقریباً آدھا فاصلہ وہ طے کر چکے تھے جب مرشد کو اس چار دیواری کے گرد کچھ افراتفری کے آثار دکھائی دیے دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں تھیں اور ان روشنیوں میں کچھ لوگوں کے ہیولے دکھائی دیے عمارت کی چھت پر بھی کوئی موجود تھا جس کے ہاتھ میں ایک طاقت ور ٹارچ تھی جس کی روشنی وہ اِدھر اُدھر ڈال رہا تھا اسی وقت حجاب کا پاؤں رپٹا اور وہ منہ کے بل آ رہی اگر مرشد نے اس کا ہاتھ نہ تھام رکھا ہوتا تو شاید اسے چوٹ بھی لگتی لیکن مرشد نے فوراً اسے سنبھال لیا تھا

''بس...... بس مرشد جی...... میں...... میں اور نہیں بھاگ سکتی...... بس۔'' حجاب وہیں بے سکت سی ہو کر بیٹھ گئی وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

''ہمیں آگے بڑھنا ہوگا اب تو فاصلہ بھی تھوڑا رہ گیا ہے۔''

''نہیں...... مجھ سے اب اور نہیں بھاگا جائے گا۔''

اس نے اپنا ماتھا تھامتے ہوئے کہا سر میں ٹیسیں سی اٹھنے لگی تھیں، نقاہت تھی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

''دشمن کو ہمارے فرار کی خبر ہو چکی ہے وہ تیزی سے ہمارے پیچھے آئیں گے اب ایک بار اس آبادی تک پہنچ جائیں تو کہیں چھپ کے تھوڑا آرام کر لیں گے یہاں کھلے میں رکنا بہت خطرناک ہوگا تھوڑی ہمت کر۔''

حجاب نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر بادل نخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کے اپنے ہاتھ پاؤں مٹی میں لتھڑ چکے تھے۔

''تھوڑا تیز چل حجاب...... جلدی۔'' مرشد نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

''میرا سر دکھ رہا ہے پاؤں...... پاؤں ساتھ نہیں دے رہے نا۔'' وہ روہانسی ہوگئی تھی مرشد ہونٹ بھینچ کر رہ گیا وہ سمجھ رہا تھا اس کی حالت کو حجاب اپنی پوری توانائیاں مجتمع کر کے آگے تو بڑھ رہی تھی، مگر اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے بھاگنا تو دور کی بات وہ چل بھی مشکل سے رہی تھی۔

مرشد نے پلٹ کر دیکھا عمارت کے عقبی طرف دو روشن ٹارچیں متحرک دکھائی دیں دشمن غالباً ان کی راہ پر لگ چکے تھے مرشد کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''وہ لوگ پیچھے آ رہے ہیں تھوڑا جلدی چل۔'' حجاب نے بھی ایک نظر پیچھے دیکھا پھر مرشد سے مخاطب ہوئی۔

''آپ...... آپ آگے نکل جائیں میں آ رہی ہوں۔''

''پاگل ہوگئی ہے کیا میں تیرے لیے یہاں تک آیا ہوں اب تجھے چھوڑ کر خود آگے نکل جاؤں...... بے وقوف۔''

''میرے ساتھ آپ بھی پھنس جائیں گے اس......!''

''بس چپ کر جا۔''

مرشد نے فوراً اسے ڈانٹ دیا حجاب کو اس کی ڈانٹ بالکل بھی بری نہیں لگی اس ڈانٹ میں ایک عجیب اپنائیت سی تھی مرشد نے اس کا ہاتھ کچھ مزید مضبوطی سے تھاما اور اسے اپنے ساتھ کھینچنے والے انداز میں لے کر آگے بڑھنے لگا آبادی والی طرف سے کسی کسی وقت ہوا کے دوش پر آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ان کے کانوں تک پہنچتیں پھر وہی خاموشی چھا جاتی اور اس خاموشی میں صرف حجاب

کی ابتری فسوں کی آواز باقی رہ جاتی۔

وہ آبادی سے ابھی دو ڈھائی فرلانگ دور تھے کہ حجاب کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ میں اضافہ ہوگیا اور اس نے چلتے چلتے رک کر اپنی پیشانی تھام لی۔

''میری...... کنپٹیاں سن ہورہی ہیں۔'' جملہ مکمل کرتے کرتے وہ لہرائی مرشد نے بمشکل اسے دھڑام گرنے سے بچاتے ہوئے سنبھال کر پگڈنڈی پر لٹلایا اور بے چینی سے اس کے گال تھپتھپانے لگا۔

''حجاب...... حجاب اے آنکھیں کھول...... ہوش کر۔''

وہ بے سدھ رہی اس کے جسم میں خون کی کمی کے باعث زیادہ سکت نہیں تھی یہاں تک بھی ہانپتی کانپتی وہ نجانے کیسے پہنچ کر آئی تھی۔

متحرک ٹارچیں مسلسل آگے بڑھتی آرہی تھیں مرشد نے فوراً قریب ہوتے ہوئے حجاب کے بے ہوش وجود کو بازوؤں پر اٹھایا اور اٹھ کر آبادی کی طرف دوڑ پڑا، اب کم ازکم اس سفر کی رفتار میں معقول حد تک اضافہ ہوگیا تھا۔

حجاب ایک اچھے صحت مند وجود کی مالک تھی لیکن مرشد کو تو جیسے اس کا بوجھ محسوس ہی نہیں ہورہا تھا بلکہ اس حادثاتی اور ان چاہے قرب نے اس کے رگ و پے میں جیسے نئی توانائیاں جگا دی تھیں اسے لگ رہا تھا کہ وہ حجاب کو یوں اٹھائے اٹھائے میلوں تک دوڑ سکتا ہے۔

وہ جیسے جیسے آبادی کے قریب ہوتا گیا ایک گونج دار مسلسل شور کی آواز واضح ہوتی گئی غالباً کوئی ٹیکسٹائل مل تھی جو قریب آتی جارہی تھی کچھ ہی دیر بعد مرشد کو اس مل کی طویل دیوار بھی دکھائی دے گئی، یہ غالباً لیبر کالونی کا احاطہ کرنے والی دیوار تھی اور اس سائیڈ کے کوارٹرز وغیرہ زیر استعمال بھی نہیں تھے کیونکہ اس طرف مکمل اندھیرا تھا دیوار کی اونچائی تو زیادہ نہیں تھی البتہ دیوار کے اوپر خار دار تاروں کی موجودگی نے دیوار پھلانگنا خاصی دشوار بنادیا تھا۔

دیوار کے قریب پہنچ کر مرشد نے اِدھر اُدھر دیکھا اندھیرے اور خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا دیوار کی اونچائی اس کے کندھوں کے برابر تھی لیکن مسئلہ حجاب کا تھا وہ بے ہوش تھی اور دیوار پر اوپر تلے تین تین خاردار تاریں موجود تھیں۔

مرشد چند لمحے ان تاروں کو دیکھتا رہا پھر اس نے جھک کر حجاب کو آہستہ سے نیچے ڈال دیا یہ روڑی نما جگہ تھی اِدھر اُدھر کچرا بکھرا ہوا تھا مگر جگہ خشک تھی حجاب کو وہاں لٹا کر وہ کندھے سے جھولتی ہوئی رائفل اتارتے ہوئے دیوار کے قریب پہنچ گیا دیوار پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لوہے کی اینگلز فٹ کی گئی تھیں اور انہیں اینگلز کے ساتھ خاردار تاروں کو باندھا گیا تھا مرشد نے دو اینگلوں کے درمیان رائفل کی نال سے تار کو اوپر اٹھاتے ہوئے رائفل کو یوں دیوار پر سیٹ کیا کہ تار اور دیوار کے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہوگیا جس میں سے وہ باآسانی گزر کر دوسری طرف پہنچ سکتا تھا اس کام سے فارغ ہوکر وہ جلدی سے حجاب کے پاس آیا اور اس کے بے حس وحرکت وجود کو اٹھا کر دوبارہ دیوار کے قریب پہنچ گیا کام تھوڑا دقت طلب تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح حجاب کے وجود کو دیوار پر اوندھا لٹا دیا مرشد نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے وجود کو کوئی رگڑ یا خراش وغیرہ نہ آنے پائے اور اس احتیاط میں اس کے اپنے بازوؤں اور ہاتھوں پر خاصی رگڑیں آگئی تھیں۔

اسے دیوار پر لٹکانے کے بعد اس کے برابر سے مرشد دیوار پر کھسک آیا دوسری طرف دیوار کے ساتھ کچرے کے ڈھیر تھے پلاسٹک کی بانیں گتے، پیپر کونز، خراب کاٹن اور پتا نہیں کیا کیا الم غلم بکھرا پڑا تھا ایک نظر اِدھر کا جائزہ لینے کے بعد مرشد دیوار سے پھسلتا ہوا آرام سے کچرے کے اس ڈھیر پر آن گرا، اس کے بعد اس نے اٹھ کر حجاب کو بھی احتیاط سے دیوار پر سے کھینچ کر نیچے کچرے پر ڈالا اور پھر تار کے نیچے سے رائفل بھی نکال لی، ٹارچ بردار یہاں سے محض دو فرلانگ کے فاصلے سے اس طرح بڑھتے آرہے تھے ٹارچیں دو تھیں مگر آنے والوں کی تعداد زیادہ معلوم ہورہی تھی، مرشد نے پلٹ کر اپنے اطراف کا جائزہ لیا چاروں طرف مل کا کچرا اور اسکریپ بکھرا پڑا تھا۔

دائیں ہاتھ دور...... اس دیوار کے کونے میں روشنی تھی سامنے کوارٹرز کی تین چار قطاریں تھیں، کوارٹرز کی ایک تین منزلہ عمارت بالکل مرشد کے سامنے تھی لیکن یہ عمارت ابھی زیر تعمیر تھی اس کا کافی کام ابھی باقی تھا ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد مرشد حجاب کی طرف متوجہ ہوا تو وہ کسمسا رہی تھی مرشد فوراً گھٹنا نیچے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

''حجاب......حجاب......اے......!''

اس نے حجاب کی ٹھوڑی تھام کر جھنجوڑا تو چند ہی لمحوں میں اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ''ہوش کر حجاب دشمن قریب پہنچ چکے ہیں، ہوش کر۔''

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگی۔

''اب آگے چل سکو گی یا اٹھا کر لے چلوں؟'' وہ جو اپنی اس جگہ موجودگی پر حیرت زدہ تھی مرشد کے سوال پر بے اختیار گڑبڑائے ہوئے انداز میں اس سے تھوڑا پیچھے ہٹ گئی۔

''آں...... ہاں نہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''مم...... میں چل سکتی ہوں۔''

''آ پھر۔''

اس نے ایک بار پھر حجاب کا ہاتھ تھام لیا اور حجاب فوراً اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی ان کا رخ بائیں سمت تھا جدھر مکمل اندھیرا تھا دیوار کا آخری کونا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

حجاب کا دل گھبراہٹ سے بھرا ہوا تھا تو ذہن میں بھی ایک انجانا سا خوف کنڈلی جمائے بیٹھا تھا کچھ درندے اس کے پیچھے آرہے تھے تو ایک درندہ ساتھ ساتھ تھا اس میں اور پیچھے آنے والوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا وہ غنڈے بدمعاش تھے تو یہ خود بھی انہیں جیسا تھا۔

بس صورت حال ہی ایسی تھی کہ وہ اس کے ساتھ آگے بڑھنے پر مجبور تھی وہ خود جو بھی تھا جیسا بھی تھا، ان حالات میں فی الوقت وہی ایک اس کا آسرا تھا آس امید تھی وہ اس کے حوالے سے جھجک اور گھبراہٹ تو محسوس کر رہی تھی لیکن خوف نہیں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بدنام زمانہ جگہ کا یہ سکہ بند بدمعاش اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا بدمعاش سہی مگر اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی یا غیر اخلاقی حرکت نہیں کرے گا اور اس کے ان خیالات کی وجہ تھی اس بدمعاش کی ماں، خالہ حسن آرا۔

حجاب گزشتہ چند دن میں ماں بیٹے کے تعلق کو دیکھ چکی تھی، وہ جانتی تھی کہ مرشد جیسا بھی ہے اپنی ماں سے بے تحاشہ محبت کرتا ہے ماں کے لیے اس کی فکر مندی اور بے قراری کا مشاہدہ وہ خود کر چکی تھی اسی ماں نے ابھی کل ہی سے حجاب کی حفاظت اور مدد کی بات کی تھی، یقینی طور پر وہ اپنی ماں کے اس کہے کو نبھانے کے لیے اس کی مدد کو اس کے پیچھے پہنچ آیا تھا۔

اس تاریک کونے میں پہنچ کر مرشد رک گیا کوارٹرز کی ایک قطار کا یہاں اختتام ہوتا تھا کوارٹر اور کالونی کی دیوار کے درمیان تقریباً دس فٹ کا راستہ تھا اس طرف بھی کچرا ہی بکھرا ہوا تھا فضا میں نم روئی اور دھاگے کی باس رچی ہوئی تھی مرشد نے دیوار کے اوپر سے جھانکا دوسری طرف ایک خالی پلاٹ تھا اور پلاٹ سے آگے کچھ فاصلے پر کچے پکے مکانوں کا ایک سلسلہ تھا اور ایک تنگ سی گلی بھی دکھائی دے رہی تھی ادھر کا جائزہ لینے کے بعد مرشد نے عقبی طرف جھانکا اس کے تعاقب میں آنے والے خاصے قریب آچکے تھے ان کا رخ کالونی کی دیوار کے ٹھیک اسی طرف تھا جدھر سے وہ دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے تھے یقیناً وہ لوگ ٹارچوں کی روشنی میں ان کے پیروں کے نشانات پر چلتے ہوئے یہاں تک پہنچ آئے تھے۔

''ہمیں یہاں سے باہر نکلنا ہے آؤ۔''

مرشد آگے بڑھ کر بغلی دیوار کے ساتھ موجود روئی اور دھاگے کے گچھوں کے ایک ڈھیر پر جا کھڑا ہوا یہاں بھی اس نے وہی حربہ استعمال کیا تار اور دیوار کے درمیان رائفل پھنسائی پھر حجاب کی طرف دیکھتے ہوئے تار کے نیچے سے کھسک کر دوسری طرف جا پہنچا۔

''آ...... جلدی کر۔''

حجاب ایک ذرا ہچکچائی مگر اسے یہ کرتب کرنا ہی پڑا دوسری طرف سے مرشد نے اسے سنبھالا دیا اور وہ اپنے وجود کو سمیٹتی ہوئی دوسری طرف جا پہنچی۔

''شاباش...... یہ ہوئی نہ بات۔'' مرشد نے دبے دبے لہجے میں جیسے اس کی حوصلہ افزائی کی پھر رائفل تار کے نیچے سے کھینچ کر حجاب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے سامنے نظر آنے والی تنگ سی گلی کی طرف بڑھ گیا۔

مل کی مشینوں کے شور کے ساتھ کسی طرف سے کسی تیز رفتار گاڑی کے ہارن کی آواز بھی سنائی دی تھی سامنے موجود مکانوں میں سے اِکا دُکا میں برائے نام روشنی موجود تھی زیادہ

ترمکانوں کی لائٹیں بند تھیں مکین اپنے گھروں میں بے سدھ پڑے سو رہے تھے، مرشد حجاب کا ہاتھ تھامے گلی میں گھسا اور تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کی حتیٰ الامکان کوشش تھی کہ دشمنوں سے مڈبھیڑ نہ ہو اسے کوئی سروکار تھا تو صرف حجاب کی ذات سے اور وہ اس وقت اس کے ساتھ تھی اس کا نرم و نازک ہاتھ بدستور اس کے مضبوط ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

اس کی کوشش تھی کہ مزید کسی ہنگامے یا مشکل میں الجھے بغیر حجاب کو لے کر یہاں سے نکل جائے علاقے بھر میں داؤ پر لگی عزت اور وقار کی سلامتی اور بحالی کے لیے لازم تھا کہ وہ حجاب کو لے کر جلد از جلد اپنے علاقے تک جا پہنچے اماں کی طرف سے بھی وہ فکر مند تھا جانتا تھا کہ اماں حجاب کے لیے انتہائی زیادہ پریشان ہوگی وہ حجاب کو صحیح سلامت لے کر اماں تک پہنچے گا تو اماں کی نظروں میں سرخروئی پائے گا اور اماں کی پریشانی بھی تبھی ختم ہوگی اسی لیے وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا کسی امتحان میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن امتحان خود اس کے گلے آن پڑا۔

بستی کی گلیاں خالی پڑی تھیں مرشد حجاب کو ساتھ لیے مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے بستی کے سامنے کے حصے کی طرف بڑھ رہا تھا اس کا اندازہ تھا کہ روڈ کے اس طرف وہ دونوں ایک کشادہ گلی میں آگے بڑھ رہے تھے اس گلی میں سے تین چار چھوٹی چھوٹی گلیاں دائیں بائیں نکلتی تھیں اچانک ہی سامنے کی طرف سے ایک کار اس گلی میں داخل ہوئی اور وہ دونوں ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نہا گئے مرشد فوراً ہی بائیں ہاتھ موجود ایک تنگ گلی میں مڑ گیا، ان کی خاموشی میں کار کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز اس نے بخوبی سنی تھی اور اس آواز ہی نے اس کی چھٹی حس کو چونکا دیا تھا اس نے واپس پلٹتے ہوئے گلی کی نکڑ سے جھانک کر دیکھا تو اس کے دماغ میں ایک ساتھ خطرے کے کئی الارم بج اٹھے وہ تین افراد تھے اور تینوں ہی رائفلوں سے مسلح کار سے اتر کر وہ اسی طرف بھاگے آرہے تھے مرشد کے رگ و پے میں ایک سنسناہٹ سی بیدار ہوآئی جس گلی میں وہ دونوں موجود تھے یہ خاص طویل تھی تمام گھروں کے دروازے بند تھے اگر وہ دوسری سمت بھاگتے تو دوسری نکڑ تک پہنچنے سے پہلے ہی دشمن انہیں گولیوں کا نشانہ بنا سکتے تھے وقت بہت کم تھا اور دشمن بہت قریب فوری فیصلے اور عمل کی ضرورت تھی مرشد نے ایک نظر حجاب کی سراسیمہ صورت پر ڈالی اور اگلے ہی پل ہی پل وہ رائفل کاک کرتے ہوئے گھٹنے کے بل بیٹھا اور پھر نکڑ سے جھانکتے ہوئے اس نے آنے والے دشمنوں کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر فائر کھول دیا۔

اس کے ہاتھ میں چھوٹے بیرل کی ٹرپل ٹو رائفل تھی رائفل کے دھانے سے شعلے اڑے اور فضا گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ سے لرز اٹھی۔ حجاب بے ساختہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے چیخ پڑی تھی مرشد نے تین میں سے دو کو تڑپ کر گرتے ہوئے دیکھا پھر برق رفتاری سے اٹھا اور حجاب کا ہاتھ تھامتے ہوئے گلی میں مخالف سمت کو دوڑ کھڑا ہوا دشمن نے شاید بوکھلاہٹ میں فائرنگ شروع کر دی تھی بستی کے کونوں کھدروں میں دبکے کتوں نے بھی اچانک ہی بھونکنا شروع کر دیا بستی کی فضا میں پھیلا ہوا سکون اور سناٹا یک ہی درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔

گلی کی نکڑ سے مرشد بائیں ہاتھ پلٹ گیا اس طرف سامنے ہی ایک طبیلہ نما جگہ تھی جس کے صحن کی صرف آدھی دیوار موجود تھی اور سامنے ہی چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا غالباً وہ جاگ رہا تھا کیونکہ مرشد اور حجاب کے صحن میں پہنچتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا مگر مرشد نے اس پر توجہ نہیں دی بائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ سے سیڑھیاں چھت پر جا رہی تھیں مرشد تیزی سے ان سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جو دشمن لیبر کالونی کی طرف موجود تھے اس فائرنگ کی آواز سے ان کا بھی فوراً بستی میں پہنچ آنا یقینی تھا ان کے یہ کار والے ساتھی یقیناً اوپر روڈ والی سائیڈ سے ادھر بستی میں داخل ہوئے تھے۔

چھت پر پہنچتے ہی مرشد کے اندازے کی تصدیق ہوگئی روڈ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا دور تک پھیلی ہوئی روشنیوں سے اسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ لوگ اس وقت شیخوپورہ کے انڈسٹریل ایریا کی ایک بستی میں موجود ہیں یہاں کچھ مکانوں کی چھتیں آپس میں یوں ملی ہوئی تھیں کہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری چھت تک جانے میں انہیں کسی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

''اوئے کون اے بھائی؟''

جس چھت پر وہ موجود تھے اچانک اس کے برابر والی چھت سے ایک کرخت مردانہ آواز بلند ہوئی مرشد نے ایک نظر اس طرف دیکھا چھت پر تین چار چارپائیاں موجود تھیں۔

''کی گل اے جی کی ہویا۔'' ایک گھبرائی ہوئی سی نسوانی آواز ابھری تھی مرشد خاموشی سے گزر کر اگلی چھت تک جانا چاہتا تھا کہ اچانک ایک ٹارچ کی روشنی نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔

''کیہڑا ایں اوئے۔''

وہ خدائی فوجدار ٹارچ سنبھالتے ہوئے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا مرشد نے فوراً اس کی طرف بڑھتے ہوئے رائفل سیدھی کرلی۔

''ٹارچ بند کر۔''

اس نے غراتے ہوئے اس شخص کو دبکا تو اس نے گڑبڑا کر ٹارچ کا رخ فوراً نیچے کرلیا لیکن اتنی سی دیر میں وہ اور اس کے عقب میں چارپائی پر موجود عورت مرشد کی ایک جھلک دیکھ چکے تھے۔ مرشد کی مونچھیں خون آلود بنیان اور ہاتھ میں موجود رائفل اس ایک جھلک سے ہی ان کے پتے پانی ہوگئے تھے عورت نے تو باقاعدہ چیخنا شروع کردیا تھا۔

''ٹارچ بند کرا سے چپ کرا۔'' مرشد نے پہلے مرد اور پھر عورت کو دبکا مرد نے تو فوراً لرزتے ہاتھوں سے ٹارچ آف کردی، البتہ عورت کا والیم کچھ مزید بلند ہوگیا تھا اور تو اور اس کے قریب موجود چارپائیوں پر سوئے اس کے بچے بھی ہڑبڑا کر اٹھے اور صورت حال کا علم ہوئے بغیر ہی انہوں نے بھی دھاڑیں مارنا شروع کردیں مرشد دانت کچکچا کر رہ گیا تھا۔

''ادھر...... اس طرف پیچھے ہیں وہ۔''

طبیلے والی سائیڈ سے اچانک ایک تیز آواز مرشد کے کانوں تک پہنچی، دشمن ان سے زیادہ دور نہیں تھے اور انہیں سمت کا اندازہ بھی ہوگیا تھا۔

''نیچے، نیچے اتر جلدی۔''

مرشد نے حجاب کو مخاطب کرتے ہوئے ایک طرف سے صحن میں اترتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ جلدی سے زینوں کی طرف بڑھ گئی خود مرشد عقبی چھتوں کی طرف دیکھتا ہوا الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا کہ اچانک اسے طبیلے کی چھت پر ایک ہیولہ سا نمودار ہوتا محسوس ہوا مرشد نے فوراً فائر کیا اور جلدی سے چند زینے طے کرتا ہوا نیچے بیٹھ گیا حجاب اتنے میں صحن میں جا پہنچی تھی مرشد کے فائر کے جواب میں ایک ساتھ دو تین رائفلیں گرج اٹھیں کئی گولیاں سیڑھیوں کے اوپری زینوں سے ٹکرائیں، اینٹوں اور سیمنٹ کے ذرات چنگاریاں اڑاتے ہوئے مرشد کے سر میں آ پڑے ساتھ والی چھت سے بلند ہوتی چیخم دھاڑ کی آوازیں فوراً ہی گھٹ کر بند ہوگئیں غالباً ماں باپ نے بچوں کے منہ دبا لیے تھے جن سیڑھیوں پر مرشد موجود تھا ان کے ساتھ ہی اس گھر کا برآمدہ تھا اور برآمدے میں سے بھی کچھ ڈری گھبرائی سی آوازیں سنائی دی تھیں۔

مرشد نے گردن موڑ کر نیچے دیکھا حجاب سیڑھیوں کے قریب ہی ساکت کھڑی مرشد کی طرف دیکھ رہی تھیں صحن میں اندھیرا تھا اس لیے وہ اس کے چہرے کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکا البتہ اسے یہ اندازہ بخوبی تھا کہ وہ بے چاری بری طرح دہشت زدہ ہے۔

''اس طرف ادھر کسی مکان میں گھسے ہیں۔''

''نکلنے نہ پائیں اور اس پھلی کو تو دیکھتے ہی چھلنی کردینا، جلدی کرو۔'' بغلی طرف موجود گلی میں کچھ فاصلے سے مدہم آوازیں مرشد کے کان تک پہنچیں تو اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔

تین مکان پیچھے ایک چھت پر دشمن موجود تھے برابر والی گلی میں بھی ان کے کچھ ساتھی پہنچ آئے تھے اور توقع تھی کہ کچھ ہی دیر میں چند ایک مزید بھی ان کے ساتھ آملیں گے جبکہ مرشد تنہا تھا اور اسلحے کے نام پر اس کے پاس صرف یہی ایک رائفل تھی اور اس ایک رائفل سے اتنے سارے دشمنوں پر فتح پاتا یا انہیں زیادہ دیر خود سے دور رکھنا ناممکن تھا۔ حالات یکا یک ہی انتہائی سنگین صورت اختیار کرگئے تھے۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔'' اچانک بستی کے شمالی کونے سے اذان فجر کی آواز بلند ہوئی تو مرشد نے اسی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے آہستہ سے گردن جھکالی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

●